RAMPUR U.P

نیاز نمبر

نگارِ پاکستان

قیمت فی کاپی
چار روپے

سالانہ چندہ
دس روپے

منظور شدہ، جاری کردہ اور اقراری اصل سرمایہ
۳,۰۰,۰۰,۰۰۰ روپے
ادا شدہ سرمایہ ۱,۸۰,۰۰,۰۰۰ روپے

محفوظ رقم

۳,۲۰,۰۰,۰۰۰ روپے
رقومِ امانت تا ختم دسمبر ۱۹۶۲ء
۱۲۶۔ کروڑ روپے

دنیا بھر میں بینک کاری کا کاروبار

ہر قسم کی بینک کاری کا کاروبار
دنیا بھر میں مختلف متعلقہ
اداروں کے توسط سے کیا جاتا ہے۔

بیرونی شاخیں:۔
لندن ۔ جدہ ۔ ہانگ کانگ
کلکتہ ۔ بغداد

مشرقی اور مغربی
پاکستان میں
۲۶۰ شاخیں

نیشنل بینک آف پاکستان

(نیشنل بینک آف پاکستان آرڈیننس XIX ۱۹۴۹ء کے تحت قائم شدہ)

ہیڈ آفس:۔ بالمقابل بولٹن مارکیٹ ۔ کراچی

NB 46-798
united

رجسٹرڈ نمبر ایس ۲۴۷۲

سالنامہ ۱۹۶۳ء

نیاز نمبر

حصّہ اوّل

نگار پاکستان

مرتبہ
فرمان فتحپوری

زرِ سالانہ
دس روپے

قیمت فی کاپی
چار روپے

نگار پاکستان - ۳۲ - گارڈن مارکیٹ - کراچی ۳

باہتمام عارف نیازی پرنٹر پبلشر - مشہور پریس میکلوڈ روڈ کراچی میں طبع ہوا۔

اہم اِعلان

نیاز نمبر دو حصّوں پر مشتمل ہوگا

آئندہ شمارہ نیاز نمبر حصّہ دوم ہوگا

نیاز نمبر حصّہ دوم میں حصّہ لینے والے

مانی جائسی
ڈاکٹر ابواللیث صدیقی
محمد طاہر فاروقی
سید ابوالخیر کشفی
محمد زکریا مائل
امراؤ طارق

مولانا ابوالخیر مودودی
مولانا عرشی ص ۱۶۲ (حصہ دوم)
جمیل جالبی
شاہد عشقی
شاعر لکھنوی
دانش فرازی

اثر لکھنوی
علامہ جمیل مظہری
ڈاکٹر محمد حسن
ڈاکٹر اسلم فرخی
سرشار صدیقی
مظفر گجراتی

ڈاکٹر عندلیب شادانی
مولانا غلام رسول مہر
ضیاء الدین برنی
پروفیسر ارشد کاکوی (مرحوم)
ساقی جاوید
عارف نیازی

رشید احمد صدیقی
شوکت تھانوی
سید محمد تقی
قیصر ابن حسن
عابد حشری
ملک محمد اسماعیل خاں

مولانا حامد حسن قادری
ڈاکٹر اختر اورینوی
(پرنسز) عابدہ سلطا
رئیس امروہوی
سید محمد مرتضیٰ
شمیم رضوی ـ نظر حیدرآبا

اس کے علاوہ دوسرے اہم مضامین یہ ہوں گے

۱۔ مضامین نیاز مطبوعہ نگار کا مکمل اشاریہ (۲۲ء سے ۶۳ء تک)
۲۔ گزشتہ بیالیس سال میں نگار نے جن کتابوں پر تبصرہ کیا ہے ان کی فہرست۔
۳۔ نگار سے قبل کے بعض رسائل میں نیاز کی تحریروں کا اشاریہ۔
۴۔ مختلف موضوع پر نیاز کی تحریروں کے نمونے۔
۵۔ نیاز کی عکسی تحریر اور متعدد تاریخی تصویریں۔

RAZA LIBRARY
RAMPUR. U.P.

۱۹۱۳ء

۱۹۲۵ء

3 JUL 1963

۱۹۳۲ء

۱۹۳۲ء

RAZA LIBRARY
RAMPUR, U.P.

یاران نجد

۱۹۲۲ء

F 3 JUL 1963

RAZA LIBRARY
RAMPUR U.P.

فہرست

مدیر اعلیٰ:۔ نیاز فتحپوری

۴واں سال | مارچ: اپریل سنہ ۱۹۶۳ء | شمارہ ۳-۴

ملاحظات ـــــ ۹

ادب اور زندگی

نیاز فتحپوری ایک نظر میں ـــــ فرمان فتحپوری ۱۲
والد مرحوم، میں اور نگار ـــــ نیاز فتحپوری ۱۹
حضرت نیاز فتح پوری ـــــ جوش ملیح آبادی ۴۲
آشفتہ بیانی میری ـــــ فراق گورکھپوری ۴۴
نیاز اور دلگیر ـــــ ارشد تھانوی ۴۸
نیاز اور نیاز مند ـــــ مالک رام ۵۴
نیاز فتح پوری ـــــ کوثر چاندپوری ۶۲
نیاز صاحب اور ان کی شخصیت ـــــ رئیس احمد جعفری ۶۹
نیاز نامہ ـــــ عشرت رحمانی ۷۲
استاد گرامی ـــــ آفتاب علی خاں ۷۷
نیاز اور دلی ـــــ ملا واحدی ۷۹
دلی کی آخری صحبت ـــــ خانم ممتاز مرزا ۸۲
نیاز اور بھوپال ـــــ سلیم حامد رضوی ۸۴
نیاز اور فتحپور ـــــ فرمان فتحپوری ۸۸

فکر و فن اور شخصیت

نیاز کی ادبیت و شخصیت ــــ ل۔ احمد ۹۴
اردو نثر، نیاز اور نئی نسل ــــ پروفیسر مجنوں گورکھپوری ۱۰۰
نیاز کا انداز تحریر ــــ ڈاکٹر اعجاز حسین ۱۰۵
کچھ نظریئے کچھ رجحانات ــــ پروفیسر عبدالقادر سروری ۱۰۶
نیاز کا مذہب ــــ ڈاکٹر شوکت سبزواری ۱۱۱
نیاز کی ادبیت کے بعض پہلو ــــ پروفیسر آل احمد سرور ۱۱۵
نیاز فتح پوری ــ چند تاثرات ــــ ڈاکٹر سید احتشام حسین ۱۱۷
نیاز فتح پوری سے نیاز ــــ ڈاکٹر محمد حسن فاروقی ۱۲۳
اردو ادب میں آزادئ فکر کا رجحان اور نیاز فتحپوری ــــ پروفیسر خان رشید ۱۲۷
تحقیق سے تخلیق تک ــــ پروفیسر مجتبیٰ حسین ۱۳۶
نگارشات نیاز پر ایک نظر ــــ فضل حق قریشی دہلوی ۱۴۲
نقوش ذہنی ــــ پروفیسر ممتاز حسین ۱۵۴
نیاز فتح پوری ــ ایک غیر فانی انسان ــــ برہم ناتھ دت ۱۵۷
نیاز کی انشاپردازی ــــ پروفیسر منظور حسین شور ۱۶۰
کچھ نیاز صاحب کے بارے میں ــــ پروفیسر نظیر صدیقی ۱۶۴
نیاز صاحب ــــ محمد طفیل (مدیر نقوش) ۱۶۸
نیاز صاحب سے ایک ملاقات ــــ ستن پرکاش شوق ۱۷۵
نیاز کی مزاح نگاری ــــ پروفیسر یوسف سرمست ۱۷۷
انفرادی اسلوب کی ایک مثال ــــ صلاح الدین پرکار ۱۹۰
صنف نازک اور نیاز فتح پوری ــــ عائشہ خاں ۱۹۴
نیاز فتحپوری ــ قدیم و جدید ــــ سید حامد حسین، ایم اے ۲۰۵

تخلیق و تنقید

تنقید

نیاز کے انتقادی خیالات —— ڈاکٹر سید عبداللہ ۲۱۰
تاثراتی و جمالیاتی تنقید میں نیاز کا حصّہ —— ڈاکٹر عبادت بریلوی ۲۱۵
نیاز فتحپوری بحیثیت نقاد —— ڈاکٹر عبدالقیوم ۲۲۱
عملی تنقید اور نیاز فتحپوری —— رشید حسن خاں ۲۲۵
نیاز کی ناقدانہ صلاحیتیں —— پروفیسر حسرت نعمانی ۲۳۱

افسانہ

نیاز کے افسانے —— عبدالقادر سروری ۲۳۴
رومانی افسانہ اور نیاز —— پروفیسر وقار عظیم ۲۳۵
نیاز کا ایک طویل افسانہ —— پروفیسر عبدالسّلام ۲۳۸

مکتوب نگاری

نیاز فتحپوری مکتوبات کے آئینے میں —— ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ۲۴۴
مکتوبات نیاز کی ادبی قدر و قیمت کا تعین۔ —— پروفیسر ارشد کاکوی (مرحوم) ۲۵۲

مقالہ نگاری

نیاز بہ حیثیت مقالہ نگار —— محمد خورشید عاصم ۲۶۲

ناولٹ

نیاز کے مختصر ناول —— پروفیسر وقار عظیم ۲۷۰
نیاز کا ایک ناولٹ —— ڈاکٹر سید شاہ علی ۲۸۳

شاعری

نیاز کی ارتجالی نظمیں —— ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی ۲۸۸
نیاز فتح پوری شاعر کی حیثیت سے —— پروفیسر عصمت اللہ خاں محسن ۲۹۱

نفسیات

نیاز اور جنسیات —— شمیم رضوی ۲۹۷

ملاحظات سے پہلے

"ملاحظات" لکھتے وقت میرا اندازہ تھا کہ نیاز نمبر ساڑھے تین سو صفحات سے آگے نہ بڑھے گا لیکن جیساکہ میں نے ملاحظات میں ظاہر کیا ہے نیاز نمبر کے سلسلے میں میرے بزرگوں اور دوستوں نے بڑے لطف و کرم کا ثبوت دیا اور توقع کے خلاف اس نمبر کے لئے تقریباً سات آٹھ سو صفحات کا مواد جمع ہوگیا اس کثیر مواد کو مقررہ وقت پر ایک جلد میں سمیٹنا بہت دشوار تھا اسی لئے سالنامہ اعلان کے مطابق اپریل کے اوائل میں شائع نہ ہوسکا جس کا ہمیں افسوس ہے اور قارئین نگار سے ہم اس کے لئے معذرت خواہ ہیں۔

کتابت کی غیر معمولی دشواریوں اور بعض اہم مقالات کے انتظار نے صورتِ حال کچھ ایسی پیدا کردی تھی کہ اگر اس نمبر کو ایک جلد میں شائع کیا جاتا تو جون کے اوائل سے پہلے اس کی نوبت نہ آتی۔ ظاہر ہے اتنا طویل انتظار ہمارے آپ دونوں کے لئے بڑا صبر آزما ہوتا اس لئے مناسب خیال کیا گیا کہ نیاز نمبر کو دو حصّوں میں شائع کیا جائے۔

اس وقت صرف حصّہ اوّل آپ کے پیش نظر ہے اور اسی لئے ملاحظات کے بعض اجزا آپ کو بے جوڑ اور غیر متعلق نظر آئیں گے۔ بات یہ ہے کہ ترتیب و تدوین کے سلسلے میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ دراصل نیاز نمبر کو ایک جلد میں شائع کرنے کے خیال سے لکھا گیا تھا۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ یہ پرچہ ملاحظات کی تفصیل کے مطابق نہ ہوگا اور اس کے لئے آپ کو نیاز نمبر حصّہ دوم کا انتظار کرنا پڑے گا۔

یقین ہے کہ نیاز نمبر حصّہ دوم جس کی تفصیل صـ۲ پر دی جاچکی ہے آپ کی توقعات کے مطابق ہوگا۔

فرمان فتحپوری

RAZA LIBRARY
RAMPUR, U.P.

۳۰ر اپریل ۱۹۶۳ء

3 JUL 1963

3 JUL 19

ادارۂ نگار (پاکستان)

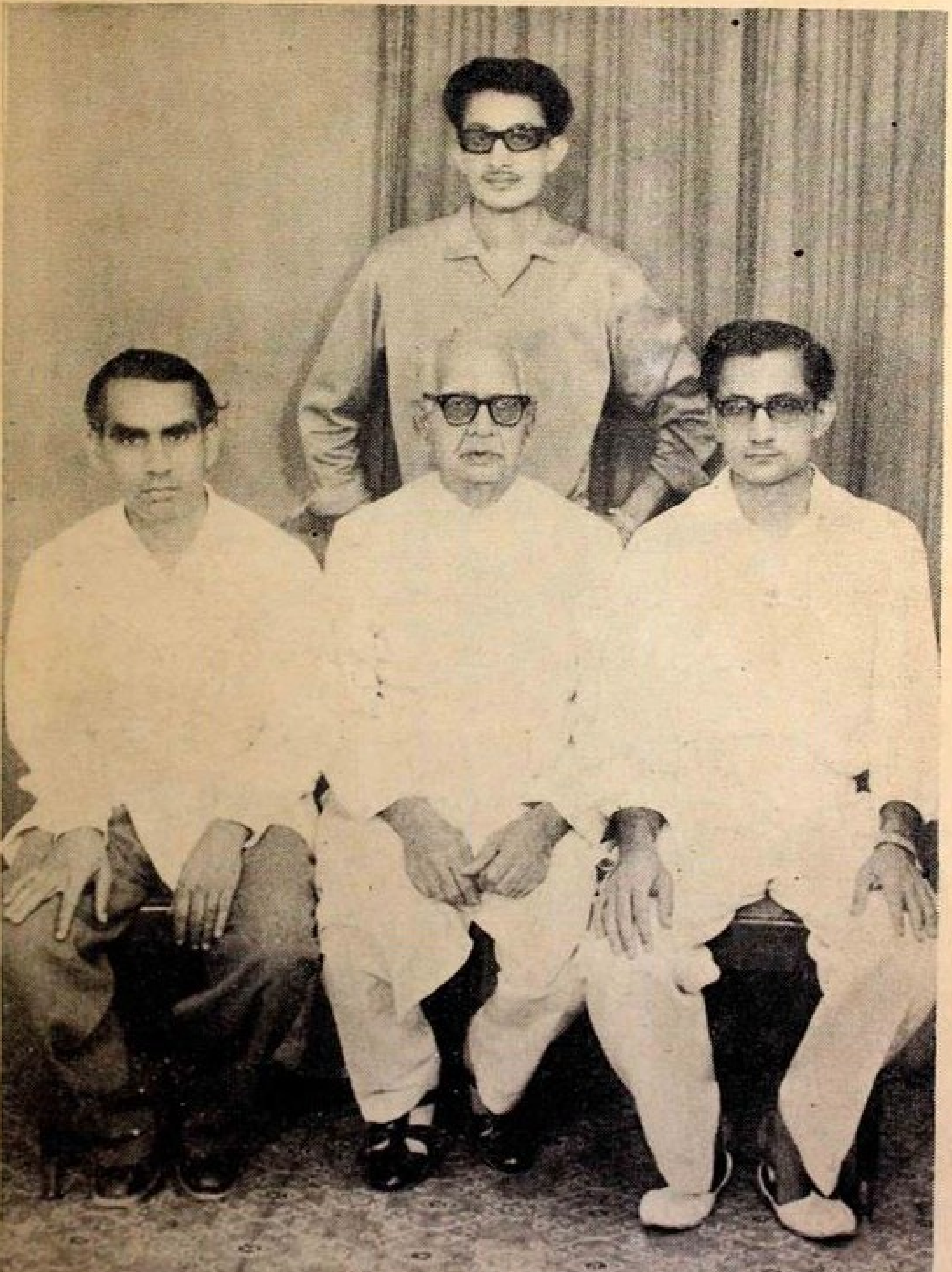

عارف نیازی
حضرت نیاز فتحپوری
فرمان فتحپوری
قمر نیازی

RAZA LIBRARY
RAMPUR, U.P.

ملاحظات

فرمان فتحپوری

سنہ ۶۳ء کے سالنامے کے لئے نیاز صاحب اکتوبر سنہ ۶۲ء کے پرچے میں "استفسار نمبر" کا اعلان کر چکے تھے۔ نومبر میں جب میں اعزازی طور پر نگار سے منسلک ہوا تو سب سے پہلے میں نے اپنی ایک دیرینہ آرزو پوری کرنی چاہی اور ایک دن "استفسار نمبر" کی جگہ "نیاز نمبر" نکالنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ نیاز صاحب نے میری بات کو کوئی اہمیت نہ دی اور کہنے لگے "اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے دو تین دن کے بعد پھر یہی ذکر چھیڑا تو فرمانے لگے "کیا آپ کو واقعی میرے جلد مر جانے کا یقین ہو گیا ہے۔ آخر یہ نیاز نمبر کی رٹ آپ نے کیوں لگا رکھی ہے" میں نے جواب دیا خدانخواستہ ایسا نہیں ہے "آپ تو مر کر بھی زندہ رہنے والوں میں ہیں۔ موت برحق ہے آئے گی اور ضرور آئے گی۔ آج نہیں تو کل۔ لیکن مجھے یقین ہے وہ آپ کا بال بھی بیکا نہ کر سکے گی، اس لئے موت کے خوف سے نیاز نمبر نکالنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس پر نیاز صاحب بولے "پھر آخر آپ نیاز نمبر کے لئے کیوں مصر ہیں؟" اب میں انہیں کیا جواب دیتا۔ سوا اس کے کہ:-

شمارِ شوق نہ دانستہ ام کہ تا چند است
جز ایں قدر کہ دلم سخت آرزو مند است (خانخاناں)

یہ شعر میرے ذہن میں آیا لیکن سنانے کی ہمت نہ ہوئی اور خاموش ہو گیا۔ دوسرے تیسرے دن موقع پا کر میں نے پھر "نیاز نمبر" کا ذکر چھیڑا۔ میرے اصرار پر پہلے مسکرائے پھر سنجیدہ ہو کر بولے "اوّل تو نگار کا نیاز نمبر نکالنا مناسب نہیں علاوہ اس کے وقت بھی کم ہے اور مضامین کی فراہمی آسان نہیں۔ میرا ارادہ دراصل اکبر الہ آبادی نمبر نکالنے کا تھا لیکن اتنے کم وقت میں نہ تو میں خود پورا نمبر مرتب کر سکتا تھا اور نہ دوسروں کو اس کی زحمت دے سکتا تھا اس لئے باز رہا اور استفسار نمبر کا اعلان کر دیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ سالناموں کا اعلان سال کے شروع میں کیا جاتا ہے۔ خود نگار کے سالناموں کا اعلان بھی میں آغازِ سال میں کرتا تھا۔ اور خواہ پورا پرچہ خود لکھنا ہو یا دوسروں سے لکھوانا ہو، پورے سال اس میں لگا رہتا تھا تب کہیں خاطر خواہ نمبر نکلتا تھا۔ دو تین مہینے کے اندر کسی خاص نمبر کا نکلنا ممکن ہی نہیں ہے" لیکن یہاں تو مجذوب کی ایک بڑ تھی۔ جب مجھ پر ان کی باتوں کا کچھ اثر نہ ہوا تو ایک دن جھنجھلا کر بولے "آپ کا جو جی چاہے کیجئے، میں کچھ نہیں جانتا" میں نے "جو جی چاہے" کے فقرے سے فائدہ اٹھایا اور اسباب و نتائج پر غور کئے بغیر نومبر کے پرچے میں "نیاز نمبر" کی صورت میں اپنے شوقِ بے پایاں کا اعلان کر دیا۔

نیاز صاحب نگار کے "نیاز نمبر" کی اجازت جس بناء پر نہ دے رہے تھے وہ میرے ذہن میں بھی تھی۔ خود نیاز صاحب جس پرچے کے مدیر ہوں وہی اُن کا نمبر شائع کرے۔ یہ بات بظاہر کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ "نگار" کے سوا کسی اور پرچے کو "نیاز نمبر" نکالنے کا استحقاق بھی نہیں پہنچتا۔ نیاز و نگار دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔ یہ دراصل ایک ہی تحریک — ایک ہی مکتبِ فکر

اور ایک ہی رجحان کے دو نام ہیں۔ انہیں ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھنا نہ تو مفید ہے اور نہ مناسب۔ نگار جسم ہے تو نیاز اُس کی روح ہیں۔ نیاز جوہر ہیں تو نگار اُس کا عرض ہے۔ نگار ایک روایت ہے تو نیاز اس روایت کے بانی ہیں۔ نیاز نے نگار کو جنم دیا ہے تو نگار نے نیاز صاحب کو حیاتِ ابدی بخشی ہے۔ چنانچہ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ نگار کا ذکر آئے اور نیاز صاحب کا نام نہ لیا جائے یا نیاز صاحب کا تذکرہ ہو اور نگار زیرِ بحث نہ آئے۔ ان دونوں میں رعایت لفظی نہیں تلازم معنوی ہے۔ نیاز صاحب کے کمالات و صفات کا اندازہ کرنا ہو تو نگار کو ذہن میں ابھارنا پڑے گا اور نگار کے جمال و جلال کو سمجھنا ہو تو نیاز صاحب کی تحریروں پر نظر ڈالنا ہوگا۔ گویا نیاز و نگار ایک دوسرے کے تتمہ ہیں جنھیں ایک دوسرے سے جدا کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ بات یہ ہے کہ کسی مدیر کا کسی علمی و ادبی ماہنامے کے ساتھ اتنا طویل و عمیق تعلق نہیں رہا، جتنا کہ نگار کا نیاز سے یا نیاز کا نگار سے ہے۔ گزشتہ چالیس سال میں ان دونوں نے علمی و ادبی خدمات کے سلسلے میں جس استقلال و استحکام اور توازن و تواتر کا ثبوت دیا ہے، شخصی حیثیت سے اُس کی مثال اردو ادب میں نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی میرے ذہن میں "نیاز نمبر" کا خیال آیا تو میں نے نگار کے سوا کسی اور پرچے کو اس کے لیے مناسب نہیں سمجھا۔ یہی خیال تھا جس کے سبب نیاز صاحب کی مرضی کے خلاف میں نے نگار کے نیاز نمبر کا اعلان کر دیا۔

اعلان تو کر دیا لیکن جب کام شروع کیا اور امکانات کا جائزہ لیا تو اندازہ ہوا کہ نیاز صاحب اپنے ساٹھ سال کے تجربے کی بنا پر جو کہہ رہے تھے وہ بالکل صحیح تھا۔ لیکن خود کردہ کا علاج بھی کیا تھا۔ "کشتی در آب انداختیم" کا مضمون تھا۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا لیکن دو تین ہفتے کے اندر ہی میرے بزرگوں اور دوستوں نے میری کچھ ایسی ہمت افزائی فرمائی کہ یاس کا اندھیرا چھٹ گیا اور امید کی کرن نظر آنے لگی۔ آخر آخر "نیاز نمبر" کی محفل میں برصغیر کے اکثر بلند پایہ اہل قلم شریک ہو گئے۔ میں ان حضرات کا حد درجہ ممنون ہوں کیونکہ انھوں نے وقت کی کمی کے باوجود میری گزارش پر جس مخلصانہ تعاون اور نیاز نمبر کے سلسلے میں جس لطف و کرم اور فرمان نوازی کا ثبوت دیا ہے وہ اگر میسر نہ ہوتی تو "نیاز نمبر" اتنی جلد منظرِ عام پر نہ آسکتا۔ نگار کا یہ نمبر کیفیت و کمیت کے اعتبار سے فی الواقع کیسا ہے اس کا فیصلہ تو قارئین نگار ہی کریں گے۔ لیکن اگر اسے میری ڈھٹائی یا خود رائی پر محمول نہ کیا جائے تو میں صرف اسقدر عرض کروں گا کہ "نیاز نمبر" کے قلمی معاونین کے توسط سے میں جو کچھ فراہم کر سکا ہوں اسے پیش کرنے میں کوئی ندامت محسوس نہیں کرتا۔

اس نمبر میں خواہ کچھ اور خوبیاں ہوں یا نہ ہوں لیکن اس میں ایک خصوصیت ضرور ایسی ہے جو اسے اس قسم کے دوسرے خاص نمبروں سے ممتاز کرتی ہے۔ میری مراد مضامین کے تنقیدی اُسلوب اور لب و لہجہ سے ہے۔ یہ نمبر نیاز صاحب کی زندگی ہی میں اُن کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف ہی میں نکالا گیا ہے لیکن اس کی حیثیت محض مدحیہ قصیدہ کی سی نہیں ہے بلکہ اس میں جتنے مضامین شامل ہیں ان سب میں نیاز کی شخصیت و فن پر بے لاگ تنقید کی گئی ہے اس سے نیاز صاحب کی شخصیت دبی نہیں اور ابھر آئی ہے۔ اس لئے کہ بقول مولانا حالی "انسان کی عظمت فرشتہ بننے میں نہیں انسان رہنے میں ہے" اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ اس کی شخصیت و فن کے اچھے بُرے دونوں پہلوؤں پر نظر رکھی جائے۔ مجھے خوشی ہے کہ میری گزارش کے مطابق "نیاز نمبر" کے مقالہ نگاروں نے جرأت سے کام لیا ہے۔ وہ اس مرعوبیت کا شکار نہیں ہوئے جس میں ہمارے لکھنے والے اکثر مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور ان کی قلم فرسائی ایک بے اثر مدح سرائی کے سوا اور کچھ نہیں رہ جاتی۔ اس نمبر میں نیاز کے فکر و فن اور شخصیت و زندگی کے ہر پہلو پر کڑی تنقیدیں ملیں گی لیکن ان تنقیدوں کا انداز نہ معاندانہ ہے نہ جارحانہ۔ نہ تنقیصی ہے نہ تخریبی بلکہ ان میں اعتدال و توازن، انصاف و سنجیدگی، تعمیر و توجیہ اور تجزیہ و تحلیل کی بہت عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ میرے خیال میں نیاز نمبر کی یہی وہ خصوصیت ہے جو اسے اس قسم کے خاص نمبروں سے ممتاز کرتی ہے۔

اس نمبر میں "نیاز و نگار" کے ہر پہلو کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ "ادب و زندگی" کے تحت وہ مقالات ہیں جن میں مقالہ نگاروں نے زیادہ تر شخصی یا ذاتی تجربات کی روشنی میں نیاز کی ادبی شخصیت اور زندگی کو پرکھا ہے۔ "فکر و فن" کے عنوان سے نیاز کے افکار و خیالات اور معتقدات و نظریات پر بحث کی گئی ہے اور نیاز کے فکر و فن کی مجموعی قدر و قیمت کا تعین کیا گیا ہے "تخلیق و تنقید" کے باب میں نیاز کی متنوع تحریروں کو فنی حیثیت سے پرکھا گیا ہے اور ہر صنفِ ادب میں اُن کے نوعیت و اہمیت کی نشان دہی کی گئی ہے۔ "نیاز و نگار" کے تحت "نیاز و نگار" کی علمی و ادبی خدمات و روایات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ "اعتراف و اعتذار" کے ذیل میں نیاز نمبر کے سلسلے میں پیغامات و تاثرات درج ہیں اور اس میں نظم و نثر دونوں شامل ہیں۔ "منتخبات" میں نیاز صاحب کی متنوع تحریروں کا ایک ایک نمونہ دیا گیا ہے۔ جس سے نیاز کی جامع الصفات شخصیت اور ہمہ گیر علمی و ادبی حیثیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ آخر میں قیصر ابن حسن کا ترتیب دیا ہوا "نیاز و نگار" کا اشاریہ ہے۔

یہ نمبر بلحاظ مقدار و معیار کس نوع کا ہے اور اس کی ترتیب و تدوین کس انداز کی ہے اس کے متعلق تو قارئین نگار ہی کی رائے صائب ہوگی۔ میں تو اپنے جذبۂ سپاس گزاری کے تحت صرف اس قدر عرض کروں گا کہ اگر نیاز نمبر کے لکھنے والے مجھ پر کرم نہ فرماتے اور مجھے بعض احباب خصوصاً زاہد علی صاحب، ابو طارق صاحب، شفیق کوٹی صاحب، محمد عمر صاحب، عابد رضا بیدار صاحب، پروفیسر ارشد کاکوٹی اور انیس احمد اعظمی صاحب کا تعاون حاصل نہ ہوتا یا میرے شریک کار برادرم عارف نیازی اور قمر نیازی اس انہماک و استقلال سے میرا ہاتھ نہ بٹاتے تو اتنے کم عرصے میں یہ نمبر وجود میں نہ آتا۔ نیاز نمبر کو جلد سے جلد تکملہ کی منزل تک پہنچانے میں زیادہ حصہ عارف نیازی کا ہے۔ یہ دراصل انہیں کی ان تھک کوششوں اور محنتوں کا نتیجہ ہے کہ نگار کا خاص نمبر آپ کے سامنے ہے ورنہ بہت ممکن تھا کہ مقالات کی فراہمی کے باوجود ابھی اس کام میں اور تاخیر ہو جاتی۔

آخر میں، میں نیاز صاحب کا شکر گزار ہوں جنھوں نے میری ضد بہر حال پوری کی اور نیاز نمبر کی تدوین و ترتیب کی خدمت کا موقع عنایت فرما کر میری ایک دیرینہ آرزو پوری کر دی۔ اب میں قلب و روح کی گہرائیوں کے ساتھ برصغیر کے دانشوروں، ادیبوں اور آزادیٔ فکر کے حامیوں کی طرف سے ان کی خدمت میں یہ خصوصی نمبر پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔

سخن طرازی و دانش ہنر نظیری نیست
قبول دوست مگر نالۂ حزیں گردد

ڈاکٹر عندلیب شادانی اور نظیر صدیقی کے خطوط سے اچانک خبر ملی کہ پروفیسر ارشد کاکوی جو کچھ دنوں سے یوکیمیا کے مریض تھے، ۱۸ فروری کی شب میں ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔ اردو کے جواں سال ادیب و شاعر "ارشد" نگار و نیاز دونوں کے دلدادہ تھے۔ "نیاز نمبر" کے سلسلے میں وہ خصوصاً مدد کر رہے تھے۔ انہوں نے تیس بتیس سال کی عمر میں اردو ادب میں جو نمایاں جگہ بنا لی تھی وہ کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ افسوس کہ زمانے کی نظر انہیں کھا گئی اور ہم ایک ایسے ہونہار ادیب سے محروم ہو گئے جس سے اردو کو بہت کچھ ملنا تھا۔

(ادارہ)

نیاز فتحپوری ایک نظر میں

فرمان فتحپوری

(۱) نام، وطن اور تاریخ پیدائش

(۱) پیدائشی نام - نیاز محمد خاں (والدہ کا رکھا ہوا)
(۲) تاریخی نام - لیاقت علی خاں ۱۳۰۲ھ (والد کا رکھا ہوا)
(۳) قلمی نام - نیاز فتحپوری
(۴) باپ کا نام - محمد امیر خاں متوفی ۱۹۰۸ء
(۵) وطن - فتح پور ہسوہ محلہ خیلدار
(۶) جائے پیدائش - سنئی گھاٹ (ضلع بارہ بنکی)
(۷) تاریخ پیدائش - ۱۳۰۲ھ / ۱۸۸۴ء
(۸) خطاب - پدما بھوشن - اپریل ۱۹۶۲ء میں بجانب حکومت ہند

(۲) تعلیم و تربیت

(۱) چھ سات سال کی عمر تک گھر پر مکتبی تعلیم والد کی زیر نگرانی پائی۔ پہلے مولوی حبیب الدین صاحب (ساکن نیوتنی ضلع اناؤ) شاگرد مولانا احسن بلگرامی اور بعد ازاں لکھنؤ میں مولوی صدیق حسن غازی پوری اتالیق مقرر ہوئے۔

(۲) نو دس سال کی عمر میں مولانا ظہور الاسلام کے بنا کردہ مدرسہ اسلامیہ فتح پور میں داخل ہوئے۔ علوم اسلامی کے ساتھ ساتھ یہیں سے ۱۸۹۸ء میں انگریزی مڈل اور ۱۸۹۹ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔

(۳) اس سے پہلے تقریباً ڈیڑھ سال دارالعلوم ندوہ لکھنؤ اور پھر مدرسہ عالیہ رام پور میں (جس کے پرنسپل مولانا عرب طبیب صاحب علم و فضل کے اعتبار سے اس زمانے کے نہایت ممتاز شخصیت خیال کئے جاتے تھے) اور مولانا وزیر محمد خاں شاگرد مولانا عبدالحق خیر آبادی سے بھی تعلیم حاصل کی۔

(۳) قابل ذکر اساتذہ جن کا مثبت یا منفی اثر قبول کیا۔

(۱) مولانا سید ظہور الاسلام صاحب محرک ندوۃ العلماء و بانی مدرسہ اسلامیہ فتح پور
(۲) مولانا نور محمد صاحب مدرس اعلیٰ شاخ عربی مدرسہ اسلامیہ فتح پور

(۳) مولانا فاروق چریا کوٹی

(۴) مولانا عرب محمد طبیب صاحب مدرس اعلیٰ مدرسۂ عالیہ رام پور

(۵) مولانا وزیر محمد خاں مدرس مدرسہ عالیہ رام پور

(۶) مولانا محمد حسین خاں صاحب فاضل دیوبند مدرس مدرسۂ اسلامیہ فتح پور

(۷) مولوی اعزاز علی صاحب ہیڈ ماسٹر شاخ انگریزی مدرسۂ اسلامیہ فتح پور

(۸) مولوی حبیب الدین اتالیق و مدرس مدرسۂ اسلامیہ فتح پور

(۹) مولوی صدیق حسن غازی پوری اتالیق

شادی

(۱) پہلی شادی سنہ ۱۹۱۰ء میں بہ عمر ۲۶ سال الہ آباد میں ہوئی۔ سنہ ۱۹۲۳ء میں بیوی کا انتقال ہوگیا

(۲) دوسری شادی سنہ ۱۹۲۶ء میں بمقام لکھنؤ مختار بیگم سے ہوئی جن کی وفات سنہ ۱۹۲۷ء میں ہوئی

(۳) تیسری شادی سنہ ۱۹۲۸ء میں مرحومہ کی چھوٹی بیوہ بہن گلزار بیگم بنت محمد ولایت خاں صاحب سے لکھنؤ میں ہوئی

اولاد

(۱) پہلی بیوی سے چار لڑکیاں ہوئیں۔ دو حیات ہیں اور پاکستان میں ہیں دو کا انتقال ہوگیا

(۲) دوسری بیوی مختار بیگم سے صرف شوکت جہاں آرا ہوئیں جو لکھنؤ میں مجدد کو بیاہی تھیں اور سنہ ۱۹۵۰ء میں وفات پاگئیں۔

(۳) تیسری بیوی گلزار بیگم حیات ہیں۔ نیاز صاحب کی چھوٹی سالی ہیں پہلے ظفر احمد خاں کو بیاہی تھیں جن سے محمد یوسف خاں محمد آصف خاں۔ محمد عارف خاں اور محمد قمر خاں ہیں۔ بیوہ ہو جانے کے بعد نیاز صاحب کے نکاح میں آئیں اور ان سے دو لڑکے محمد سرفراز خاں نیازی اور محمد ریاض خاں نیازی پیدا ہوئے۔ جن کی عمریں اس وقت بالترتیب پندرہ اور بارہ سال ہیں اور دونوں زیر تعلیم ہیں۔

خاندان

(۱) محمد امیر خاں نے تین شادیاں کیں۔ پہلی بیوی سے ایک لڑکی ہوئی۔ دوسری بیوی سے محمد نجابت علی خاں پیدا ہوئے جن کا ۱۲۔ ۱۳ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ تیسری بیوی سے ایک لڑکی نظیر النساء۔ اور نیاز محمد خاں پیدا ہوئے۔

قابل ذکر ہم درس فتحپور میں

(۱) مولانا سید فضل الحسن حسرت موہانی

(۲) سید روح الحسن (برادر بزرگ مولانا حسرت موہانی)

(۳) سید مشتاق حسین ۔ فتحپوری

طویل قیام

سن پیدائش سنہ ۱۸۸۴ء سے لیکر سنہ ۱۹۱۶ء تک کے درمیانی حصے میں تقریباً اکیس بائیس سال فتحپور میں بسر ہوئے چونکہ نیاز کے والد

محکمۂ پولیس سے وابستہ تھے اور ان کا تبادلہ یوپی کے مختلف اضلاع میں ہوا کرتا تھا اس لئے نیاز صاحب کا قیام بھی مختلف شہروں میں رہتا تھا۔ لیکن سال کے چند مہینے فتح پور ہی میں گزرتے تھے سنہ ۱۸۹۳ء کے قریب وہ مدرسہ اسلامیہ فتحپور میں داخل ہوئے اس وقت اُن کے والد اگرچہ لکھنؤ میں تھے لیکن نیاز کا زیادہ قیام بغرض تعلیم فتحپور ہی میں رہتا تھا، سنہ ۱۸۹۶ء میں جب اُن کے والد نے پنشن لیکر رام پور میں وکالت شروع کی تو نیاز بھی رام پور چلے گئے۔ واپس ہو کر سنہ ۱۸۹۸ء اور سنہ ۱۸۹۹ء میں انہوں نے انگریزی مڈل اور میٹرک کے امتحان پاس کئے۔ اس کے بعد ملازمت پولیس کا سلسلہ رہا۔ سنہ ۱۹۱۵ء تک یعنی بھوپال جانے سے پہلے وہ مختلف جگہ رہے لیکن اس عرصے میں بھی انھوں نے مدرسہ اسلامیہ (انگریزی شاخ) کے نگراں کی حیثیت سے مختلف اوقات میں تقریباً پانچ چھ سال فتحپور میں قیام کیا۔

(۲) بھوپال۔ سنہ ۱۹۱۵ء سے سنہ ۱۹۲۶ء تک
(۳) لکھنؤ۔ سنہ ۱۹۲۷ء سے سنہ ۱۹۶۲ء تک
(۴) کراچی۔ ۳۱ر جولائی سنہ ۱۹۶۲ء سے

۹ عہد رنگین کے یادگار مقامات

(۱) مسوری (۲) کلکتہ (۳) الہ آباد (۴) دلی (۵) سری نگر (۶) ہانسی (۷) اجے گڑھ (۸) لکھنؤ
(۹) رام پور (۱۰) بھوپال (۱۱) بمبئی۔

(۱۰) سلسلۂ ملازمت

(۱) سنہ ۱۹۰۰ء میں پولیس سب انسپکٹر کے لئے نامزد ہوئے اور مراد آباد میں پولیس ٹریننگ مکمل کی۔
(۲) سنہ ۱۹۰۱ء میں بہ حیثیت سب انسپکٹر تھانہ ہنڈیا (ضلع الہ آباد) میں تعینات ہوئے۔ سنہ ۱۹۰۲ء میں مستعفی ہو گئے۔
(۳) سنہ ۱۹۰۳ء اور سنہ ۱۹۰۵ء کے درمیان مدرسہ اسلامیہ انگریزی شاخ کے ہیڈ ماسٹر رہے
(۴) سنہ ۱۹۰۵ء اور سنہ ۱۹۰۶ء کے درمیان باونی اسٹیٹ (کدورا) میں بعہد نواب ریاض الحسن خاں، ہیڈ ماسٹر، شہر کوتوال اور پرائیویٹ سیکرٹری کے عہدوں پر مامور رہے۔
(۵) سنہ ۱۹۰۶ء اور سنہ ۱۹۰۸ء کے درمیان اجے گڑھ اسٹیٹ بندیلکھنڈ میں پولیس سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوئے۔
(۶) سنہ ۱۹۰۸ء اور سنہ ۱۹۰۹ء کے درمیان ہانسی (ضلع حصار) گئے اور وہاں اسکرا اسٹیٹ میں بہ حیثیت سیکرٹری کام کرنے لگے سجاد حیدر یلدرم سے ملاقات ہونے اور انکی تحریروں سے متاثر ہونے کا یہی زمانہ ہے۔
(۷) سنہ ۱۹۰۹-۱۹۱۰ء میں واپس آکر دوبارہ مدرسہ اسلامیہ سے منسلک ہو گئے۔
(۸) سنہ ۱۹۱۰ء ہی کے درمیان چند مہینے مولانا ظفر علی خاں کے اخبار زمیندار سے منسلک رہے۔ مولوی وحیدالدین سلیم بھی اُن کے ساتھ تھے
(۹) سنہ ۱۹۱۱ء میں دوبارہ ہانسی (ضلع حصار) گئے اور میونسپل سیکرٹری مقرر ہوئے

(۱۰) ۱۹۱۲ء میں فتحپور واپس ہوئے اور مدرسہ اسلامیہ سے منسلک رہے۔

(۱۱) ۱۹۱۴ء میں دلی گئے اور حکیم اجمل خاں کے انگریزی اسکول کے نگراں رہے۔

(۱۲) ۱۹۱۵ء میں بھوپال پہنچے اور مختلف شعبوں میں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔

(۱۱) صحافتی زندگی

(۱) ۱۹۱۰ء میں "زمیندار" اخبار سے منسلک ہوئے

(۲) ۱۹۱۱ء میں ہفتہ وار "توحید" کے معاون مدیر ہوئے۔

(۳) ۱۹۱۲-۱۳ء میں ہفتہ وار "خطیب" کے قلمی معاون رہے۔

(۴) ۱۹۱۹ء میں روزانہ اخبار "رعیت" کے چیف ایڈیٹر مقرر ہوئے

(۵) ۱۹۱۱-۱۲ء میں "سہیل" نامی رسالہ نکالنے کا خیال ہوا لیکن اجرا نہ ہو سکا

(۶) فروری ۱۹۲۲ء سے نگار کے مدیر اعلیٰ ہیں

(۱۲) علمی و ادبی زندگی

(۱) فتحپور کے دورِ تعلیم ہی میں یعنی ۱۸۹۸ء اور ۱۹۰۰ء کے درمیان شعر و ادب کا ذوق پیدا ہو گیا تھا اور طرح پر غزل کہہ کر مشاعروں میں پڑھنے لگے تھے

(۲) غزل کے ساتھ ساتھ نظموں کا شوق ہوا۔ چند دنوں بعد انشائے لطیف اور رومانی افسانہ نگاری پر بھی قابو پا لیا۔ یہ سلسلہ ۱۹۰۶ء سے لیکر ۱۹۲۱ء تک برابر قائم رہا۔

(۳) ۱۹۲۲ء کے بعد علمی اور مذہبی فکر انگیز تحریروں کا سلسلہ شروع ہوا۔

(۴) ۱۹۲۵-۲۶ء سے تحقیقی و تنقیدی مقالات لکھنے کا آغاز ہوا۔

(۵) ۱۹۳۰ء کے بعد متنوع مسائل حیات، اور مختلف علوم و فنون پر قلم اٹھایا اور نگار کو دائرۃ المعارف خیال کیا جانے لگا۔

(۶) تخلیقات کی طباعت و اشاعت کا آغاز "انتخاب لاجواب (لاہور) اور صلائے عام (دہلی) سے ہوا۔

(۱۳) نگار سے قبل کی تحریریں

۱۹۲۲ء یعنی نگار کے اجرا سے پہلے نیاز صاحب کی تحریریں زیادہ تر مندرجہ ذیل پرچوں میں شائع ہوئی ہیں

(۱) انتخاب لاجواب (لاہور) — (۲) صلائے عام (دہلی)
(۳) زمیندار (لاہور) — (۴) صوفی (امرتسر)
(۵) رعیت (میرٹھ) — (۶) خطیب (دہلی)
(۷) الہلال (کلکتہ) — (۸) تمدن (دہلی)
(۹) نقاد (آگرہ)

(۱۴) نگار کا اجراء

(۱) آگرہ ـــــ فروری ۱۹۲۲ء سے دسمبر ۲۲ء تک
(۲) بھوپال ـــــ جنوری ۱۹۲۳ء سے جون ۱۹۲۷ء تک
(۳) لکھنؤ ـــــ جولائی ۱۹۲۷ء سے جولائی ۱۹۶۲ء تک
(۴) کراچی ـــــ اگست ۱۹۶۲ء سے

(۱۵) فکر و فن کو متاثر کرنیوالی شخصیتیں

سرسید احمد خاں (۲) محسن الملک (۳) مولانا شبلی (۴) اکبر الٰہ آبادی (۵) ٹیگور (۶) آسکر وائلڈ (۷) مہدی افادی
(۸) مولانا ظفر علی خاں (۹) ولیم ہزلیٹ (۱۰) میر ناصر علی (۱۱) سرور جہان آبادی (۱۲) علامہ اقبال (۱۳) سید سجاد حید
(۱۴) مولوی کرامت حسین (۱۵) ابوالکلام آزاد
(۱۶) ورڈسورتھ (۱۷) شیلی (۱۸) چیسٹرٹن (۱۹) برنارڈ شا (۲۰) واشنگٹن ارونگ

(۱۶) زبانوں سے واقفیت

(۱) اردو ، (۲) فارسی (۳) عربی (۴) ترکی (۵) ہندی (۶) انگریزی

(۱۷) علوم و فنون پر دسترس

(۱) فقہ (۲) حدیث (۳) تفسیر (۴) نجوم (۵) علم الکلام (۶) معانی و بیان (۷) فلسفہ (۸) منطق (۹) عر
(۱۰) موسیقی (۱۲) تاریخ (۱۳) نفسیات (۱۳) قواعد (۱۴) فن تجوید (۱۵) فن انشاء (۱۶) تصویر کشی

(۱۸) اردو کے پسندیدہ فنکار

انشائے لطیف (۱) مہدی افادی (۲) سجاد حیدر یلدرم (۳) میر ناصر علی
ناول و افسانہ ۔ (۱) نذیر احمد ۔ شرر ۔ سرشار ۔ راشد الخیری ۔ پریم چند
طنز و مزاح ۔ (۱) اکبر الٰہ آبادی (۲) پطرس بخاری (۳) رشید احمد صدیقی (۴) شوکت تھانوی
نظم نگاری ۔ (۱) اسمٰعیل میرٹھی (۲) سرور جہاں آبادی (۳) اقبال (۴) اختر شیرانی (۵) حفیظ جالندھری (۶) نظیر اکبرآبادی
(۷) جمیل مظہری (۸) جوش ملیح آبادی (۹) شوق قدوائی (۱۰) منظور حسین شور
گیت اور غزل ، میر ، مصحفی ۔ غالب ، مومن ، داغ ، فانی ، جلال لکھنوی ۔ شاد عظیم آبادی ۔ حفیظ جالندھری
فراق گورکھپوری ۔ حسرت موہانی ، وحشت کلکتوی ۔ فیض احمد فیض ۔ اجتبیٰ رضوی ۔ علی اختر حیدرآبادی ۔
مثنوی ۔ (۱) میر حسن (۲) شوق قدوائی (۳) نواب مرزا شوق

مرثیہ ۔ (۱) میر انیسؔ

(۱۹) دوسری زبانوں کے پسندیدہ شعرا و ادبا

(۱) ترکی ۔ نگار بنت عثمان

(۲) عربی ۔ ابونواس ۔ مہلہل ۔ فرزدق ، لیلیٰ اخیلیہ ، ابوالعتاہیہ ، متنبی ،

(۳) فارسی ۔ عرفی ، غالب ، فردوسی ۔ سعدی ، حافظ ، خسرو ، بیدل ۔ ظہوری ۔ نسبتی تھانیسری ۔ اقبال

(۴) ہندی ۔ میرابائی ، بہاری لال ، تلسی داس ، عبدالرحیم خانخاناں

(۵) انگریزی ۔ ولیم ہزلیٹ ، ورڈسورتھ ۔ شیلی ، کیٹس ۔ آسکر وائلڈ ۔ واشنگٹن ایرونگ ۔ رینالڈز ۔ برنارڈ شا

(۲۰) فرصت کے مشغلے

(۱) مطالعۂ کتب (۲) موسیقی (۳) فوٹوگرافی (۴) میکانکزم (۵) سیر و سیاحت

(۲۱) حلقۂ احباب —— (نیازؔ صاحب کے احباب کی فہرست بہت طویل ہے چند حضرات یہ ہیں)

ہوش بلگرامی (مرحوم)
مانی جائسی
ملا واحدی
ڈاکٹر ذاکر حسین خاں
عارف ہسوی (مرحوم)
علی اختر حیدرآبادی (مرحوم)
جگر مرادآبادی مرحوم
اثر لکھنوی
مجنوں گورکھپوری
محمد مجیب انصاری
امتیاز علی تاج
احتشام حسین
خواجہ ذوقی

ضیاء عباس ہاشمی
مرزا عبدالغفار بیگ مغل (مرحوم)
محمود اکبرآبادی
جوش ملیح آبادی
رشید احمد صدیقی
دلگیر اکبرآبادی (مرحوم)
حکیم اجمل خاں (مرحوم)
فراق گورکھپوری
چودھری برہم ناتھ دت
مولانا ظفر علیخاں
محمد طفیل
عبدالباری آسی (مرحوم)
عبدالروف ہسوی
حکیم محمد سعید

ملک حبیب احمد خاں (مرحوم)
خلیقی دہلوی (مرحوم)
ابوالخیر مودودی
راشد الخیری (مرحوم)
بیدل شاہجہانپوری (مرحوم)
مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم)
مولانا حسرت موہانی (مرحوم)
مولانا عبدالرزاق کانپوری (مرحوم)
جمیل مظہری
غلام رسول مہر
چودھری فیض احمد فیض
ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی
شجاعت علی رضوی (مرحوم)
مالک رام

ل ، احمد
حکیم مجیب الدین لقائی (مرحوم)
مہدی افادی
سجاد حیدر یلدرم (مرحوم)
امتیاز علی خاں عرشی
مولانا ارشد تھانوی
کوثر چاندپوری
حسن الدین خاموش (مرحوم)
ڈاکٹر عندلیب شادانی
شورش کاشمیری
آل احمد سرور
ڈاکٹر نارنگ
صاحبزادہ مرزا وسیم احمد

(۲۲) تصنیفی و تالیفی سرمایہ

مطبوعہ کتابیں (۱) ایک شاعر کا انجام (۲) جذباتِ بھاشا

(۳) صحابیات
(۴) تاریخ الدولتین
(۵) المسلمۃ الشرقیہ (عربی سے ترجمہ)
(۶) عرض نغمہ (ترجمہ گیت انجلی)
(۷) فلاسفۂ قدیم کی روحوں کا اجتماع
(۸) فراست الید
(۹) مکتوبات نیاز جلد اوّل
(۱۰) مکتوبات نیاز جلد دوم
(۱۱) مکتوبات نیاز جلد سوم
(۱۲) مذاکرات نیاز
(۱۳) نگارستان
(۱۴) جمالستان
(۱۵) ترغیبات جنسی
(۱۶) شہاب کی سرگزشت
(۱۷) مجموعہ استفسارات و جوابات حصہ اوّل
(۱۸) مجموعہ استفسارات و جوابات حصہ دوم
(۱۹) " " " سوم
(۲۰) من و یزداں
(۲۱) نقاب اٹھ جانے کے بعد
(۲۲) گہوارۂ تمدن
(۲۴) انتقادیات جلد اول
(۲۵) انتقادیات جلد دوم
(۲۶) مذہب
(۲۷) حسن کی عیاریاں
(۲۸) مالہ و ماعلیہ
(۲۹) نقش ہائے رنگارنگ
(۳۰) مشکلات غالب
(۳۱) محمد بن قاسم سے بابر تک
(۳۲) مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ
(۳۳) تاریخ کے گم شدہ اوراق
(۳۴) شبنستان کا قطرۂ گوہریں
(۳۵) من و یزداں حصۂ دوم

نیاز کے تحریر کردہ نگار کے خاص نمبر

(۱) ملاحظات نمبر جنوری ۱۹۲۶ء
(۲) ڈرامہ اصحاب کہف نمبر جنوری ۱۹۳۶ء
(۳) قرآن نمبر جنوری ۱۹۳۵ء
(۴) پاکستان نمبر جنوری ۱۹۴۸ء
(۵) ایک مستقبل کی تلاش نمبر (نصف حصہ) جنوری ۱۹۵۱ء
(۶) فرمانروایان اسلام نمبر جنوری ۱۹۵۴ء
(۷) علوم اسلامی و علمائے اسلام نمبر جنوری ۱۹۵۵ء
(۸) معلومات نمبر۔ جنوری ۱۹۵۸ء
(۹) تحقیق اسلام نمبر۔ جنوری ۱۹۵۹ء
(۱۰) غالب نمبر ۱۹۶۱ء

نگار میں نیاز کی مطبوعہ تحریریں

ملاحظات (اداریہ)	تقریباً ۵۰۰	علمی و ادبی مقالات	تقریباً ۷۰۰	سوانحی مضامین	تقریباً ۱۵۰
معلوماتی مضامین	" ۵۰۰	تبصرے	" ۲،۰۰۰	استفسار کے جوابات	تقریباً ۲۵۰
اردو نظمیں	" ۹	اردو غزلیں	" ۱۵	فارسی نظمیں اور غزلیں	۱۵۰
افسانے	۱۵۰	ڈرامے	" ۷		

والد مرحوم، میں اور نگار

ز فتحپوری

جب نیاز نمبر کی ترتیب کے سلسلہ میں فرمان صاحب نے مجھے بھی دعوت شرکت دی تو یہ بات میری سمجھ میں بالکل نہ آئی، کیونکہ نگار کی یہ خصوصی اشاعت میری ہی ذات سے متعلق ہے اور اس میں میرا حصہ لینا کوئی معنی نہیں رکھتا، کیونکہ اول تو میں اپنے اندر کوئی قابل ذکر بات پاتا ہی نہیں اور اگر دوسروں کی نگاہ میں، ہو بھی تو اس کے اظہار کا حق انہیں کو پہونچتا ہے، مجھے نہیں۔ شکر ہے۔ یہ بات فرمان صاحب کی سمجھ میں آگئی، انھوں نے اپنے اصرار کا رخ بدل دیا اور اس خیال کے پیش نظر کہ ایسی تمام خصوصی اشاعتوں کا ایک پہلو تاریخی بھی ہوا کرتا ہے انہوں نے اپنی فرمائش کو میرے سوانح اور خاندانی حالات قلمبند کرنے کی حد تک مختصر کر دیا۔ گو مجھے اس کی تعمیل میں بھی پس و پیش تھا، کیونکہ جس حد تک میری داستان حیات کا تعلق ہے وہ اتنی طویل اور پیچ در پیچ ہے کہ

سرِ ایں رشتہ ندانم ز کجا بکشایم

اور اتنی ہی تکلیف دہ بھی کیونکہ اس کا تعلق زیادہ تر "یادرفتگاں" سے ہے اور یہ بڑی دکھ پہونچانے والی بات ہے۔ علی الخصوص اس شخص کے لئے جو "طویل العمری" کے خراج میں سیکڑوں اعزہ احباب کو اپنے ہاتھ سے سپرد خاک کر چکا ہو!

تاہم قطعی انکار بھی ممکن نہ تھا، کیونکہ سوال "آزردگیِ دلِ دوستاں" کا تھا اور میری فرد عمل میں یہی ایک معصیت ہے جو شاید سب سے کم نظر آئے گی۔ بہر حال طوعاً نہیں کرہاً مجھے کچھ نہ کچھ لکھنا ضرور ہے خواہ وہ کتنا ہی لایعنی کیوں نہ ہو۔

خاندانی حالات کے سلسلہ میں عموماً و رسماً تین باتوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ علوئے نسب، وجاہت و ثروت اور "علم و فضل" سو بدقسمتی سے میں اور میرا تمام خاندان ان میں سے کسی بات پر فخر نہیں کر سکتا۔ نہ بہ لحاظ نسب میں اپنے آپ کو فاروقی، صدیقی، یا تیموری و چنگیزی کہہ سکتا ہوں، نہ دولت و امارت کے لحاظ سے اپنے خاندان کے کسی فرد کی نشاندہی کر سکتا ہوں۔ رہا علم و فضل سو اس کا ذکر ہی فضول ہے کیونکہ میرے آبا و اجداد سب معمولی پڑھے لکھے تھے اور سب سے پہلے جس کی ذات سے صحیح معنی میں علم کی روشنی میرے گھر میں پہونچی وہ میرے والد محترم تھے۔ اس لئے میں اس داستان کا آغاز انہیں کے نام سے کرتا ہوں، خواہ وہ کتنی ہی غیر مربوط و غیر مسلسل کیوں نہ ہو۔

لد مرحوم

میرے والد محمد امیر خاں، جنہیں امیر محمد خاں بھی کہتے تھے، کا آبائی وطن فتحپور تھا، جو کانپور اور الہ آباد کے تقریباً وسط میں واقع ہے، یہ قدیم شہر ہے جو کسی وقت قنوج کی حکومت سے وابستہ تھا یہاں کے ہندو فرمانروا جو راجگان

اجگل کہلاتے تھے۔ قنوج کے باجگذار تھے۔ جب ۱۱۹۳ء میں معز الدین بن سام غوری نے اس حکومت کو ختم کیا تو اس کے آخری فرمانروا لجے نے اپنا خزانہ یہیں منتقل کر دیا تھا۔ اس کے بعد مسلمانوں کے عہد میں یہ حکومت جونپور اور صوبہ کوڑا سے متعلق ہو گیا (پندرہویں صدی عیس لیکن راجگان ارگل کا وجود پھر بھی باقی رہا۔ اس کے بعد عہد مغلیہ میں جب ہمایوں اور شیر شاہ کے درمیان سلسلۂ جنگ شروع ہوا تو را اجگل نے شیر شاہ کا ساتھ دیا اور آخر کار مغل حکومت نے اسے ختم کر دیا۔

اکبر کے زمانہ میں ضلع فتحپور کا نصف مغربی حصہ سرکار کوڑا سے متعلق تھا اور نصف مشرقی حصہ سرکار کڑا سے۔ عہد مغلیہ میں یہاں بہ مق کھجوا دوبارہ جنگ ہوئی۔ پہلے اورنگ زیب اور شاہ شجاع کے درمیان (۱۶۵۹ء) میں پھر فرخ سیر اور عز الدین جہاندار کے بیٹے کے د اورنگ زیب کے زمانہ میں نواب عبدالصمد خاں یہاں کے حاکم تھے۔ جن کا مقبرہ اب بھی شکستہ حالت میں موجود ہے۔ زوال عہد مغلیہ میں ص اودھ کا تسلط یہاں قایم ہو گیا۔ ۱۷۳۶ء میں جاگیردار کوڑا کے اشارہ سے مرہٹوں نے تاخت کی اور یہ ۱۷۵۰ء تک یہاں قابض ر اس کے بعد یہ علاقہ خوانین فتحگڈھ کے قبضہ میں آگیا لیکن تین سال کے بعد نواب صفدر جنگ متصرف ہو گیا۔ اس کے بعد ۱۷۶۵ء میں شاہ عا کو مل گیا۔ لیکن جب وہ مرہٹوں کا دست نگر ہو گیا تو انگریزوں نے اسے ۵۰ لاکھ میں نواب وزیر اودھ کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ لیکن نواب وزیر رقم خراج ادا نہ کر سکا تھا اس لیے ۱۸۰۱ء میں سرکار کوڑا اور سرکار الہ آباد پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا۔

جب ۶؍جون ۱۸۵۷ء کو کانپور میں ہنگامہ شروع ہوا اور ۸؍ کو الہ آباد کے خزانہ کا گارد فتحپور سے گزرا تو اسے لوٹ لیا گیا یہاں بھی لوٹ مار شروع ہو گئی۔ انگریز حکام یہاں سے بھاگ کر باندہ چلے گئے اور پورے ایک مہینہ تک پورا ضلع انقلاب پسندوں قبضہ میں رہا۔

۱۱؍جولائی کو جنرل ہویلاک نے انہیں بمقام بلندہ شکست دیکر پھر اپنا تسلط قایم کر لیا اور لکھنؤ کی حکومت ختم ہونے کے اس طرف کے سارے علاقہ پر انگریزوں کی مستقل حکومت قایم ہو گئی۔

یہ ہے فتحپور کی تاریخی حیثیت ـــــ اب رہا یہ سوال کہ میرے آبا و اجداد کون تھے، کس خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ فتحپور کی سکونت انھوں نے کب اور کیوں اختیار کی۔ اس کا حال مجھے نہیں معلوم۔ والد کو یہ کہتے ہوئے البتہ بارہا سنا کہ قانون لیستم کے زمانہ میں (معلوم نہیں قانون کس عہد میں رایج تھا)، اول اول ان کے نانا، یہاں کوتوال تھے اور باوجود اس کے کہ ان کا مشاہرہ پندرہ روپیہ ماہوار سے زیادہ تھا، بڑی مطمئن زندگی بسر کرتے تھے۔ اسی کے ساتھ ان کی زبانی مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کے اکثر اعزہ و اقربا، جاہل قسم کے پٹھان تھے او ایک گڈھی سی بنا کر اس میں رہا کرتے تھے (جس کی یادگار اب صرف وہ ٹوٹا پھوٹا مکان رہ گیا ہے۔ جسے میں اپنا گھر کہتا ہوں)۔ ان کا پیشہ صر سپہگری تھا، اور تلوار ہی ان کا ذریعۂ معاش۔ غالباً یہ وہ زمانہ تھا جب نواب عبدالصمد خاں یہاں کے حاکم تھے اور ان کی فوج زیادہ تر سپاہیوں پر مشتمل تھی جن کی اولاد نے فتحپور اور قرب و جوار کے قصبات میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

میرے خاندان میں سب سے پہلے جس نے تعلیم حاصل کی وہ میرے والد تھے۔ یہ داستان بھی بڑی عجیب و غریب ہے۔ جس زما میں میرے والد پیدا ہوئے، خاندان میں کوئی ذمہ دار مرد باقی نہ رہا تھا اور اگر تھا بھی تو علم سے ناآشنا تھا۔ میرے دادا البتہ زندہ تھے لیک چند دن بعد وہ بھی نہ رہے، بزرگوں میں تنہا میری دادی رہ گئی تھیں اور باوجود کہ اس کے کہ وہ خود بھی ان پڑھ تھیں۔ معلوم نہیں کیوں والد کی تعلیم کا خیال ان کے دل میں پیدا ہوا اور وہ بھی اس شدت کے ساتھ کہ انھوں نے اپنا زیور اور گھر کا تمام اثاثہ بیچ بیچ کر اس ارا کو پورا کیا ـــ میں نے اپنی دادی کو دیکھا ہے، بڑی گوری چٹی پٹھانی تھیں، یہ معلوم ہوتا تھا کہ روئی کے گالے سے انہیں بنایا گیا ہے بو اس قدر تھیں کہ روپیہ کے پیسے (انگریزی یا مدوشاہی)، اور پیسوں کی کوڑیاں (جن کا میرے لڑکپن میں کافی رواج تھا)، صحیح گ

سکتی تھیں۔ لیکن میرے والد کی تعلیم کے بارے میں انہوں نے بڑے ہوش و گوش سے کام لیا۔

میرے والد فتحپور ہی میں پیدا ہوئے، لیکن کس سنہ میں، یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا۔ تاہم چونکہ وہ ۵۷ء کے ہنگامۂ انقلاب میں (جیسا کہ انھوں نے بارہا ظاہر کیا) جوان بھی تھے اور برسرِ کار بھی، اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ ان کی ولادت ۱۸۳۵ء میں یا اس سے ایک دو سال پہلے ہوئی ہوگی۔

مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ ان کی تعلیم کی ابتدا کیونکر ہوئی، لیکن اسقدر ضرور جانتا ہوں کہ انھوں نے فارسی کی ابتدائی تعلیم فتحپور ہی کے کسی صاحب سے حاصل کی جو محلہ ابونگر میں رہتے تھے اور اچھے فارسی داں سمجھے جاتے تھے۔ چونکہ والد مرحوم کو اس زبان سے فطری مناسبت تھی اس لئے انھوں نے اسے بڑے شوق سے حاصل کیا اور اس کے بعد اونچی تعلیم کے لئے میری دادی نے انہیں لکھنؤ بھیجدیا اور پھر دلّی۔ مجھے اس کا علم نہیں کہ انھوں نے لکھنؤ اور دلّی میں کن کن اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔ لیکن ایک بار بسبیلِ تذکرہ انھوں نے دلّی جاکر مولانا صہبائی سے استفادہ کا ذکر ضرور کیا تھا اور یہ بھی فرمایا تھا کہ اس وقت ایران کا کوئی شاہزادہ اعجازِ خسروی" پڑھنے دلّی آیا ہوا تھا۔ (کیونکہ اس کتاب کا درس دینے والا ایران میں کوئی نہ تھا) اور وہ میرے والد کا ہم سبق تھا۔

میرے والد فارسی کے بڑے اچھے انشاپرداز تھے اور وطن میں اس لحاظ سے انہیں خاص شہرت حاصل تھی فارسی نظم و نثر پر بڑی ماہرانہ قدرت رکھتے تھے۔ ایران کے تمام کلاسکل شعراء کا انھوں نے بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا اور فردوسی، خاقانی، انوری، نظامی، سعدی، عرفی، نظیری، جامی، حافظ، غالب، بیدل وغیرہ کے ہزاروں اشعار ان کے ذہن میں محفوظ تھے۔ نثر میں وہ ظہوری کو زیادہ پسند کرتے تھے، شاید اس لئے کہ فطرتاً وہ خود بھی بہت مشکل پسند واقع ہوئے تھے۔ ہندوستان کے مثنوی نگاروں میں سے غنیمت ان کو بہت پسند تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جب مثنوی "حسن و عشق" کا درس شروع ہوا تو انھوں نے فرمایا کہ "غنیمت بڑا گرم نویس مُلا تھا"

ان کا تخلص امیر تھا اور خطوط میں ہمیشہ اپنے آپ کو "فقیر امیر" لکھتے تھے۔ غزل کی طرف انھوں نے کبھی توجہ نہیں کی۔ ان کا فن صرف "قصیدہ نگاری" تھا اور وہ بھی محض نعت و منقبت کی حد تک۔ انھوں نے کسی امیر یا رئیس کی مدح میں کبھی کوئی قصیدہ نہیں لکھا، لیکن رسول اللہ اور خلفاء اربعہ کی شان میں متعدد قصائد کہے اور متعدد تضمینیں نعتیہ غزلوں کی لکھیں۔ وہ مذہباً حنفی تھے، لیکن آلِ فاطمہ سے انہیں بڑا شغف تھا، چنانچہ انھوں نے ہفت بند کاشی کے جواب میں بھی کئی ترجیع بند لکھے۔ رباعی کی طرف انھوں نے بہت کم توجہ کی، لیکن قطعات بکثرت لکھے قصیدہ گو شعراء میں وہ عرفی کے بڑے مداح تھے اور اکثر قصائد اسی کی زمینوں میں لکھے، چنانچہ عرفی کے مشہور قصیدہ

جہاں بگردم و دردا بہ ہیچ شہر و دیار
نیافتم کہ فروشند بخت در بازار

کی زمین میں جو قصیدہ انہوں نے تصنیف کیا تھا، اس کا مطلع مجھے اب تک یاد ہے۔

بہ تیر نالہ بہ بندم اگر پر و سوفار
خزد بہ گوشۂ قوس آسمان ناوکبار

وہ بڑے اچھے خطاط بھی تھے اور انھوں نے اپنا تمام فارسی کلام جو سیکڑوں صفحات پر مشتمل تھا مع اس کی شرح کے (کیونکہ بغیر شرح کے ان کا کلام سمجھنا مشکل تھا) خود اپنے قلم سے لکھا تھا جو افسوس ہے کہ ضائع ہوگیا۔ پنشن لینے کے بعد ان کا مشغلہ صرف شعر و سخن تھا یا مذہب و تاریخ کا مطالعہ۔ میں نے کبھی ان کو بے کار بیٹھے نہیں دیکھا وہ جب پڑھتے پڑھتے تھک جاتے تو لکھنے بیٹھ جاتے

اور جب لکھتے لکھتے ہاتھ جواب دیدیتا تو پھر مطالعہ میں مصروف ہوجاتے۔ ان کا حافظہ بڑا قوی تھا اور جو کچھ انہوں نے پڑھا وہ سب مستحضر تھا۔ اساتذۂ فارسی کا کلام ان کو اتنا یاد تھا کہ محاورات فارسی کی سند میں وہ بے تکلف کلام اساتذہ پیش کردیا کرتے تھے۔ ان کا مذہبی و تاریخی مطالعہ اتنا وسیع تھا کہ اچھے اچھے علماء کی صحبت میں بھی وہ سب پر چھا جاتے تھے۔ وہ مقرر بھی اتنے ہی اچھے تھے جتنے اچھے انشا پرداز اور چونکہ فطرتاً مزاح پسند بھی تھے اس لئے ان کی گفتگو بھی بڑی دلچسپ ہوتی تھی اور محفل ان کی گرویدہ ہوجاتی تھی۔ وہ اپنے فارسی داں احباب کو ہمیشہ فارسی ہی میں خط لکھتے۔ مولانا محمد علی بہاری بانی ندوۃ العلماء سے ان کے دوستانہ مراسم بہت گہرے تھے اور ان سے بھی خط و کتابت ہمیشہ فارسی میں ہوتی تھی، جس کی نقل رکھنا میرے ہی سپرد تھا۔

اردو شاعری سے انھیں بہت کم لگاؤ تھا۔ امیر مینائی کے وہ بیشک معترف تھے، لیکن شاید اس لئے کہ وہ ان کے دوست تھے اور ذی علم انسان بھی۔ داغ کو وہ جاہل سمجھتے تھے اس لئے اس کا کلام انھوں نے کبھی پڑھا ہی نہیں۔ ایک بار میں گلزار داغ کی ورق گردانی کر رہا تھا، پوچھا کیا ہے۔ میں نے عرض کیا "گلزارِ داغ" بولے "داغ بھی کوئی شاعر تھا؟" میں نے کہا "میں تو ایسا ہی سمجھتا ہوں" فرمایا "کچھ سناؤ" اس وقت اس کی نظم "شہر آشوب" میرے سامنے تھی۔ میں نے وہی پڑھنا شروع کی اور دو بند پڑھ کر خاموش ہوگیا۔ فرمایا "پوری نظم پڑھو" اور جب میں اسے ختم کرچکا تو بولے کہ "حرامزادہ اچھا کہتا تھا" بس ان کا یہ فقرہ سنکر خوشی سے اچھل پڑا کیونکہ اس سے بہتر داد داغ کو شاید ہی کبھی ملی ہو۔ میر کے بھی بعض اشعار میں نے گاہ گاہ ان کی زبان سے سنے، ایک دن میں نے ان کو میر کا یہ شعر گنگناتے ہوئے سنا۔

تجھی سے ہیں اے میر یہ خواریاں
نہ بھائی، ہماری تو طاقت نہیں

اردو کے شاعر تو وہ نہیں تھے، لیکن نثر بڑی دلکش لکھتے تھے، چنانچہ ان کے "روزنامچے" (ملازمت پولیس کے زمانہ کے) انگریز افسران بھی ادب پاروں کی حیثیت سے دیکھتے تھے، ان کی قوت استدلال بھی بڑی زبردست تھی اس لئے جب پنشن لینے کے بعد وہ رامپور میں وکالت کرنے لگے تو چند دن میں مرجع عوام ہوگئے۔

رامپور کا ذکر آگیا ہے تو کچھ باتیں اس زمانہ کی بھی سن لیجئے:۔ رامپور میں میرے والد کے خاص احباب میں ایک مولوی فرحی تھے (جو نواب حامد علی خاں کے اتالیق و استاد تھے اور فارسی و عربی کا بڑا اچھا علم رکھتے تھے) دوسرے مولانا محمد طیب (مدرسۂ عالیہ رامپور کے صدر اور علوم عربیہ کے بے مثل فاضل و ماہر) تیسرے سنجر ایرانی (درباری شاعر) جن سے میرے والد کے بڑے بے تکلفانہ مراسم تھے۔ سنجر اچھا شاعر تھا، فارسی اس کی مادری زبان تھی، میرے والد اسے ہمیشہ "سنجرِ دریوزہ گر" کہکر چھیڑتے رہتے تھے، کیونکہ اس کی شاعری کا سرمایہ امراء کے مدحیہ قصاید کے سوا کچھ نہ تھا۔

ایک دن اسے دربار حامدی سے کسی قصیدہ پر قبائے زرکار ملی تو اینڈتا، بررتا، والد کے پاس آیا اور قبا دکھا کر بولا "خان صاحب دیکھو یہ کیا ہے"۔ والد نے فرمایا کہ "یہ ایک کپڑا ہے جسے ہمارے یہاں صرف عورتیں یا خنیاگر استعمال کرتے ہیں"۔ بولا "ابھی ابھی بازار میں تین ہزار کا سودا کرکے آیا ہوں، لیکن ابھی اسے فروخت نہ کروں گا، مبادا نواب کسی دن پوچھ بیٹھے کہ وہ خلعت کہاں ہے۔ جب دوبارہ کوئی خلعت ملے گی تو اس کو بیچ دوں گا"۔ والد نے فرمایا "حیف بر تو اے مرغ زریں"۔ وہ یہ سنکر برافروختہ ہوگیا اور بولا کہ "تم بڑے بے وقوف ہو میں نواب کی مدح کرتا ہوں تو وہ مجھے سکہ ہائے زر دیتا ہے، لیکن تم جو ابوبکر و عمر کی تعریف میں جھک مارا کرتے ہو، تو وہ تمہیں کیا دیدیتے ہیں"۔ الغرض سنجر اور میرے والد کے درمیان ہمیشہ اسی قسم کی چھیڑ چھاڑ رہا کرتی تھی۔ اس

واقعہ کے چند دن بعد وہیں ایک بڑی تقریب میں، مولوی فرخی، سنجر اور میرے والد یکجا بیٹھے ہوتے تھے کہ سامنے کے دروازے سے ایک صاحب داخل ہوئے جو تھے تو ہندو لیکن اپنی سفید داڑھی، وضع قطع سے بالکل مسلمان معلوم ہوتے تھے۔ والد ان کو جانتے تھے لیکن سنجر واقف نہ تھا۔ والد نے سنجر سے اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ”سنجر اٹھو اور ان کا خیر مقدم کر بہت بڑے شخص ہیں“ سنجر فوراً آگے بڑھا اور ایرانی تہذیب کے مطابق ”آقائے من، قبلۂ من“ کہتا ہوا، انہیں اپنی جائے نشست کے قریب لا کر بٹھا دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد مقابل کی صف سے کسی اور صاحب نے ان نووارد بزرگ کو مخاطب کیا کہ ”لالہ صاحب مزاج تو اچھا ہے“ اور اب سنجر کو معلوم ہوا کہ یہ صاحب ہندو ہیں اور اس کے بعد جو کچھ ہوا اس نے ساری محفل کو حیران کر دیا۔ وہ میرے والد کے پاس آیا اور ان سے مخاطب ہو کر چیخ چیخ کر کہنے لگا کہ ”خان صاحب۔ تف برمن کہ ایں ہندو بچہ را۔ جناب گفتم۔ ایں کافر بچہ را قبلہ گفتم“ وہ یہ کہتا جاتا تھا اور اپنا منہ پیٹتا جاتا تھا۔ میرے والد اور مولوی فرخی کا مارے ہنسی کے برا حال تھا اور سارا مجمع سنجر کی اس دیوانگی پر حیران تھا۔ لالہ صاحب تو خیر اسی وقت اٹھ کر چلے گئے لیکن اس کے بعد دیر تک محفل پر سناٹا سا چھایا رہا۔

والد مرحوم نماز کے بڑے پابند تھے اور جو اصول زندگی انھوں نے بنا لئے تھے، ان سے کبھی تجاوز نہ کرتے۔ وہ بہت تڑکے صبح صادق کے وقت بیدار ہوتے اور حوائج ضروریہ سے فارغ ہونے کے بعد چوکی پر بیٹھ جاتے، وہیں نماز پڑھتے، اوراد و وظایف میں مشغول ہو جاتے اور اس کے بعد ہی کھانا بھی کھا لیتے۔ یہی معمول نماز مغرب کے بعد کا بھی تھا۔ وہ چاء یا ناشتہ کے عادی نہ تھے اور (صبح و بعد مغرب) کھانا کھا لینے کے بعد پھر کچھ نہ کھاتے تھے۔ ان کا یہ معمول اخیر عمر تک قایم رہا اور کبھی اس سے انحراف نہیں کیا، اگر کبھی اتفاق سے کسی وقت آدھ گھنٹہ کی بھی دیر ہو جاتی تو پھر وہ دوسرے وقت تک کچھ نہ کھاتے۔

جیسا کہ میں نے ابھی ظاہر کیا وہ اوراد و وظایف کے سخت پابند تھے اور نماز کے بعد دلایل الخیرات، دعائے عکاسہ وغیرہ پڑھنا ان کے لئے ضروری تھا۔ وہ بلند آواز سے سیفی بھی پڑھتے اور کلمہ کی انگلی پر دم کر کے، اسے سر کے چاروں طرف پھراتے۔ بعض سیفیاں عجیب و غریب تھیں اور شاید انھیں کی وضع کی ہوئی تھیں۔ ایک دن صبح کو میں نے انہیں یہ سیفی پڑھتے ہوئے سنا،۔

”ہر کہ مرا بد گوید و بد بیند و بد اندیشد۔ کرم ایوب در بطن او۔ ارّہ زکریا بر سر او۔ مہر سلیمان بر زبان او۔ عصائے موسیٰ بر سر او۔ طوفان نوح بر قوم او۔ ذوالفقار علی بر گردن او۔ قہر خدا بجان او۔ بحق یا بدوح!“

جب فارغ ہو گئے تو میں نے کہا کہ ”نماز کے بعد تو ہمیشہ دعا پڑھنا چاہیئے لیکن یہ تو بڑی سخت بد دعا تھی اور محض بد دعا سے دشمن کا کیا بگڑتا ہے“ فرمانے لگے ”تم نہیں سمجھ سکتے، اس سے دشمن کو گزند پہونچے یا نہ پہونچے، لیکن اس سے خود اعتمادی ضرور پیدا ہوتی ہے جو دفاع و مقابلہ کے لئے ضروری ہے“ —— یہ نفسیاتی نکتہ میرے ذہن میں اس وقت نہ آیا تھا۔

والد مرحوم ۵۷ء سے قبل ہی اپنی تعلیم ختم کر چکے تھے —— اور ملازمت کی جستجو میں تھے۔ لیکن اس دوران میں ہنگامۂ انقلاب شروع ہو گیا اور میری دادی نے انہیں گھر سے باہر نہ نکلنے دیا۔ جب ۵۸ء میں انگریزی تسلط پھر قایم ہو گیا تو والد مرحوم فتحپور سے کانپور آئے۔

اس وقت لکھنؤ اور کانپور میں شورش تو ختم ہو چکی تھی، لیکن اسکے اثرات کے بعد نے لوگوں میں بڑی بے چینی پیدا کر رکھی تھی اور اطمینان کسی کو نصیب نہ تھا۔ ہنگامۂ گیر و دار چار طرف برپا تھا اور مارشل لا کے نفاذ نے طبقۂ اکابر و امراء میں سخت سراسیمگی پیدا کر رکھی تھی۔ ایک ایک مجسٹریٹ کو پھانسی دینے کے اختیارات حاصل تھے اور ہر طرف سولیاں ہی سولیاں نظر آتی تھیں۔ یہی زمانہ تھا جب والد مرحوم کانپور پہونچے۔ اس وقت جتنے انگریز سویلین ولایت سے آتے تھے، عموماً فارسی داں ہوا کرتے تھے۔

اتفاق کی بات کہ اس وقت جو انگریز ضلع کا انچارج ہو کر آیا تھا، وہ فارسی زبان کا بڑا اچھا ادیب تھا۔ جب والد مرحوم اس جا کر ملے اور فارسی میں گفتگو کی تو وہ اس قدر خوش ہوا کہ فوراً پیشکاری کی جگہ دیدی، اور سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا۔ جو حکم یہ لکھد وہ آنکھ بند کر کے دستخط کر دیتا۔ اپنے اس دورِ اقتدار میں ——— صوبۂ آئین و اودھ علی الخصوص لکھنؤ، کانپور کے کتنے اکابر و ام کی جانیں انھوں نے بچائیں اور کتنے نذرِ بہائے تہنیت انہیں پیش کئے گئے، اس کی تفصیل بہت طویل ہے۔ مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ ملا ہوتے ہی ان کا دور خوشحالی و فراغ شروع ہو گیا اور وہ صحیح معنی میں امیر ہو گئے۔ اس کا اندازہ آپ صرف ایک واقعہ سے کر سکتے ہیں اور وہ یہ کہ نواب دھنیا مہری جو لکھنؤ سے کانپور آ گئے تھے ان سے میرے والد کی پتنگ بازی ہوا کرتی تھی اور ہر پیچ کی ایک اشرفی مقرر منوں نخ بنارس سے آتی تھی اور درجنوں پتنگ باز ملازم تھے۔ بٹیر بازی اور مرغ بازی البتہ انھوں نے کبھی نہیں کی لیکن ان کے علاوہ (بادہ خواری چھوڑ کر) اور بہت سی بازیاں جن کا ایک شاعر رنگین مزاج شایق ہو سکتا ہے، ضرور انہوں نے اختیار کیں۔ شعر کے علاوہ رقص و سرود سے بھی انہیں خاص دلچسپی تھی اور شہر کے تمام عمایدو امرا ان محافل میں شریک ہوتے تھے، یہاں تک کہ خود مجسٹ بھی اس میں حصّہ لیتا تھا۔

والد مرحوم فطرتاً بڑے فیاض و دریا دل واقع ہوئے تھے۔ انہیں ہمیشہ تمنا رہتی تھی کہ کوئی شخص ان سے کچھ طلب کرے اور اسے نہال کر دیں۔ چنانچہ اسی زمانہ کا واقعہ ہے کہ وطن کا ایک نائی کانپور پہونچا اور اپنی لڑکی کی شادی کے لئے مدد چاہی۔ انھوں ایک ہزار روپیہ تو اسی وقت دیدیا اور شادی کی تاریخ پر خود فتحپور پہونچ کر نائی کی طرف سے سارے شہر کی دعوت کر دی جس میں ہندو مسلم سب شریک تھے۔ اس کے بعد گھر کی تمام اہم تقریبوں میں "سارے شہر کو کھانا کھلانا" ان کا معمول ہو گیا تھا جس نے "خا صاحب کی دعوت" کے نام سے روایت کی صورت اختیار کر لی تھی۔ لیکن باوجود اس خوشحالی کے اپنے اور اپنے خاندان کے مستقبل کی طر سے وہ ہمیشہ بے پروا رہے۔ لاکھوں کمائے، لاکھوں اڑائے لیکن گھر کا مکان تک درست نہ کرایا۔ حالانکہ میں نے خود اپنے لڑکپن میں لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ "اگر خان صاحب چاہتے تو سونے کی اینٹوں کا محل بنوا لیتے"

والد کی زندگی کا دورِ فراغ تو عرصہ تک قایم رہا لیکن اس کی رنگینی زیادہ دیر ثابت نہ ہوئی، کیونکہ (جیسا کہ خود وال نے ظاہر کیا) اسی زمانہ عیش و مسرت اور عروج کامرانی میں انھوں نے ایک رات خواب میں مولانا شاہ عبدالسلام ہسوی کو دیکھا وہ انہیں یاد کرتے ہیں اور فرما رہے ہیں کہ "کبھی ہم سے بھی آکر مل جاؤ"۔ اس خواب کا اتنا شدید اثر ان پر ہوا کہ صبح بیدار ہو ہی وہ کانپور چل پڑے اور شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کے مرید ہو گئے۔ ہسوہ سے کانپور لوٹے تو بالکل دوسرا عا نہ اب وہ رنگ رلیاں باقی رہیں نہ زربفت و کمخواب کا لباس، نہ مشاغل لہو و لعب سے دلچسپی باقی رہی، نہ محافل رقص و سرو کیونکہ اب وہ "نقشبندی مجددی" ہو گئے تھے اور اس مسلک میں اس نوع کے تمام لذائذ ممنوع ہیں ——— یہ تھا والد مرحوم کی زند کا دوسرا موڑ جس سے انہوں نے آخر دم تک انحراف نہیں کیا اور شعائر مذہبی کی پابندی رفتہ رفتہ ان کی طبیعت ثانیہ بن گئی، لیکن ا ذہنی انقلاب کے بعد بھی انہوں نے اپنی وضع و صورت نہیں بدلی۔ چڑھی ہوئی داڑھی (جس پر وہ روز صبح کنگھا کر کے سکھوں طرح ڈھاٹا باندھ لیتے تھے)، مینڈھے کی سینگ کی طرح بل کھائی مونچھ۔ مہندی و وسمہ کا خضاب، کمر میں پٹکا اور اس میں ایک پیش قبض۔ اس میں کبھی کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔ وہ بڑے جری و شیر دل انسان تھے۔

۱۸۹۲ء کی بات ہے، میری عمر اس وقت ۸ سال کی تھی۔ وہ اس وقت ضلع مرزا پور کے تھانہ "اورائی" کے انچارج تھے۔ تھانہ کے علاقہ میں ایک گاؤں تھا کھمریا (پٹھانوں کی بستی)، اور دوسرا گھسیا (مسلمان قالین بافوں کا مرکز)، ہندو راجپوتوں کی

ادی کافی تھی۔ نیا نیا طاعون ایکٹ نافذ ہوا تھا۔ اور ہندو بہت برہم تھے۔ اس سلسلہ میں چونکہ مسلمانوں نے ان کا ساتھ کم دیا اس لئے وہ مسلمانوں سے بھی کشیدہ ہو گئے تھے، اتفاق سے اسی زمانہ میں بقرعید پڑ گئی۔ ہندوؤں نے صاف صاف کہدیا کہ وہ گائے کی قربانی ہونے دیں گے۔ افسران ضلع فکرمند تھے کہ کیا کیا جائے۔ والد مرحوم سے پوچھا تو انھوں نے سپرڈنٹ پولیس اور ضلع مجسٹریٹ سے کہدیا کہ یہ معاملہ پر چھوڑ دیجئے اور فکر نہ کیجئے۔ احتیاطاً ایک انسپکٹر پولیس بھی مع ایک گارڈ کے بھیجدئے گئے تھے، لیکن جب بقرعید کا دن طلوع ہوا تو خوف کی ے سے انہیں بخار آگیا۔ والد مرحوم نے ان سے کہا کہ "آپ کے جانے کی ضرورت نہیں، یہیں آرام کیجئے" اس کے بعد وہ گھر آئے اور میری لدہ اور گھر والوں سے یہ کہکر رخصت ہوئے کہ "زندگی ہے تو لوٹ کر آجاؤں گا، ورنہ فکر مت کرنا، خدا سب کا مالک ہے"

کانٹے کی بات یہ تھی کہ قربانی بھی ہو جائے اور فساد بھی نہ ہو۔ یہی منشاء حکام ضلع کا تھا۔ میرے والد محض پٹھان ہی نہ تھے بلکہ بڑی سوجھ جھ رکھنے والے صاحب تدبیر انسان بھی تھے۔ چنانچہ ایک دن پہلے ہی والد مرحوم نے گھسیا کے مسلمانوں اور کھمریا کے پٹھانوں سے کہلا بھیجا کہ ہ مقررہ وقت سے کچھ پہلے ہی قربانی کرلیں اور گاؤں سے باہر نہ نکلیں، میں ہندوؤں کو روک رکھوں گا۔

چنانچہ چند سپاہیوں کو لیکر وہ بہت صبح چل پڑے اور تمام سربرآوردہ ہندوؤں کو پولیس چوکی پر اکٹھا کیا اور دیر تک ہیں سمجھاتے رہے، مقصود یہ تھا کہ انہیں دیر تک الجھا رکھا جائے اور قربانی ہو جائے۔ اسی دوران گفتگو میں ایک بار پھر ہندوؤں میں ش پیدا ہوا اور انھوں نے کھمریا کا رخ کرنا چاہا۔ یہ رنگ دیکھ کر والد مرحوم کڑک کر بولے کہ "جانتے کہاں ہو پہلے مجھ سے تو نپٹ لو اور وار کھینچکر سامنے آگئے۔ چونکہ وہ فنون سپہگری کے بھی ماہر تھے (شمشیر زنی تو ان کا خاص فن تھا جو انہوں نے لکھنؤ میں کسی میر صاحب ے سیکھا تھا) اس لئے ان کے پینترے دیکھکر ہندو تھوڑی دیر کے لئے ٹھٹھک گئے اور والد مرحوم نے اس موقع سے نفسیاتی فائدہ اٹھا کر بت و شفقت کے انداز میں گفتگو شروع کردی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قربانی بھی ہو گئی اور فساد بھی نہ ہونے پایا۔ اس کے بعد انہیں ھدوہی بھیجدیا گیا جو بنارس اسٹیٹ کا مشہور قصبہ مسلمانوں کا تھا۔

مجھے نہیں معلوم کہ کانپور میں وہ کب تک رہے لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ کانپور کی ملازمت کے بعد وہ محکمہ پولیس میں منتقل و گئے اور غالباً سب سے پہلے مظفرنگر میں ان کا تقرر ہوا۔ یہاں سے ان کا تبادلہ سنی گھاٹ (بارہ بنکی) کا ہو گیا (جہاں میں پیدا ہوا) اس ے بعد وہ مرزا پور تبدیل ہو کر سپرڈنٹ پولیس کے پیشکار رہے، اس کے بعد دو سال اورائی میں رہے اور پھر بھدوہی بھیج دئے گئے۔ ہیں میری انگریزی تعلیم شروع ہوئی، یہیں انھوں نے خطاطی، شہسواری۔ اور فنون سپہگری کی تعلیم کے لئے علٰحدہ علٰحدہ استاد مقرر ئے۔ میرے والد چاہتے تھے کہ دنیا کے تمام علوم و فنون مجھے حاصل ہو جائیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے کچھ نہ آیا۔ یہاں سے ان کا تبادلہ لکھنؤ وگیا۔ حسن گنج و سعادت گنج کے انچارج رہے اور یہیں سے ۸۸ء میں ان کی پنشن ہو گئی۔

اس کے بعد وہ رامپور چلے گئے۔ چند دن ملازمت کی اور پھر وکالت شروع کردی۔ جب ان کی صحت گرنے لگی تو ۱۹۰۷ء میں تحپور آگئے اور دوسرے سال ان کا انتقال ہو گیا۔

فتحپور آنے کے بعد مولانا ظہور الاسلام (بانی مدرسہ اسلامیہ) اور مولانا نور محمد (مدرس اعلیٰ) سے ان کے تعلقات بہت وسیع و گئے۔ یہ دونوں حضرات میرے والد کی صاف گوئی کی بڑی قدر کرتے تھے اور ان کے لطائف سے بہت لطف اٹھاتے تھے۔

ایک بار مولانا نور محمد صاحب نے نماز مغرب کے وقت میرے والد سے کہا کہ "آج نماز مغرب کی امامت آپ کیجئے۔" انہوں ے جواب دیا کہ "معاف فرمائیں" امام کی . . . . . . سے دو ڈورے گزرتے ہیں (اس سے مراد ان کی تسبیح کا امام تھا) اور اس کا ل میرے بس کی بات نہیں یہ پیشہ آپ ہی کو مبارک ہو"۔

ایک بار مولانا نور محمد صاحب نے کہا "خاں صاحب میرے دل کی سیاہی آجکل کچھ بڑھتی جارہی ہے" یہ وہ زمانہ تھا جب مولانا نور محمد صاحب کے تعلقات وہاں کے ایک مشہور مختار (وکیل) سے بہت وسیع ہو گئے تھے۔ اور مولانا اکثر کھانا بھی انہیں کے ساتھ کھاتے تھے۔ والد مرحوم نے جواب دیا کہ "مولانا حرام کا لقمہ چھوڑ دیجئے" کیونکہ ان کی رائے میں وکالت کی کمائی (جس میں زیادہ تر جھوٹ سے کام لیا جاتا ہے) حلال کی کمائی نہ تھی۔

رامپور سے فتحپور آنے کے بعد مجھے اور دوسرے کچھ طلبہ کو فارسی پڑھانا شروع کی جس میں ...... مولانا حسرت موہانی بھی میرے شریک تھے۔ (اس کا اجمالی ذکر اسی اشاعت میں کسی اور جگہ نظر آئے گا)

میرے والد نے تین شادی کیں۔ پہلی لکھنؤ (محلہ صدر) کے کسی گھرانے میں، اس سے ایک لڑکی پیدا ہوئی پہلی بیوی کے انتقال کے بعد دوسری شادی فتحپور ہی کے کسی گاؤں میں ہوئی، تیسری مظفر نگر میں میری والدہ سے ..... پہلی شادی سے ایک لڑکی ہوئی میں نے ان کو اور ان کی لڑکیوں کو بھی دیکھا ہے اس کے بعد میری والدہ سے دو بچے پیدا ہوئے ایک بڑی بہن (جو یہیں پاکستان میں مدفون ہیں) دوسرا میں میری والدہ تقریباً دس سال زندہ رہیں اور بھوپال میں ان کا انتقال ہوا۔ میرے بعد دوسری بیوی سے ۱۳۰۹ء میں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا تاریخی نام انھوں نے محمد نجابت علی خاں رکھا تھا۔ لیکن کم عمری ہی میں اس کا انتقال ہو گیا میں اس سے پانچ سال پہلے ۱۳۰۲ء میں پیدا ہوا تھا اور میرا تاریخی نام انھوں نے لیاقت علی خاں رکھا تھا۔

میں نے اپنے بچپن میں اپنی دادی کو بھی دیکھا اور والد کے ماموں، ان کی اولاد اور پھوپھی زاد بھائیوں کو بھی۔ بڑا آباد گھر تھا۔ (کم از کم بیس افراد ایک ہی دسترخوان پر کھانا کھاتے تھے) جو دیکھتے ہی دیکھتے میری آنکھوں کے سامنے بالکل اجڑ گیا۔ یہاں تک کہ اب وہ صرف ایک سنسان کھنڈر رہ گیا ہے۔

رامپور میں میرے والد کا قیام جھولے والی املی میں تھا اور مولوی فرخی (استاد نواب حامد علی خاں) سنجر، ایرانی شاعر مولوی عرب محمد طیب (صدر مدرس مدرسۂ عالیہ) اور مولوی وزیر محمد خاں سے ان کے خاص تعلقات تھے۔ نواب حامد علی خاں مرحوم بھی کبھی کبھی یاد کر لیا کرتے تھے۔ نواب مرحوم اخیر عمر میں غالی شیعہ ہو گئے تھے اور جب کوئی شخص ان سے ملتا تھا تو وہ سب سے پہلے مذہبی ذکر چھیڑ دیتے تھے، چنانچہ ایک بار انھوں نے میرے والد سے سوال کیا کہ "معاویہ کی خلافت کے نسبت آپ کی کیا رائے ہے" میرے والد کو یہ بات ناگوار ہوئی اور پوچھا "کیا آپ حضرت امیر معاویہ کے بارے میں دریافت فرماتے ہیں"۔ نواب نے پیشانی پر شکن ڈالتے ہوئے جواب دیا کہ "ہاں انہیں کے متعلق" والد مرحوم نے کہا کہ "جناب امیر معاویہ کی اہلیت خلافت کے بارہ میں مجھ سے نہیں، امام حسن سے پوچھئے جنھوں نے ان کی خلافت تسلیم کر لی تھی۔

یہ ہے مختصر ساخاکہ والد مرحوم کی زندگی اور ان کے ذہنی رجحانات کا، مختصر اس لئے کہ اس وقت میرا مقصود ان کے سوانح عمری "لکھنا نہیں ہے اور اگر ایسا چاہوں بھی تو ممکن نہیں کیونکہ اول تو میں اس وقت پیدا ہوا جب ان کا عالم انحطاط تھا۔ علاوہ اس کے جو کچھ سنا سنایا حافظہ میں موجود ہے وہ بھی بڑی طویل داستان ہے جس کے لئے علٰحدہ ایک مستقل دفتر درکار ہے۔

اب رہا خود میں اور میرے حالات، سو اول تو وہ ہیں کیا جو میں بیان کروں اور اگر ہوں تو بھی مجھے اس کا کیا حق حاصل ہے کہ ان کے بیان سے دوسروں کا وقت ضایع کروں تاہم رسماً کچھ عرض کئے دیتا ہوں۔

میرا تاریخی نام لیاقت علی خاں ہے جس کے اعداد ۱۳۰۲ ہوتے ہیں اور میں اسی ہجری سن میں پیدا ہوا۔ اس سے میری موجودہ عمر کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ملیس

مجھے اپنی زندگی کی سب سے پہلی بات جو یاد ہے وہ اس وقت کی ہے جب میری عمر صرف ۴ سال کی تھی۔ اور یہ میری علالت سے متعلق ھی۔ اس کے دوسرے سال میری بسم اللہ ہوئی۔ اور اس وقت سے لے کر اس وقت تک جو کچھ مجھ پر گزرا وہ سب یاد ہے۔ اس لئے اگر میں اپنے تمام تاثرات لکھنے بیٹھوں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تقریباً ۷۰ سال کی داستان آپکے سامنے دہراؤں اور یہ بات آسان نہیں، لیکن چونکہ اس وقت مقصود صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ میری ذہنی زندگی کن کن ہستیوں سے متاثر ہوئی۔ اور اس تاثر کی نوعیت کیا تھی۔ اسلئے موضوع نسبتاً مختصر ہو جاتا ہے اور میں اس پر ایک حد تک لکھنے کی جرأت کر سکتا ہوں، ایک حد تک میں نے اس لئے کہا کہ یہ داستان بھی اپنی جگہ بہت طویل ہے۔ لیکن چونکہ یہ اس سلسلہ میں ان تمام ہستیوں کا ذکر کرنا جو میری زندگی کے بنانے یا بگاڑنے کے ذمہ دار ہیں۔ ضروری نہیں ہے بنا بریں میں ان میں سے صرف چند کے ذکر پر اکتفا کروں گا، جنھوں نے واقعی میری زندگی میں انقلاب پیدا کیا۔

قبل اس کے کہ میں اصل موضوع پر آؤں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ میں غیر معمولی قبل از وقت پختہ ہو جانے والی فطرت لے کر آیا تھا۔ اور اس میں شک نہیں کہ میرے ذہنی انقلاب کا ایک بڑا سبب یہی میری فطرت تھی۔

عمر کے اس حصہ میں جبکہ عام طور پر بچے صرف کھیلتے کودتے ہیں، میں تعلیم کے ان منازل سے گزر رہا تھا جو عموماً سنِ بلوغ میں طلبہ ے سامنے آتی ہیں۔ اور میری یہی فطری خصوصیت تھی جس نے آگے چل کر مجھے قدامت پرستی کا (خواہ وہ مذہب سے متعلق ہو یا کسی اور ہنی رجعت پسندی سے) مخالف بنا دیا۔ لیکن آپ کو یہ سُنکر حیرت ہوگی کہ باوجود اس ذہنی خشونت کے میرا (جمالیاتی) ذوق بھی ھے اپنے والد سے ورثہ سے ملا تھا۔ اچھی صورت اور اچھی آواز میری کمزوری تھی، جو ہمیشہ میرے ساتھ رہی۔ اس نے میری زندگی و رنگینی بھی بخشی اور داغدار بھی کیا۔ میری راہ میں کانٹے بھی بچھائے اور پھول بھی برسائے۔ لیکن اس وقت میں اپنی زندگی کے اس ہلو کا ذکر نہیں کروں گا، گو میری ادبی زندگی کا انقلاب زیادہ تر اسی کا مرہونِ منت ہے۔

میں اپنی ابتدائی تعلیم کی تفصیل بھی بیان نہیں کروں گا، کیونکہ وہ موضوع زیرِ بحث سے خارج ہے۔ آپ لوگ سمجھ لیجئے کہ میری عمر کا رھواں سال ہے اور میں اپنے وطن (فتحپور) کے مدرسۂ اسلامیہ میں تعلیم کی غرض سے آ جاتا ہوں۔ یہ مدرسہ عربی کا تھا جسے مولانا ید ظہور الاسلام نے قایم کیا تھا، اور جہاں صرف درسِ نظامی کی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ ان کے ایک خواجہ تاش مولانا نور محمد صاحب تھے اور انہیں کو مولانا ظہور السلام نے اس مدرسہ کا نگراں و مختارِ کل بنا دیا تھا۔

یہ پنجاب کے کسی مقام (شاید قصور) کے رہنے والے تھے اور اس میں شک نہیں کہ بڑے متقی انسان تھے۔ لیکن سراپا ہیبت و بروت، یکسر تقشف و عبوس!

برخلاف اس کے مولانا ظہور اسلام بڑے رقیق القلب انسان تھے، وہ فارسی کا بھی بڑا اچھا ذوق رکھتے تھے اور ان کے اس ادبی حان نے ان میں زاہدانہ احتساب و دار و گیر کے بجائے بہت نرمی اور عفو و درگزر کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔

مولانا نور محمد صاحب انگریزی تعلیم کے سخت مخالف تھے، اور مولانا ظہور الاسلام صاحب موافق، اور اس ذہنی اختلاف نتیجہ یہ ہوا کہ مدرسۂ اسلامیہ میں عرصہ تک انگریزی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام نہ ہو سکا۔

اتفاق سے اسی زمانہ میں مولانا نور محمد صاحب حج کو چلے گئے، اور ان کی اس غیر حاضری سے فایدہ اٹھا کر مولانا ظہور الاسلام دفعتاً انٹرنس تک درجے کھول دئے۔ مولانا نور محمد صاحب کی ذہنیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب وہ حج سے واپس آئے انھوں نے یہ دیکھا کہ مدرسہ کی تو بالکل کایا پلٹ گئی ہے، ٹاٹ اور بوسیدہ دری کی جگہ کرسی اور بنچوں نے لے لی ہے

تو ان کی برہمی کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے ان تمام چیزوں کو اٹھا اٹھا کر پھینکنا شروع کیا اور وہ اسے برداشت نہ کر سکے کہ جہاں یزداں کی حکومت تھی وہاں اہرمن کا عمل دخل ہو جائے۔

یہ وقت بڑا نازک تھا۔ اور مولانا ظہور الاسلام، مولانا نور محمد صاحب کی اس ذہنیت سے بڑے آزردہ تھے، انھوں نہایت متانت و خوش اسلوبی سے یہ سب کچھ جھیلا۔ اور مدرسہ کی عربی شاخ کو علٰحدہ کر کے مولانا نور محمد صاحب کو اس کا مالک بنا دیا اور انگریزی تعلیم کا انتظام خود اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

میں نے اپنی عربی تعلیم کا بڑا حصہ اس دو عملی میں بسر کیا اور میری ذہنیت پر اس کا بڑا اثر پڑا۔ میں ایک ہی وقت میں مولانا نور محمد صاحب سے عربی بھی پڑھتا تھا اور انگریزی شاخ میں انگریزی بھی، اور دو مختلف کیفیات لے کر گھر لوٹتا تھا۔

مولانا نور محمد صاحب عربی کے عالم تھے، لیکن محض صرف و نحو، فقہ و حدیث کی حد تک۔ ان کو منطق و فلسفہ کا ذوق کم تھا ادبیت کا بالکل نہیں۔ وہ عالم ضرور تھے، لیکن ان کا علم جامد نہ تھا اور جب وہ کوئی کتاب پڑھاتے تھے تو ہمیشہ شروح و حواشی سے لیتے تھے اور کوئی بے ساختہ تقریر کسی علمی موضوع پر نہ کر سکتے تھے لیکن سختی کا عالم تھا کہ طلبہ کو سخت جسمانی ضرر پہونچانے سے بھی ان کو نہ تھا۔ یہ میں نسبتاً زیادہ تفصیل سے اس لئے لکھ رہا ہوں کہ میری ذہنیت میں مذہب و مذہبیت سے انحراف کی جو کیفیت پیدا ہو اس کی ذمہ داری ایک حد تک اس ماحول پر بھی تھی۔ میں مولانا کا بہت ادب کرتا تھا (اور ادب نہ کرتا تو کیا کرتا)، مگر مولانا کی طرف سے محبت کبھی کسی طالب علم کے دل میں پیدا نہ ہوئی۔ وہ اس رمز سے واقف ہی نہ تھے کہ:۔

درس ادب اگر بود زمزمۂ محبتے
جمعہ بمکتب آورد طفل گریز پائے را

میں نے ہمیشہ یہی سمجھا کہ مولانا کی اس سخت گیری اور طبعی کرختگی کا سبب محض ان کا مذہبی تقشف تھا اور میں اس کبھی بارہا سوچا کرتا تھا کہ اگر عبادت اور مذہبی تعلیم کا صحیح نتیجہ یہی ہے تو مذہب و مذہبیت کوئی معقول بات نہیں۔ دوسری چیز نے مجھے مذہبیت کی طرف سے بددل کیا، اس مدرسہ کا حافظ خانہ تھا۔ یہ بڑا قدیم ادارہ تھا جس میں طلبہ کو قرآن حفظ کرایا جاتا تھا اور بے دردی کے ساتھ کہ اس کے خیال سے میرے جسم کے رونگٹے اب بھی کھڑے ہو جاتے ہیں۔ شکر ہے کہ حفظ قرآن کے باب میں میرے والد کا مسلک کچھ اور تھا اور وہ اس کے سخت مخالف تھے کہ بچوں کو اول اول کسی غیر زبان میں تعلیم میں لگایا جائے۔

اس لئے خدا کا شکر ہے کہ حافظ خانہ سے مجھے واسطہ نہیں پڑا۔ لیکن یہاں جو عذاب بچوں پر نازل ہوا کرتا تھا اس سے میں کیا، کا ہر شخص واقف تھا۔ صبح سے دوپہر تک حافظ خانہ کی چیخ و پکار اور بچوں کی آہ و بکا سے مجھے سخت تکلیف پہونچتی تھی۔ کبھی کبھی میں والد سے کہہ دیا کرتا تھا کہ اگر قرآن کا حفظ کرانا اس حد تک ضروری ہے کہ بچہ کا جسم و دماغ دونوں کو مجروح و بیکار کر دیا جائے تو قرآ سے انکار ہی بہتر ہے۔

لیکن میرا ماحول سب کا سب ایسا تھا کہ وہ ان باتوں کو محسوس ہی نہ کرتا تھا اور وہ سمجھتا تھا کہ حفظ قرآن اتنے بڑے ثواب کا کام ہے کہ اگر اس سلسلہ میں انسان توازنِ دماغ کھو بیٹھے تو بھی تو اسے انعام آخرت کی توقع پر برداشت کرنا چاہیئے۔ بہرحال مدرسہ اسلامیہ میں مولانا نور محمد صاحب کی سخت گیری و تقشف اور حافظ خانہ کے وجود نے جو بالکل ایک مذبح کی حیثیت رکھتا تھا، میرے اندر مذہب کی طرف سے ایک خاص کیفیت احتراز پیدا کر دی تھی، اور میں سوچا کرتا تھا کہ اگر اسلام یہی ذہنیت پیدا کرتا ہے تو یہ کوئی معقول مذہب نہیں۔

میں نماز کا پابند تھا مگر اتنا زیادہ نہیں۔ تاہم یہ مجھے خوب یاد ہے کہ جب مولانا نور محمد صاحب نماز پڑھاتے تھے تو میرا جی بالکل نہ لگتا تھا کیونکہ وہ بدآواز و بدلہجہ شخص تھے، برخلاف اس کے جب کبھی مولانا ظہور الاسلام کی اقتدا میں نماز پڑھنے کا موقع ملتا تو ذہن پر ایک خاص کیفیت طاری ہوتی۔ ان کے لہجے کی نرمی و رقت اور اس کے لحن کا میرے دل پر بڑا اثر ہوتا۔

جس وقت تک مولانا سے صرف و نحو، منطق و فقہ کی تعلیم حاصل کی اس کا ذکر فضول ہے کیونکہ درسِ نظامی کی کتابیں ان علوم و فنون پر چند مسلّمہ قواعد و اصول پر لکھی گئی ہیں اور ان کو پڑھنا محض پڑھ لینا یا یاد کرنا تھا۔ لیکن جب معانی و بیان اور عقاید و حدیث کی کتابیں سامنے آئیں تو میں نے محسوس کیا کہ مولانا اس میدان کے مرد نہ تھے۔ مختصر المعانی کا درس شروع ہوا تو بالکل میکانکی قسم کا، کیونکہ وہ ادیب نہ تھے، عقاید و احادیث کی کتابوں میں بھی مجھے اکثر سوال کرنے کی ضرورت ہوتی تھی۔ لیکن محض سوال میں خوف کی وجہ سے نہ کر سکتا تھا اور اگر کبھی اس کی جرأت کی تو اس کا تشفی بخش جواب نہ پایا۔ ایک بار "شرح عقاید نفسی" کے درس میں "لا یجوز اللعن علی الیزید" کا مسئلہ سامنے آیا۔ میں نے سوال کیا اس مسئلہ کا تعلق عقاید سے کیا ہے۔ کیونکہ عقاید کا اطلاق صرف ان باتوں پر ہو سکتا ہے جن پر مذہب کا انحصار ہے اور یزید کے بُرا یا اچھا کہنے کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

واضح رہے کہ اس وقت میری عمر ۱۳ سال سے زیادہ نہ تھی اور میرے ساتھی طلبہ سب مجھ سے عمر میں بہت بڑے تھے (جن میں سے ایک مولانا حسرت موہانی کے بڑے بھائی روح الحسن بھی تھے)، لیکن ان میں سے کوئی اس کے لئے آمادہ نہ تھا کہ وہ میری ہاں میں ہاں ملائے۔ شاید اس لئے کہ وہ واقعی لعن یزید کے مسئلہ کو اس قدر اہم سمجھتے تھے یا یہ کہ مولانا کا رعب ان کو لب کشائی کی اجازت نہ دے سکتا تھا۔ میں اس قسم کی بحث کے لئے بدنام تھا اور باوجود مولانا کی خشونت و برہمی کے مجھ سے رہا نہ جاتا تھا اور میں مشکل ہی سے کسی ایسی بات کو تسلیم کرتا تھا جو میری سمجھ میں نہ آئے۔ میری اس گفتگو پر مولانا کوئی تشفی بخش جواب نہ دے سکے، انھوں نے اصولاً یہ تو تسلیم کر لیا کہ لعن یزید کا مسئلہ اتنا اہم نہیں کہ اس پر کفر و الحاد کی بنیاد قایم ہو، لیکن اس کے ساتھ انھوں نے اس کی اہمیت پر کافی زور دیا گو اس کا سبب وہ اس کے سوا کچھ نہ بتا سکے کہ یہ مسئلہ چونکہ مفہوم "معصیت" سے تعلق رکھتا ہے اس لئے اس کا ذکر ضروری تھا اس کے بعد میں نے پھر اصل مسئلہ کو لیا کہ "لعنِ یزید" کیوں جایز نہیں ہے۔ اس کا سبب یہ بتایا گیا کہ ممکن ہے خدا نے یزید کی غلطی یا معصیت کو معاف کر دیا ہو۔

میں نے پھر دریافت کیا کہ لعن کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ اس سوال پر مولانا کی خشونت بڑھ گئی۔ فرمانے لگے کہ لعن بھیجنے سے مراد ایک شخص کو بُرا سمجھ کر اس کے حق میں بددعا کرنا ہے۔ میں نے کہا پھر یزید کیا معنی، ہر اس شخص کی لعنت کا سوال سامنے آتا ہے جس کو ہم برا سمجھیں، یہاں تک کہ خود یزید پر لعنت بھیجنے والا بھی اس میں شامل ہو سکتا ہے ـــ اگر خدا یزید کو معاف کر سکتا ہے تو وہ یزید کو بُرا کہنے والے کو بھی معاف کر سکتا ہے۔ علاوہ اس کے میں سمجھتا ہوں کہ لعن کا تعلق دراصل ہماری ذاتی رائے اور تحقیق سے ہے اور یہ نتیجہ ہے ایک ایسے احتساب کا جو ہمیں ایک رائے قایم کرنے اور اس رائے کے اظہار کی بھی اجازت دیتا ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ ایک شخص جو یزید کے کردار کو قابل مذمت قرار دیتا ہے اسے ظاہر نہ کرے خاص کر ایسی صورت میں جبکہ یہ ایک حیثیت سے قومی، سیاسی، اجتماعی و ملکی اہمیت بھی رکھتا ہے۔

میرے ساتھ درس میں اور بھی متعدد طلبہ تھے جو عمر میں سب کے سب مجھ سے بڑے تھے اور بعض تو میرے والد کی عمر کے تھے۔ مثلاً عزیز الحسن غوری جو وہیں فتحپور میں ڈپٹی کلکٹر تھے، شاعر بھی تھے اور مجذوب تخلص کرتے تھے۔ لیکن کس قدر عجیب بات ہے کہ ان میں کوئی ایسا نہ تھا جو میری ہاں میں ہاں ملاتا۔ یہ سب کے سب بڑی سخت رجعت پسندانہ و مقلدانہ ذہنیت رکھتے تھے۔

اور وہ مذہبی کتابیں اس لئے نہ پڑھتے تھے کہ انہیں سمجھیں بلکہ صرف اس لئے کہ انہیں پڑھیں اور اس یقین کے ساتھ کہ ان میں جو کچھ لکھا ہے وہ وحی کی حیثیت رکھتا ہے اور اس میں چوں وچرا کی گنجائش نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں اپنی جماعت میں نکو بن کر ر گیا اور مجھے دیکھتے ہی مولانا کی پیشانی پر شکنیں آجاتی تھیں۔

اس سلسلہ میں ایک بڑا پر لطف واقعہ پیش آیا۔ ایک دن مولانا نے میرے والد سے شکایت کی کہ آپ کا لڑکا بڑا حجتی اور کوئی بات آسانی سے اس کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اس سے اور طلبہ کا بھی حرج ہوتا ہے۔ میرے والد نے اس کی تفصیل دریا کی تو مولانا نے یہی لعن یزید والی بحث پیش کردی۔

میرے والد پرانے زمانے کے سخت قسم کے پٹھان تھے۔ وہی سپاہیانہ وضع و صورت اور وہی لب و لہجہ۔ مذہباً و حنفی تھے لیکن علیؓ و حسینؓ کے باب میں ان کا مسلک ایک حد تک تفضیلیہ تھا، اور مذہب کا تاریخی مطالعہ ان کا بہت وسی تھا۔ مولانا سے یہ قصہ سنتے ہی، ان کی تیوریاں چڑھ گئیں وہ بڑے صاف گو انسان تھے، بولے کہ "مولانا یہ بتایئے کہ لعن یزید اگر ناجائز ہے تو یزید کو بُرا کہنے والا کسی گناہ صغیرہ کا مرتکب ہوگا یا گناہ کبیرہ کا نیز یہ کہ اگر لعن یزید "گناہ صغیرہ" ہے تو عقاید کی کتاب میں صرف ایک اسی گناہ صغیرہ کا ذکر کیوں اس قدر اہتمام سے کیا گیا اور دوسرے ہزاروں معاصی صغیرہ کو چھوڑ دیا گیا، اور اگر گناہ کبیرہ ہے تو دوسرے معاصی کبیرہ کی طرح اس کی کوئی حد یا سزا کیوں نہ مقرر کی گئی۔ مولانا معاف فرمایئے، آپ صرف در نظامی کے مدرس ہیں اور اسی کے معلم، آپ کا علم صرف چند مخصوص درسی کتابوں تک محدود ہے۔ نہ آپ لوگوں نے تاریخ کا مطالعہ کیا ہے اور نہ فلسفۂ تاریخ کا، آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ تاریخ اسلام کا سب سے بڑا اہم واقعہ قتل عثمانؓ تھا۔ اور یہ اتنا بڑا فتنہ تھا کہ اس نے نہ صرف مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کردی بلکہ تاریخ اسلام کے ساتھ ساتھ نفسِ اسلام و عقاید اسلامی پر بھی بڑا خراب اثر ڈالا۔ اور اسلام نام رہ گیا صرف ان سیاسی عقاید کی تبلیغ کا جو علویین اور امویین کی طرف سے پھیلائے جا رہے تھے۔ ایک طر علیؓ اور ان کی اولاد پر لعنت بھیجنا مذہب کا ضروری جزو قرار پایا اور دوسری طرف امیر معاویہ اور ان کے اخلاف کو برا کہنا مذہبی ذریعہ بن گیا۔ اسلام کی سادگی ختم ہوگئی اور ملک کی مصلحت و ضرورت حق پر غالب آگئی۔ ہر فریق کی موافقت میں حدیثیں گڑھی جانے لگیں۔ مسائل فقہ وضع ہونے لگے، تاریخیں مسخ کی گئیں۔ یہاں تک کہ صحیح اسلام گم ہوگیا اور دنیا اس کی مسخ شدہ صورت ہی کو اصل مذہب سمجھنے لگی۔ آپ کو خبر نہیں کہ شرح عقاید نسفی، امویین کے عہد کی کتاب ہے، جو علویین کے شدید دشمن تھے اور اسی لئے لعن یزید کے مسئلہ کو اس قدر اہتمام کے ساتھ اس میں بیان کیا گیا ہے۔ ورنہ دراصل "حسینؓ و یزید" کا معاملہ محض ایک تاریخی چیز ہے جس سے عقاید کو کوئی واسطہ نہیں اور محض ایک تاریخی واقعہ کی حیثیت سے اس پر غور کرنا چاہیئے۔ پھر اگر کوئی شخص واقعاتی حیثیت یا کردار کے لحاظ سے اس مسئلہ پر غور کر کے اس نتیجہ پر پہونچے کہ یزید نے جو کچھ حسینؓ کے ساتھ کیا وہ حد درجہ وحشیانہ تھا اور اس کا اظہار کرے تو کیوں اسے ناجائز قرار دیا جائے۔ لفظ لعن یا لعنت کا استعمال تو اس باب میں صرف اس لئے کیا جاتا ہے کہ اس میں مذہبی اہمیت پیدا ہو جائے۔ ورنہ یزید کو بُرا سمجھنے اور کہنے کا تعلق صرف تاریخی استنتاج سے ہے اور اس سے کسی کو باز نہیں رکھا جا سکتا۔ اگر میرے لڑکے نے آپ سے اس مسئلہ میں کوئی مخالفانہ گفتگو کی ہے تو اس کو اس گفتگو کا حق پہونچتا ہے۔ صرف و نحو یا ادب کا درس تو خیر، مقررہ قواعد و اصول کا پابند ہے، اور ریاضی کی طرح انہیں ماننا ہی ہے لیکن فقہ و حدیث کے درس میں آپ اُسے مجبور نہیں کر سکتے کہ وہ اپنی عقل سے کام نہ لے۔ میں اس کا قایل نہیں کہ خدا کے پاس جتنی عقل تھی وہ سب اسلاف میں تقسیم ہو چکی۔ اب عقل کا دروازہ پہلے سے بہت زیادہ کھل گیا ہے اور مہربانی فرما کر اس دروازے کو میرے لڑکے پر

درنہ کیجئے۔ میں نے آپ کے پاس اسے صرف اس لئے بھیجا ہے کہ آپ سے وہ کچھ سمجھ حاصل کر سکے، نہ یہ کہ اس کے جو تھوڑی بہت ھ موجود ہے وہ بھی اس سے چھین لیں۔

رہا اصل مسئلہ یزید کے لعن وطعن کا سو مولانا آپ کی عقاید نسفی جو چاہے کہیے، لیکن میں یزید کو برا کہتا ہوں اور اس کا ارضروری سمجھتا ہوں، بلکہ ان کو بھی بُرا سمجھتا ہوں جو اس کے بُرا کہنے کو بُرا سمجھتے ہیں۔"

میرے والد بڑے خوش بیان اور بے باک مقرّر تھے۔ بڑے بڑے مولوی مذہبی مباحث میں ان کے سامنے سپر ڈال دیتے تھے۔ رے مولانا تو خیر صرف مدرس ہی تھے وہ کیا جواب دے سکتے تھے۔

یہ واقعہ میری زندگی کا نہایت اہم واقعہ ہے۔ کیونکہ اس سے مجھ میں مذہبی تحقیق کا ایک نیا رجحان پیدا ہو گیا اور صحیح اسلام کو سمجھنے وق میرے اندر بہت بڑھ گیا۔

میں مدرسۂ اسلامیہ میں عربی کا درسِ نظامی حاصل کر رہا تھا اور گھر پر والد سے فارسی پڑھتا تھا ـــــ جس زمانہ کا یہ واقعہ ہے میں ی میں رسایل طغرا بھی پڑھ رہا تھا (جس میں مولانا حسرت موہانی بھی میرے ہمدرس تھے)، اور عربی میں درس نظامی کا بڑا حصہ ختم اس حد تک پہونچ گیا تھا جب صرف ونحو اور منطق کی ضروری تعلیم کے بعد اونچی تعلیم شروع ہوتی ہے۔

گھر پر میرے اوقاتِ فرصت میں دو خاص مشغلے تھے، ایک فارسی دواوین کا مطالعہ جن میں بیدل اور غالب سے مجھے خاص شغف تھا۔

میرے والد فارسی کے بڑے مشہور شاعر وانشاپرداز تھے۔ غزل سے انہیں بہت کم دلچسپی تھی، صرف قصاید لکھتے تھے اور وہ بھی ومنقبت میں۔ صہبائی کے شاگرد تھے اور غالب کی فارسیت کے شیدائی۔ اس وقت فارسی تعلیم کا رواج کافی تھا اور صبح کو کان ایک اچھا خاصہ درسگاہ ہو جاتا تھا جہاں زیادہ تر پختہ عمر کے لوگ میرے والد سے فارسی پڑھنے آجاتے تھے۔ وہ فارسی دائی کتابیں نہیں پڑھاتے تھے بلکہ ان کی تعلیم شروع ہوتی تھی مینا بازار۔ پنج رقعہ۔ رسایل طغرا۔ شبنم شاداب۔ بیدل رنامہ۔ شاہنامہ اور دفاتر ابوالفضل سے۔

میرا دوسرا مشغلہ غیرِ مذہبی کتابوں کا مطالعہ تھا۔ جن میں تصوف کی بعض کتابوں سے مجھے بہت دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ انہ میں ابن عربی کی فصوص الحکم کا ترجمہ میں نے شروع کر دیا۔ اور جب مولانا نور محمد صاحب سے میں نے اس کا ذکر کیا تو انھوں اس سے باز رکھنے کی کوشش کی کیونکہ وہ نہایت سخت وہابی قسم کے مسلمان تھے اور ابن عربی کے فلسفۂ تصوف کو جو ماورا، مذہب ر چیز ہے، وہ کبھی پسند نہ کرتے تھے۔

اس زمانہ میں مجھے شعر کہنے کا بھی شوق پیدا ہو گیا تھا۔ فارسی میں کبھی کبھی اور اردو میں اکثر۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مولانا حسرت موہانی یں زیر تعلیم تھے اور ایک خاص حلقہ میں ان کی غزلوں کو بہت پسند کیا جاتا تھا۔ میں بھی اُن کے رنگِ تغزل سے کافی متاثر تھا۔ عر کہتا تھا غالب کے رنگ میں جس میں فارسیت زیادہ ہوتی تھی۔ حُسن وعشق کی باتوں کا صرف کتابی علم تھا اور ان کے اظہار لیقہ نہ تھا۔ بعد کو میری شاعری کا یہ رنگ بدلا، یہاں تک کہ میرؔ دل ودماغ پر چھا گیا۔ اس رنگ میں خود تو کچھ نہ کہہ سکتا تھا لیکن پڑھتا تھا۔ چونکہ حسرت سے روز ملنا ہوتا تھا، ان کی شاعری سے بھی کافی متاثر تھا اور غالباً اسی لئے ان کی فارسی ترکیبیں مجھے پسند یہ نتیجہ تھا ابتدائی کلاسیکل فارسی تعلیم کا، اور اس فارسی ماحول میں جس میں میری تربیت ہوئی۔ میرے والد ہمیشہ اہل علم کو ی میں خط لکھتے تھے۔ اور طبقۂ علماء میں صرف مولانا محمد علی بہاری (جو کانپور میں مستقلاً قیام پذیر تھے اور ناظم دار العلوم ندوہ ایسے مولوی تھے جو فارسی کا اچھا ذوق رکھتے تھے اور خود بھی میرے والد سے فارسی ہی میں مراسلت کرتے تھے۔ اس مراسلت

کی ترتیب و تدوین میرے ہی سپرد تھی۔

اس بیان سے مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ فارسی ادب کا ذوق مجھ میں بہت کم سنی میں پیدا ہوگیا تھا اور اس کے ساتھ اُردو اد کا بھی، لیکن اس کی ابتدا نثر سے نہیں بلکہ شاعری سے ہوئی اور جب میں مدرسہ اسلامیہ میں درس نظامی کے لئے بھیجا گیا تو میرا شعو کافی پختہ ہوچکا تھا اور اسی لئے میں اپنے اساتذہ سے بعض دینی مسایل میں جن کو میرا ذہن قبول نہ کرتا تھا حجت کر بیٹھتا تھا۔

شکر ہے کہ حدیث کا درس ابھی شروع نہ ہوا تھا۔ لیکن جب اس کا درس شروع ہوا تو ایک بڑا ہنگامہ اپنے ساتھ لایا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اتفاق سے اسی زمانہ میں مولانا نور محمد صاحب حج کو تشریف لے گئے اور ان کی جگہ مولانا محمد حسین خاں کوٹی مقرر کئے یہ دیوبند کے فارغ التحصیل عالم تھے۔ نازک نقشے کے نہایت گورے چٹے، پستہ قد منحنی النسان، حد درجہ مغلوب الغضب اور خشک عبوس۔ اُن کے دیکھتے ہی مجھے آتش کا یہ مصرع یاد آگیا:۔

اس بلائے جاں سے آتش دیکھئے کیونکر بنے

انہوں نے آتے ہی سب سے زیادہ زور حدیث پر دیا کیونکہ دیوبند والے علوم دینیہ میں حدیث ہی کو بہت زیاد اہمیت دیتے ہیں اور اس میں وہ زیادہ درک رکھنے کے مدعی ہیں۔ میں نے اس وقت تک حدیث کی کوئی کتاب شروع نہ کی تھی لیے جب مشکوٰۃ کا درس شروع ہوا تو میری آنکھوں سے پردہ سا اٹھ گیا۔ میں نے پہلی مرتبہ یہ محسوس کیا کہ اسلام میں طامات و خرافا کا عنصر کہاں سے آیا۔

میں نے پہلے ہی دن یہ سمجھ لیا تھا کہ ان نئے مولانا سے میری نہیں بن سکتی۔ مولانا نور محمد صاحب تو خیر کسی وقت مسکرا بھی پڑ تھے، لیکن ان حضرت کی سرکہ پیشانی اس وقت بھی دور نہ ہوتی تھی جب وہ خدا کے سامنے نماز میں مصروف ہوتے تھے چہ جائیکہ در تدریس کے وقت تو وہ بالکل خدائے قہار نظر آتے تھے۔

تقرر کے بعد ایک ہفتہ تک تو ان کی تعلیم کا معمول وہی رہا جو اس سے قبل تھا۔ لیکن اس کے بعد انھوں نے اپنے اوقات ا کتابوں میں کچھ ردو بدل کیا۔ فقہ تو نہیں لیکن منطق، فلسفہ، معانی و ادب کی کتابوں کا درس کم کر دیا اور درس حدیث کی ابتدا جو اس وقت نہ ہوئی تھی۔ آخر کار ایک دن اعلان کر دیا کہ کل سے مشکوٰۃ شریف کا درس شروع ہوگا، سو ہوگیا۔

اس سے قبل فقہی کتابوں کے درس کے سلسلہ میں احادیث کے حوالے تو بارہا نگاہ سے گزر چکے تھے لیکن فن کی حیثیت س کتب احادیث کے مطالعہ کا اس سے قبل کوئی موقعہ نہ ملا تھا۔ میرا معمول تھا کہ ہر کتاب کے درس سے پہلے خود گھر میں اس کا غایر مطالعہ کرتا تھا، اور جو شبہات میرے ذہن میں پیدا ہوتے تھے، یا جن حصوں کو میں سمجھ نہ سکتا تھا ان کو کاغذ پر نوٹ کر لیتا تھا اور دو دن درس کے وقت میں معلم و مدرس کے سامنے اپنی الجھنیں پیش کر دیا کرتا تھا۔ چنانچہ جس دن مشکوٰۃ کا درس ہونے والا تھا اس س قبل کی رات میں اس ضخیم کتاب کو میں نے اپنے سامنے رکھا اور غور کرنے لگا کہ اگر حدیث سے راویوں کے سلسلہ کو اڑا دیا جائے ا صرف "قال رسول اللہ" سے ابتدا کی جائے تو کتاب بھی مختصر ہو سکتی ہے۔ اور یہ "عن فلاں، عن فلاں" کے پڑھنے میں جو وق ضائع ہوتا ہے وہ بھی بچ سکتا ہے۔ میں نے دوسرے دن صبح اپنے ساتھیوں سے ذکر کیا کہ آج مولانا سے ذرا یہ بات تو دریافت ک لیکن کوئی میرا ساتھ دینے پر آمادہ نہ ہوا۔ آخر کار جب درس کا وقت آیا تو میں نے مولانا سے نہایت ادب کے ساتھ عرض کیا کہ "حدیث ک تقدس کا پورا احترام رکھتے ہوئے مجھے ایک بات دریافت کرنا ہے، اگر اجازت ہو تو عرض کروں" نہایت خشونت کے ساتھ بو "کیا کہنا چاہتے ہو کہو" میں نے کہا، کتب احادیث میں جتنی حدیثیں ہیں ان کی تعلیم اس مفروضہ پر منحصر ہے کہ وہ سب صحیح ہیں

مولانا فوراً بپھر گئے اور نہایت تیز اور بلند آواز سے فرمایا۔

"مفروضہ! مفروضہ کیسا؟ جو حدیثیں کتاب میں درج ہیں وہ سب صحیح ہیں، اس میں فرض کرنے کا کیا سوال" میں نے کہا "معافی چاہتا ہوں، مفروضہ کہنے سے میرا مطلب یہی تھا کہ جب یہ تمام احادیث صحیح ہیں تو پھر راویوں کے نام کیوں ان میں درج ہیں۔ کیونکہ اصل حدیث تو صرف چند الفاظ پر مشتمل ہوتی ہے، لیکن راویوں کی فہرست کئی کئی سطر تک چلی جاتی ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو وقت اور کاغذ دونوں کی کافی بچت ہو سکتی ہے۔" اس کے جواب میں انھوں نے دانت پیس کر کہا کہ "احمق، راویوں کے نام اس لئے ظاہر کئے جاتے ہیں کہ ان پر حدیث کی صحت کا انحصار ہے۔ اگر راوی ثقہ و معتبر نہیں ہیں تو حدیث کو بھی معتبر نہ سمجھا جائے گا۔"

میں نے عرض کیا "یہ بالکل درست ہے اور یقیناً جامعین حدیث نے راویوں کی چھان بین کرنے کے بعد ہی صحیح احادیث یکجا کیا ہوگا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہم کو اس فہرستِ رواۃ سے کیا فائدہ پہونچ سکتا ہے جبکہ ہم کو خود ان راویوں کا حال معلوم نہیں"

مولانا نے فرمایا "راویوں کا حال معلوم کرنے کی ہم کو ضرورت بھی کیا ہے جبکہ حدیثوں کی کتابوں میں صرف وہی احادیث درج ہیں جن کے راوی سب کے سب ثقہ ہیں۔" میں نے عرض کیا کہ جب ضرورت نہیں تو پھر کیوں انہیں دہرایا جاتا ہے علاوہ اس کے "علم الرجال" طلبہ کے لئے یوں بھی بیکار ہے کیونکہ انہیں خود اپنی رائے قائم کرنے کوئی حق حاصل نہیں۔"

مولانا اس حجت کو برداشت نہ کر سکے اور انتہائی غیظ کے عالم میں کتاب بند کر کے مجھے حکم دیا کہ "درجے سے نکل جاؤ" اسی کے ساتھ اپنا ڈنڈا بھی اٹھایا اور اگر میں فوراً اٹھ کر چلا نہ جاتا تو وہ یقیناً میرا سر زخمی کر دیتے۔

اس کے بعد میں کئی دن تک مدرسہ نہ گیا۔ لیکن ایک دن پھر میرے والد پہونچا گئے اور میں درس مشکوٰۃ میں شریک ہو گیا۔ کہ میں سمجھ چکا تھا کہ مولانا محض لکیر کے فقیر ہیں اور ان کا مذہبی تقشف کسی طرح عقلی حجت کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اس لئے مجبوری میں اس درس میں شریک تو رہا لیکن کوئی سوال ان سے نہیں کیا۔ اس حال میں کئی دن گزر گئے اور کوئی صورت ہنگامہ پیدا نہیں ہوئی۔

ایک دن دوران درس میں ایک حدیث آئی جس میں رسول اللہ سے کسی نے دریافت کیا کہ دنیا میں سردی و گرمی کیوں ہے اور اس کا جواب رسول اللہ نے یہ دیا کہ "آسمان میں ایک اژدہا ہے جب وہ اپنی سانس دنیا کی طرف چھوڑتا ہے تو ہو جاتی ہے اور جب سانس کھینچتا ہے تو سردی ہو جاتی ہے۔"

یہ حدیث پڑھتے ہی باوجود انتہائی ضبط کے بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا کہ "غلط" یہ سنتے ہی مولانا کا یہ حال ہوا جیسے کوہ آتش فشاں پھٹ پڑا ہو، اور بولے کہ "بدتمیز، تو رسول اللہ کو غلط کہتا ہے۔"

میں نے عرض کیا کہ "میں رسول اللہ کو غلط نہیں کہتا۔ بلکہ اس حدیث کو غلط کہتا ہوں، کیونکہ رسول اللہ کبھی ایسی خلاف لغو بات نہیں کہہ سکتے۔"

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا نے اپنا ڈنڈا اٹھایا اور میں اٹھ کر بھاگا۔ مولانا نے کچھ دور میرا تعاقب بھی کیا، لیکن میں ہاتھ اور اس طرح ہمیشہ کے لئے میرا پیچھا ان سے چھوٹ گیا۔

اتفاق سے اسی زمانے میں میرے والد بسلسلۂ رخصت لکھنؤ جا رہے تھے اور وہ مجھے اپنے ساتھ لکھنؤ لے گئے۔

فتحپور سے لکھنؤ منتقل ہونے کے بعد بھی میرے مذہبی ماحول میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوئی اور کافی عرصہ تک یہ سلسلہ جاری

رہا۔ لیکن اس کی تفصیل کا موقع نہیں۔ مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ میرا تجربہ مولویوں کے باب میں تلخ سے تلخ تر ہوتا گیا اور میں سمجھ لیا کہ اس طبقہ کی طرف میں کبھی مایل نہیں ہو سکتا۔ ان کی رعونت، ان کا تقشف، ان کا فرعونی اندازِ گفتگو، ان کا یہ عقیدہ کہ مذ کو عقل سے کوئی لگاؤ نہیں اور ان کا یہ پندار کہ وہ عام سطح سے بہت بلند ہیں اور ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ انہیں دیکھتے ہی سر تسلیم مجھے ان سے متنفر کرتا جا رہا تھا اور میں بار بار یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ اگر یہ واقعی محض مذہبی تعلیم کا نتیجہ ہے تو مذہب سے زیادہ چیز دنیا میں کوئی نہیں ہو سکتی اور اس سلسلہ میں مجھے مذاہب کے تقابلی مطالعہ کا شوق پیدا ہوا۔

میں نے مذاہب کا مطالعہ صرف اس نقطۂ نگاہ سے شروع کیا کہ اخلاق کی عملی تعلیم کے لحاظ سے ان کا کیا درجہ ہے اور اس نے مجھ سے اور زیادہ متنفر کر دیا۔ کیونکہ جس حد تک اِخلاق کا تعلق ہے، میں نے ان میں کوئی بات ایسی نہیں پائی جسے بعید ترین تا کے بعد بھی اسلام اور بانیِ اسلام کی بلند تعلیم اخلاق سے منسوب کیا جا سکے۔

میں جس وقت ان کے بطون کا تصور کرتا تھا تو وہ مجھے بالکل سیاہ پتھر کی طرح نظر آتا تھا اور میں ایسا محسوس کرتا تھا کہ کی روح بالکل اجاڑ ہے اور ان کا دل بالکل ویران۔ اور روحانی لطف اور جمالیاتی تسکینِ ذوق کے لحاظ سے ان کی ہی "وادی غیر ذی زرع" کی حیثیت رکھتی ہے۔

ہاں اس سلسلہ میں مجھے بعض ایسے مولویوں سے بھی واسطہ پڑا جن سے مجھے نفرت کی جگہ الفت پیدا ہوئی۔ لیکن یہ وہی مولوی کم اور صوفی زیادہ تھے۔ ان میں رامپور کے مولانا وزیر محمد خاں کو میں نے سب سے بلند پایا۔ یہ بڑے فلسفی و منطقی تھے مولانا عبدالحق خیر آبادی کے ارشد تلامذہ میں سے، لیکن درس و تدریس کی دنیا سے ہٹ کر وہ بڑے پیارے عادات و خص کے انسان تھے۔ ان کا علم بڑا حاضر تھا، وہ نہایت اچھے مقرر تھے اور طلبہ کو ہر مسئلہ میں مطمئن کر دینے کی پوری کوشش کرتے لیکن ان کے شاگردوں میں صرف میں ہی ایک ایسا تھا جو اخیر وقت تک ان سے حجت کرتا رہتا تھا اور ایسے مسایل میں جن کا تعل یا سائنس سے ہے وہ مشکل ہی سے مجھے مطمئن کر سکتے تھے۔ چنانچہ ہدیۂ سعیدیہ کے درس میں جب "ابطال حرکتِ زمین" کا سامنے آیا، تو بحث زیادہ ناگوار حد تک پہونچ گئی۔ لیکن یہ ناگواری صرف درس کی حد تک محدود رہی۔ اس کے بعد وہ پھر لطف و محبت تھے اور میں یکسر انقیاد و اطاعت۔

اس سلسلہ میں زیادہ تفصیل سے احتراز کرتا ہوں کیونکہ یہ بڑی طویل داستان ہے۔ مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ جوں جو گزرتا گیا میں مولویوں کے بتائے ہوئے اسلام سے متنفر ہوتا گیا۔ اور میرا یہ جذبہ نگار کے اجرا کے بعد اس حد تک شدید ہو آخر کار میں نے اس جماعت کے خلاف ایک محاذ قایم کر دیا اور ان کے عقاید اور ان کے اخلاق پر نکتہ چینی شروع کر دی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارے ملک کے مولوی میرے دشمن ہو گئے اور مختلف مقامات سے میرے خلاف توہینِ مذہب کے مقد دائر کرنے کی تدبیریں شروع ہو گئیں۔

مختصر یہ کہ اپنی زندگی میں سب سے زیادہ اثر میں نے جس کا لیا وہ مولویوں کی جماعت تھی۔ لیکن یہ اثر بالکل منفی تھا۔ یعنی میں ان سے متاثر تو ہوا، مگر یہ تاثر ایک نوع کا انکاری تاثر تھا اور اس لحاظ سے میں ان کا شکر گزار ہوں کہ اگر مجھے واسطہ نہ پڑتا تو نہ میں اپنے مذہبی مطالعہ میں وسعت پیدا کر سکتا اور نہ مسایلِ مذہب میں صرفِ عقل کا سلیقہ مجھ میں پیدا

اب میں اپنی زندگی کے اس پہلو کو لیتا ہوں جس کا تعلق شعر و ادب سے ہے اور اس کے بھی دو حصے ہیں، ایک ادیبوں اور شاعروں سے ہے اور دوسرے کا عورت اور محض عورت سے، لیکن وہ کم اور یہ زیادہ۔

شعر و سخن سے دلچسپی اور عورت کی طرف میرا انجذاب، ان دونوں کی ابتدا اگر ایک ساتھ نہیں ہوئی تو بھی ان دونوں اتنا کم فصل ہے کہ میں اس کی حد بندی مشکل ہی سے کر سکتا ہوں۔

شعر و سخن کا ذوق بارہ تیرہ سال کی عمر ہی میں مجھ میں پیدا ہو گیا تھا اور میں فتحپور کے مشاعروں میں شریک ہو کر غزلیں سنایا کرتا تھا۔ ہر چندان غزلوں میں عورت یا محبوب کا ذکر محض روایتی حیثیت رکھتا تھا اور میں جنسی جذبہ سے آشنا نہ تھا۔ اس کے بعد ہی جب میں لکھنؤ پہونچا تو دفعتہً یہ جذبہ بھی میرے اندر نشو و نما پانے لگا اور جب میرے شباب کا پہلا چاند یہاں ع ہوا تو عورت ہی میرے آغوشِ تصور میں تھی۔

دفعتہً فضائے مذہب و مولویت سے ہٹ کر عشق و محبت یا بالفاظِ دیگر جنسی رجحان و ہیجان کی دنیا میں آجانا میری ی کا ایک ایسا واقعہ ہے جس کا ذکر کئے بغیر آگے گزر جانا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں ذہنی حیثیت سے میں (PRECOCIOUS) کیفیت لے کر پیدا ہوا تھا لیکن بعد کو معلوم اعصابی حیثیت سے بھی میں کچھ ایسا ہی تھا، جس کا علم مجھے فتحپور میں تو نہ ہو سکا، لیکن لکھنؤ آنے کے بعد اس نے پے درپے ب ثاقب کی صورت اختیار کر لی جس کا ذمہ دار بڑی حد تک اپنے والد کو بھی سمجھتا ہوں۔

میرے والد عجیب و غریب اصول کے انسان تھے۔ اور بچوں کی تربیت کے باب میں وہ اس قدر وسیع الخیال تھے وہ عہدِ ترقی میں بھی اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

میں نے اپنے والد کا عہدِ شباب نہیں دیکھا، لیکن جو کچھ میں نے سنا اس سے مجھے اس بات کا علم ہو گیا تھا کہ انھوں جوانی بالکل اسی فضا میں گزاری تھی جس کا اصطلاحی نام بعد کو "شام اودھ" قرار پایا۔ اور اپنے ذوق شباب کی تسکین ہوں نے وہ سب کچھ کیا جو ایک رنگین مزاج، دولت مند انسان لکھنؤ کی نشہ بخش اور عشق خیز سرزمین میں کر سکتا تھا۔

پھر یہ بھی بالکل اتفاقی بات ہے کہ میرے عہدِ شباب کی وہ جھرجھری جو عورت کے جسم سے مس ہونے کے بعد پیدا ہوتی ہے، سب میرے جسم میں کبھی نہیں پیدا ہوئی۔

یہ زمانہ ہر حیثیت سے لکھنؤ کا عہدِ زوال تھا اور جانِ عالم کے بعد کا بھی وہ زمانہ جسے "لگن کی چنگاریاں" کہہ سکتے ہیں۔
تھا، لیکن

ابھی باقی تھی کچھ کچھ دھوپ دیوارِ گلستاں پر

کی گلیوں میں اب بھی خاک چھاننے کو جی چاہتا تھا۔

میرے والد محکمۂ پولیس سے وابستہ تھے۔ پہلے حسن گنج تھانہ کے انچارج تھے، اور پھر کوتوالی کے تھانہ میں آگئے جو چوک پر واقع تھا۔ لکھنؤ کا وہی چوک جس کا ذکر رجب علی بیگ سرور نے کیا تھا اور پھر اس کے بعد سرشار نے۔ میں اب بھی زیرِ تعلیم نگی محل میں مولانا شاہ عبدالنعیم صاحب اپنی زندگی کی آخری ساعتوں سے گزر رہے تھے اور فرنگی محل کے پل پر مولانا عین القضاۃ طلبہ حدیث کا مرکز تھا جس میں میں بھی شریک ہوتا تھا، لیکن نہایت خاموشی کے ساتھ۔ اس لئے نہیں کہ میں حدیثوں پر ایمان ، بلکہ محض اس لئے کہ میں جانتا تھا، صبح کو جامۂ احرام کے یہ دھبّے مجھے کہاں دھونا ہیں۔

یسا کہ میں نے ابھی عرض کیا، تربیتِ اخلاق کے باب میں میرے والد کا نظریہ بڑا عجیب و غریب تھا۔ وہ جنسی داعیات کے دبانے تھے، بلکہ ان کی تسکین ہی کو ذہنی و جسمانی نشو و نما کا صحیح ذریعہ قرار دیتے تھے۔ اس لئے جب میں اپنی عمر کے ان حدود میں

آگیا، جہاں ان کو اپنے نظریے کا عملی تجربہ کرنا تھا، تو انھوں نے مجھے بالکل آزاد چھوڑ دیا۔ لیکن آپ کے لئے اس امر کا تصور بھی مشکل ہ
کہ اب سے ۶۰ سال قبل لکھنؤ کیا چیز تھا اور اس میں کسی نوجوان کا آزاد چھوڑ دیا جانا کیا معنی رکھ سکتا تھا۔

لکھنؤ کا وہ حصہ جسے صحیح معنی میں لکھنؤ کہتے ہیں بڑا رومان آفریں حصہ تھا اور ۰۰۰۰۰۰۰ اس کا مرکز چوک تھا، جہاں شام
ہوتے ہی رنگینی، تعطر اور حسن و غنا کا ایک طوفان برپا ہو جاتا تھا۔ اور جینے سے زیادہ مر جانے کو جی چاہتا تھا۔

پھر اس دور آزادی میں میں نے وہاں کیا کیا دیکھا، کن کن گلیوں کی خاک چھانی، کن کن دیواروں کے سائے میں، کن کن راہ گزار
کی خاک پر میں نے اپنے لمحاتِ شباب صرف کئے یہ بڑی طویل داستان ہے، لیکن میرے اس عہدِ آشفتہ سری کا وہ حصہ جو میری جولانگ
شباب کو ایک خاص حد تک کھینچ لایا اس کا اجمالی ذکر ضروری ہے۔

اس وقت لکھنؤ کی بلند معاشرت کا ضروری جزو یہ بھی تھا کہ امرازادے محافل رقص و غنا میں آزادی سے شریک ہوں اور بعض
مخصوص ڈیرہ دار طوائفوں کی صحبت میں لکھنوی علم مجلس حاصل کریں۔ ان گھرانوں میں اس وقت چودھرائن کا گھرانا خاص امتیاز رکھت
تھا۔ چودھرائن کا مکان اسی جگہ تھا جہاں اب حنا بلڈنگ" ہے اور یہ مکان تہذیب و شائستگی کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔

شام کو چودھرائن کا مکان بالکل دربار نظر آتا تھا جس میں شہر کے اکثر خوش ذوق لوگ شریک ہوتے تھے اور اس محف
میں چودھرائن کی حیثیت ایک معلم کی سی ہوتی تھی۔ جس کی گفتگو اور انداز نشست و برخاست سے لوگ صحیح لکھنوی تہذیب سیکھ
تھے۔ اس محفل میں شعر خوانی، داستان گوئی، لطایف و ظرائف، ضلع جگت، رقص و سرود سب ہی کچھ ہوتا تھا اور جب لوگ یہا
سے لوٹتے تھے تو موسیقی کا صحیح ذوق، زبان کا صحیح استعمال، گفتگو کا خاص انداز، لب و لہجہ کی شیرینی، نشست و برخاست کا
اور خدا جانے کن کن باتوں کا درس لے کر لوٹتے تھے۔ غرض اس عہدِ زوال میں بھی لکھنؤ کی تہذیب و شائستگی اس گھرانے سے بڑی حد تک
قایم تھی۔ .... جہاں عشق و محبت کی داستانیں ہر وقت بنتی بگڑتی رہتی تھیں۔

میرے والد نے بھی مجھے اس دربار میں بھیجنا شروع کیا اور یہیں سے میرے شباب کا وہ دور شروع ہوا جسے میں اپنے ادبی
دور کا بھی آغاز کہہ سکتا ہوں۔

چودھرائن کے گھر جاکر میں کیا محسوس کرتا تھا، یہاں کے ہنگامۂ حسن و شباب میں مجھ پر کیا گزر جاتی تھی، میرے جسم کی رگیں
وہاں کس طرح ٹوٹتی اور جڑتی رہتی تھیں، میرے شب و روز کس طرح بسر ہوتے تھے، میرے جذبات کے ہیجان کا کیا عالم تھا اور کس
کس طرح مجھے صبر و ضبط کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس کا بیان بڑی تفصیل کا محتاج ہے۔ اس عہدِ وارفتگی کا میری ادبی زندگی پر جتنا گ
اثر پڑا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اول اول جب میں غزل کہتا تھا تو اس میں لایعنی تکلفات کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا۔ لیکن اب
رنگِ تغزل کچھ اور تھا۔ چنانچہ جب میں اس دیارِ حسن و عشق سے جدا ہونے لگا تو میں نے اپنے اس عہدِ رومان کی یاد میں ایک غزل
لکھی تھی جس کا ایک شعر دورِ خوشکامی سے متعلق تھا اور دوسرا دورِ ناکامی سے جسے ہم "زہرِ عشق" والی فضا کہہ سکتے ہیں:

آپ تھے، میں تھا، شبِ ماہ تھی، تنہائی تھی
ہائے وہ وقت کہ دشوار تھا جینا مجھ کو

اف ری مجبوریِ الفت، یہ خبر کس کو تھی
تم کو چاہوں گا تو جینا بھی پڑے گا مجھ کو

میرا لکھنؤ چھوڑنا، ٹھیک اس وقت ہوا جبکہ میں شباب کے جرعۂ اولین سے بھی خاطر خواہ آسودہ نہ ہو سکا تھا اور یہاں کی فضائے سن وعشق میرا دامن چھوڑنے پر کسی طرح راضی نہ تھی۔ میری زندگی کا یہ پہلا سانحہ تھا جسے میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا کیونکہ جو زخم نے یہاں کھائے تھے وہ مندمل ہونے پر بھی عرصہ تک رستے رہے اور اپنی آیندہ زندگی میں جب کبھی ان زخموں کے چھیڑنے کی فرصت ے ملی، میں نے کبھی تامل نہیں کیا۔ ذہنی و عملی دونوں حیثیتوں سے۔ گویا یوں سمجھئے کہ فکرِ فضول بھی جاری رہی اور اسی کے ساتھ رأت رندانہ بھی۔ گو اب ان میں صرف ایک چیز باقی رہ گئی ہے اور دوسری کا صرف ماتم گسار ہوں۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس سلسلۂ بیان میں، میں اصل موضوع سے ہٹتا جا رہا ہوں، لیکن مجبوری یہ ہے کہ میرے ذہنی انقلاب اور دبی رجحانات کا تعلق زیادہ تر "مولوی" اور "عورت" ہی سے ہے۔ اس لئے مولوی کے ذکر کی تلخی کے بعد "عورت" کا ذکر آ گیا ہے وجی چاہتا ہے کہ اس سلسلہ میں وہ سب کچھ کہہ جاؤں جس کے اظہار کا موقع شاید مجھے پھر نہ مل سکے۔ لیکن میں ایسا نہیں کروں گا۔ ونکہ اس کا تعلق دراصل میرے سوانح حیات سے ہے۔ جن کی تفصیل کا موقع نہیں۔ لیکن چند خاص واقعات جنھوں نے واقعی میری دبی زندگی کو حد درجہ متاثر کیا۔ اس وقت یاد آ گئے ہیں اور ان کا سرسری ذکر بغیر کسی تاریخی تسلسل کے غالباً ناموزوں نہ ہوگا۔

اپنی آوارہ گردی کے زمانہ میں ایک بار میں پٹنا اور جے گڑھ گیا اور یہاں ایک سال رہنا پڑا۔ یہ سال میری زندگی کا عجیب و ریب سال تھا۔ اس کا اندازہ آپ ایک خط سے کر سکتے ہیں جو میں نے اپنے ایک عزیز دوست کو لکھا تھا:۔

معززیں کو بنارس میں ہر بُت برہمن بچہ" لچھمن و رام نظر آتا تھا، یہاں قدم قدم پر سیتا اور رادھا کا سامنا ہے اور اس صوصیت کے ساتھ کہ

بے پردگی دیوانۂ طرحِ انقلاب افگندش

راجپوتوں کی لڑکیاں ہیں، بلند و بالا، صحیح و توانا، تیوریاں چڑھی ہوئی، گردنیں تنی ہوئی، آنکھوں میں تیر، مانگوں میں بیر، ابروؤں میں خنجر، بالوں میں عنبر، ہاتھوں میں مہندی، ماتھے پر بیندی، اب آپ سے کیا کہوں کیا چیز ہیں"

یہ تھا ایک عمومی تاثر یہاں کی فضا کا جس سے متاثر ہو کر میں نے چند نظمیں بھی لکھیں، لیکن ایک خاص واقعہ کی وجہ سے جسے یہاں کی نشہ بخش زندگی کا انتہائے عروج CLIMAX کہنا چاہیئے، مجھے اس سرزمینِ حسن و شباب کو چھوڑنا پڑا جس کی ابتدا چھ اس طرح ہوئی:۔

"شام کا وقت ہے، ہلکی ہلکی خنک ہوا چل رہی ہے، محل کے پائیں باغ میں روشوں پر ٹہل رہا ہوں۔ مہاراج (سر رگھوبر سنگھ کی طلبی کا انتظار ہے کہ دفعتہً سامنے سے ایک مجسمۂ شباب و رعنائی نظر آ گیا ہے۔ ذی حیات، متحرک، نگراں، خنداں، ٹھیک اسی وقت چوبدار آتا ہے بعد میں اندر محل میں چلا جاتا ہوں، لیکن دو چیزیں دماغ سے اور محو نہیں ہوتیں، ہلکے سانولے رنگ پر شفق کا انعکاس اور طاؤس کی سی مستی رفتار یہ نقش بعد کو ابھرتا رہا، نشۂ جنوں میں تبدیل ہوتا رہا اور پھر نامہ و پیام کی صورت اس نے اختیار کر لی۔

اُس کے چند دن بعد:۔

بسنت کی صبح ہے، دربار میں رسم گلباری کا اہتمام ہو رہا ہے۔ گلاب اور گیندے کے سرخ و زرد پھولوں سے آنچل معمور ہیں۔ رسم گلباری شروع ہو جاتی ہے۔

—————— چند دن بعد میں نے جب ایک عزیز دوست کو یہ سارا حال لکھا تو اس کے چند فقرے یہ بھی تھے:۔

"تم کبھی ملو گے تو دکھاؤں گا کہ پھول کی وہ پنکھڑی اب تک میرے پاس محفوظ ہے، جو میرے سینے تک پہونچکر ہمیشہ کے لئے ایک زخم چھوڑ گئی"۔

کتان خویش می شویم به مہتاب

رہا انجام و نتیجہ، سو اس کے متعلق کیا لکھوں، غالب نے ایک جگہ بنارس کا حال لکھتے ہوئے وہاں کی "قیامت قامتان" اور "مژگاں درازاں" کا ذکر اس طرح کیا ہے:۔

رنگیں جلوہ ہا غارتگر ہوش، بہار بستر دلنوروز آغوش، سو اگر مجھے یہ ڈر نہ ہوتا کہ تم رشک و حسد سے مر جاؤ گے تو میں اس شعر کا صرف دوسرا مصرع لکھ کر خط کو ختم کر دیتا۔"

میرے عشق و جنوں کا یہ دور مختلف مقامات سے تعلق رکھتا ہے، جن میں لکھنؤ، الہ آباد، مسوری، سری نگر، ہانسی، بھوپال، رامپور اور کلکتہ کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

ان تمام مقامات میں، میں اور میرا ذوقِ ادب عورت سے کس کس طرح متاثر ہوا اور اس میں کیا تدریجی تبدیلیاں پیدا ہوئیں، بڑی طویل داستان ہے۔ تاہم اگر کوئی شخص میرے افسانوں کے مجموعوں کا مطالعہ کرے تو اس کے کچھ اندازہ اس حقیقت کا ہو سکتا ہے۔

اس سلسلہ میں اس سے زیادہ لکھنے کا موقع یوں بھی نہیں کہ اس کا تعلق میرے سوانح سے ہے اور وہ اس وقت زیر بحث نہیں۔

ابتداءً عمر و عنفوانِ شباب میں مجھے ادبی رسایل کے مطالعہ کا بڑا شوق تھا۔ اور ان سب میں مجھے مخزن سے زیادہ دلچسپی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سید سجاد حیدر یلدرم ترکی "انشاء عالیہ" کے تراجم پیش کر رہے تھے اور اس کا میرے ذوق پر بڑا گہرا اثر پڑ رہا تھا۔ یہاں تک کہ جب ان کا "خارستان"، "گلستان و شیرازہ" شایع ہوا تو میں نے متعدد ESSAYS اسی رنگ کے لکھے "ایک شاعر کا انجام، پارسی دوشیزہ، رقاصہ اور عورت اسی تاثر کا نتیجہ تھے۔

اتفاق سے اسی زمانہ میں (غالباً ۱۹۱۱ء) میرا اور سید سجاد حیدر کا اجتماع مسوری میں ہو گیا۔ وہ پولیٹیکل ملازمت ے سلسلہ میں افغانستان کے ایک امیر زادہ کی نگرانی پر مامور تھے اور میں اسکنر اسٹیٹ سے وابستہ تھا۔

مسوری کے دوران قیام میں، میں ہر اتوار ان کے پاس صرف کرتا تھا اور سارا وقت ادبی گفتگو میں کٹ جاتا تھا۔ چند دن ے لئے قاری سرفراز حسین دہلوی (سیاح چین و جاپان) بھی یہاں آ گئے تھے۔ اور وہ بھی اس صحبت میں شریک رہتے تھے۔ اس قت تک یلدرم کی شادی نہیں ہوئی تھی۔

ادبی منظومات میں سرور جہاں آبادی کی نظمیں مجھے بہت پسند تھیں۔ لیکن اقبال کی نظمیں ایک عمیق شاعرانہ احساس میرے ندر پیدا کر رہی تھیں۔ اسی زمانہ میں مولانا ابو الکلام آزاد کا الہلال جاری ہوا اور اس کی "انشاء عالیہ" نے مجھے بہت متاثر کیا۔ اسی مانہ میں اقبال کا شکوہ شایع ہوا، جس نے مجھے یک لخت نظم نگاری کی طرف مایل کر دیا۔ اور میری پہلی نظم اسی نہج و اسلوب کی شہر آشوب اسلام" کے عنوان سے الہلال میں شائع ہوئی۔

نظموں کے علاوہ میں نے نثر میں بھی سیاسی و قومی مضامین لکھنا شروع کئے جو زیادہ تر زمیندار میں شائع ہوتے تھے۔ اس وقت کے ادیبوں میں خان بہادر میر ناصر علی کا اسلوب تحریر بھی مجھے بہت پسند تھا لیکن میں اس کی تقلید نہ کر سکتا تھا۔

ان کی تحریر اردو میں (ESSAY WRITING) کا بہترین نمونہ تھیں، لیکن اول اول اس قسم کے مقالے میں نے انگریزی کے مشہور (ESSAYIST) ولیم ہیزلٹ سے متاثر ہو کر لکھے۔ اسی کے ساتھ میں نے مختصر افسانے بھی شروع کئے اور یہ واقعہ ہے کہ میری فسانہ نگاری زیادہ تر یونان کے صنمیاتی لٹریچر سے متاثر تھی، کیونکہ میں اپنے وہ تمام جذبات جو عورت سے متعلق تھے زیادہ دل کھول کر اس پردہ میں ظاہر کر سکتا تھا اور یہ کہنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ اس میں غالب حصہ ان جذبات کا تھا جو بڑی حد تک "ناکردہ گناہوں" کی حسرت سے تعلق رکھتے تھے۔

اسی زمانہ میں ٹیگور کی گیتانجلی انگریزی میں شایع ہوئی اور وہ مجھے اس قدر پسند آئی کہ میں نے فوراً اس کا ترجمہ "عرضِ نغمہ" کے نام سے شایع کر دیا اور ٹیگور کے طرزِ تحریر تو نہیں لیکن اس کی معنویت سے ضرور میں نے اپنے بعض مضامین میں استفادہ کیا۔

میری ادبی زندگی کے آغاز کے کچھ دن بعد ہی میری صحافتی زندگی بھی شروع ہو گئی اور اس کا آغاز زمیندار لاہور کے ادارہ میں ہوا (۱۹۱۱ء) اس کے بعد یہ سلسلہ دہلی میں قایم ہوا (۱۹۱۵ء) اور اب تک اس کا سلسلہ جاری ہے۔ میری صحافتی زندگی پر مولانا آزاد اور مولانا ظفر علی خاں کا بہت زیادہ اثر تھا۔ مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی کا اندازِ صحافت (گو میرا ان کا ساتھ ایک بار دفترِ زمیندار میں ہو گیا تھا) میں نے بالکل قبول نہیں کیا۔ حالانکہ وہ اپنی جگہ ایک خاص وزن رکھتا تھا۔

اس کے بعد جب ۱۹۲۲ء میں نگار جاری ہوا تو ادب، سیاست، مذہب اور تنقید سب پر مجھے آزادی کے ساتھ لکھنے کا موقع مل گیا اور اس کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔

ادبیات اور صحافت کے سلسلہ میں مختصراً ان حضرات کا ذکر کر چکا ہوں۔ جن کی تحریروں نے مجھے متاثر کیا۔ رہ گئے میرے سیاسی عقاید سو اس باب میں، میں صرف ان چند اکابر کا شکر گزار ہوں جو ملک و قوم کی اجتماعیت کو رنگ و نسل کے امتیاز پر ترجیح دیتے تھے اور ان حضرات میں سب سے زیادہ میں مہاتما کے مشن سے متاثر ہوا۔

مذہب کے باب میں مولویوں کے خلاف ایک منفی قسم کا ردِ عمل جو میرے اندر اول اول پیدا ہوا تھا۔ "نگار" کے اجراء کے بعد اس نے زیادہ شدت اختیار کر لی اور اس سلسلہ میں جو جو معرکہ آرائیاں ہوئیں، انھوں نے میری مذہبی آزادی کو اور زیادہ تقویت پہنچائی۔ یہاں تک کہ آج میں تمام علمائے کے نزدیک نہایت نامعقول قسم کا مرتد و ملحد ہوں اور میں اپنے اسی الحاد کو عینِ ایمان سمجھتا ہوں۔ ع نازم بکفر خود کہ بہ ایماں برابر ست

اخیر میں نگار کی زندگی کے متعلق بھی چند جملے سن لیجئے:۔

نگار غالباً نومبر ۱۹۲۱ء کی بات ہے کہ لطیف الدین احمد (ل۔ احمد) کے مکان پر چند مخصوص احباب (ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی۔ مخمور اکبر آبادی۔ ملک حبیب احمد خاں، مقدس اکبر آبادی، شاہ دلگیر اکبر آبادی وغیرہ اور خود لطیف صاحب) کا اجتماع ہے اور ایک رسالہ جاری کرنے کی تجویز پر گفتگو ہوتی ہے (اس وقت نقاد بند ہو چکا تھا) اور اس کا اجراء طے پا جاتا ہے۔ اس کے بعد دو سوال سامنے آتے ہیں ایک نام کا، دوسرا سرمایہ کا۔ چونکہ یہ بات پہلے ہی طے ہو چکی تھی کہ میں اسے مرتب کروں گا اس لئے ایڈیٹر کی زندگی کا کوئی سوال سامنے نہ تھا۔ رہا نام اس کے متعلق جب میری رائے طلب کی گئی تو میں نے نگار تجویز کیا، کیونکہ یہ وہ زمانہ تھا جب ترکی زبان سیکھنے کا جنون مجھ پر سوار تھا اور "نگار بنت عثمان" ترکی کی مشہور شاعرہ میرے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔ اس کے بعد جب سرمایہ کا سوال سامنے آیا تو یہ طے پایا کہ فی الحال کم از کم بیس اصحاب بیس بیس روپے نگار

فنڈ میں جمع کر دیں اور پہلا پرچہ آگرہ سے شائع ہوا اس کے بعد میں بھوپال واپس آگیا اور پہلا پرچہ (فروری ۲۲ء) مر
کر کے آگرہ بھیجدیا۔ اور مخمور و لطیف نے اسے آگرہ پریس میں چھپوا کر شایع کیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اول اول کن حضرات نے مو
عطیہ ادا کیا لیکن اس قدر ضرور جانتا ہوں کہ امید سے بہت کم سرمایہ فراہم ہوا تاہم چونکہ نگار اپنی پہلی ہی اشاعت کے
خود کفیل ہوگیا تھا، اس لئے سرمایہ کی فراہمی کا سوال زیادہ اہم نہ رہا اور دسمبر ۲۲ء تک نگار آگرہ ہی سے نکلتا رہا۔ چونک
بات زحمت طلب تھی کہ رسالہ کی ترتیب بھوپال میں ہو اور اشاعت آگرہ میں، اس لئے فروری ۲۳ء کے نگار سے نگار
اشاعت بھی بھوپال ہی سے شروع ہوگئی اور جنوری ۲۳ء کے نگار میں احباب نگار کا ایک گروپ یاران نجد کے عنوان سے آگر
اور بھوپال کے اس تعلق کی یاد میں شایع کر دیا گیا۔ اس کے افراد یہ تھے۔

امام اکبر آبادی۔ محمد امین۔ بیدل شاہجہانپوری۔ جعفری۔ حبیب احمد۔ خلیق۔ دلگیر۔ ضیائی۔ روف۔ نذیر
قریشی۔ لطیف۔ مانی جائسی۔ مخمور۔ مقدس۔ نیاز۔ محمد احمد۔ ان میں سے چھ احباب بیدل۔ جعفری۔ حبیب۔ خلی
دلگیر اور قریشی۔ ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو چکے ہیں۔ مخمور، ضیائی، امام، محمد احمد پاکستان میں ہیں اور مانی و امین
ہندوستان میں ہیں۔

جب نگار کا دفتر بھوپال منتقل ہوا تو اس کی ساری ذمہ داری میرے سر آگئی لیکن دسمبر ۲۵ء تک وہ بدستو
آگرہ ہی پریس میں چھپتا رہا۔ اس کے بعد جنوری ۲۶ء سے نگار وصل بلگرامی مرحوم کے مقبول المطابع لکھنؤ میں چھپنے لگا او
پھر ۲۷ء میں جب میں نے لکھنؤ پہونچکر نگار پریس قایم کیا تو جولائی ۲۷ء سے خود اپنے پریس میں طبع ہونے لگا۔

ہندوستانی جراید و رسایل کی تاریخ میں صرف نگار ہی کو یہ فخر حاصل ہے کہ اولین تاریخ اشاعت سے آج تک
(یعنی پورے ۳۴ سال میں) برابر پابندی کے ساتھ شایع ہو رہا ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ زمانہ ہمیشہ اس کے موافق رہا
ہے۔ پہلا جھٹکا تو نگار کو اس وقت پہونچا جب ۲۴ء میں الائنز بنک کا دیوالہ نکلا اور نگار کا تھوڑا بہت جو کچھ سرمایہ تھا وہ
ضایع ہوگیا۔ میں نے اس افتاد کا مقابلہ جس طرح کیا اس کا ذکر ضروری نہیں، نہ میں نے احباب کے سامنے دستِ سوال پھیلایا اور
نہ انھوں نے پیش قدمی کی۔ تاہم میں نے نگار کی وضع و رفتار میں فرق نہ آنے دیا۔ اس کے بعد دوسرا صدمہ نگار کو لکھنؤ میں اس
وقت پہونچا جب کلکتہ نیشنل بنک دیوالیہ ہوگیا۔ یہ حادثہ کس قدر سخت تھا اس کا اندازہ آپ اس بات سے کر سکتے ہیں کہ جس دن بنک
فیل ہوا ہے۔ نگار کے پاس اتنا بھی نہ تھا کہ وہ ڈاک کا خرچ برداشت کر سکتا۔ ہر چند اس حادثہ کا ذکر میں نے کسی سے نہیں کیا
لیکن جب مالک رام صاحب کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے از خود ایک گرانقدر رقم میرے پاس بمبئی سے بھجوادی اور یہ سخت گھڑیاں
بھی آسانی سے گزر گئیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جس وقت یہ سطور ان کی نگاہ سے گزریں گی تو انہیں تکلیف ہوگی۔ لیکن ان کو خوش رکھنے
کے لئے میں کیوں کفرانِ نعمت کا مرتکب ہوں۔

نگار کے لکھنوی دور کا ایک اور واقعہ جس نے مجھے کم از کم ایک سال تک مضطرب رکھا، ۳۲ء سے تعلق رکھتا ہے، جب ہندوستان کے مسلم اکابر علماء نے میرے اور نگار کے متعلق ایک متفقہ محاذ قایم کر کے نہ صرف یہ کہ مجھ پر کفر و الحاد کے فتوے صادر کئے، نہ صرف یہ کہ میرے خلاف توہین مذہب کے مقدمات چلانے کی زبردست عملی تحریک شروع کر دی، بلکہ مجھے شردھانند ثانی کہہ کر، میرے قتل پر بھی عوام کو اکسایا۔ لیکن چونکہ تعلیم یافتہ طبقہ میرے ساتھ تھا، اس لئے میری جان بھی محفوظ رہی اور نگار کی اشاعت پر بھی اس کا اثر نہیں پڑا۔

اس کے بعد مجھے یہاں زندگی کے دو بہت اندوہناک واقعے پیش آئے۔ پہلے ۶۱ء میں میری رفیقۂ حیات اور اس کے چند سال کے بعد میری لڑکی شوکت کی موت۔ اور میں ان کو بھی جھیل گیا۔

لیکن یہ خبر نہ تھی کہ زمانہ کے ترکش میں ایک آخری تیر اور بھی ہے۔ ایسا زہر آلود تیر کہ اس سے جانبر ہونا میرے لئے دشوار ہو جائے گا۔ اس کی توضیح ضروری نہیں، مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ میری زندگی کا یہ دردناک تجربہ ۶۱ء سے شروع ہوا اور اس نے رفتہ رفتہ میرے نظامِ عصبی دل و دماغ کو اس درجہ متاثر کیا کہ اشتہا مفقود ہو گئی اور غذا ترک، یہاں تک کہ میں صاحب فراش ہو گیا اور زندگی سے بالکل مایوس۔ پھر اگر میں تنہا ہوتا تو مجھے اپنی جان اتنی عزیز نہیں کہ میں اس ماحول میں جان دینے سے گریز کرتا، لیکن چونکہ میری رفیقۂ حیات اور اپنے دو چھوٹے بچوں کا مستقبل بھی میرے سامنے تھا اور مجھے یقین تھا کہ میرے بعد ان کو سخت تکالیف کا مقابلہ کرنا پڑے گا، اس لئے میرے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ ان کو لیکر پاکستان چلا آؤں، جہاں میرے اور میری بیوی کے تمام اعزہ پہلے ہی سے موجود تھے اور مجھے یقین تھا اور ہے کہ میرے بعد وہ کسی نہ کسی طرح اپنی زندگی یہاں بسر کر لے جائیں گے یا کم از کم یہ کہ انھیں کوئی ستائے گا نہیں۔

ہندوستان میں، میں نے جیسی کامیاب زندگی بسر کی اور وہاں کی حکومت نے میری جتنی قدر افزائی کی، اس کا تقاضا یہی تھا کہ میں وہیں جان دیتا، لیکن افسوس ہے کہ ان ناگزیر حالات نے مجھے ہجرت پر مجبور کر دیا اور حیرت ہے کہ یہاں آکر میری صحت و توانائی پھر عود کر آئی۔ اسی کے ساتھ سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ نگار کی اشاعت کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا۔ جولائی ۶۲ء کا نگار میں لکھنؤ سے شایع کر کے آیا تھا اور اگست ۶۲ء سے اس کی اشاعت یہاں ہونے لگی۔

میں احباب پاکستان کا شکر گزار ہوں جنھوں نے یہاں کی فضا کو سازگار بنا کر میری اور نگار کی عمر چند سال اور بڑھا دی۔

آخر میں مجھے جناب فرمان فتحپوری کا ذکر کرنا ہے۔ جنھوں نے ادارتِ نگار کی ذمہ داریاں اپنے سر لے کر میرا بڑا بوجھ ہلکا کر دیا۔ "شکریہ" کا لفظ میں نے اس لئے استعمال نہیں کیا کہ وہ میرے ہم وطن ہیں، میرے عزیز اور مخلص دوست ہیں اور وہ یہ سب کچھ مجھے اور "نگار" دونوں کو بالکل اپنا سمجھ کر کر رہے ہیں۔ اسی سلسلہ میں اپنے فرزندانِ عزیز عارف نیازی اور قمر نیازی کی صحت و سلامتی کے لئے بھی دعاگو ہوں جن کی محنت و کاوش کی بدولت نگار نہ صرف یہ کہ اپنے وقت پر شایع ہو رہا ہے بلکہ کافی ترقی کر رہا ہے۔

"**عورت** :- عورت ایک لذت ہے مجسم۔ ایک سحر ہے مرئی، ایک نور ہے مادی۔

محبت :- ایک قسم کی نکہت ہے جو روح کی شگفتگی سے پیدا ہوتی ہے۔

عریانی :- بری چیز نہیں بشرطیکہ وہ نیم عریانی سے آگے نہ بڑھے۔ بدن چرا کر چلے جانے میں سینہ تان کر سامنے آجانے سے شاید زیادہ لطف ہے۔"

(نیاز)

حضرت نیاز فتحپوری

جوش ملیح آبادی

یاد ش بخیر یہ ۱۹۲۱ء کی بات ہے کہ میری سب سے پہلی تصنیف "روحِ ادب" شائع ہوئی تھی اور میں اس زمانے میں آگرہ گیا ہوا تھا، جہاں لطیف الدین احمد صاحب کے دانش کدے پر حضرت نیازؔ سے مجھ کو پہلی ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا۔ اس وقت میں بھرپور جوانی کی طرف جا رہا تھا اور نیاز صاحب آغازِ پیری کی جانب مڑنے والے تھے۔

مجھے یاد ہے کہ نیاز صاحب نے اس ملاقات میں میری اس زمانے کی تازہ مطبوعہ نظم "جنگل کی شہزادی"[1] کی مجھے دل کھول کر داد دی تھی، اور "روحِ ادب" پر تنقید کا بھی وعدہ کیا تھا (جو کبھی ایفا نہ ہو سکا)۔

اس زمانے میں نیاز صاحب داڑھی رکھتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ان کے منہ پر داڑھی مجھ کو اچھی نہیں لگی تھی۔ اور یہ بھی یاد ہے کہ اس زمانے میں نیاز صاحب نے مجھے اپنے قریب آنے کا بھی موقع نہیں دیا تھا۔ نیاز صاحب مجھے اپنے قریب آنے کا موقع کیوں دیتے، اس وقت میرے پاس ذہانت کے سوا اور تھا ہی کیا۔

میری جھولی میں تو آج بھی، بقدرِ حوصلہ، علم و فکر کی پونجی نہیں ہے، اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس وقت تو مجھ پر علم و فکر کی چھاؤں تک نہیں پڑی ہوگی، نیاز کا سا آدمی مجھ کو منہ کیوں لگاتا۔

اس کے بعد نیاز صاحب سے حیدرآباد میں ملاقات کی مسرت حاصل ہوئی۔ اور میں نے ان کو، ان کے میزبان ہوش صاحب بلگرامی سمیت اپنے گھر مدعو کیا۔

ہزار افسوس کہ میری وہ مخلصانہ دعوت میرے ایک قرابت دار دوست کی بے پناہ بدمستی، اور شرمناک فحش کلامی کی بنا پر غارت ہو کر رہ گئی۔

وہ میری زندگی کی بڑی منحوس گھڑی تھی کہ اس دعوت میں میرے دوست کی شرافت سے گری ہوئی فحاشی کی بنا پر نیاز اور ہوشؔ دونوں کو میری جانب سے یہ بدگمانی پیدا ہو گئی کہ یہ سب کچھ میرے ایما سے ہوا ہے۔

اس بدگمانی کی شکایت نیازؔ صاحب سے نہیں کی جا سکتی۔ اس لئے کہ جس نامراد قوم کے ہم افراد ہیں وہ اس قدر اوچھی اور گھٹیا ہے کہ اس سے بھی کہیں بڑھ چڑھ کر کمینگی کا ارتکاب کر سکتی ہے۔ چنانچہ اس رات کے بعد ہمارے تعلقات کی دنیا میں سویرا ہو گیا۔ نیاز صاحب مجھ سے بگڑ گئے۔

نیاز صاحب پٹھان آدمی ہیں، میں بھی، خیر سے پٹھان ہوں، اور ظاہر ہے کہ مشتعل ہو جانے کے بعد پٹھان کے امکان سے یہ بات خارج ہو جاتی ہے کہ وہ علتِ اشتعال تک پہنچنے کی زحمت گوارا فرمائیے۔

نیاز صاحب کی بدگمانی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس تاریخ سے لے کر پورے ایک سال تک "نگار" کے ہر پرچے میں وہ مجھ پر تبرا کرتے رہے۔ اور

---

[1] یہ نظم مئی سنہ ۲۲ء کے نگار میں شائع ہوئی ہے۔ (ن ف)

اس کے بعد ہر چند ہر پرچے میں تو میرے خلاف لکھنا ترک کر دیا۔ لیکن جب بھی ان کو موقع ملا انہوں نے میرے خلاف لکھنے میں کبھی ایک بار بھی تساہلی سے کام نہیں لیا۔

ہر چند اس وقت میں جوان اور سریع الاشتعال جوان تھا، لیکن نیاز صاحب کے کسی ایک مضمون کا بھی میں نے جواب نہیں دیا، البتہ اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کی خاطر میں نے ان پر ایک بہت ہی سخت نظم کہی، لیکن اپنے دوست اعجاز الحق صاحب قدوسی کو سنانے کے بعد اس کو بھی شائع نہیں کیا۔ اور چاک کر کے پھینک دیا۔ مضامین کے علاوہ نیاز صاحب نے اس زمانے میں لوگوں کو میرے خلاف بڑے بڑے طویل خط بھی لکھے، جن میں ایک خط تو اس قیامت کا تھا کہ اگر حالات میری مساعدت نہ کرتے تو میں جس نگر میں دھونی رما کر بیٹھا تھا وہیں دفن بھی کر دیا جاتا۔

میں نہایت واضح طور سے یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ نیاز صاحب کے اس فرطِ غضب میں ان کی کوئی خطا نہیں تھی، کون معاف کر سکتا ہے ایک ایسے فرومایہ شخص کو جو اپنے دوستوں کو خود اپنے گھر بلا کر ذلیل کرتا ہے۔ نیاز صاحب نے مجھ کو ایک ایسا ہی شخص تسلیم کر لیا تھا، اور اس لئے انہوں نے میرے باب میں جو کچھ بھی لکھا وہ انسانی فطرت کے عین مطابق تھا۔

اب یہ بھی سمجھ لیجئے کہ میں نے کیوں جواب نہیں دیا تھا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھ کو اس بات کا سو فی صد یقین تھا کہ اگر میرے کلام میں جان ہے، تو دنیا کی کوئی قوت اس کو دبا نہیں سکتی اور اگر جان ہی نہیں ہے تو ایسے بے جان کلام کی حفاظت کرنا سراسر تضیع اوقات ہے، اور اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اس اُبلتی جوانی اور اس اُبلتی جوانی کے گرجتے برستے اشغال میں کس کی یہ مجال تھی کہ گھنیری زلفوں کی چھاؤں سے نکل کر جواب نویسی کی دھوپ میں آکر بیٹھ جاتا۔

اس لئے میرے جواب نہ دینے کو، براہِ کرم، میری شرافت پر محمول نہ فرمایا جائے۔ کہ ع

بنیاد تھی اس کی، ناتوانی میری

بہر حال وہ طوفانی دور باقی نہیں رہا ہے، اب ہم دونوں ضارب و مضروب بوڑھے ہو چکے ہیں۔ سریع الاشتعال جوانیاں ہم سے ہمیشہ کے واسطے رخصت ہو چکی ہیں۔ ہمارے سروں کے بال گر چکے ہیں، لیکن کھوپڑیوں میں پختہ عقل کا اکھوا پھوٹ آیا ہے۔

اس منزلِ عمر میں ہمارے واسطے یہ نازیبا، اور شرمناک حد تک نازیبا ہے کہ ہم اپنی پرانی یادوں اور طفلانہ جذبات کی بنا پر امرِ حق پر پردہ ڈالنے کا ارتکاب کریں۔ اس لئے کامل ذہنی دیانت کے ساتھ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حضرت نیاز ان چند انے گنے استثنائی افراد میں سے ہیں جن کے پیدا کرنے کے معاملے میں، یہ دون پرور آسمان ازل سے لے کر اب تک بخل کرتا چلا آ رہا ہے۔

جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ ان کی ایک ذات کے احاطے میں اتنے خلاقی کے شہر آباد ہیں، اتنے شعور کے لشکر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں اور رامش و رنگ کی اتنی بے شمار براتیں اتری ہوئی ہیں تو بے ساختہ جی چاہتا ہے کہ ان کو کلیجے سے لگاؤں۔

کاش نیاز فتحپوری کا سا خالقِ طرز انشاپرداز کسی زندہ قوم میں پیدا ہوتا۔ لیکن کیا کیا جائے۔

ہائے وہ عقل، جو نرغے میں ہو دیوانوں کے

”کیمیاوی اور میکانکی ناپ تول اپنی جگہ بالکل درست لیکن شعر سے اس کا کیا تعلق ہے اس کا مقیاس تو صرف وجدان ہے۔

پھول، خوشبو، رنگ، موسیقی اور شاعری سب ایک ہی قبیل کی چیزیں ہیں جن سے ریاضی والی ذہنیت بہت کم لطف اٹھا سکتی ہے مگر پھول کے رنگ و بو سے لطف اٹھانے والے پنکھڑیوں کی ناہمواری کو نہیں دیکھتے اور موسیقی پر وجد کرنے والے ساز کے حسن و قبح سے بے نیاز ہوتے ہیں۔“ (نیاز)

آشفتہ بیانی میری

فراق گورکھپوری

محبی فرمان،

اب سے ہفتہ بھر پہلے شاید آپ کو میرا کارڈ مل گیا ہو حسب وعدہ نثر کے یہ چند سطور اور چند اشعار "نگار پاکستان" کے "نیاز نمبر" کے سل حاضر کر رہا ہوں۔ مجھے حضرت نیاز کی عظمت کے متعلق براہ راست جو کچھ کہنا تھا وہ نثر میں عرض کر دیا۔ یوں تو اس سے بہت زیادہ کہہ سکتا تھا لیکن صحت کی معذوریاں مانع ہوئیں۔ نظم کے جو اشعار ہیں وہ صرف، اس امید سے بھیج رہا ہوں اور وہ بھی ڈرتے ڈرتے کہ شاید انہیں پڑھ کر پاکستان می نووارد حضرت نیاز کا دل ذرا شگفتہ ہو۔ یہ اشعار بستر علالت پر پڑے پڑے بے ترتیبی سے ذہن میں آتے گئے اور میں اسی بے ترتیبی سے انہیں لکھتا گی ان میں کوئی منطقی تسلسل نہیں ہے جو بات انہیں پوری اکائی بنا رہی ہے وہ صرف یہ ہے کہ تمام اشعار ایک زمین میں ہیں اور شاید ہر شعر میں میرے مختلف اسالیب میں سے میرا ایک خاص اسلوب اور لب ولہجہ جھلک رہا ہو۔ ان کی داد حضرت نیاز سے نہ ملے گی تو کس سے ملے گی اور اگر ان میں سے کچ اشعار حضرت نیاز کو خوش نہ کر سکیں گے تو پھر کسے خوش کر سکیں گے۔ حضرت نیاز سے میرا بہت بہت سلام کہیے گا۔

چند اشعار ہونے کے بعد جو شعر بھی ہوتا تھا وہ گویا حضرت نیاز کی حضوری میں ہوتا تھا اس سے زیادہ اور کیا کہوں۔

آپ کا

فراق

مجھے اس بات کا دکھ ہے کہ میرے مخلص و مکرم و محترم حضرت نیاز فتحپوری لکھنؤ سے چلے گئے اور مجھے اتنی بھی توفیق نہیں ہوئ کہ انہیں الوداع کہتا اور دائمی جدائی سے پہلے انہیں ایک بار دیکھ لیتا۔ یوں تو جب وہ یہاں تھے بہت طویل وقفوں کے بعد کبھی کبھ ان کے یہاں جا کر ان کے درشن کر لیتا تھا لیکن یہ تو اطمینان تھا کہ وہ قریب ہی ہیں۔ مجھے اپنا ہی شعر یاد آگیا:۔ یہ سوچ کر کہ اب حضرت نیاز ہم سے دور اور بہت دور ہو گئے:۔

اب یادِ رفتگاں کی بھی ہمت نہیں رہی
یاروں نے کتنی دور بسائی ہیں بستیاں

خیر یہ قربت و دوری تو ایک مسلسل اور پیچیدہ اور ناقابل حل مسئلہ حیات ہے۔ آپ کے متعدد خطوط "نگار پاکستان" کے نیاز نمبر کے سلسلہ میں ملتے رہے اور میں یہ سوچکر دل ہی دل میں کڑھ کڑھ کے رہ جاتا تھا کہ طویل اور شدید علالت کے عالم میں اتنی تاب کہاں سے لاؤں کہ اپنے محترم اور بزرگ اور سراپا خلوص و شرافت دوست حضرت نیاز فتحپوری کے متعلق اپنے خیالات کو قلمبند کروں

بول کر بھی کچھ لکھوانے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ ایک بہت بڑے مکان میں بے آل و اولاد اور بے رفیقۂ حیات چارپائی تھامے پڑا ہوں۔ یار و مددگار بھی کبھی کبھار میری تنہائی کا ہاتھ بٹا جاتے ہیں۔

حضرت نیاز کی زندگی اور ان کے کارنامے ناقابل فراموش چیزیں ہیں۔ کس آنکھ کی مجال ہے جو انھیں نظر انداز کر سکے۔ وہ ہمارے ادب و تہذیب کے قطب مینار ہیں۔ میں قریب قریب ستر برس کی عمر میں یہ کہتے ہوئے فخر محسوس کرتا ہوں کہ میں نے ان کی تحریروں سے اردو سیکھی ہے اور ان کا رسالہ "نگار" چالیس برسوں سے میرے لئے ایک فیض گاہ درس گاہ رہا ہے۔ میرا ناچیز ادب حضرت نیاز کے ادب سے بہت مختلف ہے لیکن اس کے تخلیق و تعمیر میں حضرت نیاز کی تحریریں بہت ممد و معاون و موثر قوت کا کام کرتی رہی ہیں۔ میں تو یہ کہوں کہ جو ادیب معتقد نیاز نہیں وہ آپ بے بہرہ ہے یعنی

آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں

ایک بہت بڑی بات جو ان کے اعلیٰ ترین ادبی خدمات کے علاوہ حضرت نیاز میں مجھے نظر آئی وہ ان کی روشن خیالی بے تعصبی ہے۔ اُن کے حریف جو بھی کہیں لیکن میں ببانگ دہل کہوں گا کہ حضرت نیاز مسلمان ہیں لیکن کیسے مسلمان ہیں؟ ایک ایسے مسلمان جس کے اسلام پر ہندو دھرم بھی ناز کرے۔ خود میں بھی یہ محسوس کرتا رہا ہوں کہ میرے ہندو دھرم کے سر پر دنیا کے تمام پیغمبروں اور خصوصاً پیغمبر اسلام کے دست شفقت کا سایہ ہے۔ میں نے حضرت نیاز کو ایک ایسا مسلمان پایا جو انسان دوستی کا جیتا جاگتا مجسمہ ہے۔ حضرت نیاز کی شخصیت و کردار میں عقلیت غالب عنصر ہے۔ میرے مزاج میں عقلیت مابعد الطبیعات و تصوف یا ویدانت کا امتزاج رہا ہے۔ اگرچہ محض حال و قال کا غلبہ مجھ پر کبھی نہیں رہا لیکن حضرت نیاز کی روشن خیال عقلیت پر میں تمام ان وجدان زدہ ہندو مسلمانوں کی طبعی فرقہ پرستی کو ترجیح دیتا ہوں جو حال و قال کا بھی ثبوت دیتے ہیں اور اپنے سے دوسرے فرقہ والوں سے غیریت کا بھی ثبوت دیتے ہیں۔ حضرت نیاز کی "من و یزداں" نے ایک شریفانہ و تہذیب یافتہ اور ہمہ گیر اسلام کو پیش کیا ہے جس سے کسی غیر مسلم کو بھی اختلاف کرنا ذرا آسان نہیں ہے۔ یہی مولانا روم کا اسلام تھا، یہی صوفیوں کے تمام سلسلوں کا اسلام رہا ہے اور یہی فارسی کی بلند ترین شاعری کا پیغام ہے۔

حضرت نیاز پر ایک نہایت قابل قدر مفکر، مقالہ نگار، صحیفہ نگار، فسانہ نگار، نقد و تبصرہ نگار اور ایک بلند پایہ اسٹائلسٹ (STYLIST) کی حیثیت سے اگر اختصار سے بھی لکھا جائے تو وہ ایک دفتر ہو جائے گا۔ بیماری میں اتنی سکت کہاں سے لاؤں؟

تین چار ماہ کی علالت میں دس پانچ دن ایسے بھی گزرے کہ چند غزلیں ہو گئیں جن کے متعلق لوگوں کا یہ خیال ہے کہ میرا مخصوص مذاق و وجدان اپنی آخری حد میں ان غزلوں میں چھوتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ علالت نے میری طبیعت کی فطری گھلاوٹ میں بڑا اضافہ کر دیا ہے اور میری شاعری ان غزلوں میں اپنی انتہائی منزلوں کی جھلک دکھا رہی ہے لیکن "نیاز نمبر" کے لئے یہ غزلیں کیا دیں گی۔ البتہ ایک ایسی غزل اس علالت میں ہونے لگی جو ایک قصیدہ کی تشبیب کی صورت پکڑتی گئی اور جس کے متعدد اشعار پر غالباً عرفی اور مرزا بیدل کی پرچھائیاں یا ان کی آوازوں کی پرچھائیاں پڑ رہی ہیں۔ ہند و پاک میں حضرت نیاز ان انے گنے لوگوں میں ہیں جو عرفی اور مرزا بیدل کے کلام کے خاص نکتہ نگار اور قدر شناس ہیں۔ شاید اس لئے اس خط کے ساتھ اشعار کی شکل میں جو آپ نے افکار پریشاں بھیج رہا ہوں نہایت موزوں و مناسب ہوں گے کیونکہ حضرت نیاز ان اشعار کو اپنے لئے ایک پسندیدہ نذر و تحفہ سمجھیں گے اور یہ محسوس کریں گے کہ اُن کے بلند مذاق شعری کی داد ان اشعار میں دی گئی ہے۔ یہی سوچ کر جب یہ کئی اشعار موزوں ہو چکے تو اخیر میں میں نے یہ شعر مُہر کی طرح ثبت کر دیا۔

؎ مری یہ نذر عقیدت سر قدوم نیاز
صبا کے دوش پہ پہونچے بصورت اشعار

جو اشعار بھیج رہا ہوں وہ اس موقعہ کے لئے غالباً اس لحاظ سے انہایت موزوں سمجھے جائیں کہ اگر میرے اشعار حضرت نیا کے متعلق ہوتے تو پسندیدہ ہوتے لیکن چونکہ حضرت نیاز کے رچے ہوئے ادبی مذاق کے عین مطابق یہ اشعار ہیں اس لئے صحیح معنو انہیں پھولوں کا ایک تحفہ یا نذرِ عقیدت سمجھا جاسکتا ہے اور بجائے پسندیدہ ہونے کے انھیں پسندیدہ تر خیال کیا جاسکتا ہے۔ یہ نا خدمت شاید اس لئے کسی قابل سمجھی جائے کہ ان اشعار کو پڑھ کر حضرت نیاز وجد کریں گے۔ کسی قابل قدر ہستی کو عین اس کے ذ مذاق کے مطابق اشعار سنا کر وجد میں لانا کیا ثبوت خلوص نہیں ہے ؟ کہنے کو تو ہو گیا کہ اس یادگار موقع پر فراق نے ایک ایسا تحفہ حضرت نیاز کی خدمت میں پیش کیا جو حضرت نیاز کو پسند آیا۔

اخیر میں اتنا ہی عرض کروں گا کہ مجھ جیسے ہندوستان میں حضرت نیاز کے ہزارہا نام لیوا دل سے یہی چاہیں گے کہ پاک میں ان کا قیام واقعی انہیں راس آئے اور ان کی مردانہ وار و شاندار زندگی کے آخری دن ایسوں میں کٹیں جو اپنے پیار اور محب سے، خدمت و احترام سے حضرت نیاز کو خوش رکھیں۔ یوں تو نیاز کی زندگی بڑی بے نیاز زندگی ہے۔

کہیں یہ قافلۂ صبح کے نہ ہوں آثار   سرِ افق شبِ غم اڑ رہی ہے بن کے غبار
مری صدا ہے گھنا سایہ وقتِ نصف نہار   بوقتِ شب مری آواز روشنی کا منار
دیارِ دل کے یہی ہیں علامت و آثار   تمام دشتِ جنوں ہے، تمام شہرِ نگار
نشانِ منزلِ عبرت ہر ایک راہگذار   ہر ایک نقشِ قدم لاکھوں حسرتوں کا مزار
خیالِ زلفِ سیہ سے گھٹا میں چھانے لگیں   دھواں سا اٹھنے لگا دیکھنا سرِ کہسار
کسی کی چشمِ سیہ کے پیام لائے ہیں   یہ میگھدوت جو منڈلا رہے ہیں سلسلہ وار
یہ جوگنیں سی کمنڈل لئے جو آئی ہیں   ان انکھڑیوں کا پتہ کام روپ یا تاتار
یہ امتزاجِ صفتہائے قربت و دوری   بدن تمام گریز و تمام بوس و کنار
جو انگلیاں کبھی رکھدی ہیں نبضِ دوراں پر   پتہ چلا کہ فضاؤں کو آگیا ہے بخار
ارے یہ اہلِ سیاست ہیں۔ ہم جو کہتے ہیں   وہی کریں گے یہ بعد از خرابی بسیار
ہے ایسوں ہی سے خدا واسطے کا بیر مجھے   عوام کے جنھیں دکھ سکھ سے کچھ نہیں سرکار
ہم اور کچھ نہیں کہتے مگر یہ کہتے ہیں   کہ آدمی کے نہ بس میں ہو آدمی زنہار
حریفِ ابلقِ گردوں کی باگ موڑ چکے   یہاں ہنوز وہی ذکرِ چرخِ کج رفتار
کچھ اور چاہیئے خدماتِ خارجی کے سوا   کہ زندگی کو ہے اے دوست زندگی درکار
یہ پالنا ہے تو کہتے ہیں مارکس کو   سنا تو ہے کہ کوئی ہے جگت کا پالن ہار
یہ رات اور یہ گرداب اور یہ طوفاں   درست لنگر کشتی و ناخدا بیدار
رہے گا معرکۂ زیست تا بکے جاری   کہ ٹوٹتی ہی نہیں ہے یہ خیر و شر کی قطار
عجیب ملزمِ روزِ حساب ہوں یارب   ثواب سے بھی ہوں منکر گنہ سے بھی انکار
یہ انتشارِ جہاں ہے جہانِ نو کا نقیب   غبارِ راہ گذر میں نہاں ہے کوئی سوار
وہاں بہ گردشِ وجدانِ ذکر جاری ہے   جہاں ہیں حلقۂ موہوم سبحۂ و زنار

یہ سحر کاریٔ فن ہے کہ ہے کرشمۂ چشم
مرے سخن کی دمک ہے کہ تابش رخسار
بہ یک نگاہ مٹا دے بنا بھی دے مجھ کو
چہ خوش بود کہ بر آید بہ یک کرشمہ دوکار
جو صاف گردش دوراں کی زد سے باہر تھے
تری نگاہ اڑا لے گئی وہ لیل و نہار
مری نوا میں ازل کا ترنّم سحری
مری صدا میں ابد کے سکوت کی جھنکار
ورائے کیف و اثر تھا فشردۂ انگور
عجیب حال مرا ہے کہ نشہ ہے نہ خمار
کل آئی رات گئے تیری یاد یوں مجھ کو
گماں ہوا کہ کہیں دور بج رہا ہے ستار
یہ کس کے غم میں فضا میں تھیں جامد و ساکت
یہ کس کی یاد سے چلنے لگی ہے بادِ بہار
مرے ہی دل کی ہیں کچھ دھڑکنیں زمان و مکاں
مرے ہی غم کے شرارے ثوابت و سیار
اثر سے فکرِ غزل کے گھٹا سی چھانے لگی
شعور پر لگا منڈلانے ابر گوہر بار
بس ایک ساز شکستہ ہوں خاک آلودہ
بڑھا دیا مرے نغموں نے زندگی کا وقار
بہت زمانہ ہوا قیس کو مگر اب بھی
نواحِ نجد میں اڑتا ہے ناتواں سا غبار
مجھے سکوتِ فضا میں گماں ہوا اکثر
کہ جیسے دوست کرے دوست سے کوئی اقرار
جلا رہا ہوں میں بچ بچ کے یہ چراغِ سخن
کہ پھونک دے نہ مجھے میری گرمیٔ افکار
یہ زخمِ دل کی نمائش یہ طرز خود رحمی
کچھ اس سے بڑھ کے ہے سنجیدگیٔ غم درکار
ان انگلیوں نے جو اک ساز چھیڑ رکھا ہے
یہ مہر و ماہ یہ تارے اسی کی ہیں جھنکار
لبوں سے وقتِ شہادت کرن سی پھوٹتی ہے
حیاتِ نو کی بشارت ہے نغمۂ سرِ دار
کرے شرافت و اخلاق جس کی خود تعظیم
وہ میں ہوں روسیہ و بد سرشت و بد کردار
جمالِ یار خود آگاہ ہو گیا بارے
بڑا یہ کام کیا تو نے اے دلِ خوش کار
معانقہ بھی بس اک پہلوئے تلاشِ جمال
مشاہدہ بھی بس اک دیدِ انتظار آثار
ہنوز ہوش نما غفلتوں کے جھونکے ہیں
یہ زندگی بھی ہوئی کیسی نیند سے بیزار
وہاں سے بول رہا ہوں جہاں کہ میں بھی نہیں
تمام عالمِ ہو از کنار تا بہ کنار
ہوا زمانے کی جس کو نہ چھین لینے دے
ہم اس کو زندگی سمجھیں کہ کوئی مشت غبار

فراقؔ ہوش میں ہے اب تو ایک مدت سے
اتر سکا نہ مگر تیری دوستی کا خمار
یہ میری نذرِ عقیدت بسر قدومِ نیاز
صبا کے دوش پہ پہونچے بصورتِ اشعار

نیاز اور دلگیر

مولانا ارشد تھانوی

اب سے پچاس برس یا اس سے بھی دو تین سال پہلے کی بات ہے۔ جب آگرہ سے ایک ادبی ماہنامہ "نقاد" کے نام سے نکلتا تھا۔ اس کے مالک و مدیر نظام الدین شاہ دلگیر اکبرآبادی تھے، جو بہت ستھرا ادبی ذوق رکھتے تھے اور نظم و نثر کے دل کش ادب پارے اس میں شائع کیا کرتے تھے۔ اس میں ایک مختصر نظم "کوئل" کے عنوان سے نکلی تھی اس کے اشعار اس طرح کے تھے۔

.... جوگن کس کی ہے .... برہگن کس کی ہے

اس کے دوسرے ٹکڑے کا ڈیڑھ شعر اب تک حافظ میں ہے ؎

.... نغمۂ تر کس طرح میرے شیون کے الٰہی لگ گئے پر کس طرح

اسی ایک مصرعۂ سالم سے پوری نظم کی خوبی کا اندازہ ہو سکتا ہے یعنی یہ کو۔ کو۔ کرنے والی —— خود کوئی چڑیا نہ تھی بلکہ ایک درد بھرے دل کا شیون تھا، جس کے پر لگ گئے تھے۔ میں اس ندرتِ تشبیہ سے بہت متاثر ہوا۔ اور جب بھی کوئل کی کو، سنی، یہ مصرعہ ذہن میں تازہ ہو گیا۔ یہ نظم جناب نیاز فتحپوری کی تھی۔ جس نے مجھے ان کا غائبانہ گرویدہ بنا دیا۔ ان کے نثری مضامین بھی نقاد میں شائع ہوتے تھے۔ جو انشائے لطیف کا بہترین معیار پیش کرتے تھے، ان کی ایک اور نظم کے دو مختلف مصرعوں نے ایک بار بڑی دلچسپ صورت پیدا کر دی، میں اس زمانہ میں پولیس کے چالانی مقدمات کی پیروی پر مامور تھا۔ سی، پی پولیس کے ایک بڑے عہدہ دار ریاست بھوپال کے افسر اعلیٰ نظام پولیس مقرر ہو کر آ گئے۔ ملازمانہ ذمہ داریوں کی وجہ سے مجھے ان کی خدمت میں اکثر حاضر ہونا پڑتا تھا۔ سی۔ پی کی دفتری زبان ہندی تھی۔ مگر افسر اعلیٰ صاحب کو اردو سے محبت تھی، میں نے اپنا مختصر مجموعۂ نظم "حسنِ تخیل" اور چند رسائل جن میں میرے مضامین تھے ان کے ذوق کے پیشِ نظر کر دیا تھا۔ اسی تھوڑی سی ذوقی ہم آہنگی کے باوجود افسری ماتحتی کے میرے ان کے مابین دوستی سی ہو گئی تھی۔ ایک روز جو ان کے بنگلہ پر گیا تو موصوف خانۂ باغ میں چہل قدمی کر رہے تھے میں بھی اس تفریح میں شریک ہو گیا۔ ایک گلاب کے چھوٹے سے پھول کی طرف افسر اعلیٰ صاحب نے انگلی اٹھائی اور بولے اس کی رنگت تو دیکھئے، میں نے کہا جی ہاں۔ ؎

کس قدر دوشیزگی ہے اس کے ہلکے رنگ میں

مصرعہ سن کر پھڑک اٹھے اور بار بار یہ لفظ "دوشیزگی" کو دہراتے رہے، پھر آگے بڑھے، ایک اونچی شاخ پر بہت گہرے رنگ کا بڑا سا گلاب کھلا ہوا تھا۔ ٹہنی کو جھکا کر پھول کو میرے منہ کے آگے کر دیا۔ اور فرمایا یہ پودا کئی بار بکرے کے خون سے

سینچ گیا ہے۔ کہئے کیسا ہے۔ میں نے عرض کیا۔

رہ گیا ہے جم کے گویا موجۂ فصلِ بہار

کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ اور پوچھا یہ دونوں مصرعے آپ نے ہی فی البدیہہ کہے ہیں۔ میں نے جواب دیا۔ جی نہیں نقاد میں نیاز فتحپوری کی ایک تازہ نظم پڑھ کر آیا ہوں، دونوں مصرعے ان ہی کے ہیں۔ فرمایا، مجھے بھی وہ نظم دکھانا یا نقاد کا وہ پرچہ جس میں یہ نظم تھی .... چند روز بعد میں نے انھیں ایک اور کتاب دکھائی۔ رابندر ناتھ ٹیگور کی منظوم کتاب "گیتا نجلی" پر ادب کا نوبل پرائز ملا تھا۔ اس کا نثر میں نیاز صاحب نے اردو ترجمہ اس خوبی سے کیا تھا کہ نظم منثور کا شاہکار معلوم ہوتی تھی۔ افسر اعلیٰ صاحب نے کتاب کو کئی دن زیر مطالعہ رکھ کر مجھ سے کہا، کہ نیاز کی نثر کو نظم کر دیا جائے۔ میں نے کہا کسی اچھی نظم کا اسی زبان میں نثر کرنا، تمام شعر کی خوبیوں کو تباہ کر دیتا ہے، نیاز نے غالباً بنگالی کے انگریزی ترجمہ سے اردو ترجمہ کیا ہے اور ایسا خوبصورتی سے کہ تمام شعری لطافتیں اس نثر میں موجود ہیں۔ صفحات پر الفاظ نہیں موتی بکھرے پڑے ہیں بولے ان موتیوں کو پرو کر لڑیاں بنا دو۔ میں نے عذر کیا کہ ایسا کرنا میرے لئے بہت مشکل ہے، اور اگر نیاز... کے الفاظ کو الٹ پلٹ کر وزن و قافیہ میں جکڑا بھی گیا۔ تو ادبی سرقہ کے علاوہ سعی نا مشکور ہوگی مگر ان کا اصرار جاری رہا، ملازماتی مصلحت سے مجبور ہو گیا اور ایک رات کے کئی گھنٹے صرف کر کے دو تین نثر پاروں کو چھوٹی چھوٹی نظموں میں منتقل کر دیا جب افسر اعلیٰ صاحب کو وہ مسودہ دکھایا۔ تو کہنے لگے۔ میں قلمی تحریروں کو پڑھ کر خوش نہیں ہوتا۔ کسی رسالہ میں چھپوا کر دیجئے افسروں کو خوش رکھنا کسی ضمیر دست انسان کو بڑا مشکل ہوتا ہے، میں انھیں امکانی حد تک ذہنی رشوت دے چکا تھا مزید تشہیر مجھے گوارا نہ تھی، مگر مرحلہ ترقی کا درپیش تھا۔ تھوڑے سے تذبذب کے بعد آمادہ ہو گیا۔ اتفاق سے ایک فوری ضرورت پیش آگئی۔ اور مجھے دہلی جانا پڑا، ایک روز فرصت پا کر میر ناصر علی کی خدمت میں حاضر ہوا، یہ صحیح معنوں میں اگلے وقتوں کے بزرگ تھے، یہ خان بہادر بھی تھے، مگر عام رواج کے مطابق نام سے پہلے خطاب کا استعمال نہ کرتے تھے بلکہ آخر میں لگاتے تھے۔ ان کی حویلی پر میر ناصر علی خان بہادر لکھا ہوا تھا۔ ادبی ذوق بہت پختہ تھا۔ ایک خاص طرز نگارش کے مالک تھے، اور زبانی و بیان کی خوبیوں کے دلدادہ، ان کی نثر سہل ممتنع کی تعریف میں آتی تھی باوجود ضعیف العمری کے بڑے سائز کا ایک ماہنامہ "صلائے عام" کے نام سے نکالتے تھے زیادہ تر خود ہی لکھتے تھے، دوسرے اہل قلم کو مشکل ہی سے خاطر میں لاتے تھے، لیکن چاہتے یہ تھے کہ کسی نہ کسی طرح معیاری لکھنے والوں کو ڈھونڈ نکالیں وہ اپنے رنگ میں منفرد تھے اور آرزو کرتے تھے کہ میری روش کا نہیں تو اپنی طرز کا کوئی اہل قلم ان کے رسالے کے صفحات پر گل افشانی کرے۔ باتوں باتوں فرمانے لگے، غالبؔ نے کہا تھا

کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق ہے، مکرر لب ساقی پر صلا میرے بعد

میں اپنی زندگی میں مسلسل صلائے عام دے رہا ہوں کہ مئے مرد افگن ادب کا کوئی حریف مجھے ملے، مجھے داد دینے والے تو کافی میسر آگئے، مگر مجھ سے داد لینے والا کوئی نہیں ہے میں، از راہ مروت کس کس کی حوصلہ افزائی کر دیتا ہوں ورنہ میرا رسالہ تو آئینہ در شہر کوراں ہے میں نے از راہ کسر نفسی کہا مجھ جیسے نومشق کی دو ایک نظمیں جو صلائے عام میں شائع ہوئیں، وہ اسی حوصلہ افزائی کی ذیل میں آتیں کہنے لگے نہیں، صرف اس لئے کہ رسالے کے بعض خریدار نثر کے ساتھ نظم بھی منہ کا مزا بدلنے کے لئے چاہتے تھے میں نے کہا میں ایک اچھے نظم کہنے والوں کا پتہ بتاؤں۔ بولے ضرور۔ میں نے نیاز فتحپوری کا نام لیا، کہنے لگے، میں اس انداز کے نگارش کو بہت پسند کرتا ہوں۔ اس نوجوان کی نثر بھی بڑی دلکش ہوتی ہے، اگر یہ شخص لکھتا

رہا اور دنیا کے دوسرے جھمیلوں میں نہ پڑ گیا تو اپنے طرز کا منفرد انشاپرداز ہوگا۔ آپ سے ان کی ملاقات تو ہوئی ہوگی، ان سے کہہ دینا ... میں نے قطع کلام کیا کہ وہ فتحپوری ہوں گے، میں بھوپال میں رہتا ہوں، شوق ملاقات تو ہے، دیکھئے کب اتفاق ہو ہے۔ اس کے بعد کچھ اور باتیں کر کے میں یہ سوچتا ہوا چلا آیا کہ یہ اس دور کے میر امن بھی نیاز کے نئے رنگ کے شیفتہ ہیں۔ میرا ارا تھا کہ نیاز کی اردو گیتانجلی والی اپنی نظمیں صلائے عام کے لئے دیدوں، مگر اس گفتگو کے بعد ہمت نہ پڑی اور بعض دوسرے رسائل میں ان کو چھپوا دیا۔ مگر اپنے نام کو پوشیدہ رکھنے کے لئے صرف "ا۔ ت" لکھ دیا۔ افسر اعلیٰ صاحب نے اپنی فرمائش کی تعمیل پر اظہار خوشنودی کے ساتھ مکمل کتاب کو منظوم کرنے پر زور دیا۔ اور کہا یہ میرے صرفہ سے چھپے گی۔ اور بہت خوبصورت انگریزی کتابوں کی طرح۔ غالباً ان کی خواہش یہ تھی کہ کتاب ان کی اسم گرامی سے معنون کی جائے۔ ان کی یہ خواہش تو ویسے بھی پوری ہوتی۔ مگر قضا و قدر نے مجھے اس ذمہ داری سے ان کو وفات دے کر سبکدوش کر دیا۔ جہاں تک میرا خیال ہے ـــــ نیاز صاحب کو میرے اس سرقہ ادبی کی خبر نہیں ہے۔ سنہ تو یاد نہیں غالباً اس کے سال دو سال بعد نیاز صاحب بھوپال آگئے اور نئے افسر اعلیٰ صاحب کے دفتر میں ہیڈ کلرک ہو گئے۔ کاش وہ اس سے کچھ عرصہ پہلے بھوپال آتے اور اس خدمت پر ان کا تقرر ہوتا تو مرحوم افسر اعلیٰ صاحب اس نعمت غیر مترقبہ کی بڑی قدر کرتے اب بریلی کے رہنے والے ایک نمک چڑھے یو پی پولیس کے پنشنر عہدہ دا افسر اعلیٰ پولیس تھے، مگر نیاز صاحب بڑے لئے دیئے ... خوددار آدمی ہیں، یہ افسر اعلیٰ بھی ان کی شخصیت کا پورا لحاظ رکھتے تھے، ایک روز میں ان کے دفتر میں گیا۔ نیاز صاحب اپنی کرسی پر نہ تھے۔ میز پر ایک کاغذ پر یہ مصرعہ لکھا ہوا رکھا تھا۔ ؎

تو اگر آنکھوں سے اپنی بادہ پیمائی کرے

غالباً دوسرا مصرعہ لکھنے والے تھے کہ افسر اعلیٰ صاحب نے بلا لیا۔ میں نے قلم اٹھا کر دوسرا مصرعہ لکھ کر شعر پورا کر دیا

تو اگر آنکھوں سے اپنی بادہ پیمائی کرے ؎ پھر نہ اس دفتر میں ہرگز جلوہ فرمائی کرے

مصرعہ ثانی دوسرے مصرعے سے مناسبت رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو، مگر یہ ایک قسم کا مستقبل نیاز کے لئے اشارہ تھا میں شہر سے تبدیل ہو کر باہر چلا گیا تھا۔ میرے بعد نیاز صاحب اس ناموزوں جگہ سے ریاست کے محکمہ تاریخ میں منتقل ہو گئے جو براہ راست ہز ہائینس بیگم صاحبہ فرمانروائے بھوپال کی نگرانی میں تھا۔ بھوپال کی تاریخ حاضرہ کی تدوین کے علاوہ یہاں تصنیف و تالیف کا کام بھی ہوتا تھا۔ بیگم صاحبہ بہت اچھا علمی ذوق رکھتی تھیں، خود بھی کئی کتابیں لکھ چکی تھیں، اور دوسرے اصحاب علم یہ کام لیتی تھیں نیاز صاحب نے یہاں "گہوارہ تمدن" کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی، جس میں بتایا گیا تھا کہ عہد قدیم سے اب تک دنیا میں عورتوں نے تمدنی زندگی میں کتنا وافر حصہ لیا ہے۔ اس کے بعد ہی انھوں نے ایک امتیازی ماہنامہ نگار کے نام سے نکالنا شروع کیا جو رفتہ رفتہ ترقی کے مدارج طے کرتا ہوا اس معیار پر پہونچ گیا کہ نیاز صاحب کو بھوپال کی ملاز سے مستغنی کر دیا۔ اور مستقل طور سے لکھنؤ آگئے ـــــ ابتداء میں ایک ممتاز پٹھان خاندان کے نوجوان کی حیثیت سے یو پی پولیس میں ... نیاز محمد خاں، سب انسپکٹر بھی رہے۔ لیکن ذہنی ارتقا پولیس کے فرائض سے ہم آہنگ نہ تھی۔ انھیں صرف "نیاز فتحپوری" بننا تھا اور اسی حیثیت سے دنیائے ادب کے فرد منفرد بن کر رہے۔ دہلی کے کئی اور روزناموں کی ادارت بھی کی، لیکن ـــ

آئین جواں مردی بیباکی و حق گوئی

انگریزی دور کی صحافت میں اس کی گنجائش کہاں تھی۔ آخر بھوپال آئے یہاں پہونچکر ارباب ذوق کے مجمع میں گھر گئے۔ نظموں کے علاوہ طرحی غزلیں بھی کہیں مشاعروں میں بھی شرکت کی۔ پھر چند احباب کے ساتھ اساتذہ قدیم کے کلام کا انتخاب

شروع گیا۔ روزانہ رات کو سب مل کر بیٹھتے۔ قیصر بھوپالی اڈیٹر ماہنامہ الحجاب محوی صدیقی مولوی عبدالحلیم ذکاؔ اور ایک دو آدمی اور، خیال ہوتا ہے، شاید اس انجمن کا نام "سبعہ سیارہ تھا" علاوہ انتخاب کلام کے نئی نئی بحریں تجویز کر کے مصرعہ طرح دیا جاتا تھا۔ ایک بار طرح ہوئی۔

میں ہوں تصویر جذبات پنہاں کی

یہ ضروری نہ تھا کہ سنجیدہ اور ٹھوس غزلیں کہی جاتیں عموماً فی البدیہہ شعر کہے جاتے تھے۔ بھوپال چونکہ پٹھانوں کی قائم ردہ ریاست تھی۔ اس لئے وہاں لفظ خاں سے ایک دوسرے کو مخاطب کیا جاتا تھا۔ کثرت استعمال سے یہ لفظ اتنی عمومیت اختیار ر گیا کہ شائستہ لوگوں نے اس کو بولنا چھوڑ دیا۔ مگر بازاری لوگوں میں بشدت رائج رہا، بھنگی، چمار بھی ایک دوسرے کو ارے اں کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ اس میں خان کی نون کا اعلان نہیں ہوتا تھا مولوی عبدالحلیم نے مصرعہ بالا جو شعر کہے۔ اس میں حبوب کی زبان سے انکاری جواب اس طرح ادا کر دیا گیا تھا ؎

نہیں مانیں گے ہم تو کسی خان کی

صحبت بہت دلچسپ ہوتی تھی۔ کاش اس زمانہ کے لطائف و ظرائف قلمبند کر لیے جاتے۔ تو ایک اچھا خاصا طنز و زاح کا شیرازہ مکمل ہو جاتا۔ نیاز صاحب بڑی متانت سے ایک شگوفہ چھوڑ دیتے اور احباب میں پرخلوص شعری نوک ھونک شروع ہو جاتی۔ خاص طور پر میرے اور محوی کے درمیان خوب چلتی تھی ؎

ہو گئیں باتیں ہی یہ اب تو پرائی کیا کہوں

ایک دلچسپ واقعہ اور یاد آیا ۱۹۳۰ء میں میرا قیام حیدرآباد دکن میں نواب اکبر یار جنگ کے بنگلہ پر تھا۔ میں جس کمرہ ں رہتا تھا۔ ایک اسی سالہ بزرگ عالم مولانا محمود حسن ٹونکی بھی مستقل طور سے اس میں قیام پذیر تھے۔ اتفاق انہی دنوں اب نیاز بھی حیدرآباد تشریف لائے وہ نواب ہوشیار جنگ کے مہمان تھے۔ پروفیسر محشر عابدی ان سے ملنے گئے۔ باتوں وں میں کہنے لگے کہ ارشد تھانوی بھی آنے والے تھے۔ انھوں نے مجھے اطلاع دی تھی، پھر کچھ پتہ نہ چلا۔ نیاز صاحب یہ مجھ سے قات ہو چکی تھی۔ انھوں نے فرمایا وہ تو عرصہ ہوا یہاں آ گئے اور اکبر یار جنگ کے یہاں مقیم ہیں۔ محشر عابدی نے نیاز صاحب زیز ہوٹل میں جو وہاں کا ممتاز ترین ہوٹل تھا عصرانہ پر مدعو کیا اور یہ کہہ کر چلے تھے کہ میں ارشد صاحب کو بھی مدعو کرنے ہوں۔ اکبر یار جنگ کے بنگلہ پر آکر پہرہ والے سے انھوں نے مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس نے میرے کمرہ کا پتہ دیا۔ اتفاق سے میں موجود تھا۔ حضرت مولانا محمود حسن خاں صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ محشر صاحب سے میری مکتوبی راہ و رسم تھی ات نہ ہوئی تھی۔ وہ دراز ریش مولانا کو دیکھ کر دل میں کچھ بجھ سے گئے اور سمجھے کہ یہ ارشد تھانوی تو بڑے دقیانوسی ہیں وطے تو ایک نوجوان جذبات کے انسان معلوم ہوتے تھے، بادل نخواستہ ان سے گفتگو شروع کی اپنا تعارف کرا کر رشکوہ کیا۔ آپ نے اپنے آنے کی اطلاع بھی نہ دی مجھے تو ابھی نیاز صاحب سے معلوم ہوا، مولانا بھی بہت خوش مزاج آدمی تھے نوجوان صاحب کو دیکھ کر سمجھ گئے کہ یہ ارشد تھانوی کے نادیدہ دوست ہیں۔ کہنے لگے، جی ہاں، بغیر اطلاع دیئے میں آگیا۔ محشر صاحب نے زحمت تو ہوگی نیاز صاحب کے ساتھ عزیز ہوٹل میں چائے پر زحمت کیجیے۔ محشر صاحب کا جی چاہتا تھا کہ اس دعوت کا کسی عذر نکار کر دیا جائے مگر مولانا موصوف نے بڑی پذیرائی کے انداز میں کہا۔ جی بسر و چشم حاضر ہوں گا۔ جبکہ نیاز صاحب بھی وہاں مگر شرط یہ ہے کہ آپ مجھے خود آکر لے جائیں۔ اگرچہ ہوٹل سامنے ہی ہے، لیکن میں بغیر آپ کے نہ جاؤں گا۔ بیچارے محشر

طوعاً و کرہاً ہاں کہہ کر چلے آئے۔ جب میں واپس آیا تو مولانا نے مجھ سے فرمایا کہ محشر عابدی صاحب آئے تھے۔ ان کی طرف سے ۵ بجے نیاز صاحب فتحپوری اور آپ چائے پر مدعو ہیں، وہ مجھے، آپ سمجھے اور میں نے آپ کی حیثیت میں حاضری کا وعدہ کر لیا۔ میں نے ہنس کر کہا، یہی عزیز ہوٹل جو دروازے کے سامنے ہے یا کوئی اور بولے، ہے ہوٹل یہی، مگر عابدی آپ کو لینے آئیں گے منتظر رہئے گا۔ اتنا کہہ کر مولانا نواب اختر یار جنگ کے یہاں چلے گئے۔ وقت مقررہ پر ایک نوجوان آئے اور بغیر علیک سلیک مجھ سے پوچھا۔ مولانا کہاں ہیں؟ اکثر لوگ مولانا کو اسی طرح آکر پوچھا کرتے تھے۔ حسب معمول میں نے جواب دیا کہ اختر یار جنگ کے یہاں (بزبان جوش، کے دہاں) گئے ہیں۔ نوجوان نے کہا انھیں تو عزیز ہوٹل میں نیاز صاحب کے ساتھ اس وقت چائے پینا تھی، میں سمجھ گیا کہ یہ محشر عابدی ہیں میں نے کہا میں چلتا ہوں۔ وہ کچھ متعجب سے ہو کر بولے۔ مگر میں تو مولانا کو لینے آیا ہوں کچھ لفظی تبادلہ کے بعد زبردستی میں ان کے ساتھ ہو لیا۔ اور مجھ ناخواندہ مہمان کو (غالباً دل میں کوستے ہوئے) جب احاطہ کے دروازے پر پہونچے تو اکبر یار جنگ کے داماد کار میں آگئے اور گاڑی روک کر کہا۔ ارشد صاحب کہاں، چلئے میں تمہیں قوالی میں لے چلنے کو آیا ہوں۔ ان سے تو میں نے عذر کر دیا۔ مگر محشر صاحب کی قبل از وقت غلط فہمی رفع ہو گئی۔ میں چاہتا تھا کہ نیاز صاحب کے سامنے یہ گتھی سلجھتی۔ تو مزید لطف آتا۔ حیدرآباد سے واپس بھوپال آکر میں بیمار رہا، اور جب حالت زیادہ خراب ہو گئی تو اپنی بیوی بچوں میں جو لکھنؤ میں تھے میں اس لئے چلا گیا کہ "وہیں خاتمہ بالخیر ہو" ڈھائی سال موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا رہ کر بالآخر صحتیاب ہو گیا، نیاز صاحب متواتر مجھے دیکھنے آتے رہے اور اس حالت میں کہ میں ان کی عیادت سے شدت مرض کی وجہ سے مستغنی تھا۔ انھوں نے میرے حیدرآباد سے معاملات وصول یابی میں مراسلاتی مدد بھی دی،

نیاز صاحب کم آمیز ضرور ہیں لیکن مردم بیزار نہیں، دوستوں میں بے تکلف، خوش مزاج اور غیر دوست اصحاب کے لئے شائستہ اخلاق کے سنجیدہ انسان ہیں۔ کوئی ان سے مل کر آزردہ خاطر نہیں ہوتا لیکن اپنی شخصیت کا ان پر اثر بھی نہیں ڈال سکتا۔ اس لئے کبھی کبھی انھیں شدید خودپسندی کا الزام بھی دیا گیا ہے، اور یہ کہ وہ مسلمہ روایتی تقاضوں سے انحراف اپنی انفرادیت کا لازمہ سمجھتے ہیں، یہ الزام ان کے تحقیقی و تنقیدی مزاج کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ روایات علمی و ادبی ہوں، سماجی و معاشرتی ہوں، تاریخی، سیاسی یا مذہبی ہوں، وہ روایت کے قائل نہیں، اور یہ تحقیق و تنقید کے بعد اس پر بے لاگ اظہار رائے کرتے ہیں اور اپنی اصابت رائے کی بڑی سے بڑی قیمت دیتے ہیں۔ کئی بار اسی وجہ سے ان کی عافیت ذاتی بھی خطرہ میں پڑ گئی۔ اسی استواری و پختہ مغزی نے انھیں علمی دنیا میں اس مقام پر پہونچایا جہاں ان کے معاصرین میں سے شاید کوئی ابھی تک نہیں پہونچا۔ اب سے چند سال پہلے میرے لڑکے سلمان الارشد نے "ادبائے عصر" کے نام سے ایک کتاب مرتب کرنا شروع کی تھی۔ اسی ذیل میں نیاز صاحب سے ان کے سوانح حیات کی درخواست کی، نیاز صاحب نے جواب میں صرف یہ مصرعہ لکھا

خام بدم پختہ شدم سوختم

اپنی علمی و ادبی زندگی پر یہ نیاز کا کیسا جامع تبصرہ تھا۔ نیز اپنی ذاتی زندگی کی شہرت سے بے نیازی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ وہ اپنی تصویر دوسروں کے موئے قلم سے دکھانا نہیں چاہتے گویا یہ کہتے ہیں ؎

ہر کہ دارد میل دیدن در سخن بیند مرا

سخن سے اصطلاحاً مراد کلام منظوم ہوتی ہے۔ نیاز صاحب کی تصنیفات و تالیفات کی وافر تعداد ہے، لیکن ان کے

شاعرانہ کلام کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ یہ درست ہے کہ اب وہ شعر نہیں کہتے، مگر کبھی تو کہتے تھے ان کی غزلیں بھوپال کے مشاعروں میں سُنیں، نظمیں رسالوں میں پڑھیں، وہ ان کے معیار نثر سے کم نہیں، نیاز صاحب سے تو اس کی توقع نہیں۔ کوئی صاحب ذوق کوشش کریں تو ابھی وقت ہے کہ کلام نیاز فراہم ہو جائے اور طبع ہو کر ان کے کثیر التعداد نیاز مندوں کے ذوق کی تسکین کا باعث بنے، خواہ وہ اس کو پسند بھی نہ کریں کیونکہ مدت ہوئی وہ زمرہ شعراء سے قطعی علٰحدہ ہو چکے ہیں۔

عرض نیاز عشق کے قابل نہیں رہا　　جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر وہ ذوق سخن سنجی کے تقاضوں کی تکمیل میں لگ جاتے اور اسی کی ترجمانی کرتے رہتے اور دماغ کی فکری صلاحیتوں سے کام نہ لیتے تو گوناگوں علمی و ادبی موضوعات پر اردو ادب میں یہ قابل قدر اضافہ ہوتا جو رسالہ نگار اور دوسری تالیفات و تصنیفات سے ہوا ...... اور نہ ان کی بلند شخصیت نیاز محمد خاں سے "نیاز فتحپوری" بن کر شہرت دوام حاصل کرتی اور یہ کہنے کا انہیں استحقاق نہ ہوتا کہ

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

شاعرانہ تعلی

بھوپال کی یادگار ایک تاریخی نظم

(بھوپال میں بعہد نواب سلطان جہاں بیگم، نیاز صاحب ایک ایسے محکمہ سے وابستہ رہے جو ان کے ذوق کے منافی تھا۔ خود نواب سلطان جہاں بیگم کو بھی اس کا علم تھا اور وہ نیاز صاحب کو کسی دوسرے شعبے میں منتقل کرنے کا وعدہ بھی کر چکی تھیں۔ لیکن کافی انتظار کے بعد جب کوئی نتیجہ نہ نکلا تو احباب کے اصرار پر نیاز صاحب نے فارسی میں ایک منظوم عرضداشت بطور یاد دہانی پیش کی جس میں ممدوح کی تعریف سے زیادہ شاعرانہ تعلی کا اظہار ہے۔ اس نظم کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا اور وہ بہت جلد شعبۂ تصنیف و تالیف میں منتقل کر دیئے گئے۔)

زمن سپاس تو آید ہمیں کہ نالانم　　زخندہ ات چہ نوا بُردہ ام کہ گریانم
نگاہِ مہر کہ بر من فگندہؑ، بینم　　سحاب لطف کہ بر من فشردہؑ، دانم
ولے ز آرزوِ خود ہنوز منفعلم　　ز اقتضائے کمالِ خودش پشیمانم
بدست من سر دامانِ خور رسیدن دہ　　وگرنہ چاک شدن خواہدش گریبانم
عجب نباشد اگر می زنی بدستارت　　بجائے طرّہ، کہ من گوہرے زعمّانم
بیُرمرا بہ مشامت کہ مشکم از تاتار　　بکش مرا ببرّت، تیغے از صفاہانم
مرا بہ افسر و دیہیم خود بدہ جائے　　کہ من بہ تاب و صفا لعلے از بدخشانم
مرا بپرس زحسّان و شیخ شیرازی　　کہ نغمۂ عرب و طوطیۂ ز ایرانم
مرا بہ وعدۂ لطفے چو شاد فرمودی　　نہ زیبدت کہ تماشہ کنی پریشانم
جہاں گنی کہ تو امروز نیشتر سازی　　ہماں امید کہ دی ساختی رگِ جانم
تاملے کن و قدرم شناس و کارم دہ　　کہ باشد از نظرِ عدل و نظم شایانم
وگرنہ دہ خبر از نامرادیم کہ زنم　　بہ سنگ سخت فنا قلب شیشہ سامانم

ماخوذ نگار جولائی ۱۹۶۰ء

نیاز اور نیاز مند

مالک رام

چالیس برس کا زمانہ تھوڑا نہیں ہوتا۔ کہنے کو دو لفظ ہیں، لیکن جب پیچھے پھر کر ۱۹۲۴ء کو یاد کرتا ہوں تو یوں معلوم ہوتا ہے گویا وہ کوئی اور دنیا تھی اور اب یہ سنہ ۱۹۶۴ء کی کوئی دوسری دنیا ہے۔

یہی سولہ سترہ برس کا میرا سن تھا، جب میں نے ۱۹۲۴ء کے اوائل میں وزیرآباد سے انگریزی کے دسویں درجے (میٹرکولیشن) کی سند لے کر گورنمنٹ کالج گجرات میں داخلہ لے لیا۔ میں یہاں بوجوہ کالج ہوسٹل میں نہ رہ سکا، اس لئے رہنے کو شہر میں ایک کمرہ کرایے پر لینا پڑا۔ میرے مسکن سے تھوڑی دور، کالج کے راستے میں، ایک صاحب محمد یوسف کی کپڑے کی دکان تھی۔ اسم بامسمّیٰ، گورے چٹے جوان، ۲۸-۳۰ برس کی عمر، تعلیم تو واجبی تھی، لیکن آدمی بہت ذہین تھے۔ شعر بھی کہتے تھے۔ یوسف تخلص تھا، اور چونکہ سیماب اکبرآبادی سے تلمذ تھا، اس لئے اپنے آپ کو یوسف سیمابی لکھتے تھے۔

میرے ملنے والوں میں ایک صاحب تھے، عنایت اللہ اسد میری ہی عمر کے، شاید دو ایک برس کا تفاوت ہو۔ ان کے ذریعے سے میرا یوسف صاحب سے تعارف ہو گیا۔

یوسف صاحب بڑے یار باش آدمی تھے۔ روزانہ عصر کے وقت ان کی دکان پر گویا جلسہ ہوتا۔ ان میں سے بیشتر شاعر تھے، بقیہ کو محض سننے کا شوق تھا۔ بالعموم یہ ہنگامہ چراغ جلے کے بعد تک رہتا۔ اس دوران میں یوسف صاحب بالعموم حاضرین کی چائے پانی سے بھی کچھ خاطر مدارات کرتے۔ آخر جب دکان بڑھانے کا وقت ہوتا، تو دوست احباب اپنے اپنے گھر کی راہ لیتے اور یوسف صاحب دکان بند کر کے اپنے گھر کو روانہ ہو جاتے۔ یہ ان کا گرمی سردی بارہ مہینے کا معمول تھا۔ ظاہر ہے کہ جہاں اس قماش کے دنیا جہان کے بے فکرے جمع ہوں گے، وہاں کوئی گاہک کیوں آنے لگا۔ نتیجہ وہی نکلا جس کی کسی عقل کے اندھے کو بھی توقع ہو سکتی تھی۔ یوسف صاحب نے دو ہی برس میں بزرگوں کی جمع جتھا یار دوستوں پر اڑا دی اور دکان میں تالا پڑ گیا۔ اب سوچتا ہوں تو یوں خیال ہوتا ہے کہ شاید دکان کا تو محض بہانہ تھا، یوسف صاحب نے یہ دوستوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کے لئے ایک اڈے کا انتظام کر رکھا تھا، ورنہ تجارت کا انہیں نہ کوئی تجربہ تھا، نہ سلیقہ ؎

سیکھے ہیں مہ رُخوں کے لئے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے

خیر، آمدم برسرِ مطلب۔ یوسف صاحب بہت سے اخبار رسالے بھی منگواتے تھے۔ معارف، زمانہ، پیمانہ، نگار، ہفتہ وار ریاست، اور جب اسی سال نیرنگ خیال چھپنا شروع ہوا، تو یہ بھی۔ وہ اور بھی کئی رسالوں کے خریدار

تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ بعض لوگ تو صرف ان پرچوں ہی کے پڑھنے کے لئے ان کے ہاں آتے تھے۔ جیسے یہ دکان نہیں، کوئی دار المطالعہ تھا۔ ایک دن میں نے وہاں نگار کا کوئی شمارہ دیکھا، تو اسے پڑھنے کو اٹھا لایا۔

میں نے جب نگار کا یہ شمارہ دیکھا، تو پہلی نظر میں اس کا گرویدہ ہو گیا۔ مضمون ایک سے ایک بڑھ کر اعلیٰ معیار کا، بڑھیا دبیز کاغذ، کتابت طباعت بہت اچھی، غرض

عروسِ جمیل و لباسِ حریر

جی نے کہا، یہ تو پڑھنے بلکہ رکھنے کی چیز ہے۔ میری طبیعت نے گوارا نہ کیا کہ طفیلی بن کر ہر مہینے پرچہ یوسف صاحب سے مستعار لوں۔ اگلے دن میں نے پہلا کام یہ کیا کہ پانچ روپے چندہ بھیج کر اپنا نام خریداروں میں لکھوا لیا اور پچھلے دو برس کے پرچے بھی منگوا لیئے۔ یہ وہ زمانہ ہے، جب نگار بھوپال سے شائع ہوتا تھا اور اس پر مدیر مسئول کا نام "رئیس التحریر نیاز فتحپوری" چھپتا تھا۔ یہ تھا میرا التعارف نیاز صاحب سے۔

میری ابتدائی تعلیم جس نہج پر اور جس ماحول میں ہوئی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے اردو، فارسی اور اسلامیات سے بچپن ہی سے شغف پیدا ہو گیا تھا۔ اگر خود ستائی کا مجرم نہ گردانا جاؤں، تو کہہ سکتا ہوں کہ فارسی نظم و نثر کا اچھا خاصہ حصہ بارہ تیرہ برس کی عمر میں میری نظر سے گزر چکا تھا۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ اس دور میں نیاز صاحب کی تحریریں کتنی مشکل اور فارسی ترکیبوں سے بوجھل ہوتی تھیں، لیکن مجھے ان کے پڑھنے اور سمجھنے میں کبھی کوئی دقت نہیں ہوئی، بلکہ یہ امر واقع ہے کہ ان کے پڑھنے سے فرحت محسوس ہوتی تھی۔

ہائی اسکول میں میرے ایک ہم سبق دوست ملک احمد حسن رہتاسی مرحوم تھے، جو بعد کو بہت دن تک ہفتہ وار دورِ جدید (لاہور) کے ایڈیٹر بھی رہے۔ خدا ان کی مغفرت کرے، وہ بھی میری طرح اردو فارسی اور خاص طور پر شعر کے رسیا تھے۔ ہم دونوں کا دانت کاٹی روٹی والا معاملہ تھا۔ وہ احمدی تھے۔ ان کے ذریعے سے مجھے اسلام سے متعلق بہت وسیع مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ جانے، وہ میرے لیے کہاں کہاں سے کتابیں بٹور کر لاتے تھے اور میں بڑی سے بڑی کتاب دو چار دن میں ختم کر کے واپس کر دیتا تھا۔ لازمی بات تھی کہ ہائی اسکول کی تعلیم ختم کرنے تک میری مذہبی واقفیت عموماً اور اسلامی واقفیت خصوصاً میری اپنی عمر کے طلبہ سے کہیں زیادہ تھی۔ نگار کے ہر پرچے میں نیاز صاحب کا اسلام اور قرآن سے متعلق کوئی نہ کوئی مضمون ضرور ہوتا تھا۔ ان مضامین کو دیکھ کر پہلی مرتبہ میرے دل میں براہِ راست قرآن پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ اس وقت تک اسلام سے متعلق میری تمام معلومات اردو کتابوں تک محدود تھی۔ عربی میں نے پڑھی نہیں تھی اور نہ اس کے حاصل کرنے کا کوئی موقع ہی میسر آیا تھا۔ نیاز صاحب جس طرح قرآن کی تفسیر کرتے تھے، اس کی جدت اور عقلیت نے مجھے بہت متاثر کیا۔ چنانچہ ایک دن میں بازار سے مولوی نذیر احمد دہلوی کے ترجمے والا قرآن لے آیا۔ میں نے فرصت کے اوقات میں کوئی دس پندرہ دن میں یہ ترجمہ پڑھ ڈالا۔ اس کی زبان مجھے بہت پسند آئی اور میں نے اس کے بعض مقامات بار بار مطالعہ کیے۔ اس بات پر کم و بیش ۴۰ برس گزر چکے ہیں، لیکن مجھے آج تک اس ترجمے کے کچھ حصے زبانی یاد ہیں۔

میں نے دیکھا کہ نیاز صاحب کا ترجمہ کئی مرتبہ مولوی نذیر احمد کے ترجمے سے مختلف ہوتا ہے۔ رہا ان کا تعبیر و تفسیر کا انداز، تو یہ مولوی نذیر احمد تو رہے الگ، میرے اپنے تمام پہلے مطالعات و تصورات کے بھی خلاف تھا۔ اس کے بہت دن بعد جب میں نے سرسید کی تفسیر کے مطبوعہ اجزاء دیکھے، تو میں نے محسوس کیا کہ نیاز صاحب اس سے ضرور متاثر ہوئے ہیں، دونوں کا سوچنے کا ڈھنگ تقریباً یکساں ہے۔

بہرحال ان کے یہ اسلامی مضامین مجھے بہت پسند آئے اور میں نے طے کر لیا کہ مجھے عربی پڑھنا چاہیئے اور اگر یہ نہ ہو سکے، تو کم

ازکم قرآن کو معنوں کے ساتھ کسی استاد سے سبقاً سبقاً ضرور حاصل کرنا چاہیئے۔ میری یہ آخری آرزو دو برس بعد لاہور پہنچنے پر پوری
(۱۹۲۶ - ۱۹۲۸)، اور پھر خدا نے ایسا سامان پیدا کر دیا کہ مجھے ایک زمانے تک مصر میں قیام کرنا پڑا۔ یہاں میں نے عربی میں بھی
شُد بُد پیدا کر لی۔

نگار کا باب الاستفسار اس کی خصوصیات بلکہ اولیات میں سے ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس پہلو سے کسی کو بھی اس کے تتبع
شاید ہی جرأت ہو۔

یہ دوسری چیز تھی جس نے مجھے خاص طور پر اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ ہر مہینے ایک یا دو سوالوں کا جواب لکھتے تھے، لیک
اس میں تنوع کا یہ عالم تھا کہ علم و ادب کا شاید ہی کوئی گوشہ رہ گیا ہو۔ شعر و ادب، تاریخ، تفسیر، حدیث، تصوف، فنو
لطیفہ۔ غرض دنیا بھر کے موضوع —— ان کی زد سے کوئی نہیں بچا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ میں ان سے بہت حد تک مرعوب ہو گیا
بلکہ یہ احساس آج تک رفع نہیں ہوا۔

اس میں قطعاً کوئی مبالغہ نہیں کہ آہستہ آہستہ نگار میرا محبوب ترین رسالہ بن گیا۔ جس مہینے اس کے پہنچنے میں دیر ہو جاتی
پرچہ کہیں ڈاک میں گم ہو جاتا، تو میں بے چین ہو جاتا، اور جب تک پرچہ دیکھنے کو نہ ملتا، یوں معلوم ہوتا، جیسے زندگی کے معمو
میں کوئی ناقابلِ برداشت خلا پیدا ہو گیا ہے۔

انسانی فطرت کا یہ خاصہ ہے کہ وہ اپنی پسند کی چیز کی نوک پلک سنوارنے میں لگا رہتا ہے۔ یہی کچھ نگار کے سلسلے میں
میرے ساتھ ہوا۔ جن لوگوں نے اس زمانے کا نگار دیکھا ہے، انہیں یاد ہو گا کہ اس کے سرِ ورق پر خطِ نستعلیق میں نام (نگار) کے علاو
بہت کچھ اور عبارت بھی ہوتی تھی مثلاً "اردو کا علمی و ادبی مجلّہ"، مقامِ اشاعت، قیمت، مدیر کا نام وغیرہ (یہ محض حافظے کی مد
لکھ رہا ہوں۔ ممکن ہو جزئیات میں کچھ اختلاف ہو) مجھے سرِ ورق پر اتنی عبارت اور تفصیل سخت ناپسند تھی ؎

مشاطہ را بگو کہ اسباب حسنِ یار
چیزے فزوں کند کہ تماشا بما رسید

چنانچہ میں نے ایک دن دل کڑا کر کے نیاز صاحب کو خط لکھا کہ حضرت! یہ تمام عبارت اڑا دیجئے۔ سرِ ورق پر صرف لفظِ نگار
اور بس —— آپ میری خوشی کا اندازہ نہیں لگا سکتے، جب انہوں نے میری تجویز پر صاد کیا اور اس کے بعد اس کا سرِ ورق اس ط
ہو گیا، جیسا اب ہے (یعنی ہندستان میں)

خود مجھے لکھنے کی طرف توجہ بھی نگار کے مطالعے اور نیاز صاحب کی تحریروں سے ہوئی۔ میں نے شروع میں ایک آدھ
انگریزی سے ترجمہ کی اور خود بھی لکھی۔ لیکن مجھے انہیں نگار میں اشاعت کے لئے بھیجنے کی جرأت نہ ہوئی۔ غالباً ۱۹۲۵ء میں ڈا
محی الدین قادری زور مرحوم کا ایک مضمون "غالب کی ذہنیت" کے عنوان سے دو قسطوں میں نگار میں شائع ہوا۔ اس میں انہو
کہیں کہیں غالب پر نکتہ چینی کی تھی۔ اس پر ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ کئی اصحاب نے اس مضمون کے بعض حصّوں پر سخت اعتراض کیا اور ت
بہ ترکی جواب دیا۔ اس سلسلے میں ایک مختصر مضمون میں نے بھی "غالب اور ذوق" کے عنوان سے لکھا اور بڑی حیص بیص کے بعد اسے نیاز
کی خدمت میں بھیج دیا۔ چند مہینے بعد یہ ۱۹۲۶ء کے کسی شمارے میں چھپا تھا۔ یہ میرا پہلا مضمون ہے جو نگار میں چھپا، اور غالب سے متع
یہ میرا پہلا مضمون تھا۔ اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً میرے کچھ مضمون نگار میں شائع ہوئے، جن میں سے بعض میں نے خود نیاز صاحب ہی
فرمائش پر قلم بند کیے۔ لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ اپنی تحریروں کو نگار میں اشاعت کے لئے بھیجنے پر میں اپنے آپ کو کب

آمادہ نہیں کر سکا۔

۱۹۲۶ء میں انٹرمیڈیٹ (Intermediate) میں کامیابی کے بعد میں مزید تعلیم کے لیے لاہور چلا آیا۔ یہاں میں نے، جیسا کہ اوپر ذکر کر چکا ہوں، قرآن کا بالاستیعاب مطالعہ کیا۔ سبق کے وقت میری اپنے استاد سے بڑی بحث ہوا کرتی تھی۔ نگار کے طویل مطالعے کے باعث میرا اسلامی مسائل سے متعلق سوچنے کا انداز ہی کچھ اور طرح کا ہو گیا تھا۔ سبق میں جہاں کہیں کوئی ایسا موضوع آجاتا جس سے متعلق میں نگار میں کوئی مضمون پڑھ چکا تھا، تو فوراً سوال کر بیٹھتا۔ بخاری صاحب مختصراً جواب دے دیتے، دل میں یہ خیال کرتے ہونگے کہ اس کی تشفی کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ میں اس پر جرح شروع کر دیتا۔ وہ پہلے تو طرح دیتے کہ بات نہ بڑھنے پائے۔ اس لیے کچھ ادھر ادھر کی بات کرکے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے، لیکن جب دیکھتے کہ میں بال کی کھال نکالے بغیر ٹلنے کا نہیں، تو کتاب بند کر دیتے اور ہنس کر فرماتے:

اچھا صاحب! یہ بتائیے کہ آپ مجھ سے پڑھنے کو آتے ہیں یا مجھے پڑھانے کو۔ لیکن سو آفرین ہے ان کے صبر و تحمل کو کہ وہ میرے بخیئے بلکہ ٹ جھجی تنگ کرنے پر بھی کبھی ناراض نہیں ہوئے، بخندہ پیشانی سے میری سنتے اور مسکرا مسکرا کر جواب دینے کی کوشش کرتے۔ افسوس کہ میں پندرہ سولہ پاروں سے زیادہ ان سے پڑھ نہ سکا اور باقی مجھے اپنے طور پر مترجم نسخے کی مدد سے پورا کرنا پڑا۔ لیکن میں ان کا احسان بھول نہیں سکتا کہ کم فرصتی کے باوجود انھوں نے سال ڈیڑھ سال میرے ساتھ گزارا کیا۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ

اب میں تعلیم سے فارغ ہو چکا تھا۔ یہ ۱۹۳۲ء یا شاید ۱۹۳۳ء کی بات ہے۔ میں نے مطالعے کے اثنا میں محسوس کیا کہ قرآن میں عورت کی زندگی کے متعلق بڑی تفصیلی تعلیم دی گئی ہے، لیکن یہ کسی ایک مقام پر نہیں، بلکہ مختلف سورتوں میں منتشر حالت میں ملتی ہے۔ جی میں آئی کہ کیوں نا اسے یکجا کرکے اس پر ایک مضمون لکھا جائے۔ میں نے نیاز صاحب کو اپنے اس ارادے کی اطلاع دی اور یہ بھی درخواست کی کہ اگر ہو سکے تو عنوانات مقرر کر دیجئے، جن کی روشنی میں یہ مضمون مرتب کروں۔ انھوں نے جواب دیا کہ فہرستِ عنوانات خود تیار کرو۔ اس سے چند مہینے پہلے رسالہ جامعہ (دلّی) میں ایک مضمون اس موضوع پر شائع ہوا تھا۔ انھوں نے اسے دیکھنے کی بھی ہدایت کی۔ غرض میں نے عنوان مقرر کرکے ان کی خدمت میں بھیج دیئے۔ انہوں نے ان سے اتفاق کیا اور فرمایا کہ جب مضمون مکمل ہو جائے، تو اسے نگار میں اشاعت کے لیے بھیج دو۔

میں نے شروع سے یہ طے کر لیا تھا کہ اساسی طور پر تمام مسائل کا استخراج قرآن سے کروں گا اور حدیث محض نص کی تشریح و توضیح کے لیے پیش کروں گا اور یہ بھی تا بحدِّ امکان بخاری اور مسلم سے یا زیادہ سے زیادہ صحاح ستّہ سے۔ اتنی پابندیوں کے باوجود لکھنے بیٹھا، تو بات سے بات پیدا ہونے لگی، اور وہ جو خیال تھا کہ پورا مقالہ رسالے میں دو یا تین قسطوں میں چھپ جائے گا، کسی طرح درست ہوتا نظر نہ آیا۔ جب مضمون خلاف توقع لمبا ہونے لگا تو میں نے پھر لکھا کہ یہ تو میرے اندازے سے بہت طویل ہو گیا۔ انھوں نے جواب دیا کہ اس کی فکر نہ کرو، جو جی میں آئے، اسے قلم بند کر ڈالو، ترمیم بعد کو کر لینا۔ قصّہ کوتاہ، میں نے کوئی سو سوا سو صفحے میں اسے ختم کیا اور مسودہ ان کی خدمت میں بھیج دیا۔

نیاز صاحب نے پورا مضمون دیکھا اور اسے واپس کرتے ہوئے لکھا کہ بعض مسائل پر مزید غور و خوض درکار ہے مثلاً مجھے یاد ہے کہ انھوں نے متعہ سے متعلق لکھا تھا کہ شیعی نقطۂ نگاہ معلوم کرنے کے لیے فلاں فلاں کتاب کا مطالعہ کر لو۔ جب مسودہ واپس آگیا، تو میں نے، ؟ اجازت لے کر پہلے اسے مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم (مدیر معارف) کی خدمت میں پیش کیا۔ میں چاہتا تھا کہ اگر حسنِ اتفاق سے یہ رسالہ شائع کر سکوں تو کم از کم اس میں کوئی ایسی غلطی نہ رہ جائے، جو کسی بنیادی اسلامی تعلیم کے خلاف ہو۔ مرحوم نے میری توقع سے کہیں بڑھ کر مضمون کی تعریف کی، بلکہ یہاں تک لکھا کہ اگر مجھے یہ معلوم نہ ہوتا کہ مضمون کس کا لکھا ہوا ہے، تو میں اسے

پڑھ کر یہی خیال کرتا کہ یہ کسی مسلمان عالم نے لکھا ہے۔ نفسِ مضمون سے متعلق انھوں نے فرمایا کہ بعض مسائل سے متعلق مجھے آپ سے اختلاف ہے۔ اس پر میں نے درخواست کی کہ یا تو مسودے کے حاشیے میں اشارہ کر دیجیے یا خط میں تحریر فرمایئے تاکہ میں استفادہ کر سکوں۔ انھوں نے فرمایا کہ نہیں، اس کی ضرورت نہیں، اگر ملاقات ہوگی، تو تفصیل سے گفتگو کریں گے۔ مجھے بھی کوئی عجلت نہیں تھی اور اس کے علاوہ زندگی کے اور جھمیلے بھی تھے:

اور بھی درد ہیں دنیا میں محبت کے سوا

میں نے لکھ دیا کہ بہت اچھا، مسودہ اپنے پاس ہی رہنے دیجیے، جب ملیں گے تو بات چیت کرنے کے بعد اسے واپس لے لونگا۔ اتفاق دیکھیے کہ اس کے بعد ان سے ملاقات ہوئی بھی، لیکن ایسی صورت میں کہ تفصیلی گفتگو کا موقع نہ ملا۔ پھر میں ۱۹۳۹ء میں ہندوستان سے باہر چلا گیا، تو انھوں نے لکھا کہ آپ کا مسودہ میرے پاس امانت پڑا ہے، اسے جہاں کہیں، وہاں بھیج دوں۔ میں نے جواب دیا کہ ملک احمد حسین کے پاس لاہور بھیج دیجیے۔ احمد حسن نے اسے میرے پاس مصر روانہ کر دیا۔

ان چھ سات برس میں بھی میرا مطالعہ تو بہر طور جاری رہا ہی تھا۔ اب میں نے خود ہی مسودے پر نظر ثانی کی۔ جہاں کوئی کسر نظر آئی، اسے ٹھیک کیا اور اس کے بعض حصّے دوبارہ لکھے۔

میں نے مضمون کے چھ باب تجویز کئے تھے:- (۱) بیٹی یا (۲) بیوی (۳) ماں (۴) مطلقہ یا بیوہ یا (۵) وارثہ (۶) عورت مذاہبِ عالم میں۔ پہلے پانچ ابواب میں صرف اسلامی تعلیم اور آخری میں اس کا دوسرے مذاہب سے تقابل اور موازنہ۔ جب مضمون مکمل ہو گیا، تو میں نے بوجوہ خیال کیا کہ آخری باب کو اس کتاب کے ساتھ شائع نہیں کرنا چاہیئے۔ یہ موضوع اپنی جگہ مکمل ہے اور اسے الگ رکھنا چاہیئے۔ میں نے نیاز صاحب سے اس کا ذکر کیا، تو انھوں نے اتفاق کرتے ہوئے لکھا کہ اسے نگار میں اشاعت کے لیے بھیج دو۔ چنانچہ یہ مضمون 'عورت اور اسلام' کے عنوان سے ۱۹۴۵ء میں نگار کی تین اشاعتوں میں چھپا۔ پہلے پانچ باب بالآخر ۱۹۵۱ء میں "عورت اور اسلامی تعلیم" کے عنوان سے کتابی صورت میں نیاز صاحب نے اپنے تعارف کے ساتھ اپنی نگرانی میں چھاپے۔ میں مضمون کا تسلسل قائم رکھنے کو حالات سے بہت آگے نکل گیا۔

نیاز صاحب سے خط و کتابت کا سلسلہ ۱۹۲۴ء میں ہی قائم ہو گیا تھا۔ وہ خطوں کا جواب حد درجہ باقاعدگی سے بلا تاخیر دیتے ہیں۔ ان کے خطوں پر رائے زنی کرنا اس مضمون کے حدود سے باہر ہے اور ان سے متعلق کسی حد تک اپنی تفصیلی رائے میں ایک مضمون میں ظاہر بھی کر چکا ہوں، جو نقوش (لاہور) میں چھپا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ ان کی انشا کی تمام رعنائیاں ان خطوں سے ظاہر ہوتی ہیں۔ ان کے جو خطوط "مکتوبات نیاز" کے نام سے تین جلدوں میں چھپے تھے، ان سے متعلق بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ کسی شخص کے نام نہیں لکھے گئے۔ میں نہیں جانتا کہ یہ شبہ کس حد تک درست ہے۔ البتہ اتنا یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ان میں بعض ایسے خطوط ہیں، جو خود میرے نام لکھے گئے تھے۔ ان کی بانکی البیلی نثر، شعروں کا برجستہ استعمال اور ہلکا سا مزاح

لوگ جانیں طبلۂ عنبر کھلا

شعروں کے برمحل استعمال میں ان کے پیشرو مولانا ابوالکلام آزاد اور میر ناصر علی (صلائے عام والے)، تھے میرا خیال ہے کہ وہ ان دونوں سے متاثر ہوئے ہیں۔

ابھی تک ان سے ذاتی طور پر ملنے کا کوئی موقع نہیں ملا تھا۔ پہلی ملاقات ۱۹۳۶ء کے جاڑوں میں ہوئی۔ میں اس زمانے میں دلی میں تھا۔ انھوں نے لکھا کہ میں فلاں دن آل انڈیا ریڈیو سے ایک تقریر نشر کرنے کو آرہا ہوں۔ یہ ریڈیو کے ابتدائی دور

کی بات ہے، جب اس کا دفتر پرانی دلی میں علی پور روڈ پر تھا۔ جس شام ان کی تقریر[1] تھی، میں ریڈیو اسٹیشن پہونچ گیا۔ اسسٹنٹ ڈائرکٹر جناب سید ذوالفقار علی بخاری سے میری کچھ یاد اللہ تھی، انہی نے میرا تعارف کرایا۔ وہاں تو زیادہ بات چیت کا موقع نہ ملا، لہذا میں نے اگلے دن ملنے کے لیے وقت طے کیا اور واپس چلا آیا۔

یہ اپنے ایک دوست حبیب احمد صاحب کے پاس قرول باغ میں اترے ہوئے تھے۔ اتفاق سے میں بھی ان دنوں وہیں قرول باغ ہی میں رہتا تھا اور جناب حبیب احمد کا مکان بھی میرے مسکن سے کچھ زیادہ دور نہیں تھا۔ چنانچہ میں اگلے دن وقت مقررہ پر حاضر خدمت ہوا۔ دیر تک گپ رہی، کسی سنجیدہ موضوع پر گفتگو نہیں ہوئی؛ نہ اس کا موقع تھا، نہ ضرورت۔ ہم ایک دوسرے کو بارہ برس سے جانتے تھے اور جب پہلی مرتبہ ہی ملے ہیں، تو اسی طرح جیسے پرانے ملنے والے باہم ملتے ہیں، اجنبیت کا کوئی شائبہ نہیں تھا۔

اس موقعہ کا ایک لطیفہ سنیے:-

دوسرے دن شام کو نیاز صاحب کہیں باہر جا رہے تھے، میں بھی موجود تھا۔ کہہ چکا ہوں کہ یہ جاڑوں کا زمانہ تھا۔ انھوں نے اچھی طرح گرم کپڑے پہن لیے۔ جب خوب کس کسا کر کمرے سے باہر نکلے، تو حبیب احمد صاحب نے کہا کہ اتنے زیادہ کپڑوں کی کیا ضرورت تھی، تو انھوں نے جواب دیا کہ صاحب، سردی کا موسم ہے۔ اس کا علاج یہی ہے کہ یا تو انسان شراب سے اپنے آپ کو گرم رکھے یا اونی کپڑوں سے۔ شراب پینے کی توفیق نہیں، اس لیے احتیاط کا تقاضہ یہی ہے کہ کپڑوں کے متعلق کوتاہی نہ ہو۔ میرے منہ سے نکل گیا، شراب نہ پینے کی جو توجیہہ آپ نے کی ہے، حرام کرنے والے نے اس کا خیال نہیں کیا۔ تو کیا کہتے ہیں، صاحب! جس زمانے میں یہ حرام ہوئی ہے، اس وقت جس چیز کو شراب کہتے تھے، وہ واقعی اس قابل تھی کہ اسے حرام کر دیا جاتا۔ بھلا وہ بھی کوئی شراب تھی! کھجوریں اور انگور، گندم اور جو — انھیں پانی میں ڈال دیتے۔ آٹھ دس دن کے بعد جب خمیر تیار ہو جاتا، تو ہاتھ سے اس کا غلغوبا بنا کر اسے نچوڑ یا چھان لیتے۔ یہ شراب تھوڑی ہے! اسے آپ زیادہ سے زیادہ ٹھنڈا جوشاندہ کہہ سکتے ہیں۔ شراب تو اس چیز کا نام ہے، جو اب ملتی ہے۔ زرا اسے دیکھیے تو کہ کتنی صاف شفاف اور دلکش ہے کہ خواہ مخواہ پینے کو جی چاہے۔ اسے بھلا کون حرام قرار دے سکتا ہے؟

میں ۱۹۳۹ء میں مصر چلا گیا اور کوئی سات برس کے بعد تین چار مہینے کے لیے وطن واپس آیا، تو ان سے ملنے کو لکھنؤ گیا۔ انہی کے ہاں اترا اور دو دن ٹھہر کر دلی چلا آیا اور پھر اپریل ۱۹۴۷ء میں باہر چلا گیا۔ اگلے پانچ برس میں میرا زیادہ قیام مصر اور عراق میں رہا۔ اب کے واپسی ۱۹۵۲ء میں ہوئی۔ لیکن بدقسمتی سے حالات اچانک کچھ ایسے پیش آگئے کہ مجھے ڈیڑھ دو مہینے کے بعد ہی پھر باہر جانے کی ضرورت پیش آگئی۔ دل نہ مانا کہ ملے بغیر چلا جاؤں، چنانچہ میں نے تار دیا کہ اگلے دن پہنچ رہا ہوں۔ جب وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ یہ حیدرآباد گئے ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ انہیں میرا تار ملا ہی نہیں تھا۔ ملاقات نہ ہو سکی، جس کا مجھے بہت قلق تھا لیکن وقت اتنا تنگ تھا کہ میں ان کی حیدرآباد سے مراجعت تک انتظار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ لہذا یہ حسرت دل کی دل ہی میں رہی اور میں دلی چلا آیا، چند دن بعد ہوائی جہاز سے مصر چلا گیا۔

میں اواخر نومبر ۱۹۵۴ء میں دلی آیا، دسمبر میں لکھنؤ گیا۔ میری غیر حاضری میں ان کی صاحبزادی شوکت کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس کی تعزیت بھی کرنا تھی۔ میں یہاں دو تین دن ٹھہرا۔ انہوں نے جس محبت و شفقت کا اظہار کیا، اب اس کا ذکر بھی ان کے خلوص کی

---

[1] اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا، تو ان کی تقریر 'اہرام مصر' کے موضوع پر تھی۔

توہین ہو گی۔ کیا بتاؤں کہ کہاں کہاں وہ مجھے ساتھ لیے لیے پھرے۔ ان سے بڑی بڑی باتیں ہوئیں۔ ان کی زندگی کے متعدد واقعات سنے۔ ان کا دفتر دیکھا، جہاں ہر چیز قرینے سے اپنی اپنی جگہ رکھی تھی۔ ان کے کام کرنے کا ڈھنگ دیکھا۔ ان کی پابندیٔ اوقات سے متعلق کچھ کہنا تو تحصیل حاصل ہے۔ اسی ایک بات سے اندازہ لگا لیجیے کہ نگار فروری ۱۹۲۲ء میں جاری ہوا تھا اس ۴۰ — برس میں کبھی ایک مرتبہ بھی تو ناغہ نہیں ہوا۔ پہلے تو یہی دیکھئے کہ، مذہبی اور نیم مذہبی پرچوں کی بات نہیں، خالص علمی ادبی پرچوں میں اتنی لمبی عمر کس کی ہوئی۔ زمانہ (کانپور) غالباً ۴۲ برس زندہ رہا، لیکن منشی دیانرائن نگم مرحوم کہا کرتے تھے کہ زمانہ کا خرچ روزنامہ آزاد سے نکلتا ہے، ورنہ خود زمانہ خسارے میں چل رہا ہے۔ یہ نہیں کہ نگار پر مشکل وقت نہیں آئے۔ جب ۱۹۳۵ء — ۳۶ء ۱۹ میں بعض اسلامی حلقوں سے اس کے خلاف تحریک چلی اور نیاز صاحب پر کفر کا فتویٰ صادر ہوا ہے، تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ اب نگار بند ہو جائے گا۔ یہ بھی کچھ کم سخت واقعہ" نہ ہوتا، لیکن اس سے بھی بڑھ کر خود ان کی اپنی جان تک کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ ان صبر شکن حالات میں بھی ان کی پامردی اور مستقل مزاجی نے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا اور پرچہ برابر نکلتا رہا۔ یہاں مجھے اس سے بحث نہیں کہ اس تنازعے میں کون راستی پر تھا اور کون غلطی پر۔ اگرچہ میں پورے واقعات سے بہت حد تک واقف ہوں اور چاہوں تو ان پر بھلا برا محاکمہ بھی کر سکتا ہوں؛ لیکن ایک تو نقار خانے میں طوطی کی کون سنتا ہے اور دوسرے اب گڑے مُردے اکھاڑنے سے حاصل بھی کیا ہو گا۔ یہاں مقصود صرف ان کے کردار کا یہ پہلو پیش کرنا ہے کہ نیاز صاحب کے مزاج میں، گفتار و کردار میں، بات کی پچ ہے، استواری ہے، یا وہ چیز جسے بزرگ وضعداری کہا کرتے تھے۔ نیاز صاحب قوم کے پٹھان ہیں۔ پٹھانوں میں ضد کا عنصر بہت ہے؟ اس لیے آپ اسے ضد بھی کہہ سکتے ہیں، لیکن یہ اندھی دھند یا ناعاقبت اندیشانہ ضد نہیں۔ ان کی دنیوی سوجھ بوجھ بلا کی ہے؟ وہ کسی مسئلے کے حسن و قبح اور مالہٗ وما علیہ پر پوری طرح غور و فکر کیے بغیر کوئی اقدام نہیں کرتے۔

میں پچھلے پانچ برس سے پھر وطن سے باہر زندگی بسر کر رہا ہوں۔

اک چکر ہے مرے پانو میں زنجیر نہیں

ان سے آخری ملاقات روانگی سے چند ماہ بیشتر دلّی میں ہوئی تھی۔ خیال تھا کہ جب واپس جاؤں گا، تو حاضرِ خدمت ہونگا، لیکن پارسال انھوں نے نقلِ مکان کر لیا۔ غالب نے کسی ایسے موقع ہی کے لیے کہا تھا،

بُت خانہ میں اسدؔ بھی بندہ تھا گاہ گاہے
حضرت چلے حرم کو، اب آپ کا خدا ہے

میں یہ تو نہیں کہنا چاہتا، کیونکہ آخر دلّی اور کراچی میں اتنا بُعد تو نہیں، جتنا بُت خانے اور حرم میں ہے۔ لیکن اتنا کہہ دینے میں بھی کیا حرج ہے:۔

پیامِ من کہ رساند بیار مہر گسل — کہ بر شکستی و مارا ہنوز پیوندست
قسم بجانِ تو گفتن طریقِ عزت نیست — بخاکِ پائے تو و آں ہم عظیم سوگندست
کہ باشکستنِ پیمان و برگرفتنِ دل — ہنوز دیدہ بدیدارت آرزومندست

یہ مختصر مضمون لکھنے سے میری غرض یہ نہیں تھی، نہ ہے، کہ میں ان کی علمی اور ادبی خدمات کا جائزہ لوں اور بتاؤں کہ انھوں نے اپنی ساٹھ سالہ ادبی زندگی میں، زبان کی، شعر و ادب کی، انشاء کی تنقید (یا ان کی اصطلاح میں انتقاد) کی، مذہب اور تاریخ کی، صحافت کی، کیا کیا خدمات سرانجام دی ہیں۔ کس طرح ہمارے مشہور لکھنے والوں کی بہت بڑی تعداد نے نہ صرف ان کی ذات

ے بلکہ ان کے اسلوبِ تحریر سے بھی متاثر ہوئی اور انھوں نے نگار ہی سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ نہ میں یہ چاہتا ہوں ان کی ہمہ جہتی شخصیت پر کوئی تبصرہ کرکے تاریخِ ادبِ اردو میں ان کا مقام متعین کروں۔ یہ کام مجھ سے زیادہ قابل ر اہل لوگ غالباً اسی خاص نمبر میں کریں گے اور آیندہ بھی کرتے رہیں گے۔ میرا مقصود یہ چند سطریں لکھنے سے رف اتنا تھا کہ میں اپنی طرف سے ان کی خدمت میں ہدیۂ نیاز پیش کرنا چاہتا تھا۔ میں نے ان سے بہت استفادہ کیا، ت کچھ سیکھا ہے اور میری معنوی نشو و نما میں نیاز اور نگار کا بہت ہاتھ رہا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ اس کا برملا ہار کردوں۔

از عیشِ ما مپرس نظیری، خبر کہ ما
چوں خضر لب ز چشمۂ نایاب شستہ ایم

"شعر کی خصوصیات کیا ہیں؟ یعنی کس شعر کو صحیح معنی میں شعر کہہ سکتے ہیں؟ یہ سوال اس قدر قدیم ہے کہ اگر ہم چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ تنقید کے اولین اس کے ساتھ یہ بھی وجود میں آیا تھا، اور اس لئے آپ جس زمانہ اور ملک کے لٹریچر کو اٹھا کر دیکھیں گے تو اس موضوع پر کافی سرمایۂ تحقیق نظر آئے گا۔

میں یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ جس طرح حُسن و جمال کے لئے کوئی خاص مادی معیار اس وقت قایم نہیں ہو سکا اسی طرح فن یا اصولِ فن اظ سے شعر کی خوبی کا اندازہ دشوار ہے۔ البتہ جس حد تک ذوق و وجدان کا تعلق ہے یہ کہا جا سکتا ہے کہ حُسن و شعر کی خوبی منحصر ہے صرف ناظر و ع کے تاثر و کیف پر جو بالکل ذاتی و انفرادی چیز ہے اور اس پر کسی کا اعتراض کرنا بالکل خلاف محل ہے، جس طرح ایک حبشی کی محبوبہ یوروپ میں ترین چیز سمجھی جاتی ہے اس طرح حبش میں سیمبران فرانس کو مبروص سمجھ کر ان کی طرف سے منہ پھیر لیا جاتا ہے، اور یہی وہ راز ہے جس و پر آج تک یہ فیصلہ نہ ہو سکا کہ لکھنؤ اسکول کی شاعری قابلِ ترجیح ہے یا دہلی اسکول کی، ایک شخص جس کا دل کیفیتِ عشق و محبت لی ہے اس کے نزدیک میر و درد کی شاعری لایعنی ہذیان سرائی ہے اور دوسرا جو صرف حکایاتِ محبت ہی سننا چاہتا ہے، وہ اسیر و ناسخ اوین کو مجموعۂ مزخرفات جانتا ہے میں نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جو میر کا یہ شعر سن کر:-

اک نگہ سے بیش کچھ نقصان نہ آیا اسکے تئیں
اور میں بیچارہ تو اے مہرباں مارا گیا

گھنٹوں کے لئے بے کار ہو گئے اور وہ ملکوتی نفوس بھی میری نگاہ سے گزر چکے ہیں جن کے نزدیک "میرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا" ی کا بہترین معیار ہے۔

بہر حال تنقیدِ شعر کے متعلق کوئی ایسا فیصلہ جس کو سن کر ہر شخص سرِ تسلیم خم کرے، نہ آج تک ہو سکا نہ آیندہ اس کا امکان ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی یقینی ر کوئی شخص صحتِ عقل و فکر سے کام لے کر محض فطری اصول اور علمی مسلمات پر بنیاد رکھ کر ایک حقیقت کو سمجھنا چاہے تو وہ ایسے حدود معین کر سکتا ہے ن و معیار کے تمیز میں مدد دے سکتے ہیں اور اسی لئے نہ صرف شعر بلکہ ادب و انشا کے تمام اقسام کے لئے اولین اصول جس کو ہر شخص تسلیم کرتا ہے یہ قرار دے ہے کہ:- "آنچہ از دل خیزد بر دل ریزد۔"

پھر چونکہ شاعری میں زیادہ تر وارداتِ قلب ہی سے بحث کی جاتی ہے، اس لئے وہاں اس کلیہ کی قوت اور زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔ اور ریزد" ہی کو دیکھ کر "از دل خیزد" پر حکم لگایا جاتا ہے۔"

(نیاز)

نیاز فتحپوری

شخصیت اور فن کے آئینے میں

کوثر چاندپوری

سانولے رنگ، بھرے ہوئے چہرے، بھاری جسم اور متوسط قد و قامت کا ایک باوقار آدمی سنہری کمانی کی عینک لگائے شیروانی پہنے س دوپلی یا ترکی ٹوپی رکھے اکثر بھوپال کے تنگ و طویل بازار ابراہیم پورہ یا لوہا بازار میں نظر آیا کرتا تھا، کبھی امیر حسن کی دوکان پر اور کبھی عبدالحکیم جز کے یہاں، اس کی خشخشی داڑھی اور قدرے لمبی مونچھوں میں کوئی ندرت نہ تھی، لیکن مُنہ کے چھوٹے اور گول دہانے اور خمار آگین آنکھوں میں ایک عالمان اور ادیبانہ تبحر یقیناً تھا۔ ایک مرتبہ یہی شخص ہاتھ میں چھوٹا سا بنڈل لئے لکھیرہ پورہ میں دُلہن صاحبہ کے محل والی سڑک پر ملا، کھویا کھویا خاموش بھوپال اس زمانہ میں کوئی بہت بڑا شہر نہ تھا۔ زندگی میں آجکل کی سی تھرتھراہٹ، ہلچل اور مشینی کیفیت بھی نہ تھی نہ موٹروں کے ہارن کی گونج تھی سائیکلوں کی گھنٹیوں کے نغمے۔ اس ماحول میں اگر کوئی خاص آدمی نظر آجاتا تو اس پر غور کرنے اور اسے موضوعِ گفتگو بنانے کی کافی فرصت تھی۔ عرب کے ہوٹل میں بھی باتیں کی جا سکتی تھیں اور طبیہ کالج کے ہوسٹل میں بھی جہاں تعلیم کے سلسلہ میں میرا قیام تھا۔ میں نے اس شخص کو جو میرے لئے اجن ہونے کے باوجود "غریبِ شہر" نہ تھا اور لبوں پر "سخنہائے گفتنی" کی تڑپ رکھتا تھا بہت غور اور توجہ سے دیکھا، اور اس کی شخصیت میں کشش م کی۔ اپنے ساتھیوں سے اس کے متعلق سوالات بھی کئے، ایک مرتبہ یہی شخص حکیم قمر الحسن (مرحوم) کے ساتھ اسی بازار میں ملا، گرمیوں کی شام تھی کی گرد کے سُرخ ذرات چھڑکاؤ کی وجہ سے دب گئے تھے۔ حکیم قمر الحسن بڑے دھان پان اور خوبصورت نوجوان تھے ان میں صبحِ بنارس کی رعنائی بھی اور شامِ اودھ کی نزاکت بھی۔ اس وقت وہ بالکل لکھنوی لباس میں تھے باریک ململ کا (غالباً) تنگ آستینوں کا انگرکھا، چست پاجامہ اور دوپلی ٹو

میں نے ان سے پوچھا۔ "یہ کون صاحب ہیں"؟

آپ نہیں جانتے، نیاز صاحب ہیں، آئیے میں آپ کو ان سے ملا دوں!

اس طرح میں پہلی مرتبہ علامہ نیاز فتحپوری سے ملا جن کی ادبی شہرت اور لامذہبیت عام ہو چکی تھی، وہ عام طور پر نیچری مشہور تھے۔ قمر الحسن س زمانہ میں نیاز صاحب کی صاحبزادی منسوب ہوئی تھیں اور وہ ہائی کورٹ میں ملازم تھے، نیاز صاحب ایک خاص ادائے بیگانگی سے ملے ایک آدھ سوال ک اور خاموش ہو گئے، مجھ پر اس شیوۂ بے نیازی کا بہت اثر ہوا اور ادبیت کا رعب بھی پڑا۔ اور خود میرے اندر ادیب بننے کی آرزو بیدار ہو گئی، قمر الحسن نیا ہی کے فیضانِ صحبت سے بہت اچھے ادیب بن چکے تھے۔ نیاز صاحب بھوپال کے محکمہ تاریخ سے متعلق تھے اور نور محل میں رہتے تھے۔ اس سے پہلے جیسا ک اختر عزیز صاحب سے معلوم ہوا وہ "تاج محل" میں بھی رہ چکے تھے، تھوڑے دن کے بعد میں محمد زکریا مائل کے ساتھ انھیں کی تحریک پر نیاز صاحب کے مکا گیا اور ایک طویل زینہ طے کر کے بالائی منزل پر پہونچا۔ نیاز صاحب کو اطلاع کرائی گئی۔ ذرا دیر بعد وہ باہر تشریف لائے ان کے ایک ہاتھ میں فاؤنٹین پ

سرے میں کچھ کاغذات، آنکھوں پر وہی سنہرے کیس کی عینک تھی بدن پر ململ کا کرتہ اور لٹھے کا پاجامہ سر پر انگریزی بال تھے جن کے بیچ میں مانگ نکلی تھی، یہ غالباً ۲۲ء کی بات ہے۔

کیا لکھ رہے ہیں آپ مائل صاحب نے پوچھا

صحابیات پر مقدمہ لکھ رہا ہوں، جتنی بڑی کتاب ہے اتنا ہی بڑا مقدمہ لکھ دوں گا۔

طویل مقدمے لکھ کر کتاب کی ضخامت بڑھا دینا نیاز صاحب کی عادت ہی میں داخل معلوم ہوتا ہے، عرض نغمہ میں بھی اتنا ہی بڑا دیباچہ امل ہے۔

میرا دوبارہ تعارف ہوا نیاز صاحب نے غالباً مجھے پہچان لیا تھا، ان کے متعلق یہ خیال عام تھا کہ وہ بہت مغرور آدمی ہیں، باتیں بہت کم کرتے اور لئے دیئے رہنے کے عادی ہیں لیکن اس دن پتہ چلا کہ انھیں مغرور کہنا صحیح نہیں۔ وہ خوددار اور کم آمیز ضرور معلوم ہوئے جیسا کہ ہر فن کار کو ہونا ے۔ آگے چل کر ان خصوصیات کا اظہار ہوتا رہا کہ وہ کم آمیزی اور کم گوئی کی اس شہرت کے باوجود بہت اچھے ملنے والے، بڑے بزلہ گو اور خوش مذاق ہیں ے ملتے ہیں بڑی بے تکلفی اور خلوص سے ملتے ہیں، ناجنسوں کی موجودگی میں اپنے اوپر ایک متکبرانہ انداز ضرور طاری کر لیتے ہیں۔ مائل صاحب سے وہ ہنس کر باتیں کرتے رہے، انھیں چھیڑتے بھی رہے، اسی ملاقات میں نیاز صاحب نے بتایا کہ انہیں فوٹوگرافی سے بھی دلچسپی ہے۔ اور ان کی ایک تصویر لباً ٹائمز آف انڈیا نے انعام کا مستحق قرار دیا ہے، تصویر کو شاید انہوں نے صرف "واش" ہی کیا تھا۔ اس وقت میں ادب اور مصوری کے رشتوں کو قائل نہ تھا۔ آج سوچتا ہوں تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے۔ کہ ادب، مصوری، موسیقی، رقاصی اور بت تراشی بنیادی قدروں کے لحاظ سے الگ الگ تھوڑے تفاوت کے ساتھ سب ایک ہیں۔ کہیں آواز سے کام لیا جاتا ہے کہیں رنگ سے اظہار جذبات ہوتا ہے اور کہیں الفاظ یا جسمانی حرکات سے، ہوا کہ نیاز صاحب کو موسیقی سے بھی شغف ہے اور وہ ستار بھی بجا لیتے ہیں*، زمانہ وہ تھا جب نیاز صاحب کے بے تکلف احباب میں ملک حبیب صاحب جائسی بھوپال ہی میں سکونت پذیر تھے، یہ دونوں اس فوٹو گروپ میں بھی شامل تھے جو "یاران نجد" کے نام سے "نگار" کے پہلے نمبر میں چھپا تھا، اور تصاویر پر ظریفانہ رنگ میں تبصرہ کرتے ہوئے کسی صاحب نے مانی جائسی کو "سرکس کا منیجر" لکھا تھا، ملک حبیب تاج محل میں رہتے تھے اور بقول نیاز صاحب ان کا مکان خوش ذوق حضرات کی جائے پناہ تھا، کبھی کبھی "موتی جان" کی وجہ سے دلگیر اکبر آبادی بھی آتے تھے، ایک آدھ مرتبہ غلام بھیک بھی آئے تھے مجھے اس صحبت میں شرف کا موقع ہی نہیں ملا۔ لیکن ادب اور ادبی شخصیتوں سے دلچسپی ضرور ہو گئی تھی، مشاعروں میں بھی شریک ہونے ، مانی جائسی سے ملاقات ہو چکی تھی، محمد ذکریا مائل، منشی محمد جمیل صاحب جمیل سہسوانی کی اصلاح سے غیر مطمئن ہو کر مانی جائسی ہی سے مشورہ کرنے لگے تھے اور میں انھیں کے ساتھ مانی صاحب سے لکھیرہ پورہ والے مکان میں ملا تھا، انھیں دنوں شاہی خاندان کے ایک وثیقہ یاب نواب صاحب لکھنؤ چھوڑ کر بھوپال آگئے اور ریت گھاٹ پر بڑے تالاب کے سامنے عبدالاحد صاحب ینجر کے مکان میں فروکش ہوئے نواب صاحب بڑے راق، خوش لباس اور جامہ زیب تھے، عمر پچاس کے قریب ہوگی، موسیقی اور شعر و ادب سے بڑی دلچسپی تھی۔ ایک مرتبہ نواب صاحب کے مکان کی بالائی ایک مخصوص صحبت مشاعرہ منعقد ہوئی، اس میں چند ارباب ذوق ہی مدعو تھے، میں ایک طالب علم کی حیثیت سے مائل صاحب کے ساتھ گیا تھا نواب بدھن ے سن رہے تھے داد دینے کا انداز قطعی لکھنوی تھا جس سے سخن سنجی اور شعر فہمی کا پتہ چلتا تھا۔ میں نے اسی بزم میں پہلی بار نیاز صاحب کو ترنم سے ھتے سُنا، آواز میں درد اور تاثر تھا کوئی شعر اس وقت یاد نہیں، شعور پر الفاظ کا ہلکا سا لمس محسوس ہو رہا ہے آواز کی دھیمی سی گونج بھی دماغ میں) یہ غزل نگار میں چھپ گئی تھی، نواب بدھن اپنے ادبی ذوق کے لحاظ سے قدامت پرست تھے، اور نیاز صاحب کی اکثر ترکیبوں پر معترض رہتے تھے،

میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ ستار کے متعلق میری یاد داشت درست ہے یا نہیں۔ (کوثر)

اسی درمیان میں مجھے محکمہ طبابت میں ملازمت مل گئی اور میں بھوپال سے باہر چلا گیا، جس فضا سے واسطہ پڑا وہ ادب تو کیا انسانی اقدار سے بھی تھی ابتدا میں بڑی گھٹن رہی، "نگار" برابر پڑھ رہا تھا اسی کے صفحات سے اس عالم تنہائی کو انجمن کی وسعت اور رونق مل رہی تھی، انسانوں میں صرف ایک خدا بخش میرا رفیق تھا جو لکھنؤ کے نواب شیش محل کے یہاں رہ چکا تھا اسی وجہ سے حد درجہ انفرادیت پسند تھا، تقریباً تین سال بعد پھر نیاز صاحب سے گیا وہ اب بھی نور محل ہی میں رہتے تھے، لیکن مکان تبدیل کر دیا تھا اس مرتبہ نچلی منزل میں ملاقات ہوئی، انہوں نے حکیم کبیر الدین کی کتاب "طب قدیم و کی علمی جنگ" کا ذکر کیا جو تبصرہ کے لئے آئی تھی، انہوں نے فرمایا کہ فنی چیز ہے اس پر تبصرہ آپ کریں، میں اس زمانہ میں تحصیل جاور کی ڈسپنسری میں تھا سے ریویو لکھ کر بھیجا جس کو نیاز صاحب نے شائع کر دیا، پھر میں بیگم گنج تبدیل ہو گیا جسے علمی سرگرمیوں سے تاریخی تعلق تھا۔ مولوی عبد الرزاق کانپوری نے بیگم گنج ہی میں "نظام الملک طوسی" مکمل کی تھی، میں نے یہاں کے دوران قیام میں "بیرم خاں ترکمان" لکھی "دنیا کی حور" اور دلگداز افسانے بھی بیگم گنج عہد تنہائی کی یادگار ہیں، اور ان کی تخلیق میں "نگار" کا بہت زیادہ اثر ہے جو صرف رسالہ ہی نہ تھا بلکہ ایک ادبی تحریک بن گیا تھا، میرے چند مضامین بھی میں چھپ چکے تھے، اسی زمانہ میں اچانک جھانسی کے اسٹیشن پر نیاز صاحب مل گئے وہ مانک پور سے آ رہے تھے خواتین بھی ساتھ تھیں، اور زنانہ تھرڈ میں بیٹھی ہوئی تھیں، نیاز صاحب نے بتایا کہ ان کی بیگم کا انتقال ہو چکا ہے انھوں نے ایک شیر خوار بچی چھوڑی ہے اس کی پرورش کا مسئلہ بہت اہم لیکن میری بہن کے دودھ اتر آیا جن کے عرصہ سے اولاد نہیں ہوئی تھی، اور اس طرح یہ مشکل مسئلہ حل ہو گیا۔ صبح کا وقت تھا میں اپنے ڈبے میں بیٹھ تھا، نیاز صاحب پلیٹ فارم پر کھڑے تھے اسی وقت پوریوں والا آ گیا اور انھوں نے پوریاں خرید کر ہاتھ پر رکھ لیں ترکاری پوریوں کے اوپر رکھی ہوئی نیاز صاحب دانتوں سے کاٹ کاٹ کر کھا رہے تھے، تو انجن سیٹی بجی کہ گاڑی چلتے ہی باتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ نیاز صاحب نے دیج گڑھ کے قصے جہاں وہ سپرنٹنڈنٹ رہ چکے تھے، جذبات بھاشا انہوں نے وہیں لکھی تھی۔ نیاز صاحب نے ریت میں دھنس جانے کا بھی ایک حیرت انگیز واقعہ سنایا، باتیں میرے ذہن پر اب تک یوں چھپی ہوئی ہیں جیسے کسی نے ٹائپ کر دی ہوں ارادی طور پر میں نے ان کو یاد رکھنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ نیاز صاحب کی غیر معمولی اور دلکش شخصیت کا جادو ہے کہ ان کے متعلق ان یادوں کے نقوش نہ صرف یہ کہ محو نہیں ہوئے بلکہ اسی طرح ابھرے ہوئے ورنہ اکثر چیزیں سوچنے پر بھی ذہن میں نہیں آتیں اور حافظہ میں نہ جانے کہاں دبی رہ جاتی ہیں۔ بیگم گنج کے زمانہ قیام ہی میں میری شادی ہو گئی یہ جنوری ۱۹۱۹ کا ذکر ہے، اس انقلاب نے میری ادبی زندگی پر کوئی خراب اثر نہیں کیا۔ اگرچہ ایک بزرگ نے ریاست دہلی میں میرا ایک افسانہ دیکھ کر پیشین گوئی کی تھی شادی ہوتے ہی یہ سارے شوق ٹھنڈے پڑ جائیں گے وہ نفسیات کے ماہر نہ تھے ظاہری وضع قطع کے اعتبار سے مولوی ضرور تھے اگرچہ مولویت بھی مشاغل میں دب گئی تھی۔ صرف لمبی داڑھی اس کی علامت کے طور پر باقی رہ گئی تھی۔ پھر بھی میں چوکنا رہا اپنی حسین اور رومانی راتوں کو سونے میں کم اور میں زیادہ صرف کرتا تھا۔ بہرحال کوئی شوق ٹھنڈا نہیں پڑا، ادبی شخصیتوں نے جن میں نیاز صاحب کی ہستی ممتاز ہے میرے ذوق میں جو آگ جلا دی تھی کبھی نہیں، بدستور جلتی رہی نگار کے علاوہ دوسرے ادبی رسائل (عالمگیر، نیرنگ خیال، ادبی دنیا اور ہمایوں) بھی مطالعہ میں رہتے تھے۔ عرصہ تک پھر نیاز سے نہیں مل سکا، وہ بھی بھوپال چھوڑ کر لکھنؤ چلے گئے، کبھی کبھی خط و کتابت کی نوبت آ جاتی تھی، نیاز صاحب نے میرے ابتدائی افسانوں کی مجموعہ "دلگداز افسانے" نگار میں بڑا حوصلہ افزا تبصرہ کیا، میری کردار نگاری کو بہت سراہا۔ نیاز صاحب نے صرف ریویو ہی کیا تھا انہیں غالباً معلوم نہ ہو گا کہ میرے قلب و دماغ پر اس کیا اثر ہوگا یا ممکن ہے بہت بڑھانے ہی کو ایسا لکھا ہو۔ انھوں نے ہر مرحلہ پر میری حوصلہ افزائی کی ہے اور میری کتابوں کو توجہ سے پڑھ کر تبصرے کئے ہیں اسی زمانے میں ایک صاحب نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ میں افسانے لکھنا چھوڑ دوں، ان میں جھوٹ ہوتا ہے تحقیقی مضامین لکھا کروں۔ اس مشورے سے ایک جھٹکا لگا تھا مگر نیاز صاحب کے اظہار خیال نے میرے عزم میں پختگی اور روانی پیدا کر دی اور میں افسانوں میں سماجی حقیقتوں کی عکاسی کرتا رہا۔ وقت رہا، سماج میں تبدیلیاں آتی رہیں۔ بہت سے انقلاب آئے اور آندھی کی طرح سنسناتے گزر گئے۔ میں پہلے رائسین، اور پھر بھوپال تبدیل ہو گیا اس میں نے ادبی سفر کی کئی منزلیں طے کر لی تھیں متعدد تاریخی کتابیں اور افسانوی مجموعے چھپ چکے تھے، مضامین بھی ملک کے معیاری رسائل میں شائع ہو رہے

اس حقیقت کے اعتراف میں مجھے مسرت ہوئی ہے کہ یہ ذوق نیاز صاحب کی حوصلہ افزائی اور "نگار" وغیرہ کے مطالعہ ہی سے پروان چڑھا تھا اس کو آگے بڑھانے میں منشی پریم چند کے افسانوی ادب نے بھی بڑا کام کیا ہے، حقیقت پسندی، اور زندگی سے آنکھیں چار کرنے کا فن میں نے پریم چند ہی سے سیکھا ہے۔ انھیں دو حضرات سے میں متاثر ہوا ہوں۔ پریم چند کو کبھی دیکھا نہیں، نیاز صاحب سے وقتاً فوقتاً ملتا رہا ــــ بڑی لمبی مدت کے بعد فروری یا مارچ ۵۵ء میں نیاز صاحب کو پھر بھوپال میں دیکھا، اب نہ وہ لمبی مونچھیں تھیں نہ خشخشی داڑھی بالکل کلین شیو تھے۔ بھرے ہوئے رخسار لٹک گئے تھے۔ سر کے بالوں میں خضاب کی سیاہی نمایاں تھی، کنپٹی پر سفیدی جھلک رہی تھی، دانت سب غائب تھے، آنکھوں پر موٹی سیاہ کمانی کی عینک تھی، بحیثیت مجموعی ان کا بڑھاپا جوانی کے اس دور سے زیادہ جاہ و جلال کا حامل اور حسن و دلکشی کا مالک تھا جس میں وہ رنگینی اور جذباتی افسانوں میں تخیل کی ایسی جنت آباد کیا کرتے تھے، جہاں زندگی کے علاوہ سب کچھ ہوتا تھا۔ اب وہ خود حیات انسانی کی ایک عملی تاریخ اور اس کے تجربات کا مکمل اظہار تھے۔ انداز گفتگو بے حد سنجیدہ، موثر اور فاضلانہ تھا باتیں پورے وثوق سے کرتے تھے، سوالات کا جواب بھی دیتے، البتہ جو سوال ناگوار ہوتا اس کا جواب نہ دیتے۔ قیام مولانا طرزی مشرقی وزیر صحت کے یہاں قیصر بنگلہ (شاہجہاں آباد) میں تھا، میں بھی شاہجہاں آباد ہی کی ڈسپنسری سے سبکدوش ہوا تھا اور بدھواڑے میں رہتا تھا۔ نیاز صاحب بڑی توجہ اور شفقت سے پیش آئے بہت سی باتیں ہوئیں، ایک روز سویرے ہی جیپ میں بیٹھ کر میرے یہاں آ گئے، پوچھا:۔

یوسف ہوٹل کہاں ہے میں نے اس کا اشتہار پڑھا ہے وہاں جا کر کچوریاں کھانا چاہتا ہوں۔

یہیں کیوں نہ منگا لی جائیں۔ میں نے پوچھا۔

جی نہیں، وہیں جا کر گرم گرم کھاؤں گا اس عمر میں مجھے اچھا کھانے سے بڑی دلچسپی ہے۔

نیاز صاحب ہوٹل چلے گئے اور شام کو گرم اور پھولی پھولی کچوریوں کی بہت تعریف کی، دانتوں کا ذکر آیا تو کہا کہ میرا منہ چھوٹا ہے بتیسی فٹ کرنے کے لئے آپریشن کی ضرورت ہوئی اور محض دانتوں کے لئے اس سانحہ سے گزرنا مجھے پسند نہیں۔

ایک دن میں نے اپنی کتاب ــــ اطبائے عہد مغلیہ کا ذکر کیا جو ہمدرد اکیڈمی کراچی کے اہتمام میں چھپ رہی تھی، نیاز صاحب ذرا مزاحیہ موڈ میں تھے بولے:۔

" ذرا سی ترکیب کیجئے کتاب خوب بکے گی اس میں اطبا کے مجربات اور شامل کر دیجئے۔"

اس پر ایک قہقہہ پڑا،

میں نے کہا اسی طرح اس کی تاریخی اور ادبی حیثیت ختم ہو جائیگی اور یہ بات مجھے کسی طرح پسند نہیں اس میں طبیبوں کی علمی، ادبی، سیاسی اور ملکی سرگرمیوں کا ذکر ہے، علاج معالجہ کا نہیں، نیاز صاحب خاموش ہو گئے۔

اسی صحبت میں ناخون اور ناخن کی بحث چھڑ گئی میں نے کہا ناخون بھی غلط نہیں بلکہ اصل اور بنیادی لفظ یہی ہے، یعنی وہ جگہ جہاں خون بالکل نہ ہو، حرف علت (واؤ) کو گرا کر پیش لگا دیا گیا ہے، ایک فارسی شعر ہے:۔

؎ تو چنانی مرا بجاں و بدل ــ اے نگاریں کہ گوشت با ناخون

امیر خسرو کی ایک پہیلی ہے:۔

بیسویں کا سر کاٹ لیا
نا مارا ناخون کیا

نیاز صاحب گفتگو میں کوئی حصہ نہیں لے رہے تھے آخر میں بڑی متانت سے بولے:۔

پہیلی سے مدعا ثابت نہیں ہوتا، مگر شعر سے بات صاف ہو جاتی ہے۔

3 JUL 1963

میں نے کہا کہ نیاز صاحب آپ پر فلاں صاحب نے جو اعتراض کیا ہے آپ اس کا کیا جواب دیں گے، نیاز صاحب نے فرمایا۔

کوثر صاحب جواب دینا حماقت ہے!

یہ سفر نیاز صاحب نے اپنے کسی مقدمہ کے سلسلے میں کیا تھا، جس میں اختر سعید اور مولانا طرزی قانونی مشیر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے، کامیابی نیاز صاحب ہی کے حصہ میں آئی تھی۔ میں نے نیاز صاحب کے "ذوقِ طعام" کا احترام کرتے ہوئے انھیں دوپہر کو کھانے پر مدعو کیا اور مرغ مسلم نہایت اہتمام سے تیار کروایا جو انہیں بہت پسند آیا اور روانگی کے وقت ایک مرغ اور پکوانے کی فرمائش کی، اسٹیشن پہونچ کر معلوم ہوا کہ نواب زادہ رشید الظفر اور مولانا طر سے بھی یہی فرمائش کی گئی تھی۔ چنانچہ ان دونوں نے بھی الگ الگ ناشتہ دانوں میں مرغ بھجوائے تھے۔ روانگی جی ٹی سے شام کو ۷ بجے یا پٹھان کوٹ سے چا ہو رہی تھی۔ نیاز صاحب صبح لکھنؤ پہونچ کر بچوں کے ساتھ ناشتہ کرنے کے لئے بیتاب تھے دو تین مرتبہ کہا کہ بچے منتظر ہوں گے ناشتہ انھیں کے ساتھ جائے گا۔ اگلی مرتبہ نیاز صاحب تشریف لائے تو سب کے ناشتہ دان ساتھ تھے۔ میرے ناشتہ دان کے ایک خانہ میں لکھنؤ کے کسی سندھی حلوائی کی بنائی مٹھائی بھری تھی اور ناشتہ دان بھی خالی نہ تھے، شاید یہ اس قدیم اعتقاد کا اثر تھا جس کی رو سے خالی برتن لوٹانا اچھا نہیں سمجھا جاتا۔

مولانا طرزی نے بھی اس مرتبہ ایک شاندار ڈنر دیا تھا جس میں شکار کے کوفتے اور کباب نیاز صاحب نے پسند کئے تھے۔

اس کے بعد اگست ۵۶ء میں نیاز صاحب بھوپال آئے۔ ایک دن شام کو نیاز صاحب نے مجھے کھلا ہوا ایک لفافہ دیتے ہوئے بڑی تاکید کے فرمایا کہ صبح اس کی رجسٹری کرا دیجئے گا، اگلے پرچہ میں اس کا چھپنا ضروری ہے۔ پتہ "منیجر نگار" کا درج تھا۔ لفافہ میں نہر سوئز پر لکھا ہوا ایک مضمون ت جو قلم برداشتہ لکھا گیا تھا کیونکہ جملے کے کٹے ہوئے تھے یہی مضمون ستمبر ۵۶ء کے "نگار" میں نہر سوئز کا تاریخی و سیاسی پس منظر" کے عنوان سے شائع ہوا۔ پھر نوا ہوش یار جنگ کے بلانے پر نیاز صاحب نے بھوپال کا سفر کیا۔ اس مرتبہ وہ ہوشیار جنگ کے ساتھ ہی شملہ کوٹھی (فلک نما) پر ٹھہرے اور نواب زاد رشید الظفر کے مہمان ہوئے۔ ان کے دوران قیام میں رشید صاحب نے ایک پر تکلف دعوت دی، کھانے کے بعد لائبریری میں مختصر سا مشاعرہ ہوا۔ صدر ہوش یار جنگ تھے۔ نیاز صاحب نے ان کی تازہ کتاب پر لکھا ہوا اپنا پیش لفظ پڑھا اور کچھ فکاہیہ کلام بھی سنایا۔

۵۷ء میں نیاز صاحب کے اعلان کے مطابق بھوپال میں ایک طرحی مشاعرہ ہوا۔ مصرعہ طرح پہلے ہی تجویز کیا جا چکا تھا۔

ع میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

۱۱؍ مئی ۵۷ء کو نیاز صاحب کی صدارت میں صدر منزل کے سامنے والے میدان میں مشاعرے کا آغاز ہوا، نیاز صاحب نے خطبۂ صدارت پڑ جو مختصر ہونے کے باوجود نہایت بلیغ اشارات کا حامل تھا، اس کے بعد مجید نیازی نے نہایت سحر آگین اور وجد انگیز ترنم میں مومن، آنند نرائن ملا، شفیق اور جعفر علی خاں اثر کی غزلیں سنائیں۔ بہت سے مقامی اور بیرونی شعراء شریک تھے، اجتماع بہت عظیم الشان تھا اتنا مجمع پہلے کسی ادبی جلسہ میں کبھی نہیں دیک گیا تھا۔ انتظام شاکر علی خاں کے ہاتھ میں تھا۔ بعض حلقوں کی جانب سے مشاعرے کی مخالفت کی جا رہی تھی اور ہوٹنگ تو یوں بھی بھوپال کے بڑے مشاعرو کی خصوصیت بن چکی ہے لیکن ۱ بجے سے ۵ بجے صبح تک یہ بزم شعر و سخن برپا رہی اور ایک سیٹی یا تالی تک نہیں بجی، سامعین مسحور ہو کر رہ گئے، آخر میں نیاز نے مختلف رنگ کی پانچ غزلیں سنائیں جن کو وہ چھپوا کر ساتھ لائے تھے، نیاز صاحب لہک لہک کر تحت اللفظ پڑھ رہے تھے اور داد کا ایک ہنگامہ گرم تھا۔ پڑھنے کا انداز بہت ہی اچھا تھا، نیاز صاحب کی آواز میں زندگی گنگناتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی اور خود ان کے اندر جوانی عود کر آئی تھی۔ پانچوں غزلیں قوس قزح کی رنگینیوں میں لپٹی ہوئی تھیں اور میر سے لے کر موجودہ عہد تک کے تغزل کی روایات کو مسلسل کر رہی تھیں۔ مشاعرہ ختم ہونے پر نیاز صاحب نے شاکر علی خاں کی پیشانی چوم کر ان کے حسن انتظام کی داد دی۔ جولائی ۵۷ء کے "نگار" میں مشاعرے کا انتخاب شائع ہوا۔ مشاعرے کی گونج دیر تک معا اخباروں کے کالموں میں باقی رہی، نیاز صاحب کی غزلوں پر عجیب عجیب تنقیدیں ہوئیں۔ ایک حد درجہ دل آزار قسم کا مضمون بھی شائع ہو گیا جس نیاز صاحب کو شدید تکلیف پہونچی اور انہوں نے معاملہ اپنے قانونی مشیر کے سپرد کر دیا۔ لیکن معذرت شائع ہو جانے پر قانونی چارہ جوئی کا ارادہ ترک کر دی

نیاز صاحب بڑی پاکیزہ اور صاف ستھری شخصیت کے مالک ہیں، ان کا فن اسی شخصیت کا عکس ہے، وہ روایتی قسم کے محبوب نہیں مگر شانِ محبوبیت ھتے ہیں۔ ان کی شخصیت میں کشش اور توانائی ہے پیچیدگی اور انفعالیت بالکل نہیں اس کی تعمیر میں شرافت، وضعداری، محبت اور خلوص کے عناصر بڑی وانی سے صرف ہوئے ہیں مگر ان عناصر کا امتزاج ظرافت اور خودداری کے ذریعہ کیا گیا ہے۔ ہیومر (Humour) ایک اچھی شخصیت کی نہایت پختہ یاد ثابت ہوتا ہے فن میں شگفتگی، شوخی اور رعنائی اسی کے راستے آتی ہے۔ نیاز صاحب کی شخصیت میں گوشے اور پہلو بہت ہیں وہ ہشت پہل نہیں صد پہل خصیت کے مالک ہیں ہر پہلو اور گوشہ ایک مستقل شخصیت کی حیثیت رکھتا ہے اور ہر شخصیت پکار کر کہہ رہی ہے :-

"ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

ان کی ہزار شیوہ شخصیت میں ہزار آہنگ ہیں اور ہر آہنگ میں انفرادیت ہے وہ مورّخ، مفسّر، عروضی، محدّث، فقیہہ اور ناقد، غرض سب کچھ ہیں، خلوص ع اور آئینِ دوستداری میں اپنی نظیر آپ ہیں۔ لکھنؤ میں صبح کی سیر کے بعد اپنے ایک دوست کے مکان پر بیٹھنے کے عادی تھے، ان کے پاکستان چلے جانے پر اپنی یہ وضع تبدیل نہیں کی اور واپس آتے وقت بس پانچ منٹ خالی مکان ہی پر بیٹھ آتے تھے، بھوپال میں مسٹر اختر عزیز بی اے ریٹائرڈ کلکٹر ان کے قدیم لیس اور دوست ہیں۔ اب میرے قریب رہتے ہیں، نیاز صاحب سے میں نے ان کا ذکر کیا تو بے چین ہو کر بولے :-

اختر صاحب سے ابھی ملیں گے!

میں انھیں لیکر اختر عزیز صاحب کے یہاں گیا، نیاز صاحب بڑی گرم جوشی کے ساتھ بغل گیر ہوئے اور دیر تک باتیں کرتے رہے۔

نیاز صاحب رہن سہن میں بھی اصول، سلیقہ اور ترتیب کے قائل ہیں ہر چیز نہایت سلیقہ اور شائستگی کے ساتھ اپنی جگہ جمی رہتی ہے۔ اگر کوئی مہمان چیز کو بے ترتیب طور پر رکھ دیتا ہے تو وہ اپنے ہاتھ سے سابقہ ترتیب بحال کر دیتے ہیں۔

افسانوی ادب میں سجاد حیدر یلدرم، سلطان حیدر جوش اور نیاز فتحپوری کی حیثیت ایک "مثلث" کی ہے۔ جس کا ہر زاویہ جڑا ہوا بھی ہے اور الگ ، تحلیل و تجزیہ نفسی اور کردار نگاری میں نیاز صاحب کے معاصرین میں بہت کم ان کے حریف ہیں، رومانوی افسانہ نگاری میں وہ اپنے دور کے منفرد فنکار نمیات یونان سے انھیں گہرا شغف رہا ہے یہ ان کا محبوب موضوع ہے انہوں نے اس میدان میں بڑی گلکاریاں بلکہ سحر کاریاں کی ہیں۔ کیوپڈ و سائکی ت نگاری، رنگین انداز بیان اور رنگینیٔ فن کی بہترین مثال ہے۔ اس میں بڑا والہانہ انداز، رومانوی شدت اور جذباتیت ہے ان کے افسانوں کی یر ہیجان انگیز اور نشاط آفریں ہوتی ہے۔ اور حسن بیان میں گہری شعریت بھی شریک ہو جاتی ہے۔ نیاز صاحب کے افسانوں میں کیوپڈ و سائکی کے علاوہ کا گلاب" اور "نائرِ محبت" رنگینیٔ فن کا دلکش نمونہ ہیں، "رومان" اور عورت ہی سے وہ اپنی کہانیوں میں رنگ بھرتے ہیں، وہ مقصدیت کے پابند نہیں بلکہ شرقی حدود سے بھی بغاوت کی جرأت رکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں کی ایک اور خصوصیت تخیئل کی سحر کاری ہے، ان میں رنگ اور نشاط وں دست و گریباں نظر آتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کی روشنی ان کے شعور میں بہت پہلے آئی، چنانچہ اس تحریک کے آغاز سے چند سال قبل ہی خیل کی دنیا سے نکل کر زندگی کے ماحول میں آ گئے اور مقصدیت بھی نمایاں ہو گئی۔ "ازدواجِ مکرر" میں یہ فضا موجود ہے، نیاز صاحب کا شمار نکاروں میں ہے جنہوں نے داستان کے بطن سے کہانی کی نئی صنف پیدا ہی نہیں کی بلکہ آپریشن کر کے نکالی ہے۔

مضمون نویسی اور مقالہ نگاری میں بھی ان کا مقام بلند ہے ان کے خطوط کو بعض لوگوں نے مقالات سے تشبیہ دی ہے انہیں ان خطوط رادہ کی جھلک نظر آتی ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ غالب کے خطوط بھی جو مکالمہ کی حیثیت رکھتے ہیں بے ارادہ نہیں لکھے گئے، لکھنے سے پہلے ے کا خطرہ بھی کسی نہ کسی صورت سے لاحق رہا ہے۔ نیاز صاحب کے خطوط میں جہاں معلوماتی فضا تعمیر ہوتی ہے وہاں وہ بائرن کے قدم بقدم آتے ہیں۔ اور جہاں برجستگی، روانی، شوخی گفتار اور مکالمے کا رنگ ملتا ہے وہاں کارلائل کا انداز جھلکتا محسوس ہوتا ہے۔ مختلف ادبی یات کے پیش نظر انھیں ایک انجمن اور ادارہ کہنا زیادہ موزوں ہے۔ معلومات اور وسعت نگاہ کے اعتبار سے انکی حیثیت ایک انسائیکلوپیڈیا

کی ہے۔ ان کا انداز نگارش شوخ اور جان دار ہے، بے باک نگاری ان کا حصہ ہے۔ ان کے جملوں میں جدت ترکیب اور بلاغت ہوتی ہے۔ وہ بڑی قدرت اور چابک دستی سے اپنے موضوع کا احاطہ کرتے ہیں۔ تنقیدوں میں بعض مقامات پر جارحانہ انداز نمایاں ہوجاتا ہے۔ منظوماتِ ناطق” اس کی ایک کھلی مثال ہے۔ ان کے یہاں تحقیق اور تنقید دونوں ہم آہنگ ہوتی ہیں۔ نیاز صاحب شاعر ہونے کے ساتھ ہی بڑے پائے کے سخن سنج ہیں۔ شعر کی نزاکتوں کو سمجھنے اور اس کی گہرائی تک پہونچنے کی صلاحیت انھیں عربی اور فارسی کی فاضلانہ قابلیت کے طفیل حاصل ہوئی ہے۔ پھر جدید اور قدیم علوم کی مہارت نے ذہن میں ادبی مسائل کو سمجھنے اور ان پر اظہار رائے کرنے کا بہت عمدہ او پختہ سانچہ بنا دیا ہے۔ وہ ہر موضوع پر لکھتے ہیں۔ ان کی کوئی تحریر سرسری اور بے اثر نہیں ہوتی۔ ان کے قلم پر عمر یا قویٰ کے اضمحلال کا کوئی اثر نہیں۔ وہ اب بھی یہی کہتا ہے کہ نیاز صاحب کے عناصر میں وہی اعتدال و توازن موجود ہے۔ جو عہد شباب میں تھا۔ ممکن ہے وہ عشق و مستی نہ ہو جس کی شہادت انھوں نے ”میری زندگی کے دو موڑ“ (نگار اگست ۶۱ء) میں لکھنؤ کی حسین و جمیل سرزمین کا ذکر کرتے ہوئے مہیا کی ہے۔

ہلالی پرچم

”عام طور سے یہی خیال کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے ہلال کا نشان، سلطنت بازنطین سے لیا ہے، لیکن بعض نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ سلطنت بازنطین پر فتح پانے سے قبل ترکوں کے پرچموں پر یہ نشان پایا جاتا ہے، تاہم اس سے یہ سوال رفع نہیں ہوتا کہ ہلال کے ساتھ . . . . اس کے بطن میں ستارہ کہاں سے آیا، جبکہ بازنطین کا پرچم اس سے خالی تھا۔

اس کے متعلق ایک روایت اور ہے جس سے ایک حد تک تسلی ہو سکتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ارطغرل اعظم جو سلطنت اتراک کا موسس اولین سمجھا جاتا ہے، ایک مرتبہ کسی درویش سے ملنے گیا اور اس درویش نے پیشین گوئی کی کہ تیرے خاندان میں ایک ایسا شخص پیدا ہوگا جو اپنی فتوحات سے تمام دنیا کو لرزہ براندام کردے گا اور تیری قایم کی ہوئی حکومت نہایت طویل زمانہ تک باقی رہے گی، جس وقت ارطغرل درویش کے پاس سے باہر نکلا تو شام ہو چکی تھی اور یہ وہ وقت تھا جب ہلال اور زہرہ کا (بالکل اس طرح جس طرح آج قومی نشان دیکھا جاتا ہے) قران ہو رہا تھا۔ ارطغرل نے اس کو دیکھتے ہی تفاؤل نیک خیال کیا اور اسی وقت سے اپنے پرچم کا نشان اس کو قرار دیا۔“

(نیاز)

نیاز صاحب اور اُن کی شخصیت

رئیس احمد جعفری

نیاز صاحب سے میرے تعلقات کی نوعیت کچھ عجیب سی ہے۔ وہ میرے بزرگ بھی ہیں، راہ نما بھی، اور محسن بھی۔ بزرگ اس بار سے کہ وہ میرے بزرگوں کے دوست ہیں۔ راہ نما اس لحاظ سے کہ مجھے جو تھوڑا بہت لکھنا آتا ہے، اس میں ان کے سحر آفریں انداز ریر کے تاثر کا پہلو اتنا زیادہ ہے کہ میں اسے فراموش نہیں کر سکتا۔ ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے، ایک مورخ کی حیثیت سے، ایک اد کی حیثیت سے، ایک محقق کی حیثیت سے اور ایک ادیب کی حیثیت سے ان تحریروں کا رنگ جداگانہ ہوتا ہے اور یہ میں نے انہی سے سیکھا کہ افسانہ زبان اور ہوتی ہے، تاریخ کی اور، تنقید، تحقیق اور تاریخ کی الگ۔ وہ میرے محسن اس حیثیت سے ہیں کہ بعض بڑے کٹھن مواقع نہوں نے میرا خیال کیا اور مجھے یاد رکھا۔ تعلقات کی یہ گراں بار حیثیتیں میرے اور ان کے ذہنی و فکری اختلافات میں مانع نہ ہو سکیں، اللہ یا چیز نے بہت بعد میں، لیکن پوری قوت سے، مجھے یہ باور کرنے پر مجبور کر دیا کہ وہ بہت اچھے اور بہت بڑے انسان بھی ہیں۔ میں کے اندازِ فکر سے اختلاف کر سکتا ہوں اور بارہا کر چکا ہوں، میں ان کے افکار و خیالات، تحقیق و نظریات، اور داعیات اختلاف کر سکتا ہوں اور مجھے اعتراف ہے کہ میں نے ایسا کیا بھی، لیکن جس چیز سے کبھی انکار نہیں کر سکتا وہ ہے ان کی عالی ظرفی مقامِ انسانیت۔

میں نے نیاز صاحب کو دور سے بھی دیکھا ہے اور قریب سے بھی، اور میں اسے اپنی بدقسمتی سمجھتا ہوں کہ ان کے علاوہ بھی مجھے ن بزرگوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ کاش یہ موقع مجھے نہ ملا ہوتا، کوئی حرج نہ تھا اگر میں نیاز صاحب کے مقام انسانیت زمزمہ سنج نہ ہوتا، لیکن جن کی عقیدت سے دل سرشار تھا ان سے بدظنی تو نہ ہوتی، وہ میری نگاہوں سے گر تو نہ جاتے! عقیدت کا یہ جب لٹتا ہے تو انسان کو بڑی ذہنی اذیت سے دوچار ہونا پڑتا ہے، اور یہ سطریں لکھتے وقت میں اسی ذہنی اذیت سے وچار ہوں۔

نیاز صاحب کے خلاف، ان کے نام نہاد الحاد، دہریت اور بے دینی کے خلاف جو طوفان لکھنؤ میں اٹھا تھا، اگرچہ اس ت میری عمر ۱۸ ـ ۱۹ سال سے زیادہ کی نہ تھی اور میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں زیر تعلیم تھا، لیکن اس طوفان میں، پورے ش و خروش کے ساتھ میں نے حصہ لیا۔ یہ بڑا نازک وقت تھا، زمین و آسمان نیاز صاحب کے دشمن ہو رہے تھے، دوست کٹ گئے، رفیقوں نے منہ موڑ لیا تھا، ساتھی کترانے لگے تھے۔ لیکن جب مطلع صاف ہوا، حالات بدلے، اور طوفان کے آثار نابود ہوئے، تو نیاز حب پھر نیاز صاحب بن گئے، وہی دبدبہ، وہی شان، وہی "نگار" کی حشر سامانیاں، وہی انشائیے نیاز کی سحر طرازیاں، وہی فکر و نظر نئے زاویے، ــــــ گویا:-

ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا۔

دو سال کرسمس کی تعطیل میں، میرا لکھنؤ جانا ہوا، نیاز صاحب سے ملنے کا جی چاہا، لیکن ہمت نہ پڑی، پھر جی چاہا اور قدم بے ساختہ ان کے دفتر کی طرف اٹھنے لگے، میں پہونچ گیا، وہ اس طرح ملے، اس شفقت اور محبت کے ساتھ کہ گویا مجھ سے کسی غلطی اور گستاخی کا اظہار ہی نہیں ہوا تھا ——— یہ پہلا نقش تھا، نیاز صاحب کی عالی ظرفی کا جو میرے دل پر قائم ہوا۔

ماہ و سال گزرتے رہے، میں جامعہ ملیہ سے بمبئی پہونچا، اور روزنامہ "خلافت" کا ایڈیٹر بن گیا۔

بمبئی اور لکھنؤ میں کئی سو میل کا فاصلہ تھا لیکن اس فاصلہ کو "خلافت" اور "نگار" کے تبادلہ نے بہت کم کر دیا تھا۔ بمبئی میں کم و بیش ۱۶ سال تک میرا قیام رہا، اس مدت میں متعدد بار میں نے نیاز صاحب کے افکار و خیالات سے اختلاف کیا، اور اس اختلاف میں کبھی کبھی تلخی اور درشتی بھی پیدا ہو گئی، لیکن جب بھی لکھنؤ جاتا، نیاز صاحب سے ضرور ملتا اور وہ اس شفقت سے پیش آتے کہ میں ایک طرح کی ندامت سی محسوس کرنے لگتا۔

سیاسی طور پر بھی میرے، اور نیاز صاحب کے خیالات میں بعد المشرقین تھا، لیکن جب ہندوستان تقسیم ہوا اور حکومت ہند کے موجودہ وزیر مالیات مرارجی ڈیسائی نے جو اس وقت بمبئی کے وزیر داخلہ تھے مجھ سے صاف الفاظ میں فرما دیا کہ "اب آپ کی ہندوستان میں جگہ نہیں ہے۔ پاکستان تشریف لے جائیے"، اور میں نے پاکستان آنے کا فیصلہ کر لیا۔ اسی وقت نیاز صاحب کا ایک خط مجھے ملا جس میں انہوں نے تحریر فرمایا تھا،

"انجمن اتحاد و ترقی کی طرف سے اردو کا ایک روزنامہ نکالنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں، آپ اگر اپنے خیالات میں ذرا سا لوچ پیدا کر سکتے ہوں تو لکھنؤ آ جائیے!"

یہ خط نیاز صاحب نے اس شخص کو لکھا تھا جس کے "اینٹی نیشنلسٹ" افکار و آرا سے وہ اچھی طرح واقف تھے، لیکن ان کے سمندر کے سے وسیع دل میں اس کے لئے اتنی گنجائش تھی کہ اپنے حلقۂ اثر میں اس کے لئے ایک باعزت جگہ پیدا کرنے کو تیار تھے —— کیا نیاز صاحب کی وسعتِ قلب کا یہ واقعہ ناقابلِ فراموش نہیں ہے؟ کیا میں اسے بھول سکتا ہوں۔

ہندوستان میں اپنی ہر چیز دفن کر کے میں پاکستان آ گیا۔ یہاں آ کر نئی زندگی بنانا پڑی، از سر نو زندگی کا آغاز کرنا پڑا ——

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں،

اور مجھے وہ طریقے بھی نہیں آتے تھے جنھیں برت کر لوگ اپنی پرستش کرا لیتے ہیں، مکان، دوکان، دفتر، کوئی چیز بھی میں الاٹ نہ کرا سکا۔ کشاکشِ حیات کے بحرِ ناپیدا کنار میں مجھے کودنا پڑا۔ یہ حالات ایسے تھے کہ انسان دوسروں کا کیا ذکر اپنے آپ کو بھی بھول جاتا ہے، میں نے سب کو فراموش کر دیا۔ اپنے آپ کو بھی بھول گیا۔ لیکن نیاز صاحب اپنے ایک بے مایہ خورد کو نہ بھول سکے۔ کئی سال ہوئے وہ کراچی تشریف لائے۔ میں کراچی ہی میں مقیم تھا۔ مجھے خاص طور پر یاد فرمایا، اس دل سوزی اور شفقت سے حالات دریافت کئے، مشورے دئے، تعلقِ خاطر کا اظہار کیا کہ میں یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا کہ یہ باتیں صرف ایک بزرگ خاندان ہی کر سکتا ہے۔ اس بے لوث خلوص، اور بے ریا تعلقِ خاطر پر میرا دل خراجِ محبت پیش کرنے پر مجبور ہو گیا، اور ان کی بلند و بالا شخصیت کے جو نقوش میں قبول کر چکا تھا۔ ان میں ایک کا اور اضافہ ہو گیا۔

اب گزشتہ چند سال سے میرا زیادہ تر قیام لاہور میں رہتا ہے۔ دو سال کی بات ہے نیاز صاحب لاہور تشریف لائے۔ طفیل صاحب مدیر نقوش کی خواہش تھی کہ لاہور میں سب سے پہلی پارٹی نیاز صاحب کو وہ دیں۔ دعوت نامہ میرے پاس بھی آیا۔ یہ کوئی تعجب

کی بات نہ تھی۔ ان سے میرے دیرینہ مخلصانہ تعلقات ہیں۔ لیکن تعجب اس پر ہوا کہ شرکت کے لئے پھر ان کا ایک تاکیدی خط آیا۔ یں گیا، نیازؔ صاحب شاعروں اور ادیبوں کے جھرمٹ میں بیٹھے تھے۔ میں دیر سے پہونچا۔ آخر میں ایک کرسی خالی تھی۔ اسی پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد باتیں کرتے کرتے نیازؔ صاحب نے حاضرین پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ مجھے انہوں نے دیکھ لیا، میں لپک کر آگے بڑھا۔ انہوں نے اپنے پاس جگہ پیدا کی، اور بٹھالیا اور اس طرح باتیں کرنے لگے جیسے میرے منتظر ہی تھے۔ میو گارڈن میں ایک ریلوے افسر کے ہاں قیام تھا، تاکید کی کہ وہاں ملنے آنا۔ تھوڑی دیر کے بعد پارٹی ختم ہوگئی۔ دروازے پر طفیل صاحب سے ملاقات ہوئی، کہنے لگے آپ کو میرا خط مل گیا تھا؟ میں نے جواب دیا مل گیا تھا، لیکن اس کی ضرورت کیا تھی؟ دعوت نامہ کافی تھا، کہنے لگے۔ نیازؔ صاحب نے مجھے لکھا تھا کہ "رئیسؔ کو ضرور بلانا!" —— یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے!

نیازؔ صاحب کی شخصیت کے مطالعہ سے میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ وہ بہت اچھے انسان ہیں، اور بہت اچھے مسلمان بھی، بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ دونوں چیزیں لازم و ملزوم ہیں، لکھنے بیٹھا ہوں تو جی چاہتا ہے لکھتا ہی چلا جاؤں لیکن کہاں تک؟

سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے!

مجنوں

"مجنوں" نام نہیں ہے بلکہ قیس کی صفت ہے۔ "دیوانہ یا پاگل" کے معنی میں، اس کا نام قیس بن ملوح بتایا جاتا ہے بعض نے قیس بن معاذ لکھا ہے اور یہی "عامر بن صعصعہ" کے قبیلہ کی مشہور ہستی ہے جسے لیلیٰ بنت سعد سے (جو خود قبیلۂ بن عامر کی لڑکی تھی) عشق ہوگیا تھا س کی تاریخ وفات سنہ ۸۰ھ ظاہر کی جاتی ہے۔ لیکن یہ امر مشتبہ ہے کہ واقعی یہ کوئی تاریخی ہستی تھی یا نہیں۔ صاحبِ اغانی، ابن خلکان ور ابن خلدون نے لکھا ہے کہ مجنوں کی ہستی بالکل فرضی ہستی ہے اور اس کا وجود ظاہر میں کبھی نہیں پایا گیا۔

ابن الکلبی کا بیان ہے کہ مجنوں کا افسانہ اور اس کے اشعار بنو امیہ میں سے کسی شخص کے وضع کردہ ہیں۔ اگر تمام شاعرانہ مبالغوں ور روایاتی اضافوں کو علٰحدہ کر دیا جائے تو لیلیٰ مجنوں کا افسانہ بہت سادہ و مختصر الفاظ میں صرف اس قدر رہ جاتا ہے کہ:۔ قیس عورتوں ی ایک جماعت میں لیلیٰ کو دیکھتا ہے اور اولین نگاہ میں عاشق ہو جاتا ہے، پھر اپنا اونٹ ذبح کر کے اس جماعت کی دعوت کرتا ہے، یلیٰ بھی اس سے محبت کرنے لگتی ہے۔ مگر لیلیٰ کا باپ شادی پر راضی نہیں ہوتا اور ایک شخص ورد بن محمد العقیلی سے نکاح کر دیتا ہے، یس کو یہ معلوم کر کے سخت صدمہ ہوتا ہے اور نجد کی پہاڑیوں اور وادیوں میں پاگلوں کی طرح نیم عریاں حالت میں سر ٹکراتا پھرتا ہے اور اشعارِ فراق پڑھتا رہتا ہے۔ کبھی کبھی اسے لیلیٰ بھی نظر آجاتی ہے اور آخرکار وہ اسی عالم مرادی میں ایک دن مرجاتا ہے۔

ریگستانِ عرب کی اس سادہ کہانی میں عجمی رنگ آمیزیاں سب سے پہلے نظامیؔ گنجوی نے اضافہ کیں جن کے خمسہ میں مثنوی لیلیٰ مجنوں بھی شامل ہے۔ بعد کو ہاتفیؔ اور امیر خسروؔ نے بھی اس فسانہ کو مثنوی کی صورت میں پیش کیا اور رفتہ رفتہ یہ واقعہ عجم کی شاعری کا ایک خاص زو بن گیا جس سے اردو نے بھی فائدہ اٹھایا۔ مولانا رومؔ کی مثنوی میں بھی لیلیٰ کے بہت سے واقعات منظوم کئے گئے ہیں۔ لیکن وہ سب عبیرات تصوف ہیں اور واقعیت سے انہیں کوئی واسطہ نہیں۔

(نیازؔ)

نیاز نامہ

عشرت رحمانی

۱۹۳۴ء کے اوائل کا ذکر ہے۔ سردی کا موسم شباب پر تھا۔ اور پھر لکھنؤ کا شباب، گل پوش و گل بداماں، جس کی بہار و خزا دونوں فردوس نشاں۔ اسی مرحوم لکھنؤ کے ایک غیر شاعرانہ نام کے محلہ گھسیاری منڈی میں ایک مختصر بزم شعر و ادب برپا ہے۔ چند نووارد تشنگان ادب اس ادبی فضا میں اجنبیوں کی طرح کسی مخصوص ذات کو تلاش کرتے داخل ہوتے ہیں جس کی صفات سے غائبا تعارف تو ہے مگر ملاقات کا شرف حاصل نہیں۔ اور ذرا سی دیر میں رسمی تعارف کے بعد انھیں اس بزم میں اس طرح باریابی نصیب ہو ہے جیسے یہ اسی مقصد سے آئے نہیں بلکہ صاحب خانہ کے بلائے ہوئے ہیں۔ ابتدائی مصافحہ و معانقہ کے رسمی تکلفات آناً فاناً ختم ہو بے نیازی اور نیازمندی کے مراحل کچھ اس طرح طے پا گئے کہ احساس کو ذرا بھی زحمت نہ ہوئی۔

یہ تھی نیاز فتحپوری کی "بزم نگار" —— یعنی 'نگار' کا دفتر اور نیاز صاحب کا دولت کدہ —— نوواردوں میں یہ نیازمن بھی شامل تھا۔ میری طالب علمی کا زمانہ تھا اور کالج کی تعطیلات کے زمانہ میں میں رامپور آیا ہوا تھا۔ چند علم دوست احباب کے ساتھ ادبستانِ لکھنؤ کی سیر کا پروگرام بنا اور ہمارا مختصر قافلہ دیارِ رنگ و بو پہنچ گیا۔ وہاں کے نامور ادیبوں اور شاعروں سے ملاقاتیں ہو اور اسی زمرہ میں نیاز صاحب کی خدمت میں بھی حاضری ہوئی —— یہ وہ دور تھا جب میرے عزیز دوست مولانا عزیز اللہ خاں مرحو و مغفور رامپور سے ماہنامہ نیرنگ شائع کیا کرتے تھے۔

مجھے اسکول کے زمانہ ہی سے شعر و ادب کا چسکا تھا۔ نیرنگ کے علاوہ نگار۔ الناظر اور مرقع میں اپنا ابتدائی کلام اور طالب علمانہ مضامین شائع ہو جانے سے اپنے ادیب اور شاعر ہونے کی خوش فہمی میں مبتلا تھا۔ نگار کے لئے غزلیں بھیجیں تو نیاز صاحب نے لکھا۔ "میں آپ کے ذوقِ شعری کا معترف ہوں اپنے بارے میں ذرا تفصیل سے لکھئے تاکہ مزید مطالعہ کا موقعہ ملے" یہ ایسی سن تھی جسے پانے کے بعد اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھنا شروع کر دیا اور یہی سبب تھا کہ لکھنؤ پہنچ کر سب سے زیادہ مجھے نیاز صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے اور اپنا مزید تعارف کرانے کا شوق تھا اور اس لئے بھی کہ میں ان کی سحر نگاریوں کا گرویدہ تھا۔ ان کے اور نگار کے بارے میں دوستوں اور بزرگوں سے بہت کچھ سن چکا تھا بہت کچھ، میں اچھا بُرا سب ہی شامل تھا۔ کوئی کہتا "صاحب، نیاز کا طرزِ نگارش۔ سبحان اللہ۔ آفت ہے، قیامت ہے، نثر میں شاعری کرتے ہیں۔ ترکی کے تامق کمال کا سا اعجا اور ٹیگور کے سحرِ بنگالہ کا جمال دیکھنا ہو تو نیاز کا انشائے لطیف دیکھئے" کوئی کہتا "نیاز کے ادیبانہ کمال میں کلام نہیں۔ مگر آدمی بڑے مغرور اور بد دماغ ہیں۔ کسی سے سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتے اور نہ اپنے مقابلہ میں کسی دوسرے کو خاطر میں لا ہیں" کسی کا خیال تھا۔ "نیاز —— لطیف و بدیع طرزِ انشا کے مالک ہوتے ہوئے نہایت دلکش و پرکیف شخصیت رکھتے ہیں" وغیرہ وغیرہ۔ اور مجھے یہ گمان تھا کہ نیاز صاحب بہرحال مجھے شاعر سمجھتے ہیں۔ اس وقت ہندوستان بھر میں چند ادبی رسائل تھے جن میں 'نگار' کا پایہ سب سے بلند تھا۔ اور پھر اس میں میرا کلام شائع ہوتا تھا اور نیاز جیسا صاحب طرز ادیب اور باکمال

لقاد میری رطب ویابس کا معترف تھا۔ جب کوئی نیاز صاحب کی بد دماغی کا ذکر کرتا میں اسے حاسد سمجھتا اور کہتا کہ جو شخص ایک گمنام طالبعلم کے چند اشعار دیکھ کر اس کی غائبانہ تعریف کے لئے اس کھلے دل سے آمادہ ہوجائے وہ مغرور اور بد دماغ کیسے ہو سکتا ہے۔

جس بزم نیاز کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ اس میں مولانا وصل بلگرامی مرحوم اڈیٹر ماہنامہ مرقع۔ مولانا عبدالباری آسی مرحوم، پروفیسر گوپتی سہائے۔ فراق گورکھپوری اور لکھنؤ کے چند مخلص شعراء و ادباء شریک تھے۔ نیاز صاحب نے ہمارا سب سے تعارف کرایا۔ میری سرت کی انتہا نہ تھی کہ بیک وقت اتنے مشاہیر سے نیاز حاصل ہوا۔ وصل صاحب اس محفل کی خاص رونق تھے۔ وہ بڑھ بڑھ کر سب حضرات ے یکے بعد دیگرے شعر خوانی کی فرمائش بھی کرتے اور داد دینے میں بھی پیش پیش رہتے۔ چندے بعد کھانے پینے کا دور ہوا گرم گرم چائے ی گئی اور میٹھے نمکین کھانے اڑاتے رہے۔ یہاں بھی وصل صاحب ہی سب سے آگے رہے۔ وہ کھانے اور کھلانے دونوں ہی میں بڑھ چڑھ ر ثابت ہو رہے تھے۔ نیاز صاحب ایک طرف بیٹھے اپنے ہی دسترخوان پر ایک پر تکلف مہمان ثابت ہوتے رہے۔ ان کا لطیف تبسم ورکم گوئی، فراق صاحب کے دلچسپ لطائف اور قہقہے۔ آسی صاحب کی یکسر خاموشی اور ان سب کے ساتھ وصل صاحب کا مخصوصانہ غل غپاڑہ ب مل جل کر ایک عجیب کیفیت برپا کئے ہوئے تھے۔ بزم نیاز کا یہ نقشہ آج تک میری آنکھوں کے سامنے ہے اور نیاز صاحب کے متعلق میرے دل و دماغ نے جو پہلا تاثر قبول کیا وہ اس کے بعد کی ملاقاتوں میں گہرا ہوتا گیا۔ ان کی پر وقار شخصیت اور علمی ادبی شان و شوکت کے متعلق جو باتیں سنی تھیں ان کا ثبوت ان سے قریب و دور رہ کر مجھے ملتا رہا۔ نیاز صاحب کے فاضلانہ کارناموں اور علمی ادبی صانیف پر میں محاکمہ کرنے بیٹھا ہوں اور نہ یہاں موقعہ ہے کہ اپنے ذاتی تاثر کو ادبی نقد و تبصرہ کی زد میں لانے کی لایعنی ولاطائل سعی روں۔ اس کے لئے دفتر درکار ہیں اور وہ دفتر صرف نگار کے مختلف ابواب اور چند خاص نمبروں سے بھی کم تر ہوں گے۔ نگار کے لکھوں کے دفاتر نیاز کی علمی بصیرت اور ادبی فضیلت کے شاہد ہیں اور ساتھ ہی ان کی شخصیت کے بھی کیونکہ نیاز صاحب کے علمی بی کمالات کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ہر رنگ اور ہر انداز میں وہ اپنے عقائد کی حقیقی عکاسی کرتے ہیں۔ ان کا ظاہر و باطن یکسا ر سپاٹ ہے جس میں ذرا بھی تصنع و تکلف کو دخل نہیں ہوتا۔ دوسرے الفاظ میں یہ سمجھئے کہ "وہ ولی ہیں تو کھلے اور کافر ہیں تو کھلے" قائق کی حزم و احتیاط یا نمود و نمائش کے لئے پوشیدہ رکھنا فطری طور پر وہ کسر شان سمجھتے ہیں، اور یہی سبب ہے کہ بعض لوگ ن کی اس خصوصیت کو 'انا' سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں یہ ان کے کردار کی پختگی اور خلوص و دیانت کی صداقت ہے جسے وہ پوشیدہ رکھنا بھی چاہیں تو نہیں رکھ سکتے۔ یہی سبب ہے کہ خواہ وہ "شہاب کی سرگزشت" یا "شاعر کا انجام" کے مصنف حیثیت میں ہوں۔ یا انتقادات علم و ادب کے مبصر و مفسر کی شان میں ہر رنگ ان کے انداز فکر کی شناخت کرنے والے انھیں ا ہی دیکھیں گے۔ اور تقریباً نصف صدی سے دیکھتے آئے ہیں۔

غرض ان کی تحریر و تقریر کردار کی خوبی لہجہ و بہرہ جو نمایاں رہتی ہے۔ پابندی وضع، حفظ مراتب اور روابط و ضوابط میں اسی خلوص حاد پایا جاتا ہے۔ نیاز کم آمیز تو ہیں اور نازک مزاج بھی جو ان کی نفاست طبع کا خاصہ ہے۔ لیکن قریب تر مطالعہ کے نتیجہ میں بلاخوف ردید کہہ سکتا ہوں کہ وہ تنگ مزاج ہیں نہ بد دماغ۔ مخصوص احباب کے ساتھ شگفتہ مزاجی کے عالم میں دیکھئے تو باغ و بہار لیکن بت ناجنس میں وہ ہزار کوشش کے باوجود اپنی تیوری سے بل جدا نہیں کر سکتے۔ دوستوں کے دوست اور دشمنوں کے دشمن ہیں۔ اس صوصیت کی تصدیق کے لئے ان کی زندگی کے بیشمار واقعات موجود ہیں۔

دوست نوازی کا صرف ایک ہی واقعہ پختہ ترین دلیل کے طور پر کافی ہے۔ سابق صوبہ سرحد کے ایک خاص دوست کی بیوی کی دفات گی۔ نیاز صاحب اپنے دوست کے اس شدید حادثہ پر بیحد مغموم تھے۔ اس لئے کہ دوست موصوف کو مرحوم بیوی کی مفارقت سخت شاق

تھی۔ نیاز صاحب نے ہر چند ان کی دلجوئی کی اور طرح طرح کے جتن کئے کہ وہ اس صدمے کو بھلا دیں۔ لیکن بے سود۔ آخر نیاز صاحب آخری تدبیر یہ پیش کی کہ دوست عقد ثانی پر آمادہ ہو جائیں مگر اس میں قباحت یہ تھی کہ مرحومہ نے ایک کمسن بچہ چھوڑا تھا اور اندیش تھا کہ بجائے سوتیلی ماں کا سلوک اس کے ساتھ کیسا ہو۔ مگر نیاز صاحب کو ہر حالت میں دوست کے غم کا مداوا تلاش کرنا تھا۔ انھو نے اس بچہ کو متبنّیٰ بنا لیا اور دوست کی دوسری شادی کرا دی۔ اس طرح اجڑا گھر بھی بس گیا اور بچہ کی پرورش کا قابلِ اطمینان انتظام ہو

نیاز صاحب نے اس بچہ کو حقیقی اولاد کی طرح ناز و نعم سے پالا بلکہ اپنی اولاد سے زیادہ شفقت کا برتاؤ کرتے رہے۔ دیکھنے وا کو گمان بھی نہ ہونے پایا کہ وہ نیاز کی اپنی اولاد نہیں کسی اور کی ہے۔ جنھیں اصلیت کا علم تھا وہ ان کے اخلاص کے معترف تھے اس لئے انھیں یہ بات خلاف توقع معلوم ہوتی تھی۔ آخر تعلیم و تربیت کے بعد اس دینی اولاد کی شادی اپنی ہی بچی سے کر دی تاکہ اسے اپنے سات سے جدا نہ ہونے دیں۔ یہ بچہ جوان ہو کر اپنے حقیقی باپ کو چچا اور نیاز صاحب کو حقیقی باپ ہی سمجھتا تھا اور اب بھی سمجھتا ہے۔ کیونکہ لڑک نے عین نوجوانی کے عالم میں وفات پائی اور یہ دینی بیٹا اب بھی ان کے سایۂ عاطفت میں ہے۔

اس کے علاوہ بیشمار واقعات نیاز صاحب کے اخلاص و محبت کی مثال میں گنائے جا سکتے ہیں۔ اور ایسی مثالیں بھی ہیں کہ بعض ان احباب کے لئے ایثار و قربانی سے گریز نہیں کیا جنھوں نے ان کے ساتھ غیر مخلصانہ سلوک کیا۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا نیاز صاحب عقائد کے معاملہ میں نہایت پختہ، صاف باطن اور صاف گو ہیں۔ خواہ یہ تعلق خدا کا کیوں نہ ہو۔ اس کے ساتھ ان کا کیش ترک رسوم ہے۔ اوہام کی بت شکنی ان کا شعار رہا۔ ہر باطل کے رد کے لئے وہ سدا اس شدت سے دلیر اور بیباک نظر آئے کہ کڑی سے کڑی نکتہ چینی اور بڑے سے بڑے خطرہ کی کبھی پرواہ نہ کی۔ چنانچہ نگار کے استفسارات کے مباحث پڑھ کر بعض قارئین کو ان کے دینی عقائد سے اختلاف رہا۔ بعض نے انھیں ملحد اور منکر سمجھا۔ لیکن انھوں نے لوگوں کی غلط فہمی سے خا ہو کر اپنی پختہ دینداری میں کبھی فرق نہ آنے دیا اور اس کٹر مردِ مومن نے بیجا نکتہ چینی سے ڈر کر کسی باطل کو حق کہنا گوارا نہ کیا۔

نیاز صاحب حق و انصاف پر کبھی ظلم ہوتے نہیں دیکھ سکتے۔ کسی کمزور کو ایک زبردست کے چنگل میں دبا ہوا دیکھ کر وہ بیتاب ہو جاتے ہیں اور اس کی نجات کی ہر ممکن سعی اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

صنفِ نازک کا مسئلہ ان کے نزدیک ایک ایسا لطیف اور مقدس باب ہے جس کی اہمیت اور احترام مذہبی فریضہ سے کم نہیں اور تحریر و تقریر بلکہ ہر ممکن عمل سے اس باب کی آراستگی میں وہ سدا ساعی رہے۔ یہ ان کی قلبی پاکیزگی اور فطری لطافت کا ایک بین ثبوت ہے۔ عورت ان کے ادب کا ایک دلکش باب ہے اور ان کی زندگی کا ایک مقدس مرحلہ۔ جس کی مجبوری و بیکسی پر ان کا دل بےچین ہو جاتا ہے۔

تقریباً ۲۵ سال پہلے کی بات ہے لکھنؤ کے ایک فلسفی محترم بزرگ (مولانا) کی شدید مخالفت کے لئے وہ سینہ سپر ہو کر میدان میں اتر آئے تھے۔ محض اس لئے کہ مولانا موصوف نے اپنے ایک مرحوم دوست کی بیوہ خاتون سے عقد ثانی کیا اور چند دن بعد ہی اس بیچاری کو طلاق دے دی۔ خاتون مذکور بے دست و پا دربدر ہو گئی اور اس نے نیاز صاحب کو تمام واقعہ لکھ کر بتایا کہ اس کو ابتلا میں ان محترم مولانا نے ہمدردی جتا کر سہارا دینے کا وعدہ کیا لیکن چند ہی روز بعد علیحدگی اختیار کر لی اور میں اب بے یار و مددگار ہوں۔ کیونکہ خاندانی مخالفت کو برداشت کر کے میں نے عقد ثانی کیا تھا اور مولانا کی محترم ذات میں حقیقی سرپرست کا آسرا حاصل کیا تھا جو بالکل فریب ثابت ہوا۔ چنانچہ نیاز صاحب نے کسی کے اثر و رسوخ کی پرواہ کئے بغیر ایک بے بس معزز خاتون کی حرمت کی حفاظت کا بیڑا اٹھایا اور اس کی حمایت میں ندائے حق بلند کر کے مولانا موصوف کی زیادتیوں کو بے نقاب کر دیا۔ نیاز صاحب کی

صیت گوناگوں خصائص کی حامل ہے اور ان کے ادبی کمالات کی متنوع صفات کی طرح ان کی ذات میں بھی رنگا رنگی پائی جاتی ہے۔ وضع پابندی کے مثل نیاز صاحب اخلاق و عادات میں مستحکم اور معمولات کے سختی سے پابند ہیں۔ کسی مجبوری کے تحت وہ کوئی بات یا کام ف عادت یا خلافِ معمول کرنا گوارا نہیں کرتے۔ ان کی طبیعت میں گداز اور عصبیت کی متوازی کیفیات پائی جاتی ہیں۔ انھیں کسی شاذ ہی کسی خوشی کے وقت یا تفریح و تفنن کے لمحات میں قہقہہ لگاتے دیکھا ہو۔ طنز و مزاح کے اظہار میں بھی وہ اکثر محتاط ہی نظر تے ہیں۔ ان کی گفتگو میں کبھی کسی موقعہ پر مزاح کا پہلو نمایاں ہو تو سامعین لطف اندوز ہو کر کتنا ہی ہنسیں مگر ان کا تبسم زیرِ لب خندۂ بے محابا نہیں ہوتا۔ البتہ بعض اوقات اہم علمی ادبی یا سیاسی مباحثے کے دوران دیکھنے میں آیا ہے کہ اگر ان کے مدمقابل بحثی پر اتر آئیں تو وہ اپنے دلائل منوانے کے لئے سخت گیر ہو جاتے ہیں اور بیجا ضد سے تو انھیں ازلی چڑھ ہے۔ ایسی حالت میں اکثر یت درجہ تلخ نظر آتے ہیں۔ یہ بھی ان کی دیانت ثقاہت کی ایک اور دلیل ہے۔

میں آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت کے دوران ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۷ء تک لکھنؤ میں مقیم رہا۔ اس دوران میں نیاز صاحب کی خدمت خاصی قربت حاصل رہی۔

اگرچہ میں ہمیشہ اپنے کو ان کے مقابلہ میں ایک خورد کی حیثیت ہی سے پیش کرتا اور کوشش میں رہتا کہ ان کے فیضِ صحبت مستفید ہوتا رہوں۔ چنانچہ میں نے اس زمانہ میں ان سے کچھ حاصل کرنے کے موقعے نکال ہی لیے۔ تاہم نیاز صاحب کی مخصوص داری اور طبعِ محتاط نے کبھی بھی مجھ پر بزرگانہ رعب ڈالنے یا صحیح غلط سمجھائے بغیر اپنی ضد منوانے کی سعی نہ کی۔ میں حفظِ مراتب اظ کرتا مگر وہ مجھے اپنا ہمعصر و ہمسر تصور کرتے اور میرے ان کے درمیان علمیت کے لحاظ سے بعد المشرقین ہوتے ہوئے ہر لہ میں برابری کا سلوک روا رکھتے۔ نیاز صاحب کا مکان یا دفتر نگار لکھنؤ ریڈیو کی پناہ گاہ تھی۔ کوئی دشواری آپڑی نیاز صاحب شورہ سے حل ہو جاتی۔ کم سے کم وقت میں اہم سے اہم موضوع پر تقریر کرانا ہے۔ میرے افسر، میرے ماتحت اور میں خود حسب رت نیاز صاحب کے پاس کسی وقت بھی پہنچ جاتے اور جتنی دیر میں جو کچھ چاہتے لکھوا لاتے۔ حتیٰ کہ ایک ایک گھنٹہ کی مدت کے نشری ے میں نے نیاز صاحب سے دو تین دن میں لکھوائے ہیں اور وہ نشریے شاہکار ثابت ہوئے ہیں۔ لطف یہ تھا کہ بعض اوقات صاحب واقعی طور پر بیحد مصروف ہوتے۔ ریڈیو کے عملہ کا کوئی رکن ان کے پاس جاتا اور تقریر یا ڈرامے کے لئے درخواست کرتا ہوتے ہی انکار کرتے اور اصرار کے باوجود مسلسل انکار جاری رہتا۔ کئی روز اسی طرح گزر جاتے۔ آخر میں خود حاضر ہوتا نہایت مجبور اور مضمحل صورت بنائے ان کے سامنے بیٹھ جاتا۔ وہ پوچھتے۔ 'کہئے کیا حال ہے؟' میں کہتا "بہت برا" فرماتے "کیوں ت؟" میں رفتہ رفتہ اپنا اضمحلال بڑھانے کی کوشش کرتا اور ان کی تشویش میں اضافہ ہوتا جاتا۔ وہ سمجھتے میں بیمار ہوں۔ اور بس۔ نہایت تناک اور مشفقانہ انداز میں فرمانے لگتے۔ "صاحب لوگ اپنی صحت کی طرف مطلق توجہ نہیں کرتے۔ کام کی آخر کوئی حد ہوتی ہے۔ پابندیٔ ت قطعاً آپ لوگوں کی زندگی میں ہے ہی نہیں۔ کھانے پینے اور آرام کی طرف کوئی دھیان نہیں۔ صحت خراب نہ ہو تو کیا ہو۔ دن ہے تو پروگراموں کی فکر ——" اور میں موقعہ نکال کر دبی زبان سے بول پڑتا۔ "جی وہ اسی فکر میں تو آیا تھا۔" "کیا مطلب؟" س استفسار پر میں پہلے کارکن کی درخواست کی سفارش کرتا اور اس پروگرام کی اہمیت پر مختصر گفتگو کرنے لگتا۔ اس وقت صاحب کا چہرہ جو اس سے پہلے تشویش و تفکر ہوتا جا رہا تھا اس پر اطمینان کے ساتھ خفیف تبسم کی لہر نمودار ہونے لگتی اور ں" کہہ کر اب بھی مجھے اپنی صحت کو مقدم سمجھنے اور غیر معمولی مصروفیات میں احتیاط برتنے کی تاکید کرنے لگتے۔ گویا وہ شعوری اور وری طور پر مجھ سے اظہارِ شفقت کے لئے اچانک گریز پر آمادہ ہونا نہ چاہتے تھے اور میری درخواست کو براہ راست رد کرنے یا ٹالنے

کے بجائے اسے نصیحت کے پیرایہ میں یوں الٹ پلٹ کر رکھنا چاہتے۔ "بہر حال آپ کو اپنی صحت سے لاپرواہی برتنے کا کوئی حق نہیں۔" عرض کرتا۔ "جی ہاں بجا ہے مگر کیا کیا جائے۔ اچھی چیزیں نشر کرنے کو جی چاہتا ہے۔ پروگراموں کی خرابی دیکھی نہیں جاتی۔ اس میں نیک نامی پر حرف آتا ہے اور طبیعت بھی منغض ہوتی ہے۔ لے دے کے چند حضرات ہیں جن کی مدد سے کام چلاتے ہیں۔ آپ کی بے پناہ مصروفیت میں عرض کرنے کو بھی جی نہیں چاہتا مگر ــــ اور 'مگر' کے آگے مجھے خاموش دیکھ کر مسکرانے لگتے۔ فرماتے۔

"ہاں مصروفیت تو آپ کو معلوم ہے۔ میرا کام بھی تو کچھ اسی قسم کا ہوا۔ اور کچھ الجھنیں بھی ــــ تاہم ــــ اچھا تو یہ چاہئے کب تک؟"

یہ اس تقریر یا فیچر ڈرامے کی طرف اشارہ ہوتا جس کی فرمائش کی جا چکی ہے اور میں جلدی سے کہتا۔ "جی اب تو بہت کم وقت ہے پریشانی تو یہی ہے۔ پروگرام چھپنے جا رہے ہیں اور مسودے کے بغیر کام نہیں چلے گا یا تقریر ریکارڈ کر کے نئی دہلی بھیجنی ہے اور دو روز باقی ہیں" وہ سمجھ جاتے کہ میری بیماری کیا ہے اور اس کا علاج صرف ان ہی کے پاس ہے۔ میں ان کے اقرار کے بغیر ٹلنے والا نہیں" چنانچہ اب زیادہ اصرار کی نوبت ہی باقی نہ رہتی۔ اور وہ کہدیتے "میں سمجھ گیا آپ نہیں مانیں گے۔ دو راتیں خراب کرنا پڑیں گی ــــ لکھ دوں گا ــــ خیر ــــ ہاں تو لیجئے ــــ لکھنؤ اسٹیشن کا معیار بہر حال برقرار رکھنا چاہئے۔ اسٹاف کے لوگ محنتی تو ہیں لیکن ذرا وقت سے پہلے اطلاع دے دیا کریں"۔ ایسے بے شمار مواقع آتے رہے اور نیاز صاحب کی پُر خلوص شفقت ہمارے شریک حال رہی۔ اس کے علاوہ اکثر زبان و ادب کے مسائل میں ان سے مشورے حاصل کئے جاتے رہے۔ ان حالات میں نیاز کی پرخلوص شخصیت کو اگر کوئی ناواقف ناروا تجزیہ و تبصرے سے ملوث کرنے کی سعیٔ بیجا کرے تو اس کی ہٹ دھرمی کو کون قبول کرے گا ــــ نیاز صاحب کو بعض بر خود غلط اصحاب نے اکھڑ بھی کہا لیکن لطف یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ان سے کبھی ملا ہے تو جانتا ہے کہ وہ اپنے کسی مخاطب کو خواہ وہ کوئی ہو اور چھوٹا ہی کیوں نہ ہو۔ یا ان کی اس کے ساتھ کتنی ہی بے تکلفی کیوں نہ ہو کبھی آپ سے تم نہیں کہتے۔ علاوہ ازیں ان کی طبیعت میں جو لطیف گھلاوٹ اور مزاج میں تکلف و احتیاط ہے اس کے لحاظ سے بھی ان میں 'اکھڑ پن' کا ہونا ممکن نہیں۔ ہاں وہ انسان ہیں اور انسانیت کے جامہ میں کوئی ذات بے عیب نہیں ہو سکتی ــــ البتہ ان کے محاسن کے مقابلہ میں ان کے مخالفین بھی ان کے معائب کو کم گنتی میں شمار کر پائیں گے۔ انسان دوستی اور ہمدردی کا مادہ ان کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ نیاز صاحب کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے لئے میرے سامنے بے شمار واقعات اور حالات ہیں لیکن اپنی کوتاہ قلمی سے شرمندہ اور وقت کی قلت کے ساتھ اپنی علالت کے سبب معذور رہوں۔ ورنہ جی چاہتا ہے کہ 'نیاز نمبر' میں ایک طول طویل داستان میرے قلم سے لکھی جاتی جو کم از کم اس مکمل شمارہ پر حاوی ہوتی۔

آخر میں نیاز صاحب کی ایک خصوصیت کا مختصر ذکر ضروری سمجھتا ہوں اور وہ ہے ان کی 'خودی'، جو نہایت پر تکلف حسین و جمیل اور پر جلال کیفیت میں کہیں سات پردوں میں تبسم نظر آتی ہے اور کہیں نمایاں ہو کر اس معصوم دوشیزہ کا انداز اختیار کرتی ہے جو کہیں گستاخ نگاہوں سے گریز کی خاطر بدن چراتی ہے یا نظر بچا جاتی ہے لیکن اگر کوئی اس کے مقابل آکر خواہ مخواہ چھیڑ چھاڑ پر دلیر ہو جائے تو وہ دندان شکن وار کئے بغیر نہیں رہتی اور یہی نیاز کی انانیت اور خودی کا نانہ ہے۔ جسے غرور و تمکنت کے نام سے غلط تعبیر کیا جاتا ہے۔ ورنہ وہ نیازمندوں کے نیازمند اور اخلاص پسندی کے لئے مخلص شفیق ہیں۔ ساتھ ہی نامنصفی و ریا سے انھیں سخت بیر ہے یہی ان کے کردار و شخصیت کا روشن ترین پہلو ہے۔ خذ ما صفا و دع ما کدر۔

اُستادِ گرامی

آفتاب علی خاں

سنہ ۱۹۱۲ء کی بات ہے میں گورنمنٹ ہائی اسکول فتح پور کی ساتویں جماعت میں تعلیم پا رہا تھا۔ اس زمانے میں گورنمنٹ ہائی اسکول کے نویں ردسویں جماعت کے طلباء میں یہ تذکرہ سننے میں آیا کہ نیاز صاحب فتح پوری نے اسلامیہ اسکول کے بانی و سرپرست مولانا ظہور الاسلام صاحب شہر کے دیگر معزز حضرات کی خواہش پر اسلامیہ اسکول کو ترقی دینے کی خاطر ہیڈ ماسٹر بننا منظور کر لیا ہے۔ گورنمنٹ ہائی اسکول کے نویں اور سویں جماعت کے طلبہ نے اپنے لئے بھی اسے نیک ساعت سمجھا اس لئے کہ وہ نیاز صاحب کی ذاتِ گرامی سے استفادہ کرنا چاہتے تھے اس ت تک نیاز صاحب سے میں شرف نیاز حاصل نہ کر سکا تھا لیکن ان کے فضل و کمال کے تذکرہ نے میرے دل میں اُن سے ملنے کا اشتیاق کر دیا تھا۔ تعلیم کے دوران میں اچانک بیمار پڑ گیا میری علالت نے بڑا طول کھینچا جس کے نتیجہ میں سالانہ امتحان کی شرکت سے محروم ۔ گرمیوں کی چھٹیاں ختم ہونے پر میں نے اس امر کی سعی کی کہ مجھے ساتویں سے ترقی دیکر آٹھویں جماعت میں لے لیا جائے لیکن میں اس کوشش کار نہ ہو سکا۔ یہاں کی ناکامی نے مجھے دوسری طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا اور نیاز صاحب کی خدمت میں اس غرض سے حاضر ہوا کہ وہ مجھے اپنے اسلامیہ اسکول ٹھویں جماعت میں داخل فرمالیں۔ نیاز صاحب نے میری صلاحیت کا اندازہ لگانے کا ایک وقت مقرر فرما دیا اور میں امتحان کے لئے معینہ وقت پر نچ گیا۔ امتحان کے بعد نیاز صاحب نے مجھے میری تمنا کے مطابق آٹھویں جماعت میں داخل فرما کر میرے قلب پر اپنی شفقت و عظمت کا پہلا س چھوڑا۔ اس کے بعد سلسلہ تعلیم شروع ہو گیا۔ نیاز صاحب کی اعلیٰ و ارفع ذہنی صلاحیتوں کا مجھے یوں بھی اندازہ ہوا کہ گورنمنٹ ہائی اسکول کے تذہ جن مضامین کو دیر اور دقت کے بعد ذہن نشین کرا پاتے۔ نیاز صاحب ان مضامین کو کم وقت میں اس طرح ذہن نشین کرا دیتے کہ پھر طالبعلموں بھی بھٹکنے کا امکان ہی نہ رہ جاتا۔

نیاز صاحب کی شفقت، عظمت، قابلیت اور صلاحیت کے باعث اُنکے شاگرد اُنکی ذات سے گہری عقیدت رکھتے تھے۔ اگرچہ اُن کے برتاو جاہ و جلال کو دخل تھا تاہم طلبہ احترام کے حدود سے گزر کر بیجا شوخی کی حد میں داخل نہ ہوتے۔ نیاز صاحب غریب اور ہونہار طالب علموں کا خیال رکھتے اور انکی ممکنہ مدد میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے۔ اسی زمانے میں اسلامیہ اسکول (عربی) کے ہیڈ مدرس اوّل ایک جیّد عالم مولانا ر صاحب تھے نیاز صاحب نے اُنسے عربی پڑھی تھی۔ اسلامیہ اسکول انگلش اور اسلامیہ اسکول عربی دونوں کے سرپرست مولانا ظہور الاسلام صاحب بھی بڑی ی کے بزرگ تھے۔ یہ دونوں حضرات محسوس کرتے کہ نیاز صاحب کی آمد کے بعد اسلامیہ اسکول (شعبہ انگلش) کو جو فروغ حاصل ہوا، وہ سے پہلے کسی ہیڈ ماسٹر کے زمانے میں نہیں ہوا۔ اور جو عزت نیاز صاحب کی ہے کسی دوسرے ہیڈ ماسٹر کی نہیں تھی۔ گورنمنٹ ں سے اکثر طلبہ نام خارج کرا کے اسلامیہ اسکول میں داخلے کو سعادت اور کامرانی کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے۔ گورنمنٹ ہائی اسکول کے

اساتذہ اسناد کے اعتبار سے نیاز صاحب سے بڑھے ہوئے تھے لیکن نیاز صاحب کی تعلیمی اور تدریسی صلاحیتوں کا اُن سے کوئی مقابلہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں ایک سال تک اسلامیہ اسکول میں رہا۔ نیازؔ صاحب کی عنایتوں کے تذکرے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں۔ میں نے ان کی شفقتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا لیکن اسے کیا کہیئے کہ آٹھویں جماعت کی کامیابی کے بعد میرے لئے اسلامیہ اسکول میں پڑھنے اور رہنے کا رستہ ہی بند تھا۔ چنانچہ مجھے آگے پڑھنے کے لئے الہ آباد جانا پڑا۔ وہاں داخلہ کے مسئلے کو بھی میں نے نیاز صاحب ہی کے تعاون سے حل کیا۔ اسکول اور تعلیم کو خیرباد کہہ کر ایک زمانہ ہو چکا ہے، لیکن نیاز صاحب کی ہمدردی کا میرے دل میں وہ گہرا نقش ہے جس پر ماضی کا غبار اثر انداز نہیں ہوتا اور یہ نقش تا حیات تابندہ رہے گا۔ میرا خیال ہے کہ نیاز صاحب کا ہر شاگرد اُن سے اسی قسم کی گہری عقیدت رکھتا ہے، وہ بغیر کسی امتیاز کے ہر شاگرد کو ایک جیسا سمجھتے تھے اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ بعض اولاد بعض باپ کو بعض صفات کی بنا پر زیادہ پیاری لگنے لگتی ہے لیکن ایک باپ کی نظر میں سارے بچے بچے ہی ہوتے ہیں۔ طلبہ کی اخلاقی نگرانی، اُن کے سرپرستوں کو ہدایات، ان سے برتاؤ، نیازؔ صاحب کی یہ ساری خوبیاں ناقابلِ فراموش ہیں۔

نیازؔ صاحب، ایک شاعر اور ادیب کی حیثیت سے بھی خاصی شہرت حاصل کر چکے تھے، اُن کا کلام اس زمانے کے معیاری، پرچوں میں شائع ہوتا تھا اور بڑے ذوق و شوق سے پڑھا جاتا تھا۔ میرے ذہن میں اب تک ان کے کلام کا کچھ حصہ محفوظ ہے۔ اس جگہ صرف ایک غزل اس زمانے کی یادگار کے طور پر درج کرتا ہوں۔

غزل عہ

مژہ کے دامن پہ کھیلتا تھا جو فتنہ اُس چشمِ فتنہ زا کا
وہ تیرِ دلدوز مرحمت تھا، پیامبر تھا مری قضا کا

ہمیشہ تم نے چھپائی صورت، یہ تشنہ کامانِ دردِ اُلفت
مٹا کئے زیرِ نقشِ حیرت، تماشا دیکھا کئے وفا کا

نہیں گلہ کچھ ترے کرم سے، ہمیں تو اس بات کا ہے رونا
ذرا سا دل وہ بھی زخم خوردہ، خود اپنے ہی شوقِ التجا کا

میں نقشِ حیرت بنا ہوا ہوں، خبر نہیں کیا میں دیکھتا ہوں
پلک نہ جھپکے تو کیا میں جانوں کہ جلوہ تھا حسنِ خود نما کا

وہ خونچکاں سوزشِ محبت، وہ زخم خوردہ شرارِ اُلفت
وہ انکے عارض پہ کیفِ بہجت، ہے رنگ حسرت مری دعا کا

لحد میں جو سو رہا ہے جاکر، جو خاک میں مل رہا ہے مٹ کر
اُسے نہ چھیڑو نیازؔ ہے وہ، تھکا مسافر رہِ وفا کا

عہ۔ یہ غزل مارچ سنہ ۱۳ء کے نقاد میں شائع ہوئی تھی۔

E 3 JUL 1963

نیاز اور دلی

مُلّا واحدی

۱۹۱۲ یا ۱۳ کی بات ہے۔ چلچلاتی گرمی کی دوپہر تھی۔ مجھے بخار چڑھا ہوا تھا۔ اور میں زنانہ مکان میں لیٹا تھا کہ خواجہ حسن نظامی ایک صاحب کو ساتھ لیے میری عیادت کرنے آئے۔ فرمایا:۔ یہ مولانا نیاز فتحپوری ہیں، اخبار توحید کے ایڈیٹر۔

توحید، بھیا احسان الحق مرحوم، رئیس میرٹھ کا اخبار تھا۔ جس کا مضمون "کہو تکبیر" نوشتہ خواجہ حسن نظامی آج تک لوگوں نے فراموش نہیں کیا ہے۔

توحید کے پہلے ایڈیٹر خواجہ صاحب تھے۔ پھر نیاز صاحب کو اُن کا معاون مقرر کیا گیا تھا۔ توحید ہفتہ وار علمی، ادبی اور سیاسی اخبار تھا، اور اس کی حیثیت قریباً وہی تھی جو کلکتے کے "الہلال"، لاہور کے "زمیندار" اور دلی کے "ہمدرد" کی تھی۔ اس زمانے میں خواجہ صاحب بھی انگریزوں کے ویسے ہی مخالف تھے جیسے مولانا ابوالکلام، مولانا ظفر علی خاں اور مولانا محمد علی تھے۔ خواجہ صاحب کی البیلی اور نیاز صاحب کی پرشکوہ تحریروں نے توحید کو بہت مقبول کر دیا تھا۔

نیاز صاحب کی شہرت کی ابتدا ہو چکی تھی۔ میں نے اُن کا نام سنا تھا اور شاید ان کی کتاب "شہاب کی سرگزشت" سے بھی واقف تھا۔
ہلی ملاقات بالکل مختصر رہی۔ لیکن ۱۹۱۴ء میں نیاز صاحب حکیم اجمل خاں کے انگلش اسکول کے ہیڈ ماسٹر بن کر دلی تشریف لائے تو یرے ہاں ٹھہرے اور پورا ۱۹۱۴ء ہم دونوں کا بڑے اخلاص سے گزرا۔ انگلش اسکول حکیم اجمل خاں نے اپنے فرزند حکیم جمیل خاں اور اپنے خاندان ے دوسرے لڑکوں کے واسطے کھولا تھا، اور مولانا ابوالکلام آزاد کی تجویز پر نیاز صاحب کو اس کا ہیڈ ماسٹر بنایا تھا۔

۱۹۱۴ء میں میرا ہفتہ وار رسالہ خطیب نکل رہا تھا، نیاز صاحب حکیم اجمل خاں کے اسکول کی ہیڈ ماسٹری کے علاوہ خطیب میں علمی، ادبی ور مذہبی مضامین لکھا کرتے تھے۔ ۱۹۱۴ء میں اُن کی مذہبی تحریریں ادبی تحریروں کی طرح پسند کی جاتی تھیں۔

آجکل کی تو خبر نہیں، ۱۹۱۴ء میں نیاز صاحب نماز کے نہایت پابند تھے۔ بارہا ایسا ہوتا تھا کہ نیاز صاحب نے کہا سنیما جاتے وقت مجھے کیم اجمل خاں کے مکان سے لے لیجئے گا۔ میں نے اس وقت انھیں شریف منزل کی بجائے ہمیشہ شریف منزل کے سامنے والی مسجد میں عصر کی نماز پڑھتے ا۔ یہ وہی مسجد ہے جس کے زیر سایہ مرزا غالب کا گھر تھا۔ میں اور نیاز صاحب قریباً روزانہ فلم دیکھتے تھے اور نیاز صاحب فلم دیکھ کر کوئی نہ کوئی ضمون ضرور لکھتے تھے۔ "کیوپڈ اور سائیکی" انہوں نے کسی فلم ہی سے متاثر ہو کر لکھا تھا۔

۱۹۱۵ء میں نیاز صاحب بھوپال چلے گئے اور میرے پاس اپنی جگہ مولانا عارف ہسوی کو چھوڑ گئے۔ عارف صاحب سے نیاز صاحب کے برادرانہ علقات تھے۔ عارف صاحب کا رجحان سیاست کی طرف زیادہ تھا۔ میں نے خطیب کا باب سیاست ان کے سپرد کیا اور پھر اخبار انقلاب جاری کر کے انھیں قلاب کا کلی مختار کر دیا۔ عارف صاحب نے میدانِ سیاست میں بڑی ترقی کی۔ اخبار انقلاب انگریزوں کے عتاب کا شکار ہو گیا۔ تو عارف صاحب ا محمد علی کے روزنامہ ہمدرد میں پہنچ گئے۔ اس کے بعد خود دلی پراونشل کانگریس کمیٹی کی طرف سے اخبار کانگریس نکالا۔ لکھنا اور جیل جانا بس یہی

اُن کی زندگی تھی۔ عارف صاحب ۱۹۳۶ میں دنیا سے سدھارے ہیں تو پراونشل کانگریس کمیٹی کے صدر تھے۔

سیاسی آدمیوں میں اُن کا سا اخلاص میں نے کم دیکھا ہے۔ وہ نیاز صاحب کے تو خیر فدائی تھے، لیکن میرے ساتھ اور علامہ راشد الخیری خواجہ فضل احمد سید اور منشی عبد المجید خاں، ایڈیٹر مولوی کے ساتھ انہوں نے جو اخلاص برتا اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ انسانوں کے ساتھ ہی نہیں، کانگریس کے ساتھ بھی انھیں اخلاص تھا۔

۱۹۱۹ء میں مجھے نیاز صاحب کی دوبارہ ضرورت پڑی۔ سردار دیوان سنگھ مفتوں کا روزانہ اخبار رعیت، بھیا احسان الحق نے اور میں نے لیا تھا۔ نیاز صاحب سے درخواست کی گئی کہ چھٹی لے کر آجائیں اور رعیت کی چیف ایڈیٹری سنبھالیں۔ چنانچہ نیاز صاحب آگئے۔ اس دفعہ نیاز صاحب کا دلّی میں فقط تین مہینے قیام رہا۔ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے جو اب امیر جماعت اسلامی ہیں اخبار رعیت ہی کے سلسلے میں نیاز صاحب کی شاگردی اختیار کی تھی۔ مودودی صاحب ۱۹۱۹ء میں اٹھارہ انیس برس کے ہوں گے۔ نیاز صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ یہ اخبار نویسی سیکھنی چاہتے ہیں۔ تنخواہ نہیں لیں گے۔ بس ایک میز اور ایک کرسی کی ضرورت ہے۔

حکیم اجمل خاں کے اسکول کی ہیڈ ماسٹری اور بھوپال کی ملازمت کے وقت بھی نیاز صاحب نے لکھنا ترک نہیں کیا تھا۔ اور نیاز صاحب کی ادبیت کا آفتاب برابر بلند ہو رہا تھا۔ خاص طور سے علی گڑھ کالج کے طلبا اُن سے بے حد متاثر تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین (نائب صدر جمہوریہ ہند) اور کئی اور طالب علم، عبد الرؤف (ڈپٹی کلکٹر) نور الرحمٰن (بیمہ کمپنی والے) وغیرہ نیاز صاحب کے ادبی معتقد تھے اور نیاز صاحب سے ملنے کے لئے دلّی کے پھیرے کیا کرتے تھے۔ مولانا عبد الماجد دریا بادی کو بھی میں نے اول بار نیاز صاحب کے طفیل دیکھا۔ منشی محمد الدین خلیقی، سید ظفر احسن علوی، حکیم مجیب الدین بقائی نیاز صاحب ہی کی وجہ سے میرے گھر کی رونق بڑھاتے تھے۔ یہ تینوں انشا پرداز تھے۔ ان تینوں کے اور نیاز صاحب کے جمع ہو جانے سے میرے گھر میں بہار اُتر آتی تھی۔ ایسا معلوم ہونے لگتا تھا کہ گویا چمن میں مہکتے پھول کھل گئے۔

نیاز صاحب لئے دیئے رہنے والے آدمی ہیں، مگر بات کرتے ہیں تو انسان خوش ہو جاتا ہے۔ بات کرنے کا اللہ تعالےٰ نے انھیں سلیقہ دیا ہے ان کی باتیں جچی تلی اور معیاری ہوتی ہیں۔ باتوں کے معاملے میں وہ مولانا ابو الکلام کی صف میں کھڑے کئے جا سکتے ہیں۔

عارف صاحب اخبار رعیت سے بے حد ناراض تھے۔ کیونکہ رعیت کی پالیسی معتدل تھی۔ عارف صاحب اسے کیسے پسند کرتے۔ نیاز صاحب بھی اکسٹریمسٹ نہیں ہیں۔ عارف صاحب اکسٹریمسٹوں سے چار قدم آگے تھے۔ آخر ان کی دعا قبول ہوئی اور اخبار رعیت نے تین مہینے سے زیادہ عمر نہیں پائی۔

اخبار رعیت بند ہو گیا تو عارف صاحب نے جشن منایا۔ دلّی کی مشہور ڈیرہ دارنی موتی جان انداز کا میرے گھر پر گانا کرایا۔ موتی جان کا ذکر میں نے اپنی کتاب "میرے زمانے کی دلّی" میں کیا ہے۔ مضمون "نیاز اور دلی" سے اس ذکر کا تعلق ہے۔ لہٰذا اسے نقل کرتا ہوں:-

طوائفوں میں بھی اونچ نیچ ہے۔ خاندانی اور غیر خاندانی، شریف اور رذیل سب قسم کی طوائفیں ہوتی ہیں۔ خاندانی طوائفوں کو ڈیرہ دار کہا جاتا ہے۔ موتی جان، جن کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ اُن کا شمار دلّی کے بڑے ڈیرہ دار خاندان سے تھا۔ انھیں لکھنؤ کی ڈیرہ دارنیوں کی طرح امراؤ روسا کے لڑکوں کی تربیت کرتے تو نہیں سنا گیا۔ البتہ دلی کے ہندو مسلمان عمائدان کے درباری تھے۔ عشا کے قریب موتی جان کے ہاں دربار لگتا تھا اور اس دربار میں دلی کے ادیب اور شاعر اور امرا اور رؤسا شریک ہوتے تھے۔ موتی جان انتہا درجہ مہذب اور شائستہ خاتون تھیں۔ انداز تخلص تھا شعر کہتی تھیں۔

ایک مرتبہ موتی جان میرے ہاں بھی گانا گانے تشریف لائی تھیں۔ ہوا یہ تھا کہ سردار دیوان سنگھ مفتوں نے ۱۹۱۹ء میں دلی سے روزانہ اخبار رعیت جاری کیا تھا۔ اخبار مالی دشواری کے سبب بیٹھتا دکھائی دیا تو بھیا احسان الحق نے اسے اس شرط پر لے لیا کہ میں فقط روپیہ لگاؤں گا

ام واحدی صاحب اور سردار صاحب کریں گے۔ میں نے اس اخبار کی چیف ایڈیٹری جناب نیاز فتحپوری کے حوالے کی۔ حاجی ریاض الدین بریلوی یرہ رعیت کے معاون ایڈیٹر تھے۔ مولانا سید ابوالاعلےٰ مودودی نے صحافت کی ابتدا اعزازی طور پر رعیت کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں شامل ذکر کی تھی۔ تین مہینے بعد بھیا بھی ہار گئے اور رعیت بند کر دیا گیا۔ میرے اور نیاز صاحب کے مشترک دوست مولانا عارف ہسوی رعیت کی معتدل پالیسی ے نالاں رہتے تھے۔ انھیں رعیت کے بند ہونے کی بڑی خوشی ہوئی۔"

اخبار رعیت بند ہو گیا تو نیاز صاحب بھوپال واپس چلے گئے۔ اور بھوپال سے رخصت ہو کر انہوں نے لکھنؤ میں ڈیرے ڈال دیئے اور سالہ نگار کی ایڈیٹری اور کتابوں کی تصنیف و تالیف سے ان کی قابلیت کا ڈنکہ بج گیا۔

دلی وہ برابر آتے جاتے رہے۔ مگر جتنا قیام ۱۹۱۴ء اور ۱۹۱۹ء میں کیا تھا اتنا قیام دلی میں پھر کبھی نہیں کیا۔

"اب سے تقریباً ۶۲ سال پہلے کی بات ہے۔ میرے والد پنشن لینے کے بعد رامپور میں وکالت کر رہے ہیں اور میرا قیام بھی بہ سلسلۂ تعلیم رہیں ہے۔ داغ ابھی زندہ ہیں لیکن حیدرآباد میں، امیر مینائی کا دو سال ہوئے انتقال ہو چکا ہے۔ نواب حامد علی خاں کا دور حکومت ہے اساتذہ میں امیر اللہ تسلیم، جلال لکھنوی وغیرہ زندہ ہیں اور دربار رام پور سے وابستہ —— نواب کلب علی خاں کے زمانہ میں جو شاعرانہ فضا رام پور کی تھی وہ تو خیر نہیں ہے، پھر بھی شعر و شاعری کا کافی چرچا ہے، عام مشاعروں کے علاوہ سرکاری مشاعرے بھی گاہ گاہ ہوتے رہتے ہیں جن میں نواب خود بھی شریک ہوتے ہیں، شعراء کے کلام کی داد دیتے ہیں اور اپنے کلام کی بھی دوسروں سے بے پناہ داد لیتے ہیں۔ مشاعرہ کے دوران ہی میں نواب خاصہ بھی کھاتے ہیں (رات کا خاصہ وہ عموماً بہت دیر میں کھاتے تھے) چائے کا دور بھی چلتا ہے اور شام سے صبح تک یہ چہل پہل قائم رہتی ہے۔ میں خود بھی بعض مشاعروں میں تماشائی کی حیثیت سے شریک ہوا ہوں۔

فارسی کہنے والے شعراء میں مولوی فرخی (نواب صاحب کے استاد) سنجر ایرانی اور میرے والد کے درمیان (جنھیں امام بخش صہبائی سے تلمذ حاصل تھا) اکثر فارسی شعر و سخن کا چرچا رہتا اور اس صحبت میں عرب محمد طیب (جو مدرسۂ عالیہ کے پرنسپل اور غیر معمولی قابلیت و ذہانت کے انسان تھے) اور حکیم اجمل خاں بھی شریک ہوتے ہیں۔

رام پور کا یہ وہ دور تھا جب شعراء کے علاوہ اچھے اچھے علماء و فضلاء بھی وہاں موجود تھے اور اکثر علمی و ادبی صحبتیں برپا ہوتی رہتی تھیں۔ امیر مینائی سے میرے والد کو بڑی عقیدت تھی، غالباً اس لئے کہ وہ بڑے زاہد و متقی تھے، شاہ مینا کی اولاد میں سے تھے اور ہر چند اس وقت ان کا انتقال ہو چکا تھا لیکن ان کے بلندی اخلاق اور زہد و ورع کی داستانیں عام تھیں۔ میرے والد نے ہمیشہ فارسی میں شاعری کی اور وہ بھی صرف نعت و منقبت کے قصاید تک۔ غزل انھوں نے کبھی نہیں کہی، لیکن اردو شاعری میں امیر مینائی کے وہ بڑے مداح تھے اور "صنم خانۂ عشق" کا مطالعہ کبھی کبھی کر لیتے تھے۔

میرا عنفوانِ شباب تھا، اور کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیتا تھا، لیکن شعر کہنے سے زیادہ مجھے سننے کا شوق تھا اور جب کبھی کسی صحبت میں داغؔ و امیرؔ کا ذکر آجاتا تھا (اور یہ ذکر اکثر آتا)، تو میں ہمیشہ داغؔ کی طرفداری کیا کرتا تھا، جس کا علم میرے والد کو بھی تھا۔ رام پور میں اس وقت بڑی جماعت مداحینِ امیرؔ ہی کی تھی اور داغی بہت کم تھے۔" (نیازؔ)

* * *

دلی کی آخری صحبت

خانم ممتاز مرزا

قمر بھائی، آداب،

آپ مجھے یقیناً انتہائی بد اخلاق سمجھتے ہوں گے کہ میں نے آپ کے اتنے سارے خطوں کے جواب میں اب تک خاموشی اختیار کی۔ لیکن دراصل بات یہ ہے کہ میری گھریلو پریشانیاں آج کل انتہائی عروج پر ہیں جس کی وجہ سے دماغی سکون میسر نہیں۔ میں چاہتی تھی کہ ذرا اطمینان ہو تو آپ کو لکھوں اور اب اتنی دیر ہو گئی کہ مارے شرمندگی کے خط تک لکھنے میں تامل ہے۔ مولانا نیاز جانتے ہیں کہ میں نثر لکھنے کے معاملے میں خاصی کاہل واقع ہوئی ہوں غزل بھی مہینوں میں ایک آدھ ہو جاتی ہے نظم کہتی ہی نہیں۔ بس یہی امر مانع تھا کہ آخر کیا لکھوں اور کیونکر۔ اب آپ چاہیں تو میرا یہ خط ہی شائع کر دیں۔ مولانا کی ادبی و علمی حیثیت پر قلم اٹھانے کا تو میں تصور بھی نہیں کر سکتی۔ ان کی شخصی حیثیت سے البتہ میں تھوڑی بہت واقف ہوں لیکن نہ اتنی کہ مضمون لکھ سکوں۔ آج سے تقریباً چودہ سال پہلے ۴۹ء میں پہلے پہل سردار دیوان سنگھ مفتون کے ہاں مولانا کے نیاز حاصل ہوئے۔ سردار جی جانتے تھے کہ مجھے لکھنے پڑھنے کا خبط ہے۔ اس لئے جب کوئی عظیم شخصیت ان کے ہاں آتی تھی تو مجھے اطلاع کر دیتے تھے اور مولانا تو ہمیشہ جب بھی دہلی آئے سردار جی کے ہاں ہی قیام کیا۔ اس دن مارے رعب کے میں شاید چند جملوں سے زیادہ نہ بول سکی۔ بقول عالمؔ مولانا ہو بہو مرزا غالب لگے اور مرزا غالب کے آگے بھلا کیسے زبان کھل سکتی تھی، میرے شوہر بھی جانے کب سے مولانا کے نادیدہ عاشق تھے اتنے کہ ان کی کتابوں کے پورے پورے پیراگراف انہیں حفظ تھے۔ اور شاید مولانا کی کوئی کتاب ایسی نہ تھی جو ان کے پاس نہ ہو۔ شروع شروع میں خط و کتابت بھی ان ہی سے ہوتی تھی۔ اس کے بعد یوں ہوا کہ مولانا دہلی آئے تو بجائے سردار جی کے ہمارے غریب خانہ کو عزت بخشی۔ ان دنوں میرے والد بھی میرے پاس ہی ٹھہرے تھے۔ لہٰذا اس مرتبہ بھی میں تو ڈرتی ہی رہی اور ابا کی مولانا سے خوب دوستی ہو گئی۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ میرے دل میں بجائے خوف کے مولانا کے لئے محبت پیدا ہوتی گئی۔ عزت و احترام تو ظاہر ہے برسوں سے تھا ہی اب ان کی حیثیت میرے لئے ایک محترم دوست اور شفیق بزرگ کی سی ہو گئی۔ مولانا اوائل ملاقات سے ہی برابر اس کوشش میں لگے رہے کہ میں نثر میں کچھ مضامین لکھوں لیکن میں کچھ اتنی کم ہمت واقع ہوئی ہوں کہ اب تک کچھ بھی تو نہ کر سکی سوائے دو ایک ترجموں کے۔ جب مولانا زیادہ اصرار کرتے ہیں تو مارے شرمندگی کے میں کچھ دن تک خط نہیں لکھتی۔ بس اس طرح یہ اصرار و فرار کا سلسلہ مسلسل چودہ سال سے چل رہا ہے۔ اس مرتبہ، شاید آخری مرتبہ خطاب پدم بھوشن کا تمغہ لینے کے لئے ۲۷ اپریل سنہ ۶۲ء کو مولانا دہلی تشریف لائے تو از راہ شفقت میرے ہاں ٹھہرے۔ میں ان سے تقریباً چھ سات سال بعد ملی تھی۔ اتنا عظیم انقلاب ہو چکا تھا ان میں۔

کہ میرا دل رو دیا۔ اعصاب کے مریض، بے خوابی کے شکار، مولانا پہچانے نہیں جاتے تھے --- ان تین دنوں میں مولانا میرے لئے ایک شفیق باپ سے بھی زیادہ ثابت ہوئے۔ میں نے ایک لمحہ کو بھی تو محسوس نہ کیا کہ اتنی عظیم شخصیت جس کا ثانی نہ ہندوستان میں ہے نہ پاکستان میں، اور اللہ جانے آئندہ کتنی نسلوں تک پیدا نہ ہو، میرے یہاں ہے۔ سیدھے سادھے معمولات، سادہ اور کم غذا خستہ اور شکستہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ ذرا ٹھیس لگے گی تو مولانا رو دیں گے اور سچ مچ پہلی مرتبہ میں نے مولانا کی آنکھوں سے برسات برستی دیکھی۔ اس دن آگرے سے محترم میکش صاحب بھی تشریف لائے ہوئے تھے (جن کے دل پر مجھ سے کچھ کم ہیبت مولانا کی نہیں ہے) مولانا کی فرمائش پر میکش صاحب اور تاباں صاحب نے اپنا کلام سنایا۔ اس کے بعد مولانا نے مجھے حکم دیا اور میں نے ڈرتے ڈرتے پہلی مرتبہ اپنی تک بندی مولانا کو سنائی اس کے بعد نہ پوچھئے مولانا کے حافظے نے کیا کیا جوہر دکھائے سینکڑوں اشعار سناتے چلے گئے۔ اور اسی دن میں نے اولین مرتبہ مولانا کے منہ سے خود مولانا کا کلام سنا تو یوں کہ مارے رقت کے آواز ساتھ نہیں دے رہی۔ آنسو موتی کی لڑیوں کی طرح برابر بہہ رہے ہیں اور مولانا شعر سنا رہے ہیں۔

میری تنہائی نہ پوچھو، جیسے کوئی نقشِ پا
دور صحرا کے کسی گوشے میں پایا جائے ہے

مجھے نہیں معلوم دوسرے لوگوں کا کیا حال ہوا مگر میرا دل تو کٹ کٹ گیا۔ اسی دن مولانا رات کی گاڑی سے واپس لکھنؤ تشریف لے جا رہے تھے۔ رات کو پھر کھانے کے ساتھ ساتھ اپنے شعر سناتے رہے، اور میں لکھتی رہی۔ خدا کرے کہ ویسی صحبت پھر میسّر آ سکے لیکن اب تو مولانا اتنی دور ہیں۔ لکھنؤ تھے تو جی میں یہ خیال رہتا تھا کہ کیا ہے جب چاہیں گے جا سکتے ہیں۔ جب انہیں فرصت ملے گی بلا لیں گے۔ مگر اب یہ دیواریں ——— کون ہٹائے۔

سنتے ہیں مولانا آزاد کا حافظہ اس غضب کا تھا کہ بلا تکلف حوالے پر حوالے مع کتاب کے نام اور صفحہ کے دیتے چلے جاتے تھے۔ میں مولانا آزاد کے نیاز کبھی حاصل نہ کر سکی۔ دعوتوں میں دیکھا مگر اس طرح نہیں کہ ان کی گفتار کے معجزے دیکھتی لیکن مولانا نیاز کے حافظے کے معجزے بے شک اس ملاقات میں دیکھے یاد نہیں کس نے مولانا سے کوئی سوال پوچھا اس کے جواب میں بلا مبالغہ دسویں شعر اور کتابوں کے حوالے دیتے چلے گئے اور یہ عالم اس وقت تھا جب کہ بے حد پریشانِ خاطر تھے۔ صحت اتنی گر چکی تھی دس بارہ سال پہلے کیا عالم ہوگا اس کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔

جیسا کہ میں نے پہلے ہی کہا مولانا کی ادبی اور علمی خدمات پر میں قلم نہیں اٹھا سکتی۔ ان پر لکھنے والے سینکڑوں اہلِ قلم موجود ہیں میں نے انہیں ایک محترم اور شفیق دوست اور محبت کرنے والے بزرگ کی حیثیت سے جانا ہے۔ میرے لئے تو وہ مجسم خوبی اور محبت ہیں۔ پھر بھلا ان پر کیا لکھوں۔ یہ جو کچھ لکھا ہے ان کی شخصیت کی ایک جھلک بھی تو نہیں ہے۔ اتنے عزیز ہوتے ہوئے بھی میں ان سے ہمیشہ دور رہی، دہلی اور لکھنؤ میں خاصا فاصلہ ہے۔ وہ ہمیشہ بلاتے رہے مگر مجھے کبھی لکھنؤ جانے کی توفیق نہ ہوئی۔ میری نظر سے تو ان کے ہزاروں پہلو مخفی ہیں، بہرحال آپ کا اصرار تھا کہ کچھ لکھوں اس لئے اپنے تاثرات لکھ دیئے۔ جو کچھ لکھا ہے انتہائی شرمندگی کے عالم میں لکھا ہے اور یہ سوچ کر لکھا ہے کہ میرا قلم مولانا پر نہیں اٹھ سکتا۔ کہاں شبنم کا ایک قطرہ اور کہاں چشمۂ خورشید ——— اب اجازت چاہتی ہوں اور یہ معلوم کر کے بہت خوش ہوں کہ کراچی پہنچ کر وہ صحیح و تندرست ہو گئے۔ خدا انہیں تا دیر زندہ رکھے۔ ایسے انسان روز روز نہیں پیدا ہوتے۔

★

نیاز فتحپوری اور بھوپال

ڈاکٹر سلیم حامد رضوی

علامہ نیاز فتحپوری کی وابستگی بھوپال سے بہت پرانی ہے۔ اس وقت "نگار" عالم وجود میں نہ آیا تھا۔ ۱۹۱۶ء میں بھوپال آئے اس سے قبل علامہ لاہور کے اخبار زمیندار کے اڈیٹر اور اردو کے مشہور رسائل میں مضامین لکھنے کی وجہ سے بحیثیت صحافی و ادیب پہچانے جاچکے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نیاز صاحب ادب لطیـ کا اردو میں آغاز فرما رہے تھے۔ عام طور پر آپ کی نثر شعری کو لوگ بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھا کرتے تھے، اسی وقت آپ نے چند افسانے بھی لکھے جنہوں نے ا میں رومانی تحریک کا آغاز کیا۔

بھوپال میں ان کے طرز تحریر کے ایک قدردان ملک حبیب احمد صاحب (محکمہ اوقاف کے افسر اعلیٰ) تھے انہوں نے کوشش کر کے ان کو اپنے محکمہ میں لے لیا۔ اس کے بعد وہ محکمۂ پولیس سے وابستہ ہو گئے۔ مگر پولیس ہو یا اوقاف، دونوں محکمے علامہ کے مذاق اور طبیعت سے مناسبت نہ رکھ تھے۔ آخر کار اپنی ادبی و علمی صلاحیتوں کی بدولت ان کو بھوپال کے "دفتر تاریخ" میں منتقل ہو جانے کا موقع مل گیا۔ دفتر تاریخ دراصل ایک قسم کا "دارالمصن تھا جس میں اس دور کے مشہور اہل قلم نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ فرمانروائے بھوپال کی ہدایات کے مطابق تاریخی، مذہبی اور معاشرتی کتابیں تصنیف یا تالیف ہوا کرتی تھی۔ اس محکمہ کے مہتمم مولوی محمد امین زبیری مارہروی مرحوم تھے جنہوں نے بے شمار کتابیں تصنیف یا تالیف کیں ہیں۔ دوسری اہم شخصیت مولوی عبدالرزاق (البرامکہ) کی تھی جو اپنی مشہور تصانیف البرامکہ۔ نظام الملک طوسی۔ کی وجہ سے مشاہیر ہند میں شمار کیے جاتے تھ تیسری عظیم شخصیت مولوی محمد مہدی مرحوم کی تھی جو پس پردہ دفتر تاریخ کی تمام مطبوعات کے حقیقی مصنف تھے۔ یہ بھی اسی ادارہ سے منسلک تھے۔

بہرحال دفتر تاریخ علامہ کی زندگی کا وہ پہلا زینہ ہے جس نے انکی معلومات، مطالعہ اور تحقیق کے میدان کو وسیع کرنے میں مدد دی۔ چنانچہ اس محکمہ متعلق ہو جانے کے بعد نیاز صاحب بھی مصنفین کی فہرست میں آگئے۔ ان کی یہ کتابیں اسی دور کی یادگاریں ہیں۔ گہوارہ تمدن، صحابیات —— مصطفےٰ کمال پاشا۔ تاریخ الدولتین۔ تاریخ اسلام ابتدا سے حملۂ تیمور تک۔

اس ادبی اور علمی ماحول نے نیاز صاحب کی فطری صلاحیتوں کو بڑی حد تک ابھارا۔ بھوپال میں شعر و شاعری کا ذوق بھی عام تھا چنانچہ نیاز صاحب خود بھی علمی مشغلہ کے ساتھ ساتھ شعر و شاعری کی طرف متوجہ رہے۔ عام طور پر مشاعروں میں شریک نہیں ہوتے تھے البتہ مخصوص صحبتوں میں کلام سنایا کرتے تھے۔ ماکی جائسی کے مشاعروں میں ضرور شریک ہوا کرتے تھے۔ نیاز صاحب کا اس دور کا کہا ہوا کلام دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مستقبل میں جتنے بڑے نثر نگار اور نقاد بننے والے تھے ماضی میں اتنے ہی بڑے شاعر بھی تھے۔ آپ کو نظم اور غزل دونوں پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ آئیے اس بھولے بسرے دور کے نیاز کا کچھ کلام آپ کو سنا دیں :-

چاہتے ہیں وہ کہ اظہار شکایت چھوڑ دوں — یعنی الفت چھوڑ دوں اسکی حکایت چھوڑ دوں
دیکھ کر تم کو میری آنکھوں میں آنسو بھی نہ آئیں — کس طرح اظہار شوق بے نہایت چھوڑ دوں

جاناں یہ کس طرح کہ محبت نہیں مجھے   ہاں تم سے عرض حال کی جرأت نہیں مجھے
مانا کہ مستحق محبت نہیں ہوں میں   یہ بھی نہ کہہ مگر کہ "محبت نہیں مجھے"
آرام دن کا، رات کا سونا، سکون جاں   ہاں تم سے چھٹ کے کونسی راحت نہیں مجھے
پھر ہاتھ میرے سینہ پہ رکھ کر کہو کہ "ضبط"   پھر میں کہوں کہ اس کی تو طاقت نہیں مجھے

خدا معلوم دُنیائے محبّت کیسی دُنیا ہے   جو دشمن ہے تمنا کا وہی جانِ تمنا ہے!
نیاز آیا تھا ہمکو بھی نظر کل راہ میں بیٹھا   ہے یوں تو آدمی اچھا مگر کھویا ہوا سا ہے

نیاز صاحب کا اصل میدان جس میں وہ خوب پرواز کرتے ہیں نظم ہے اور جب ہم نیاز صاحب کی نظم دیکھتے ہیں تو ہم کو کہنا پڑتا ہے کہ اگر وہ شاعری چھوڑ دیتے تو نظموں ہی کے بل پر ایک بڑی شخصیت بن چکے ہوتے۔ نظم کا کچھ نمونہ ملاحظہ ہو۔

کوئل

اے نوید جاں فزا، اے طائرِ فرخندہ فال   آگئی بارے تو لیکر پھر پیام برشکال
یعنی آپہونچی وہی شوریدگی سر میں لئے   اک جہان بیقراری جنبش پر میں لئے
کیسے بھینی ہے تو شرمندہ جس سے پارہ ہے   میں سمجھتا ہوں کہ تو موسیقیٔ آوارہ ہے
اے نقیب ابر باراں اے علم بردار بہار   اے کلید میکدہ اے آرزوئے مے گسار
اے کہ تیری ہر صدا گویا جواز بادہ ہے   کچھ گنہ کرنے پہ میرا دل بھی اب آمادہ ہے

"بہار کی دیوی"

تمنا زا تھیں کیفیات صبحِ صحنِ بستانی !   فضا میں منتشر تھے نشہ ہائے باد بارانی ؛
ابھی تک ارغوانی تھی افق کی شعلہ سامانی   نہ تھا خورشید کا چہرہ ہنوز آگاہ عریانی
تھی بلبل شاخ گل پر، اور شبنم گل کے دامن میں
تھی ہر شے خلوت آسودہ غرض اپنے نشیمن میں
صباحت جلوہ گر تھی اور اس میں اک ترنم تھا   فضا خاموش تھی اور اس میں پنہاں اک تکلم تھا
جدھر دیکھو، ادھر امواج نکہت میں تلاطم تھا   زمیں تا آسماں گویا تبسم ہی تبسم تھا
وہ رنگ صبح اور وہ اہتزاز نور کا عالم :
تھیں گویا مجتمع رعنائی و دوشیزگی باہم

(اس نظم میں دس بند ہیں اور یہ "نگار" آگرہ ۲۲ء میں شائع ہو چکی ہے)

نیاز صاحب کے ہمعصر سید محمد یوسف قیصر کا بیان ہے کہ میں کبھی کبھی نور محل نیاز صاحب کی قیام گاہ پر جایا کرتا تھا۔ دفتر کے اوقات کے علاوہ میں ہمیشہ انکو مطالعہ کتب میں مصروف پایا۔ اردو فارسی اور عربی کی کتابوں کے علاوہ ان کے پاس انگریزی کتابوں کا ذخیرہ بھی بہت تھا اور وہ اکثر

بحث و مباحثہ کے وقت انھیں کتابوں کا حوالہ دیتے یا اس کے اقتباسات سُنا دیا کرتے تھے۔ بحث کرنا ان کا خاص مشغلہ تھا۔ ایک مرتبہ مولوی محمد ارشد تھانوی، محمد یوسف قیصر اور سرور قادری نے مل کر اساتذہ اردو کے کلام کا انتخاب کتابی صورت میں شائع کرنا چاہا۔ نیاز صاحب کو جب کی اطلاع ملی تو وہ بھی اس جماعت میں شامل ہو گئے۔ انکی شرکت کے بعد بحث و تنقید زیادہ ہونے لگی اور انتخاب کم۔ کچھ دن بعد انتخاب کا یہ ہو گیا۔ نیاز صاحب نے اپنے احباب کے اصرار پر "نگار" فروری ۱۹۲۲ء میں آگرہ سے جاری کیا۔ مگر چونکہ وہ خود بھوپال میں رہتے تھے اس لئے کاموں میں بڑی دقت پیش آتی تھی اس لئے جنوری ۲۳ء سے تنہا بھوپال سے نکالنے لگے۔ ایک سال کے اندر اندر نگار اردو کا معیاری پرچہ بن جس میں خود نیاز صاحب کے سلیقہ اور قابلیت کو بہت دخل تھا۔ بھوپال میں نگار کا دفتر نور محل میں تھا جس میں خود نیاز صاحب رہتے تھے ہمیشہ آگرہ اخبار پریس آگرہ میں چھپتا رہا اور نور محل بھوپال سے شائع ہوتا تھا۔ اس طرح فروری ۲۷ء تک نگار بھوپال سے نکلتا رہا لیکن حا کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ بقول خود نیاز صاحب ان کو یکایک ملازمت ترک کر کے لکھنؤ منتقل ہونا پڑا۔ چنانچہ مارچ ۲۷ء کا پرچہ لکھنؤ سے شائع ہوا۔

اسی درمیان میں نیاز صاحب کی چند اور کتابیں شائع ہوئیں "کیوپڈ اور سائیکی"۔ قربان گاہ حسن۔ تلاش راز۔ صدا بصحرا۔ مسدس سورت کانفرنس میں پڑھا گیا۔ جذبات بھاشا ۲۴ء میں یہ افسانے "نگارستان" کے نام سے کتابی صورت میں چھپ گئے۔ جولائی ۲۳ میں شہاب کی سرگزشت نام کا مسلسل افسانہ بھی نکلنا شروع ہوا جو بعد میں کتابی صورت میں چھپ گیا۔ نیاز صاحب کے اجرائے نگار نے علمی اور ادبی ماحول پر بڑے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ کیونکہ "نگار" کے لئے مضامین کا معیار کافی بلند تھا اس لئے یہاں کے ادیبوں کو کافی مطالعہ کے بعد مضامین لکھنا پڑھتے تھے اور جب وہ نگار میں پھر بھی نہیں چھپ سکتے تھے تو انکو دوسرے جرائد کی طرف متوجہ ہونا پڑتا تھا۔

بھوپال سے نیاز صاحب کی دلچسپی بدستور قائم رہی۔ چنانچہ وہ اکثر بھوپال آئے اور شملہ کوٹھی میں قیام فرمایا کرتے تھے۔ ۱۹۵۶ء میں جب لائے تو مجھے بھی نیاز صاحب سے نیاز حاصل کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اس مضمون کی بہت سی باتیں خود انھیں کی بتائی ہوئی ہیں وہ بھ قدرتی مناظر اور ادبی ماحول کے حد سے زیادہ مداح تھے۔ ان کا بیان ہے کہ جب تک وہ بھوپال میں رہے اس وقت تک شعر و شاعری کی طرف یہاں سے جانے کے بعد انہوں نے اس مشغلہ کو تقریباً ترک کر دیا۔ البتہ ۵۷ء میں انہوں نے غالب کے ایک مصرع پر پورے ہندو اردو شعرا کو دعوت دی کہ وہ اس پر غزل لکھیں، بھوپال میں تو انہوں نے ۲۵ مئی ۵۷ء کو ایک عظیم الشان مشاعرہ بھی منعقد فرمایا۔ جس کی خود انہوں نے ہی کی۔ اس مشاعرے میں انہوں نے اپنا کلام خود بھی سُنایا اس میں بھی انہوں نے بڑی جدت سے کام لیا یعنی پانچ مختلف مصرع طرح پر غزلیں لکھ کر سنائیں۔

اساتذہ متقدمین کے رنگ میں:۔

چشم تر ہے اس طرف اور اس طرف ابر بہار
دیکھنا ہے آج کس سے کتنا رویا جائے ہے

جاں گسل ہے گو بہت ترک محبت کا خیال
لیکن اس پیماں شکن کو یوں بھی چاہا جائے ہے

متوسطین کے رنگ میں:۔

نیاز صاحب نے اس غزل میں متوسطین کے انداز کی محاکاتی، وارداتی اور معاملہ بندی کی شاعری کی ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

قصۂ کشتی و ساحل ناخدا تو ہی تو تھا
کون ان دونوں میں کس سے دور ہٹتا جائے ہے

ہو برا تیرا نگاہ شوق وہ جان حیا
دیکھ تو کیسا پسینہ میں نہایا جائے ہے

ہم سنانے کو سنا دیں داستان غم مگر
کس سے ان بھیگی ہوئی پلکوں کو دیکھا جائے ہے

اُف رے وہ ٹھنڈا سا اور ہلکا سا نم جو بعد غسل
سوکھ جانے پر ترے بالوں میں پایا جائے ہے

اب ایک غزل متاخرین کے رنگ میں ملاحظہ فرمایئے جس میں نئے زاویوں سے مرکب تشبیہات اور سخن گسترانہ تعبیرات ہیں —

سنگ کیا ہے بس سراپا انتظار بت تراش زندگی کا خواب لوگوں یوں بھی دیکھا جائے ہے
میری تنہائی نہ پوچھو جیسے کوئی نقش پا دور صحرا کے کسی گوشہ میں پایا جائے ہے
وہ خنک سی تابناکی اس کے رنگ جسم کی ہمکو تو اس چاندنی میں نیند سی آجائے ہے
صرف اک لرزش ہے نوک خار پہ شبنم کی بوند پھر بھی اس فرصت پہ اسکی مجھ کو رشک آجائے ہے
اب یہ حال دل ہے جیسے رکھ کے کانٹوں پر نیاز ریشمی چادر کو بیدردی سے کھینچا جائے ہے

نیاز صاحب کی چوتھی غزل عہد حاضر کے رجحانات کی عکاسی کرتی ہے۔ اردو شاعری اپنے ابتدائی عہد سے کن کن منزلوں سے گزر کر یہاں تک ہے اس کی تشریح کے لئے یہ غزل دیکھئے —

قافلہ چھوٹے زمانہ ہو گیا لیکن ہنوز ! یاد آواز جرس رہ رہ کے تڑپا جائے ہے
خود زمانہ رخ ہمارا دیکھتا ہے ہم نہیں جس طرف مڑ جائیں ہم دھارا بھی مڑتا جائے ہے
کل اسی آہنگ پر ہونا ہے تعمیر جہاں آج جو کچھ زیر لب دیوانہ کہتا جائے ہے
آرہا ہوں دوستو، ٹھہرو مگر یہ تو بتاؤ مجھ کو کس گوشہ سے صحرا کے پکارا جائے ہے

یہ تمام غزلیں نیاز صاحب لکھنؤ سے کہہ کر لائے تھے اب وہ غزل بھی سنئے جو انہوں نے بھوپال پہونچکر اس مشاعرے کے لئے کہی —

تو کہ ہے ہر نقش پا تیرا چراغ رہگذر مجھ سے چھپ چھپ کر کہاں راتوں کو جایا جائے ہے
آنکھ ملتے آرہے ہیں خواب گہ سے بزم میں تیر پہلا دیکھئے کس پر چلایا جائے ہے
ہائے اس دم پر مرا پندار خدائی دیکھئے جب مجھے بندہ ترا کہہ کر پکارا جائے ہے
جسکو کہتے ہیں صنم ہے حرف شوق برہمن شوق بڑھتا جائے ہے بت خانہ بنتا جائے ہے

اس طرح یہ کہنا نامناسب نہیں ہوگا کہ نیاز صاحب کا تصنیفی زندگی کا ابتدائی دور بھوپال ہی میں گزرا۔ "نگار" کا پودا بھی بھوپال ہی میں بڑھا جو پہونچ کر ایک تناور درخت بن گیا۔

بھوپال میں نیاز صاحب کے ہم عصروں میں اب صرف محمد حسین محوی، سعید رزمی اور قیصر بھوپالی زندہ ہیں۔ باقی یا تو انتقال فرما گئے پال سے عرصہ ہوا چلے گئے۔ بھوپال کے شعرا میں نیاز صاحب بعض کی بہت زیادہ قدر کرتے تھے ان میں سہا مجددی مرحوم، سعید رزمی، حامد سعید خاں مرحوم ط بھوپالی مرحوم اور نوجوانوں میں وہ اختر سعید خاں اور سید اختر بھوپالی کے کلام کو بہت پسند کرتے ہیں

* * *

موسیقی نام سُر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کا نہیں بلکہ سروں کو ہم آہنگ کر دینے کا ہے۔

(نیاز)

نیاز اور فتح پور

فرمان فتحپوری

فتح پور جو کہ نیاز فتحپوری کے توسط سے علمی و ادبی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں رہا۔ دوآبے کا ایک چھوٹا سا ضلع اور شہر ہے الٰہ آباد اور کانپور کے درمیان شیر شاہ کی بنوائی ہوئی مشہور شاہراہ پر واقع ہونے کی وجہ سے اسے ہر زمانے میں برصغیر کی سیاسی و ثقافتی زندگی میں نمایاں حیثیت حاصل رہی ہے۔ اسکی تاریخی قدامت کے متعلق تو کچھ وثوق سے کہنا مشکل ہے لیکن یہاں کی بعض قدیم عمارتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے بہت پہلے بھی یہ ضلع قائم تھا۔ چنانچہ ہتگام (تحصی کھاگا) کو راجہ جے چند کے زمانے کی ایک قدیم عمارت آج بھی موجود ہے۔ جو ایک مدت سے مسلمانوں کی عبادت گاہ ہے۔ اور جے چندی مسجد کے نام سے مشہور ہے [1]۔

ہتگام ضلع فتحپور کا ایک پرانا قصبہ ہے۔ جہاں مسلمان بزرگوں کی مزاروں کا ایک طویل سلسلہ نظر آتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کڑا مانک پور اور ہتگام میں جن بزرگوں کی مزاریں ہیں۔ وہ ایک ہی معرکۂ جنگ سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ بات قرین قیاس بھی ہے کہ اس لئے کہ یہ دونوں تاریخی قصبے صرف دس بارہ میل کے فاصلے پر واقع ہیں۔ اور دونو کے آثار قدیمہ صاف پتہ دیتے ہیں کہ کسی زمانے میں انھیں سیاسی اہمیت حاصل رہی ہے۔ ہتگام میں تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے آخری زمانے تک عدالت خفیفہ قائم تھی۔ اور سرسید احمد خاں کے بڑے بھائی سید محمد خاں جنہوں نے ۱۸۳۷ء میں اردو کا دوسرا اخبار نکالا یہاں منصف کے عہدے پر فائز تھے [2]۔

ہتگام کی طرح کوڑا جہان آباد (تحصیل کھجوہ) بھی فتح پور کا تاریخی قصبہ ہے۔ اور اس کا ذکر تاریخی و ادبی کتابوں میں اکثر جگہ ملتا ہے۔ اورنگ زیب اور شجاع کے معرکے اسی علاقے میں ہوئے تھے [3] مولانا حسرت موہانی کی اولین تربیت گاہ بھی اسی خطے میں ہے۔ حسرت کی شاعری کا وہ لپکا بھی یہیں سے تعلق رکھتا ہے جس نے انھیں امام المتغزلین بنا دیا اور جس کا ذکر انھوں نے ایک شعر میں اس طور پر کیا ہے [4]

وہ جو ایک لپکا کبھی خاکِ جہان آباد سے
اب تلک موجود ہے کچھ کچھ لگا لائے تھے ہم

شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی کے رفیق سفر حکیم نصرت حسین اسیر مالٹا و شہید مالٹا کا وطن عزیز بھی یہی قصبہ ہے [5]

قصبات کی طرح خاص شہر میں بھی بعض ایسے مقبرے، تالاب، مسجدیں اور عمارتیں موجود ہیں۔ جو اسکی قدامت اور تاریخی اہمیت پر روشنی ڈالتی ہیں جے چند کے زمانے سے لیکر دہلی کے سراج الدین ظفر اور اودھ کے واجد علی شاہ کے عہد تک کے نقوش و آثار یہاں جگہ جگہ ملتے ہیں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اس ضلع اور شہر نے انگریزوں کے خلاف زبردست محاذ قائم کیا تھا۔ اور اسی لئے جب انگریزوں نے مجاہدین آزادی پر قابو پا لیا۔ تو دلی، لکھنؤ، میرٹھ اور کانپور کی طرح فتحپور کو بھی تباہ و برباد کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ امرار و رؤسا کی جائدادیں ضبط ہوئیں۔ اور اکثر کو پھانسی کی سزا دی گئی۔ خود نیاز فتحپوری کے دادا پیر محمد خاں اور ان کے خاندان کے افراد اسی سلسلہ میں گولی کا نشانہ بنائے گئے۔ اردو ڈرامہ کے اولین معمار محمد عبداللہ فتحپوری کے والد منشی الٰہی بخش جو کہ اس وقت ضلع ایٹہ میں منصف کے عہدے پر مامور تھے۔ جرم بغاوت میں ماخوذ ہوئے اور انھیں فتحپور شہر کے صدر بازار میں ۳۱ دسمبر ۱۸۵۷ء بوقت عصر پھانسی دیدی گئی تھی [6]۔ اس طرح کا ظلم و ستم سارے شہر پر روا رکھا گیا اور صدیوں کی رونق ایک آن میں اس شہر سے چھین لی گئی۔

---

[1] Fatehpur District Gazatter 1904 [2] داستان تاریخ اردو از مولانا حامد حسن قادری

[3] تاریخ ہند از ڈاکٹر تاراچند [4] حسرت موہانی از عبدالشکور [5] ریشمی رومال [6] نگار مئی، جون ۱۹۶۳ء

پھر بھی یہاں سے علم و ادب اور تصوف و روحانیت کے بعض ایسے چشمے پھوٹے ہیں۔ جنہوں نے برصغیر کی پوری زندگی کو کسی نہ کسی طور پر متاثر کیا ہے۔ اس سلسلے میں میر ہیبت اللہ شاہ، مولانا شاہ عبدالسلام ہسوی۔ حضرت شاہ نجم الدین، مولانا ابو سعید ایرایانی، سید شاہ نذیر الحسن فتح الٰہی اور مولانا سید شاہ ظہور الاسلام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

ہیبت اللہ شاہ سترھویں صدی عیسوی کے بہت بڑے بزرگ تھے جنہیں شاہجہاں اور اورنگ زیب کے عہد میں ان کے فیوض و برکات سے متاثر ہو کر دو گاؤں معافی میں دیئے گئے تھے۔[1] آج بھی ان کا مزار موجود ہے، جس کی زیارت کے لئے قرب و جوار سے لوگ آتے ہیں۔ مولانا عبدالسلام ہسوی ابن سید شاہ ابوالقاسم انیسویں صدی عیسوی کے صاحب کمال بزرگ اور مولانا سید شاہ احمد سعید اجمیری کے خلیفہ تھے[2] اردو کے مشہور نعتیہ قصیدہ نگار محسن کاکوروی ان کے مرید اور سندی خلیفہ تھے۔[3] مولانا عبدالسلام ہسوی کا وصال ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۲ء میں ہوا ہے جس کی خبر اس زمانے کے مشہور اخبار "نور الانوار" کانپور میں ۲۰ اگست ۱۸۸۲ء میں شائع ہوئی تھی۔[4] مولانا شاہ نجم الدین بھی مولانا عبدالسلام کے سندی خلیفہ تھے۔ اور انہیں فتحپور خاص میں رہنے کا حکم ہوا تھا۔[5] شاہ نجم الدین دراصل وہ فاضل بزرگ ہیں، جن کی رسم بسم اللہ ندوۃ العلماء کے سب سے پہلے طالب علم کی حیثیت سے اس کے افتتاح کے موقع پر مولانا کے ہاتھوں ادا کی گئی تھی۔[6] شاہ نجم الدین کا وصال ۴۰-۱۹۳۹ء میں ہوا ہے۔ ان کے فیوض روحانی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے۔ کہ ان کا مزار آج بھی مرجع خلائق بنا رہتا ہے۔ اور برصغیر کے دور دراز علاقوں سے زائرین آتے رہتے ہیں۔ مولانا ابو سعید ایرایانی بھی اسی زمانے کے زبردست عالم اور صوفی گزرے ہیں۔ وہ مدرسہ دیوبند کے فارغ التحصیل عالم اور مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی کے خلیفہ تھے۔ ہر چند کہ وہ ایک گوشہ نشین عالم تھے۔ پھر بھی انہیں مسلمانوں کی تعلیمی و مذہبی تحریکوں سے خاص دلچسپی تھی۔ مولانا کا وصال ۱۹۱۰ء میں ہوا تھا۔ ان کے ایک پرانے شاگرد سید گلزار حسین جن کی عمر ۸۰ سال ہے بتاتے ہیں کہ مولانا ندوۃ العلماء کی تحریک میں پیش پیش تھے۔ اور ان کے علم و فضل کی شہرت سن کر ایک دفعہ خود علامہ شبلی اور ایک بار مہرکشن پرشاد شاد ان سے ملنے کے لئے گئے تھے۔ شیعہ سنی فرقوں میں اتحاد پیدا کرنے کے لئے مولانا نے "فیصلہ" نامی ایک مثنوی بھی لکھی تھی۔ ۴۴ صفحات کی یہ مطبوعہ مثنوی راقم الحروف کی نظر سے گزری ہے۔ کہا جاتا ہے۔ کہ ایک زمانے میں یہ بہت مقبول ہوئی تھی۔

مولانا عربی فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں شعر کہنے پر قادر تھے۔ ان کا قلمی کلیات آج بھی ان کے وارثوں کے پاس محفوظ ہے۔ اس کے علاوہ مولانا کے کتب خانہ میں قلمی کتابیں "دوادین" اور ایک روزنامچہ بھی موجود ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اسے کھنگالا جائے۔ تو شبلی اور اس زمانے کی تحریکوں کے متعلق بعض بڑی وقیع اور مفید باتیں سامنے آئیں گی۔

شاہ نذیر الحسن فتح الٰہی ایرایانی بھی صاحب علم و عرفان صوفی منش بزرگ تھے۔ ان کا وصال اب سے پندرہ سال پہلے ہوا ہے۔ مولانا عربی و فارسی کے علاوہ انگریزی بھی خوب جانتے تھے۔ تصوف اور فلسفہ پر ان کی نظر گہری تھی[7] اور علمی و روحانی پیاس بجھانے کے لئے انہوں نے شام، حجاز، روم، مصر اور ترکی کا سفر بھی کیا تھا۔[8]

ندوۃ العلماء کے معاملات سے خاص دلچسپی رکھنے والوں میں خان بہادر احمد حسین ساکن اجودہ (تحصیل کھاگا) بھی خصوصیت رکھتے ہیں۔ ابو الکلام آزاد کے الہلال میں ان کی تحریریں ملتی ہیں۔ وہ شبلی کے حامیوں میں تھے اور انہیں دوبارہ ندوہ سے منسلک کرنا چاہتے تھے۔[9] اس زمانے کے ایک اور بزرگ رحمت علی ساکن ایرچھن پرگنہ کوٹلہ د فتحپور بھی قابل ذکر ہیں رحمت علی مولانا عبدالسلام ہسوی کے مقربان خاص میں تھے۔ علوم دین پر ان کی کئی کتابیں یادگار ہیں۔ "واقعات ولی" اور —

---

[1] فرامین شاہی مملوکہ سید صدیق حسن ساکن ہیبت پور تحصیل کھاگا ضلع فتحپور

[2] تذکرہ علمائے ہند از عبدالرحمٰن

[3] "واقعات ولی" از رحمت علی مطبوعہ نظامی پریس کانپور ۱۳۰۴ھ/۱۸۸۶ء

[4] "شعلہ جان سوز" از رحمت علی مطبوعہ نظامی پریس کانپور ۱۳۰۱ھ/۱۸۸۴ء

[5] "واقعات ولی" " " ۱۳۰۴ھ/۱۸۸۶ء

[6] روزنامچہ اطراف ملی، از مولوی عبدالحی

[7] "الفرمان" مصنفہ سید شاہ نذیر الحسن فتح الٰہی، مطبع حکیم برہم گورکھپور ۱۹۱۶ء

[8] سفرنامہ شام و مصر، از سید نذیر الحسن فتح الٰہی، مطبوعہ علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ ۱۹۱۲ء

[9] الہلال بابت ۲۲ اپریل و ۱۸ مارچ ۱۹۱۳ء

شعلہ جان سوز کا ذکر اسی مضمون میں کسی جگہ حاشیہ میں آیا ہے۔ اس کے علاوہ رکن الاسلام فی مسائل الصیام، دولت کبریٰ، اور ہدایت الاخلاق الی الاحکام النکاح والط اُن کی مطبوعہ تصانیف ہیں اور میری نظر سے گزری ہیں اسی طرح کی اور کئی شخصیتیں فتحپور میں گذری ہیں۔ لیکن ان سب سے زیادہ معروف و نمایاں نام مولانا سید شاہ ظ کا ہے۔ اس لئے کہ وہ عالم باعمل اور صوفی باصفا ہونے کے ساتھ ساتھ تعلیمی و سماجی مصلح بھی تھے۔ مولانا سید شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی کے خلیفہ تھے۔ مولانا شبلی کو کہ ندوۃ العلماء کے قیام میں سب سے زیادہ انھیں کا حصہ ہے [3] علامہ سید سلیمان ندوی نے انھیں ندوۃ العلماء کے ارکان خاص میں شمار کیا ہے [4] بعض تاریخی حقائق سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا فی الواقع ندوۃ العلماء کے محرک اور بانی تھے [5] مولانا کو مسلمانوں کے تعلیمی مسائل سے دلچسپی تھی۔ اور وہ انھیں دینی و دنیاوی دونوں علوم کی طرف متوجہ کرنا چاہتے تھے۔ اسی لئے مولانا نے ۱۸۸۳ء میں سرسید کے مدرسہ علیگڑھ کے صرف سات سال فتحپور میں ایک نئے طرز کے مدرسہ کی بنیاد ڈالی۔ اور اسمیں عربی فارسی کے ساتھ ساتھ انگریزی پڑھانے اور صنعتی تعلیم دینے کا بھی انتظام کیا۔ غالباً برصغیر کا یہ پہلا تھا جس میں مذہبی علوم کے ساتھ ساتھ انگریزی پڑھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ مولانا کے اس مدرسے سے ہزاروں نے فیض اٹھایا ہے۔ اور آج بھی اس مدر فیضان جاری ہے۔ لیکن جنھوں نے علمی و ادبی دنیا میں خاص ناموری حاصل کی۔ ان میں مولانا حسرت موہانی، حکیم عبدالحیٔ، نیاز فتحپوری، مولانا عبدالرزاق کا اور مولانا حسن الدین خاموش فتح پوری وغیرہ کے نام آتے ہیں۔

فتح پور سے تعلق رکھنے والی شخصیتوں میں نیاز فتحپوری کا نام خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ یوں تو نیاز سے پہلے بھی فتح پور کے ادیبوں اور شاعروں قدیم تذکروں اور تاریخوں میں ملتا ہے۔ مثال کے طور پر محمد عبداللہ فتح پوری اردو ڈرامہ کے قدیم ترین معماروں میں ہیں۔ ڈاکٹر نامی کی رائے ہے کہ وہ ڈراما صلاحیتوں میں آغا حشر سے آگے تھے۔ محمد عبداللہ نے ۱۸۸۰ء اور ۱۸۹۳ء کے درمیان کوئی پچاس ڈرامے لکھے ہیں۔ اور اسٹیج کئے [6] عبداللہ بھتیجے اور داماد عبدالوحید قیس نے بھی ڈرامہ نگاری میں خاص شہرت حاصل کی ان کا ذکر ڈراما کی تاریخ اور تنقیدی کتابوں میں ملتا ہے [7] ان دونو اکثر ڈرامے مطبع لائع النور فتح پور [8] سے شائع ہوئے ہیں۔ گارساں دتاسی نے تاریخ ادب ہندوستانی میں فتح پور کے کئی شاعروں کا ذکر کیا ہے۔ محسن کے ہیں، سید محمد حسن خراب، سلامت علی زار اور اکرم علی توانا نامی شاعروں کا ذکر آیا ہے۔ [9] ہندی شاعری کی تاریخ میں بھگونت رائے راجہ اسوتھر متوفی کا ذکر بھی ملتا ہے۔ جس نے مغلوں کا مقابلہ آخری وقت تک کیا اور ایک راماین یادگار چھوڑی [10]

انیسویں صدی کے اواخر میں فتح پور سے سحر بابل نامی ایک رسالہ بھی نکلتا تھا اس کے چند پرچے میری نظر سے گذرے ہیں اس کا پہلا شمارہ نومبر ۱۸۸۶ء میں شائع ہوا تھ سید واحد علی وحید متوفی ۱۳۲۴ھ اس کے مدیر تھے اس پرچے میں فتح پور کے جن شاعروں کی غزلیں ملتی ہیں ان میں خود واحد علی وحید، التجا، احسان ہسوی، جگموہن لال شاطر، عاشق دوسرے شعراء کے نام ملتے ہیں۔ وحید، بلبل فتحپوری، متحمل زار، اور تحمل حسین صاحب دیوان تھے [11] وحید متوفی ۱۳۱۶ھ/۱۸۹۸ء کی دو مثنویاں اور ایک نعتیہ دیوان مطالعہ کے لائق ہی [12] عطا علی خاک فتحپوری نے بھی گلدستہ مسرت کے نام سے ایک پاکیزہ عشقیہ مثنوی لکھی تھی [13] ڈاکٹر نارنگ نے اس مثنوی پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے [14] نیاز کے معاصر اد میں اصغر ولائی، سیف فتحپوری، نشتر ہتگامی [15] سحر ہتگامی [16]، ابراہیم ہندی، عارف ہسوی [17] محمد فاروق شاہ پوری، تلخ گوتموی، زیبا کوثی، حسن الدین خاموش، علی واسط اور مولوی رعایت علی خاں کوثی مصنف خلفائے اسلام کے نام قابل ذکر ہیں۔ نشتر اور سحر دونوں شاعر بھی تھے اور مقالہ نگار بھی "زمانہ" کان پور

---

[1] مطبوعہ احمدی پریس کانپور ۱۳۰۳ھ [2] ثقافت، بابت جون ۱۹۶۳ء [3] یادگار ظہور از مولانا حسن الدین خاموش مطبوعہ عزیزیہ پریس آگرہ ۱۹۲۰ء

[4] "معارف" دسمبر ۱۹۵۱ء [5] "یاد ایام" از مولانا عبدالرزاق کانپوری [6] "داستان سے افسانے تک" از وقار عظیم [7] "ڈراما کی تاریخ و تنقید" از عشرت ر

[8] یہ مطبع چوگلیا (فتحپور شہر) میں واقع تھا اور عبدالغفور عاشق اس کے مالک تھے۔ [9] "سراپا سخن" از محسن مطبوعہ ۱۲۷۷ھ/۱۸۶۱ء ص ۲۳۵ + ۳۷۵

[10] تاریخ ادب ہندی از ظہیر الدین ص ۸۶ [11] "سراپا سخن" از محسن و تاریخ ادب ہندوستانی از گارساں دتاسی [12] ملاحظہ ہو مثنوی "نار سوزاں" از نشتر دل مطبوعہ الجلیل پریس بہرائچ ۱۹۲۹ء [13] "گلدستہ مسرت" مطبوعہ نظامی پریس کانپور ۱۲۹۵ھ [14] "اردو مثنویاں" ص ۳۳۵

[15] "ہماری زبان" علی گڑھ بابت اپریل ۱۹۶۰ء [16] "خمخانہ جاوید" از لالہ سری رام [17] "عظمت رفتہ" از ضیاء الدین احمد

تمدن ۔ اور اردو میں ان کے نام اکثر نظر آتے ہیں ۔ یہ دونوں فتح پور کے اس شریف و مشہور کائستھ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں ۔ جو موتی اینٹ والے سے مشہور ہے ۔ عہد برطانیہ کے پہلے ہندوستانی آئی جی مان سنگھ اسی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں ۔ اور فراق گورکھپوری کی دو بہنیں اسی خاندان کو بیاہی س خاندان کے افراد نے ہمیشہ علم و ادب اور سماجی و تعلیمی تحریکوں سے دلچسپی کا اظہار کیا ہے[1] ۔ رعایت علی خاں کوثی، عارف ہسوی، محمد فاروق شاہ پوری اور دین خاموش کا انتقال ابھی چند سال پہلے ہوا ہے ۔ اور ان کے بہت سے علمی و ادبی مقالات اور کتابیں شائع ہو چکی ہیں ۔ ابراہیم ہنری ۔ تاج گونوی سطار رشک، اور زیبا کوثی، نہایت خوش گو، خوش فکر شاعر تھے ۔ اور ان کا کلام مفصل بحث چاہتا ہے ۔ لیکن ان معاصرین میں سب سے زیادہ اہم اور قدر نام نیاز فتح پوری کا ہے ۔ اس لئے کہ آج علمی و ادبی حلقے میں فتح پور انہیں کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے ۔

ابتدائی بارہ تیرہ سال چھوڑ کر نیاز کی ساری عمر فتح پور سے باہر گذری ہے ۔ ۱۹۲۶ء کے بعد تو انہوں نے لکھنؤ میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی اگر وہ چاہتے تو خود کو فتحپوری کی بجائے لکھنوی لکھنے لگتے ۔ لیکن جس طرح ان کے ہم درس مولانا حسرت موہانی کانپور میں عمر بھر رہنے کے باوجود کانپوری سکے ۔

نہ چھوٹا درِ یار حسرت نہ چھوٹا
بہت ہم نے چاہا نہیں کانپوری[2]

اسی طرح نیاز بھی لکھنؤ میں مستقلاً رہ کر بھی لکھنوی نہ ہو سکے ۔ اس کے دو سبب معلوم ہوتے ہیں اول یہ کہ بارہ تیرہ سال کی عمر تک فتح پور کی وادبی فضا اور خصوصاً مولانا سید ظہور الاسلام کی شخصیت نے ان کے دل و ذہن پر اتنے گہرے نقوش بٹھا دیئے تھے کہ ان کا بھلانا مشکل تھا ۔ دوسرے یہ افتاد مزاج کی بنا پر وہ لکھنویت سے اس قدر دور تھے کہ لکھنؤ میں رہ کر بھی ان کا لکھنوی ہو جانا دشوار تھا ۔ ماہرین نفسیات کا یہ خیال درست معلوم ہوتا تیرہ چودہ سال تک کسی آدمی کا جو مزاج یا کردار بن جاتا ہے ۔ پھر اس میں بنیادی تغیر آسان نہیں ہوتا ۔ نیاز کے ساتھ کم از کم یہی ہوا ہے ۔ فتح پور ائی زندگی میں جو نقوش ان کے ذہن و قلب پر مرتسم ہو چکے تھے ان کا اثر عمر بھر نہ گیا ۔

نیاز فتح پوری ۱۳۰۲ھ ۱۸۸۴ء میں بمقام سنی گھاٹ (ضلع بارہ بنکی) پیدا ہوئے ۔ لیکن ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت زیادہ تر خود ان کے والد کی رانی فتح پور میں ہوئی ۔ ان کے والد محمد امیر خان عربی فارسی کے عالم و شاعر اور امام بخش صہبائی کے شاگرد تھے ۔ وہ فارسی اردو دونوں میں شعر تھے ۔ لیکن ان کی فکر کا دائرہ نعتیہ شاعری تک محدود تھا ۔ باپ کے اس ذوق فارسی اور ذوق شعری کا اثر بیٹے پر بھی پڑا ۔ چنانچہ نیاز کی ابتدائی تعلیم یس کا آغاز اس زمانہ کے قاعدے مطابق عربی فارسی سے کرایا گیا ۔ اور سات آٹھ سال کی عمر میں انھوں نے گلستان بوستان ختم کر لیا ۔ اس د نو دس سال کی عمر میں تقریباً ۱۸۹۳ء میں وہ مدرسہ اسلامیہ میں باقاعدہ تعلیم کے لئے داخل کئے گئے ۔ اس وقت اس مدرسہ میں تین شاخیں تھے ۔ عربی مدرسہ، انگریزی مدرسہ اور حافظ خانہ ۔ یہ تینوں شعبے ایک مجلس نظما کے تحت چل رہے تھے ۔ جس کے صدر خود مدرسہ کے بانی مولانا اسلام تھے ۔ نیاز فتحپوری ۔ اس کی دو شاخوں کے بہ یک وقت طالب علم تھے ۔ یعنی مدرسہ عربی میں درس نظامیہ کے طرز پر فقہ ۔ حدیث عربی صرف و منطق و فلسفہ کا درس لیتے تھے ۔ اور انگریزی شعبے میں علوم عمرانی و ریاضیات کے ساتھ انگریزی بھی پڑھتے تھے ۔ گھر پر الگ فارسی زبان و ادب س والد صاحب سے اور مولوی حبیب الدین سے لیتے تھے ۔ مدرسہ اور گھر دونوں جگہ کے ہم درسوں میں مولانا حسرت موہانی خصوصاً قابل ذکر ہیں ۔ وقت مدرسہ عربی میں صدر معلم مولانا نور محمد کے علاوہ مولوی امام علی اور مولوی حبیب الدین جیسے اساتذہ وقت موجود تھے ۔ مولانا ظہور الاسلام خود بھی درس دیا تھے ۔ انگریزی شاخ کے صدر معلم اعزاز علی تھے ۔ اس وقت چونکہ انگریزی تعلیم کے حصول کو گناہ کے مترادف خیال کیا جاتا تھا ۔ اس لئے بعض مسلمان مولانا ظہور الاسلام

---

[1] ثقافت لاہور جون ۱۹۶۳ء

[2] حسرت موہانی از عبدالشکور

کی اس تحریک کو پسند نہ کرتے تھے۔ کہ مدرسہ میں عربی و فارسی کے ساتھ انگریزی بھی پڑھائی جائے لیکن مولانا ظہور السلام نے علماء اور مدرسہ کے بعض اساتذہ کی پروا نہ کر انگریزی کو جاری رکھا اور بہت جلد اسے انٹرنس کے درجے تک پہونچا دیا۔ گویا اس مدرسہ میں نیاز کو دو خاص قسم کے علماء اور اساتذہ سے واسطہ ہوا۔ ایک وہ جو مولانا ظہور الاسلام جیسے نہایت سادہ مزاج، رقیق القلب، وسیع النظر اور کشادہ دل واقع ہوئے تھے۔ دوسرے حافظ قادر بخش اور محمد حسن جیسے جو مذہب و تعلی کے معاملے میں بڑے تنگ نظر اور سخت گیر تھے۔ نیاز کے والد اگرچہ کٹر مذہبی آدمی تھے۔ اور بچوں کے تعلیم و تربیت کا خاص خیال رکھتے تھے۔ لیکن ان کا نقطہ نظ اس بات میں اپنے معاصرین سے بہت مختلف تھا۔ وہ بچوں کی ذہنی پرداخت اور صحیح نشوونما کے لئے ان کو زیادہ سے زیادہ آزادی دیتے اور انھیں اپنے طور پر ہ چیز پر غور و فکر کا عادی بنانے کے قائل تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نیاز کے مزاج میں بچپن ہی سے ایک قسم کی آزادہ روی، روشن خیالی اور کشادہ نظری پیدا ہوگئی تھ اس لئے جب وہ مدرسہ میں داخل ہوئے تو انھیں بعض علماء اور اساتذہ کی سخت گیری اور تنگ نظری تعلیم کے سلسلے میں پسند نہ آئی۔ خاص طور پر جلیہ بنانے کے سلسلے میں قاری صاحب بانس کی قمچیوں سے جس بے رحمی کے ساتھ بچوں کے جسم لال کر دیتے اس سے نیاز بہت کڑھتے اور تنگ نظر علما اور مذہب کے متعلق ان کے دل میں جگہ کم ہوتی جاتی۔ مدرسہ کے سات سالہ قیام میں جب انہوں نے یہ دیکھا کہ دیوبند کے بعض فارغ التحصیل اساتذہ بھی انگری شاخ کو سٹنے کے درپے ہیں۔ اور مغربی تعلیم کے حصول کو گناہ خیال کرتے ہیں۔ تو انھیں ایسے تنگ نظر علماء سے نفرت پیدا ہونے لگی۔ اسی نفرت کا رد عمل ا کی وہ تحریریں ہیں۔ جو کچھ دنوں بعد نگار کے صفحات میں نمودار ہوئیں اور عقلی و مذہبی معرکہ آرائیوں کو جنم دیکر علمی و ادبی حلقے میں آزادی فکر کا ایک نیا باب کھو

نیاز نے مدرسہ اسلامیہ میں کوئی سات سال تعلیم پائی۔ عربی۔ فارسی۔ منطق۔ فلسفہ صرف و نحو اور فقہ و حدیث کا درس انھوں نے یہیں لیا۔ یہیں سے مڈل کیا اور یہیں سے انھوں نے ۱۸۹۹ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس وقت ان کی عمر کوئی قریب چودہ سال کی تھی۔ بعد ازاں وہ اپنے والد کے ساتھ لکھنؤ چلے گئے۔ اور وہیں ان کی تعلیم کا انتظام کیا گیا۔ لیکن ان کی زندگی میں مدرسہ اسلامیہ فتح پور کے عہد طالب علمی کو جتنی اہمیت حاصل ہے۔ اتنی کسی اور جگہ کے قیا کو نہیں ہے۔ خود نیاز کے قول کے مطابق ان کی شخصیت کو بنانے یا بگاڑنے میں فتحپور کے زمانہ طالب علمی کا بڑا ہاتھ ہے۔ [1] اسی زمانے میں وہ مذہب کو تحقیق و تشکیک کی نگاہ سے دیکھنا شروع کرتے ہیں۔ یہیں ان میں صحیح اسلام کو سمجھنے کا شوق اور مذہبی تحقیق کا نیا رجحان پیدا ہوتا ہے۔ اور یہیں ان کا ذ شعر و ادب اول اول تخلیق و اظہار کی صورتیں اختیار کرتا ہے۔ چنانچہ وہ خود ایک جگہ لکھتے ہیں۔ "اس زمانے میں مجھے شعر کہنے کا بھی شوق پیدا ہو گیا تھا فارسی میں کبھی کبھی اور اردو میں اکثر۔" [2] اس بیان سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ان کے ذہن کی فکری اور ادبی دونوں راہیں فتح پور کے قیام ہی میں متعین ہوگئی تھیں اور وہاں سے جانے کے بعد ان میں کوئی خاص تغیر نہیں ہوا۔

۱۸۹۹ء میں میٹرک کرنے کے بعد نیاز فتحپوری لکھنؤ چلے گئے اور اپنے والد محمد امیر خان کے وسیلہ سے جو کہ اس وقت لکھنؤ میں کوتوال تھے۔ پولیس میں انسپکٹر نامزد ہوئے۔ ۱۹۰۰ء میں پولیس ٹریننگ سے واپس آکر تھانہ ہنڈیا (ضلع الہ آباد) میں تعینات ہوئے۔ لیکن چونکہ پولیس کی ملازمت اور نیاز کے مزاج میں بعد المشرقین تھا۔ اس لئے یہ سلسلہ بہت دنوں تک قائم نہ رہ سکا۔ اور صرف دو سال بعد ۱۹۰۲ء میں اس ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔

چند سال ججگڑھ اسٹیٹ (بندیل کھنڈ) اور ہانسی (ضلع حصار) میں بسلسلہ ملازمت مقیم رہے اور ۱۹۰۷ء، ۱۹۰۸ء میں جب ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ تو فتح پور واپس آگئے۔ اور مدرسہ اسلامیہ میں انگریزی شاخ کے ہیڈ ماسٹر ہو گئے۔ ڈپٹی عبدالرؤف عشوی اور آفتاب علی خاں کو جن کی عمریں اس وقت ساٹھ کے قریب ہیں۔ آپ کے اسی زمانہ کے شاگرد ہیں۔ اس بار فتح پور میں نیاز کا قیام دو تین سال سے زیادہ نہیں رہا۔ لیکن ان کے علمی و ادبی رجحا و مذاق کو اس مختصر قیام نے بھی متاثر کیا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ علامہ عبداللہ یوسف علی فتح پور خاص میں کلکٹر تھے۔ اور فتح پور سے ملحق تحصیل سراتھو (ضلع الہ آباد) میں اردو کے مشہور انشاء پرداز مہدی افادی تحصیلدار کے عہدے پر فائز تھے۔ نیاز کے لکھنے پڑھنے کا زمانہ شروع ہو گیا تھا۔ اور ان کی ذہانت اور طرز انشا کی شہرت قرب و جوار میں عام ہو چکی تھی۔ عبداللہ یوسف علی اور مہدی افادی کی ملاقاتوں نے ان کے لکھنے پڑھنے اور غور و فکر کی رفتار کو تیز تر کر دیا۔

---

[1] میری زندگی کے دو موڑ۔ دسمبر ۱۹۶۰ء

[2] " " " "

۱۹۱۰ء میں نیاز "زمیندار" اخبار سے وابستہ ہو گئے۔ اور فتحپور اب ان سے مستقلاً چھٹ گیا۔ اس کے بعد وہ مختلف جگہ رہے۔ لیکن اپنے آبائی وطن جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ ۱۹۳۳ء/۳۴ء میں مدرسہ اسلامیہ کی ایک ادبی تقریب میں البتہ وہ چند گھنٹوں کے لئے گئے تھے۔ ۱۹۴۸ء میں راقم الحروف نے لکھنؤ جاکر مدرسہ مذکور کے سالانہ مشاعرے کے لئے انھیں دعوت دی۔ نیاز صاحب سے یہ میری اولین ملاقات تھی۔ بڑی شخصیتوں سے ملتے وقت جو رعب داب انسان پر طاری ہو جاتا ہے۔ وہ مجھ پر بھی ہوا۔ ڈرتے ڈرتے حرفِ مدعا زبان پر لے آیا۔ جواب میں فرمانے لگے۔ "چلئے فتحپور والوں نے مجھے یاد تو کیا۔ آپ لوگوں نے تو مجھے بھلا دیا۔ لیکن میں اس سرزمین کو نہیں بھولنے کا"[1] ان فقروں میں کتنا خلوص، کتنا اثر اور میرے لئے نیاز سے قرب کا کتنا سامان موجود تھا۔ میں بیان نہیں کر سکتا۔ میری ہمت بڑھاتے ہوئے پوچھنے لگے۔ "اور کون کون مشاعرے میں آرہا ہے" میں نے چند نام بتائے۔ کہنے لگے اثر لکھنوی اور فراق گورکھپوری تو بہت قریب ہیں۔ انھیں بھی دعوت نامے بھیجے" خود بھی اسی وقت خط لکھے اور میرے حوالے کر دیئے۔ میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ کہاں چھوٹے موٹے شاعروں کو بھی درجنوں خوشامدانہ خطوط لکھنے اور ناز برداریاں اٹھانے کی مصیبت میں گرفتار تھا۔ کہاں چند منٹ میں اثر لکھنوی اور فراق جیسے بڑے ادیبوں اور شاعروں کی شرکت کی صورتیں پیدا ہو گئیں۔ چلتے وقت میں نے ان کی روانگی کی تفصیل پوچھنی چاہی کہنے لگے۔ "آپ میری فکر نہ کیجئے۔ میں کانپور سے ڈاک پکڑ لوں گا۔ مشاعرے سے دو گھنٹہ پہلے ۶½ بجے فتح پور پہنچ جاؤں گا۔"

حقیقتاً یہی ہوا۔

نیاز صاحب نے رات کو مشاعرے کی صدارت فرمائی۔ صبح ناشتہ کر کے مدرسہ اسلامیہ کی سیر کی۔ اور اس کے در و دیوار پر حسرت سے نظر ڈالتے ہوئے دوپہر کی گاڑی سے لکھنؤ واپس چلے گئے۔ لکھنؤ پہنچ کر انھوں نے ایک نہایت شفقت آمیز اور حوصلہ افزا خط لکھا اور تحریر فرمایا۔ کہ آپ مدرسہ اسلامیہ (موجودہ انٹر کالج) کے کتب خانہ کے لئے اگر کچھ کتابیں چاہیں تو لے جائیں۔ میں اپنے دو عزیز دوستوں احباب محمد کامل و شباہت علی خاں کے ساتھ جب لکھنؤ پہونچا تو معلوم ہوا ایک دو نہیں وہ سینکڑوں کتابیں مدرسہ کو دینے کے لئے تیار ہیں۔ چنانچہ ہم نے کئی بڑے بڑے بورے خریدے اور ان میں گنتی کئے بغیر کتابیں بھر لیں۔ یہ کتابیں مدرسہ اسلامیہ کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں۔ ان کتابوں کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیجئے کہ ان میں فارسی اور اردو شعراء کے تقریباً سارے کلیات و دواوین، قدیم تذکرے اور بہت سی نادر کتابیں تھیں۔ مستند قدیم مطبعوں کی چھپی ہوئی تھیں۔ اور آج پاکستان میں جن کے دیکھنے کے لئے آنکھیں ترستی ہیں۔

مدرسہ اسلامیہ کے سالانہ مشاعرے ہی کے سلسلے میں نیاز صاحب ایک بار اور ۱۹۵۱ء میں فتح پور گئے۔ اس لئے کہ ایک خط میں انہوں نے لکھا، "پرسوں فتحپور کے مشاعرے میں شریک ہوا تھا۔ آپ کا ذکر دیر تک رہا"[2]۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۴ فروری ۱۹۵۱ء کے مشاعرے میں شریک ہوئے اور دوسرے روز لکھنؤ واپس آگئے۔

★

"مولانا حسرت موہانی کو اپنی دادی کی طرف سے تحصیل کھجوا ضلع فتح پور میں تین گاؤں وراثتاً ملے تھے اور اسی سلسلے میں حسرت کا آنا فتح پور ہوا۔ ۱۸۹۴ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول میں انگریزی تعلیم شروع کی لیکن خارجی اوقات میں مولانا ظہور الاسلام بانی مدرسہ اسلامیہ فتح پور سے عربی اور میرے والد سے فارسی پڑھی۔ میں ان کا ہم درس تھا اور مجھے ان سے نسبت خواجہ تاشی حاصل تھی۔ وہ میرے گھر کے پاس شیخ شاکر علی مرحوم کے مردانخانے میں رہا کرتے تھے اور وہیں ہر وقت محفل شعر و سخن گرم رہتی تھی۔ فتح پور میں حسرت کا جاننے والا میرے سوا کوئی نہیں۔ ان کے خاص احباب، روح الامین اور سید ہاشم کورٹوی تھے، . . . . ہاشم کے ساتھ انھیں خصوصیت سے شغف تھا اور یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ وہ حسرت کی شاعری کے موضوع تھے چنانچہ حسرت نے اپنے اشعار میں متعدد جگہ ان کا ذکر کیا ہے۔"

(نیاز)

---

[1] میری زندگی کے دو موڑ۔ دسمبر ۱۹۶۲ء

[2] خط بنام راقم الحروف مرقومہ ۱۶ فروری ۱۹۵۱ء

نیاز فتحپوری کی ادبیت

ل۔ احمد

نیاز صاحب کی طویل فہرست تصانیف پر نظر ڈالنے سے بسہولت اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان کی ہمہ گیر جودت طبع کسقدر متضاد و موضوعات علم و ادب پر محیط ہے۔ کیوپڈ و سائکی اور فراست الید اور اُن کے مابین متعدد و شاعر مضامین پر مبسوط بحثیں ان کے امعان نظر کا ثبوت ہیں۔ ظاہر ہے کہ اتنے متنوع موضوعات کا احصاء کرنا میرے امکان سے باہر ہے۔ نتیجے سے قطع نظر، اگر ایسی جسارت کی بھی جائے تو اس کی شکل ایک مضمون کی نہوگی بلکہ مستقل تصنیف بن جائیگی۔

نفسِ مضمون پر گفتگو کرنے سے پہلے میں توجہ دلانا چاہوں گا کہ ہماری زبان جس دورِ ارتقا سے گزر رہی ہے، میرے خیال کے مطابق، اس کا تقاضا ہے کہ اردو میں ادبی پیداوار کی مقدار زیادہ سے زیادہ ہو۔ انتقادِ ادب کی اہمیت و ضرورت میں مبالغہ کیا ہی نہیں جاسکتا، لیکن ادبی پیداوار بڑھنے کے معنے ہیں کہ الفاظ و اسالیب کے ذخیرے میں اضافہ ہو۔

نیاز کی ادبی شخصیت

چنانچہ ادبی ذخیرے کی فراہمی اور علمی و ادبی ابداع یعنے الفاظ و اسالیب کی جدت کے پہلو سے نیاز صاحب کی خدمات نہایت وزنی ہیں، اور ان کی ادبی شخصیت نہایت ممتاز ہے۔ مستقل تصانیف کے علاوہ، نیاز صاحب نے نگار کے ذریعے سے گزشتہ چالیس سال میں اردو کو متمول بنا دیا ہے، موجودہ نسل میں مدیر الہلال مولانا ابوالکلام آزاد کے سواء اور کوئی نہیں سکا ہے۔

اردو بولنے اور پڑھنے والی موجودہ نسل کی ذہنی تربیت میں نیازؔ صاحب کی روشن خیالی اور حریتِ فکر کو بہت بڑا دخل ہے۔ تقلید پرستی نے ہماری فکری صلاحیتوں پر جو جالے پڑے تھے۔ ان کی صفائی میں نگار کی تحریروں نے حیرت انگیز کام کیا ہے۔

مجاز مرحوم اور سبط حسن صاحب نے ایک صحبت میں اعتراف کیا کہ "ہماری ذہنی تعمیر نگار کے مطالعے سے ہوئی ہے۔" اور مکرمی جمیل مظہری صاحب کے الفاظ ہیں کہ "نگار پڑھ پڑھ کے ہمیں لکھنا آیا۔"

نیازؔ کی ادیبانہ شخصیت میں، میری نظر میں، پہلی اور بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انہیں اپنی رائے پر کلی اعتماد ہوتا ہے، اور ایسا اعتماد اسی صورت میں ممکن ہے جب آدمی کو محض اپنی ذات پر اعتماد ہو، یا کہئے اعتماد و رائے اور اعتماد ذات ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ اور اسی اعتماد رائے کا نتیجہ ہے کہ وہ عام معتقدات کے خلاف ہیں۔ اپنے نتائجِ فکر کو کمال وثوق اور حرارت کے ساتھ پیش کر دیتے ہیں۔ البتہ بعض مصالح کی بناء پر وہ اپنے معتقدات سے توبہ بھی کر سکتے ہیں

یعنے ناحق سے مصالحت بھی کر لیتے ہیں۔ ان کی دوسری خصوصیت میری نظر میں یہ ہے کہ وسیع المطالعہ ہونیکے ساتھ ان کی نظر دور رس اور عمیق ہے۔ اُن کا ذہن و دماغ زرخیز ہے جو تھکنا نہیں جانتا اور مشاہدہ حد درجہ تیز اور ذکی ہے۔

ہر چند اس مشینی تہذیب کے دور میں یک فنی ہونا ہی مفید و کارآمد سمجھا جاتا ہے یعنے آدمی کسی ایک علم میں ایک شاخ یا شعبے کا ماہر بن جائے لیکن یہ بات ان قوموں کے اندر تو مفید اور قابل عمل ہو سکتی ہے جن میں قحط الرجال ہو؛ ہماری قوم میں ایسی ہستیاں مغتنمات سمجھی جانا چاہئیں جو زبان و ادب کے مختلف پہلوئی اور شعبوں پر عبور رکھتی ہوں۔ نیاز صاحب کے ذات میں یہ جامعیت نظر آتی ہے کہ وہ علم و ادب کی مختلف شاخوں اور متنوع پہلوؤں پر اعتبار رائے کر سکیں: ان کی نظر وسیع ہے کیونکہ ان کے اندر اخذ و اقتباس کی قوت بدرجۂ کمال ہے؛ جو کتاب یا مضمون ان کی نظر سے گزرتا ہے اس کا جوہر یا ماحصل ان کے دماغ میں محفوظ ہو جاتا ہے۔

شروع بیسویں صدی کے اردو مجلات میں الہلال وصلائے عام وغیرہ چند کے علاوہ باقی رسالوں کے فائل اگر آج دیکھے جائیں تو نہایت سطحی قسم کے مضامین پڑھنے میں آئیں گے۔ نگار کے اجراء نے نہ صرف اردو ادب کا معیار بلند کیا بلکہ اعلیٰ اور سنجیدہ ادب کے پڑھنے اور پسند کرنے والوں کی ایک جماعت پیدا کر دی؛ بالکل اسی طرح جیسے اس نے سنجیدہ اور اعلیٰ ادب تخلیق کرنے والوں کا ایک حلقہ منظم کیا۔ اور اسے جناب نیاز کی کارگزاری ہی کہا جائیگا: موجودہ دور میں ادبی ذوق کی تعمیر اور علمی معلومات کی جستجو کے اندر نگار اور اس طرح ایڈیٹر نگار کا بڑا ہات ہے؛ جو اس نیازمند کے اندازے میں نیاز صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

علمی معلومات کی اشاعت میں نگار نے جس قدر اور جتنا اہم کام کیا ہے، اردو کے کسی دوسرے مجلے نے نہیں کیا ہے: علمی و ادبی مقالات کی اشاعت سے قطع نظر صرف استفسار و جواب کے ذریعے سے ایڈیٹر نگار نے موجودہ نسل کو وقیع اور سنجیدہ علمی مذاق سے آشنا کیا اور حریت فکر کا سبق دیا ہے۔ اس عنوان کے تحت جتنا مالاہم تحریر آیا ہے وہ اپنی جگہ تو دائرۃ المعارف نہیں ہے۔ مگر اس کی بنیاد ضرور بن سکتا ہے۔

یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ اس قدر مختلف النوع مباحث پر جستجو کر کے معلومات بہم پہنچانا بجائے خود بڑی قابلیت کا ثبوت اور بہت بڑی خدمت کی دلیل ہے۔ اس سلسلے کے پڑھنے والوں کی علمی و تاریخی معلومات میں کتنا اضافہ ہوا اور اس مطالعے نے ہمارے ذہنوں کی تربیت میں کیسا زبردست کام کیا ہے، اس کو عام لوگ نہیں سمجھ سکتے مگر خواص بالیقین محسوس کر سکتے ہیں۔

نیاز کی انشاء پردازی

اس دور میں نیاز صاحب اردو کے مسلمہ ادیب و انشاء پرداز اور بلاشبہ اعلیٰ طرز نگارش کے مالک ہیں۔ آپ چاہیں تو اسے میرا ذاتی تاثر سمجھ لیں کہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کے بعد ایک نیاز صاحب ہی کی انشاء و ادبیت کا قائل ہوں: ان کی چست اور رواں عبارت کو پڑھ کر الفاظ کے صحیح و باموقعہ استعمال کا فن سیکھا جا سکتا ہے۔ نیاز صاحب نے اکثر مغربی اسالیب بیان کو مشرق کی طرف موڑ دیا اور بے تکلفانہ انداز میں اپنا کر اپنی زبان و ادب کو متمول بنایا ہے۔ نیاز صاحب کی انشاء کی ایک بڑی خوبی میری نظر میں یہ ہے کہ اُن کے قلم سے خشک مضامین بھی، خواہ وہ پیمائش افلاک ہی کیوں نہو، افسانے کی رنگینی اور حکایت کی دلچسپی لئے نکلتے ہیں۔

نیاز صاحب کی انشاء و ادبیت کے ذیل میں میں ان کے دو مجموعوں یعنے نگارستان و جمالستان کا ذکر کروں گا۔ جو ان کے افسانوی ادب پر مشتمل ہیں۔ ان مجموعوں میں ورد الحمراء، کیوپڈ و سائکی، ایک رقاصہ سے، چنگاری، مطربۂ فلک، ایک شاعر کا انجام اور ستی وغیرہ بہ لحاظ نزاکت تخیل، طرز ادا اور ادبی ساعتہ میرے خیال میں ایسے ادب پارے ہیں جو ادب عالیہ" کی حیثیت سے ہمیشہ پوجے جائیں گے۔

ان مجموعوں میں بعض پارے ایسے بھی ہیں جنھیں کہا جائے گا کہ اصلاحی مقصد سے لکھے گئے ہیں۔ اور جو اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہیں اور بعض پارے ایسے بھی ہیں جو مزاح کا پہلو لئے ہوئے ہیں۔ نیاز صاحب کی طبیعت میں شوخی کا جزو شامل ہے جو ان کی انشاء میں جھلکتا بھی ہے مزاح و ظرافت ایک جداگانہ چیز ہے۔ میرے خیال میں نیاز صاحب اس کے لئے بنے نہیں ہیں۔

میں نیاز صاحب کی افسانہ نگاری پر اظہار رائے کرنا نہیں چاہتا کیونکہ یہ ایک نقد نگار کا فرض ہوتا ہے؛ اتنا البتہ کہہ سکتا ہوں کہ ان ک
افسانوں کا تخیل و تصور جسے انگریزی میں (CONCEPTION) کہا جاتا ہے، مجھے اس سے کلی اتفاق نہیں ہے۔ بہرگونہ ان کی ہر تحریر شاہد ہے کہ نیا
صاحب کا متخیلہ ازبس قوی۔ تخیل نہایت نازک، ذہن کمال رسا اور مشاہدہ غایت دقیق ہے: وہ نہایت معمولی باتوں میں حسن کا پہلو دیکھ لیتے ا
اسے بڑے دلاویز اور حسین طریق پر پیش کر سکتے ہیں۔ الحاصل نیاز صاحب ایک صناع ادب ہیں!

اس ذیل میں "مکتوبات نیاز" کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ لوگوں کے مکاتیب بالعموم اس وقت مجتمع کئے جاتے اور شائع ہوتے ہیں جب اُن
لکھنے والوں کے اعمال منقطع ہو چکتے ہیں۔ مگر یہ کتاب[1] خود نیاز صاحب کے اہتمام میں شائع ہوئی۔ بالفاظ دیگر یہ خطوط تصنیف کئے گئے ہیں۔ اس لئے اس
وہ خصوصیت تلاش کرنا جو نجی خطوط ہی میں ملتی ہے، غلط ہوگا۔ مگر ایک تصنیف کی حیثیت سے ان کی دوسری تصانیف کی طرح اس کتاب میں بھی برجستگ
کلام، شوخی بیان اور لطافت خیال کی بہتات ہے، اور انشائے عالیہ کا عمدہ نمونہ!

نیاز کے معترضین

مجھے ایسے لوگوں سے گفتگو کا موقعہ ملا ہے جو نیاز صاحب کی علمی و ادبی خدمات کو اس لئے بلند مرتبہ نہیں دیتے کہ نیا
کے بیشتر مضامین ماخوذ ہوتے ہیں مگر وہ اپنے ماخذ کا حوالہ نہیں دیتے اور استفسار و جواب کے ضمن میں وہ ان کتا
کے نام ظاہر نہیں کرتے جن سے مدد لیتے ہیں۔

میں ان اعتراضات کی نوعیت سے تو بحث نہیں کروں گا مگر اس ذیل میں یہ ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ چونکہ مجھے نیاز صاحب سے ایک زمانے یں
قربت زیادہ رہی ہے۔ اس وجہ سے مجھے یہ اندازہ ہوا کہ ان کے ذہن و فراست کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ جو کتاب ایکدفعہ ان کی نظر سے گزر جاتی ہے ا
خلاصہ یا ماحصل ان کے ذہن و نفس میں محفوظ ہو جاتا ہے اور اس صورت میں بالکل قرین عقل ہے کہ ایک موضوع پر ان کے ذہن میں جو مواد محفوظ
رہا ہے، کسی وقت تحریک ملنے پر ایک مضمون یا مقالے کی صورت اختیار کرے؛ اور مختلف ماخذوں سے ایک ہی موضوع پر مواد حاصل ہونے کی صورت
تو حوالہ دے سکنا ممکن بھی نہیں ہے۔

اب دیکھنا یہ رہ جاتا ہے کہ آیا دنیا میں کسی خیال یا عندیے کو نیا کہا بھی جا سکتا ہے؟ اور اس مقولے میں کتنی صداقت ہے کہ "زیر آفتاب کوئی
نئی نہیں ہے"؟ عرفی کی حسین شاعرانہ قسموں کا اولین خاکہ امیر خسرو کے یہاں موجود ہے اور اقبال کے شکوہ کا چربہ غالب کی مثنوی میں دیکھا جا
لیکن کیا اس بناء پر عرفی کا قصیدہ اور اقبال کی نظم قابل قدر نہ سمجھی جائیگی؟

استفسار و جواب کے متعلق بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ بہ لحاظ نوعیت اس قدر متنوع اور مختلف معلومات پر مشتمل ہوتا ہے کہ ہمیں بغیر کہ
لینا چاہیئے کہ وہ معلومات نیاز صاحب مختلف ذرائع سے بہم پہنچاتے ہیں۔ اور بالیقیں وہ ایک لمحے کے لئے بھی نہیں سوچ سکتے ہیں کہ ان معلومات
خود ان کے دماغ کی پیداوار سمجھیں گے۔ میری دانست میں تو کسی کا بھی اس طرح سوچنا یا سمجھنا مضحکہ انگیز خیال ہے اور اس سے زیادہ مضحکہ انگی
خیال ہے کہ نیاز صاحب ان تمام معلومات کو اپنے ذہن و دماغ کا ماحصل باور کرانا چاہتے ہیں۔ اور بالفرض، اگر مختلف و متعدد ماخذوں سے معا
بہم پہنچانا "علامہ" سمجھے جانے کی وجہ و ثبوت ہو سکتا ہے تو اخبار اسٹیٹسمین[2] کا "سوال و جواب" کا کالم مرتب کرنے والا نیاز صاحب سے بھی بڑ
ہے۔ کیونکہ وہ بھی اپنے ماخذوں کا حوالہ نہیں دیتا ہے۔

مجھے شدید احساس ہے کہ نیاز صاحب کی انشاء و ادبیت کے محاسن اجاگر کرنے کے لئے کسی ایسی ہستی کی ضرورت تھی جو نیاز صاح

---

[1] اس قسم کی دوسری کتاب مولانا آزاد مرحوم کی غبار خاطر ہے۔

[2] اس زمانے میں اس اخبار کا آخری صفحہ سوال و جواب کے لئے مخصوص تھا۔

مرتبہ ہوتی۔ مگر جناب منظر صدیقی کے اصرار اور خود اپنی نیازمندی کے تقاضے کی بناء پر یہ جرأت کر سکا ہوں اور یقین ہے کہ اپنی کم مائیگی کی وجہ ے میں جن خوبیوں کو نہیں دیکھ سکا ہوں، قارئین کا ذوق و ذہانت انہیں نظر انداز نہیں کر سکے گا۔

ضروری نہ تھا کہ نیاز صاحب کی انشاء کے نمونے پیش کئے جاتے کیونکہ ان کی تحریر کا کوئی جزو ایسا نہیں ہوتا جو ادبی حسن نہ رکھتا ہو، لیکن اپنے وق و پسند کے مطابق بعض اقتباس پیش کر رہا ہوں:-

ایک مصور فرشتہ

"خشکی کا حصہ سارے عالم میں صرف اسی قدر تھا اور میرِ آب حباب کا حکم سوائے اس قطعۂ زمین، ساری کائنات پر سیال، لیکن حالت یہ ی کہ سبزہ نہ تھا مگر یاسمین، اور چھوٹی چھوٹی موج آب تھی مگر برگِ نیلوفر، سفید اور صرف سفید رنگ بس تمام موجودات عالم ملفوف تھے۔ گویا نیچر ہنس ہا تھا......

"ایک شب کا واقعہ ہے، وادی قاف میں سپید پھولوں کی کثرت سے ایک طوفان عریانی بپا تھا، فرط تعطر سے پنکھڑیاں جابجا شق ہو گئی تھیں، چاند اپنے ارے وجود کے ساتھ چادر میں پھیلا کر اتر آنے کی کوشش کر رہا تھا، چھوٹی چھوٹی موجیں جن میں ضیائے ماہ بھر کر رہ گئی تھی یہ معلوم ہوتا تھا کہ نقرئی زنجیریں یں اور حباب کے گھونگر دانے، جو صبا کے سبک و نازک پاؤں سے فرشِ آب پر بہنگام رقص نکل کر رہ گئے ہیں، کرۂ آب یادشت نیلوفر میں جو کلی کھل کر گئی تھی اور اس کے اندر قطرۂ آب جگمگا رہا تھا تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ ناہید فلک کا ہیکل کی شوالے میں رکھا ہوا ہے......"

کیوپڈ و سائیکی

"جب رات کو شاہی باغ اور کنجوں میں گھڑی گھڑی بجلی کی سی چمک نمودار ہو کر غائب ہو جاتی تو سارے شہر کو معلوم ہو جاتا کہ آج سائیکی نقاب ٹ کر پھول توڑ رہی ہے......"

"...... انتخاب شوہر کی حس جو عورت کی جوانی کی تنہا حس ہے، اس میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔ بہت سی تصویریں اس کے سامنے پیش ں نہ کی جاتیں اور جو دکھائی جاتیں اس کے سوا کچھ نہ ہوتا کہ وہ ایک دفعہ تصویر پر نگاہ ڈالتے ہی لانے والے کو نہایت غور سے از سر تا پا دیکھ لیتی۔ ہاں، اسے ور تھا، اپنے حسن پر ناز تھا! بار ہا ایسا ہوا کہ اس نے تصویر کی پشت پر لکھوا دیا کہ یہ اگر انسان ہے تو مجھے ایسے انسان کی ضرورت نہیں!"

"وہ کسی شاعر کی بہترین تصنیف اٹھا لیتی اور جذباتِ حسن و عشق میں یہاں تک مستغرق ہو جاتی کہ کتاب اس کے ہات سے چھوٹ جاتی۔ بار ہا ایسا تا...... کہ اسی حالت انہماک میں اس کی نگاہ کسی پھول پر پڑ جاتی تو وہ خدا جانے کیوں شرما جاتی ...... غرضکہ اس کی تنہائی کی کوئی گھڑی ی نہ تھی، اس کی خلوت کی کوئی ساعت ایسی نہ تھی جسے وہ اپنے حُسن سے معمور نہ پاتی ہو؛ اس کا کوئی تخیل ایسا نہ تھا جو شرم و حجاب پر ختم نہ ہوتا ہو...... ھر ایسے کھیلوں میں جن میں وہ خود کسی کو ڈھونڈھنا یا اپنے تئیں ڈھونڈھا جانا پسند کرتی ...... اکیلی ہوتی تو مہندی کی بھول بھلیوں میں گھس تی اور آپ اپنی تلاش کرنے لگتی ...... سائیکی نصف عورت تھی اور نصف انفعال و جستجو!"

"اب وہ اپنی زندگی سے جسے وہ صرف ایک طویل دن کہہ سکتی تھی یہاں تک سیر تھی کہ اکثر تاریک مقامات میں وقت صرف کرنا پسند کرتی تھی، مگر یہ دیکھکر کیسی گھبراتی تھی کہ تاریکی اس کے لئے روشنی ہے......"

"اس کے اعضا دکھ رہے تھے ...... اس لے ہات الٹ کر پیشانی کو چھوا اور پھر اپنے بازوؤں کو اپنے ہات سے پکڑ کر ایک آدھ دفعہ بل دیا......"

"...... لیکن اگر رفتار کی لچک کوئی مستقل چیز ہے، اگر سبک خرامی صرف کشیدہ قامتی کی صفت لازم نہیں بلکہ جداگانہ حسن ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ حسن صرف سائکی کی رفتار کو دیکھکر سمجھ میں آسکتا تھا ...... سائیکی کنجوں میں غائب ہو گئی لیکن اس کی رفتار کا ارتعاش اب بھی روح میں ہوا ہے۔"

وینس کو سائکی کے حسنِ عالم سوز کی اطلاع ملتی ہے تو رشک و حسد سے بیتاب ہو جاتی ہے اور ایک تدبیر سوچ کر اپنے بیٹے کیوپڈ سے جاکر کہتی ہے:۔

"جب تو تیر و کمان لے کر نکلتا ہے تو سنا ہے کہ جوان لڑکیاں تیرے ہاتھ جوڑتی ہیں کہ 'اچھے کیوپڈ جی چاہتا ہے تو ہمارے دلوں کو چھلنی کر دے لیکن خدا کے لیے پیروں میں زنجیرِ محبت نہ ڈال'، کرۂ زمین میں رئیس یونان کی چھوٹی بیٹی سائیکی تیری قائل نہیں، جا اور اس کو بتا دے کہ وینس کا بیٹا کیا تیر انداز اور غرور شکن ہے!"

کیوپڈ جاتا ہے کہ سائیکی کو گھائل کر دے مگر،۔

"فرشتوں نے صحائف میں لکھ لیا، حوروں نے اپنے کاشانوں میں سن لیا کہ آج وینس کا بیٹا سائگی کے باغ میں بے ہوش پڑا ہے!"

میری دانست میں پسند کے مطابق شاعرانہ تخیل اور نزاکت بیان کی جو بلندیاں نگارستان میں ملتی ہیں، جمالستان کے اندر اتنی نہیں ہیں۔

"دنیا کا اولین بت تراش" اس مجموعے کا پہلا افسانہ ہے جس میں علوئے تخیل کے ساتھ نفسیات کے ایسے لطیف اشارے اور نازک لمس سامنے آتے ہیں کہ دل پھڑک اٹھتا ہے۔ ہیرو جب ایک بت بنا کر اس سے محبت کرنے لگتا ہے تو اس کے دل میں یہ فطری آرزو پیدا ہو کر اسے بیتاب کر دیتی ہے کہ:۔

"اس سے کچھ بات کرے اور وہ جواب دے، اس کو اپنی آغوش میں لے لے اور اس کا بدن لچک جائے ...... بسا اوقات وہ اس خیال سے اس حد تک متاثر ہو جاتا ہے کہ وہ اسے واقعی زندہ سمجھنے لگتا اور اس سے جا کر پوچھنے لگتا کہ تیرے لب کیوں نہیں کھلتے —— کیا مجھ سے برہم ہے؟"

"...... جب اس نے دیکھا کہ مجسمے کا رنگ بدل چلا ہے اور اس کا جسم اتنا سخت نہیں رہا کہ اسے سنگین کہہ سکیں، جب وہ دبا تو نرم محسوس ہوتا تھا جیسے کیلے کا درخت ......"

اس آرزو کی شدت یہاں تک بڑھتی ہے کہ ہیرو آفتاب سے التجا کرنے لگتا ہے کہ اپنی محبوبہ سنگین کے لئے وہ چیزیں اس سے مانگ لے جن کی اس میں کمی پاتا ہے:۔

"...... لیکن اگر تو چاہے تو سب کچھ کر سکتا ہے، تیرے دامن سے میں تھوڑا سا رنگ چاہتا ہوں اور ذرا سی گرمی، اور اگر تو عنایت کرے تو کچھ وہ چیز بھی جس سے تو جنگلوں میں پھلوں کو پختہ کرتا ہے اور سنہرا!"

ہیرو صنم تراش اپنی تمنا آرزو کو ہر ذرے کے سامنے پیش کرتا پھرتا ہے اور اسی پیشکش التجا میں ایک شب:۔

"...... قریب قریب ساری روح صرف کر چکا تو بے ہوش ہو گیا۔"

اس مجسمے میں جان پڑ جاتی ہے اور صنم تراش کی آرزوئیں اور خواہشیں آسودہ ہو جاتی ہیں؛ اور بالآخر مسرتیں اور لذتیں عادتوں اور روزمرہ میں تبدیل ہو جاتی ہیں، اور پھر وہ وقت آ جاتا ہے کہ بیزاری شروع ہو جاتی ہے، پھر:۔

"...... یہاں تک کہ ایک دن ازقاد (ہیرو)، نے انتہائی غیظ و غضب کی حالت میں اس کو مارا تو دفعتاً نگاہوں پر سے پردہ ہٹ گیا اور اس کا ہاتھ کسی پتھر جیسی چیز پر پڑا ......"

"ایک شاعر کی محبت" میں نیاز صاحب نے مرد کی وہ خصوصیات بیان کی ہیں جو جنسِ لطیف کی توجہ کو جذب کر لیتی ہیں:۔

"جاوید کی قابلیت، اس کا ذوقِ ادب، اس کی شہرت شعری، اس کی وارفتہ ادائیں، اس کی ہر وقت کی بیخودی اور پھر اس کے ساتھ اس کے تاثراتِ عشق کا چہرہ سے اظہار، ان سب نے مل کر اسے جنسِ لطیف کی توجہ کا آماجگاہ بنا دیا تھا۔ ......

چہرے کی ساخت اس قدر متناسب تھی کہ نگاہ جس جگہ پڑتی وہیں آسودہ ہو کر رہ جاتی تھی ......"

حسن محبت کا خالق ہے یا محبت خلاق حسن ہے، ایک بحث طلب مسئلہ ہے، اور کوئی شک نہیں کہ جب ان دونوں کا تصادم یا کہئے اتصال ہوتا ہے تو "ہر لحظہ برنگ دگر آمد" کا مصداق ہوتا ہے۔ لیکن وہ فریب کتنا عجیب ہے جو حسن و عشق ایک دوسرے کو نہیں

بلکہ اپنے آپ کو دیتے رہتے ہیں: ایک ایسے ہی موقعے کو نیاز صاحب نے کیسی سادگی سے پیش کر دیا ہے:۔

"..... جاوید کو جب اس نے (ہیروئن)، اول بار دیکھا تو اس کے دل میں سوائے اس کے کوئی جذبہ موجود نہ تھا کہ ملک کو ایسے ہونہار شاعر کی قدر کرنا چاہیئے۔ لیکن جب رفتہ رفتہ مراسم بڑھے تو اس نے اپنے اندر ایک خاص قسم کا انجذاب محسوس کیا اور آخر کار وہ اس سے محبت کرنے پر مجبور ہو گئی۔"

ہیروئن مبتلائے محبت ہے اور ہیرو اس سے بے پرواہ، ایک جگہ رسمی ملاقات ہوتی ہے، تخلیہ ملتا ہے، ہیروئن آرزوں کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے مگر ہیرو خموش رہتا ہے تو وہ کہنے پر مجبور ہو جاتی ہے:۔

"جاوید بولو، تمہارا یہ سکوت مجھے تباہ کئے دے رہا ہے۔ تم مجھ پر ظلم ہی کرو لیکن لبوں کی جنبش سے، مجھے مایوس کرو مگر خموشی سے نہیں بلکہ ملامت سے، جھڑکی سے!"

"..... محبت ایک قسم کی نکہت ہے جو روح کی شگفتگی سے پیدا ہوتی ہے۔"

ہیرو کی کرداری بلندی کا اظہار ایک دوست سے گفتگو میں اس طرح بیان ہوا ہے:۔

"تم اسے صرف عورت جان کر یہی سمجھتے ہو کہ اس کے سامنے صرف محبت پیش کی جاسکتی ہے۔

"لیکن میں ایک عورت سے زیادہ بلند ہستی جان کر محبت سے زیادہ قیمتی چیز اس کی نذر کے لئے اپنے پاس رکھتا ہوں: وہ میرا جذبۂ احترام ہے۔"

ہیرو کسی ملکہ کی ممی سے محبت کرنے لگتا ہے اور تنہائی میں اس ممی کے سامنے اپنی صمیم آرزوئیں پیش کرتا ہے۔ یہ پورا ادب پارہ شاہ کار کا درجہ رکھتا ہے مگر اس کے فقرے حسین ترین ہیں:۔

"..... جو نیند تجھ پر طاری کر دی گئی ہے اگر وہ فطرت کا کوئی راز ہے، اگر وہ سنگدل قدرت کی کوئی طلسمی مہر ہے، تو میں اس سے بھی التجا کرنے کو تیار ہوں، خواہ اس ایک لمحے کے لیے جب وہ اپنی چشم خواب آلود کو نیموا کر کے میری اشکبار پلکوں کو دیکھ سکے مجھے اپنی جان کی قربانی ہی کیوں نہ دینا پڑے.....

"..... میں بعض اوقات ایسا محسوس کرتا ہوں کہ تیری خاموشی مجھ سے کچھ گفتگو کرنا چاہتی ہے، تیری لانبی پلکوں کو کھول کر تیری نگاہ مجھ تک پہنچنے ہی والی ہے، اور میں سراپا انتظار، ہمہ تن حیرت ہو کر رہ جاتا ہوں۔ لیکن پھر مجھے ہوش آجاتا ہے اور سمجھتا ہوں کہ تیرا استغنا، کبھی مجھ سے خطاب کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا اور نہ تیری شاہانہ تمکنت کا یہ اقتضا ہو سکتا ہے کہ وہ مجھ ایسے ذلیل انسان کی طرف اعتنا کرے...."

ہیروئن ایک خط کے ذریعے سے اپنے قلب زار کی حالت کی ہیرو کو اطلاع دیتی ممی کا عاشق اس خط کا جواب لکھتا ہے، اس خط میں نیاز صاحب نے حسن تلمیح کی ایک نادر مثال پیش کی ہے:۔

"اے ابراہیم کی بیٹی، ابھی تو زلیخا کی بنائی ہوئی بہت سی چالیں باقی ہیں، وہ بھی چل کے دیکھ لے! یوسف کو تو عزیز مصر کا خزانہ حاصل کر کے اپنی پیغمبری کے کاروبار کو فروغ دینا تھا کہ پھنس گئے، مجھے یہ بھی غرض نہیں......"

ہیروئن جس مرتبے اور مزاج کی عورت تھی اور جس حال میں تھی اس پر اس تحریر کا وہی اثر ہوتا ہے جو ایک عورت پر ہونا چاہیئے! وہ برہم ہو جاتی اور انتقام لینے کا عزم کر کے اپنے آپ سے کہتی ہے:۔

"جس سرزمین میں زلیخا پیدا ہوئی تھی وہیں میں بھی پیدا ہوئی ہوں اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ وہ تو اپنی سعی سے ایک نبی رام کرے اور میں ایک معمولی انسان سے شکست کھا جاؤں!"

اور یقیناً اس ہیروئن کو ہزیمت خوردہ نہیں کہا جائے گا۔

کیوپڈ و سائیکی کی تمہید میں نیاز صاحب نے جو کچھ کہا ہے، اس جواز کی بناء پر آئندہ نسلیں نیاز صاحب کی تحریروں کو ادب عالیہ اور انشائے لطیف کی حیثیت سے ہمیشہ قابل پرستش سمجھیں گی۔

جدید اُردو نثر، نیاز فتحپوری اور نئی نسل

مجنوں گورکھپوری

ہندوستان کی پہلی پرخلوص مگر بدانجام سعیِ آزادی جس کو آج تک انگریزوں کے دئے ہوئے نام سے یاد کیا جاتا ہے یعنی جس کے لئے "غدر" یا "بدعملی" کے شرمناک لفظ کے سوا ہمارے بزعم خود آزاد ملک کے ذہن میں کوئی دوسری اصطلاح ابھی تک نہیں آئی۔ ایک ایسا تاریخی تجربہ تھی جس نے کئی اعتبار سے اور کئی سمتوں میں ہماری آنکھیں کھول دیں: ہم کو یہ احساس دلا دیا کہ ہم کس قابل ہیں اور دراصل کیسی قابل ہونے کے لئے ابھی ہمکو کیا کرنا ہے اور کن آزمائشوں سے گزرنا ہے۔ ہمکو اپنی اصلی حالت کا اندازہ ہوگیا اور ہم نے اپنی توانائیوں کی نارسائی اور اپنی طاقتوں کی بے اثری کو ایک شدید کسک کے ساتھ محسوس کرنا شروع کیا۔ یہ احساس روز بروز زندگی کے ہر شعبہ میں جڑ پکڑتا گیا ہر طرف ہم کو انتہائی ترمیم و اصلاح کی ضرورت محسوس ہونے لگی، ہمکو یقین ہوگیا کہ جب تک ہمارا پرانا نظام معاشرت اپنے تمام شعبوں اور اداروں کے ساتھ نئے زمانہ کے مطابق بدل نہیں جائے گا اس وقت تک آزادی اور ترقی کی ساری جدوجہد ایک خواب بے تعبیر سے زیادہ وقیع نہ ہوگی۔

یہ حق ناشناسی ہوگی اگر یہ سمجھیں کہ ہمارے اندر یہ نیا شعور جگانے میں ہمارے برطانوی آقاؤں کا کوئی حصہ نہ تھا جنھوں نے ہمکو غلام بنائے رکھنے کے لئے یہ بھی ضروری سمجھا کہ ہمیں انگریزی زبان سے بخوبی واقف کریں تا اس زبان کے ذریعہ تمام مغربی افکار و آراء سے خبردار رہیں۔ ہمارا یہ نیا شعور جس کو بیک وقت غلامی اور آزادی کا شعور کہنا چاہیے بہت تیز اور بڑی احتیاط کے ساتھ ہمارے اندر فروغ پانے لگا اور اس کا اثر ہر سمت اور ہر ادارے میں سرعت کے ساتھ سرایت کرنے لگا۔ سوامی دیانند اور سرسید کی اصلاحی تحریکیں اسی نئے شعور کی نمائش تھیں اور ان میں سے ایک تحریک ایسی نہیں تھی جو یہ دعویٰ کر سکے کہ برطانوی قیصریت کے ہاتھ بڑھا کر دی ہوئی برکتوں سے بے نیاز رہی ہو۔

جہاں تک اردو زبان اور ادب کی اصلاح اور ترقی کا تعلق ہے یہ سب جانتے ہیں اور ہم کو ڈنکے کی چوٹ پر یہ اعتراف کرنا ہے کہ اس کا واسطہ براہ راست تحریک سرسید سے تھا جس کا دوسرا نام تحریک علی گڑھ ہے۔ سرسید بیچ میں آتے یا نہ آتے اردو زبان و ادب کو ایک نیا موڑ لینا تھا اور ایک نئی روش اختیار کرنی تھی۔ بہرحال اردو زبان اور اردو شعر و نثر کا نشاۃ الثانیہ سرسید کی معاشرتی تحریک کا ایک جزو لاینفک ہے۔ اس تحریک سے ایک نہایت مختصر مدت کے اندر اردو نثر اور شاعری میں نئے عنوان اور نئے اسلوب کے اتنے کثیر نمونے وجود میں آگئے کہ ہم حیرت کے ساتھ یہ سوچنے لگے کہ ابھی کل تک ہماری زبان کس قدر تنگ دامن اور کم مایہ تھی اور آج اس کا دامن کتنا وسیع نظر آرہا ہے۔ جو طرح طرح کے نئے ادبی جواہر پاروں سے بھرا ہوا ہے۔ ہم کو امید بندھ گئی کہ ہماری زبان کا مستقبل بہت روشن ہے اور اس کے لئے نت نئی ترقیوں کے امکانات لامحدود ہیں اور ہماری یہ امید بہت جلد پوری ہوئی۔

سرسید سے لے کر شبلی تک کوئی بڑی مدت نہیں ہے لیکن اس عرصے کے اندر نظم و نثر کے کتنے بڑے نئے ذخیرے کا اضافہ ہوگیا۔ خصوصیت کے ساتھ نثر کے شعبے میں مختلف موضوعات و مسائل پر نئے اصول اور نئے اسالیب کے ساتھ جتنی کتابیں حالی، آزاد، شبلی اور سرسید کے دوسرے رفقا نے تصنیف کیں وہ ہم کو حیرت میں ڈال دینے کے لئے کافی ہیں۔ ہم مجبور ہیں کہ اس کم مدت کو ایک پورا دور قرار دیں۔ جس کو جدید اردو نثر کا پہلا دور کہنا چاہیے۔

یہ اردو ادب کا افادی دور تھا یعنی اس زمانہ میں جو کچھ لکھا گیا وہ زندگی کے معاشرتی اور اخلاقی مفاد اور فلاح کو مدنظر رکھ کر لکھا گیا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ دور اردو میں اسی طرح عقلیت اور نثر کا دور تھا جس طرح انگریزی زبان کی تاریخ میں اٹھارہویں صدی اس عہد میں اردو زبان کی اصلاح اور اس کی توسیع و ترقی کے لئے ویسی ہی کوششیں ہوئیں جیسی کہ انگریزی زبان کی اصلاح و ترمیم کے لئے اٹھارہویں صدی میں ہوئیں۔

سرسید کا یہ دور اردو نثر کا پہلا مہتم بالشان دور ہے۔ اس دور کے سب سے زیادہ اور گراں قدر لکھنے والے خود سرسید اور ان کے رفقاء ہیں حالی۔ آزاد، مولوی ذکاءاللہ، مولوی چراغ علی۔ مولانا شبلی اور شرر ہیں۔ ان میں سے ہر ایک نے کسی ایک دو اصناف نثر کو اپنا فن بنایا اور ان اصناف میں بہترین کارنامے پیش کئے۔ ابھی سرسید کا دور اپنا کام کر رہا تھا کہ مغرب سے نئے ادبی تاثرات و تصورات اور روایات و اسالیب کی نئی لہریں ہندوستان میں پہنچیں، اور ہمارے دل و دماغ، ہمارے فکر و احساس اور ہمارے اسلوب بیان اور انداز اظہار کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ تحریک سرسید کے نمائندے ابھی اپنا کام کر ہی رہے تھے کہ اردو ادب میں وہ نیا میلان شروع ہوا جس کو مجمل طور پر ہم رومانیت کہیں گے اس میلان سے جدید اردو نثر اور نظم کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے لیکن پہلے دور اور دوسرے دور کے درمیان نہ کوئی خلا ہے اور نہ کوئی بے ربطی ۔ دونوں ادوار باہم مسلسل ہیں۔ اور ابوالکلام آزاد اس سلسلے کی درمیانی کڑی ہیں۔ اگر ایک طرف سرسید، حالی اور شبلی کے اسالیب کو مدنظر رکھا جائے اور دوسری طرف ابوالکلام آزاد کی طرز تقریر اور اسلوب تحریر پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ محمد حسین آزاد کے سوا پہلے دور میں کسی انشا پرداز کے وہاں رنگینی یا انشائی دلکشی نہیں پائی جاتی۔

ابوالکلام آزاد دونوں ادوار کے ممتاز عناصر کا امتزاج ہیں۔ ایک طرف تو موضوع اور مواد کے اعتبار سے ان کی بیشتر تحریریں اور تقریریں افادی انداز رکھتی ہیں دوسری طرف انکی اسلوب نگارش اور انداز تقریر دونوں میں کچھ ایسی سموئی ہوئی رومانیت یا شعریت محسوس ہوتی ہے جو ان سے پہلے کے اساتذہ کے اسلوب میں نہیں پائی جاتی اور جو صاف اور نمایاں طور پر نیا عنصر معلوم ہوتی ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ جہاں تک کہ اسلوب اور طرز بیان کا تعلق ہے ابوالکلام آزاد سے اردو نثر میں وہ دور شروع ہوتا ہے جس کو ہم رومانی دور کہیں گے۔

ابوالکلام آزاد کی امامت میں دیکھتے دیکھتے ایسے نوجوانوں کی ایک جماعت تیار ہوگئی جو موضوع اور اسلوب دونوں کے لحاظ سے رومانیت پسند تھے۔ ابوالکلام آزاد سے لیکر نیاز تک ایک مکمل دور ہے جس کا اردو ادب کی تاریخ میں وہی مقام ہے جو کہ انگریزی ادب کی تاریخ میں انیسویں صدی کا ہے۔ اس دور کی ابتدا تو ابوالکلام آزاد سے ہوئی لیکن اس کے اصلی علمبردار نیاز فتحپوری ہیں۔ ابوالکلام آزاد ادیب اور انشا پرداز سے زیادہ ماہر سیاسیات اور خطیب تھے اور وہ بہت جلد دوسری سمت میں نکل گئے اور ایسا مشغول ہوئے کہ ادبی تخلیق کی فرصت ہی نہ ملی۔ خالص ادب کے میدان میں نیاز استقلال اور استقامت کے ساتھ اردو نظم و نثر کے نئے دور کی رہنمائی کرتے رہے۔

اس سلسلے میں ایک شخص کا ذکر نہ کرنا بڑی بے انصافی ہوگی۔ ہماری مراد مہدی حسن افادی الاقتصادی سے ہے۔ یہ وہ انشا پرداز ہے جس نے واقعی اپنے زمانے کے نوجوان نثر نگاروں کو ایک خالص جمالیاتی اسلوب تحریر دیا۔ شبلی جیسا فاضل انشا پرداز مہدی حسن کی رچی ہوئی طرز نگارش پر رشک کرتا ہے اور خود نیاز نہ صرف ان کے انداز بیان کے قائل ہیں بلکہ ان کی نثر میں جو جمالیاتی کیف ہے، اس کے مزاج میں افادی الاقتصادی کا اثر بھی اور دوسرے اثرات کے ساتھ جھلکتا ہوا محسوس ہوتا ہے لیکن ہماری بدنصیبی یہ ہے کہ سرکاری ملازمت کی غلامانہ مشغولیت نے مہدی حسن کو اتنی فرصت نہ دی کہ وہ کسی موضوع پر کوئی مستقل تصنیف یادگار چھوڑ جاتے۔ صرف چند ادبی شہ پارے اور کچھ خطوط ہیں جو ان کے نام کو تاریخ ادب اردو میں ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔

یہ عجیب بات ہے کہ جس زمانے میں ہندوستان کا سیاسی شعور کہیں خفیہ کہیں علانیہ طور پر سرفروشانہ انداز سے آگے بڑھ رہا تھا اس وقت ہندوستان کا ادب خالص رومانی میلان کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ یہ بڑھتی ہوئی رومانیت ایک طرف تو مغربی ادبیات کے مطالعہ کا نتیجہ تھی دوسری طرف خود اپنے ملک میں ٹیگور کی متصوفانہ رومانیت اس کی ذمہ دار ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ٹیگور کے ساتھ ساتھ انگریزی کے مشہور شعراء اور مصنفین بالخصوص عہد وکٹوریہ کے آخری دور کے ادیبوں کا اثر روز بروز اردو ادب میں مقبول ہو رہا تھا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب کہ اردو میں اس عجیب و غریب صنف نثر کا سودا ہر لکھنے والے کے سر میں سمایا ہوا تھا جو شعر منثور یا شاعرانہ نثر کہتے ہیں۔ ہندوستان میں اس کی ابتدا ٹیگور سے ہوتی ہے لیکن اس سے پہلے انگریزی میں اسکر وائلڈ (Oscar Wilde) اور والٹر پیٹر Walter Pater جیسے جمال پرستوں نے ایک مدرسہ کی بنیاد ڈال رکھی تھی۔ اور شعر منثور کی نئی صنف یورپ کے اکثر ملکوں میں رواج اور قبول عام حاصل کر چکی تھی۔ خود ٹیگور اس مدرسہ کی نظم و نثر کے اسالیب سے کچھ کم متاثر نہیں ہیں۔ اگرچہ ان کے افکار اور اسلوب پر اس ادبی تحریک کا اثر زیادہ ہے جسکو "Celtic Revival"

کہتے ہیں۔ اور جس نے بالآخر سیاسی رُخ اختیار کر کے آئرستان Ire Land کو قومی آزادی دلوائی۔ آج ہم صحیح طور پر اندازہ نہیں لگا سکتے کہ ٹیگور کی منظومات کا کی ترکیب میں ان کے شدید قومی اور ملکی میلانات کے باوجود مغربی رومانیت کا کس حد تک اثر ہے اور شاید بغیر سوجھائے ہوئے ہم کو آج بھی نہ سوجھے کہ ہندوستان کی کے ادب کو اور خاص طور پر اردو نظم و نثر کو "گیتانجلی" "باغبان" "ماہ نو" وغیرہ نے کس حد تک متاثر کیا ہے۔

اُردو زبان میں نیاز فتحپوری نہ صرف اس نئے دور کے رہنما ہیں بلکہ ایک خاص ادبی دبستان کے بانی بھی ہیں جس کو جمالیاتی دبستان کہنا چاہیئے۔ رومانیت اور جمالیات دونوں انکی ادبی تخلیقات کی بہت نمایاں خصوصیتیں رہی ہیں۔ میں صرف آج کی بات نہیں کر رہا ہوں بلکہ خصوصیت کے ساتھ نیاز کی ادبی زندگی کے اس ح کا ذکر کر رہا ہوں جو ۱۹۲۲ء پر ختم ہوتا ہے۔

نیاز فتحپوری نے اپنی ادبی زندگی کی ابتدا شاعری سے کی اور نظمیں لکھنے لگے انکی نظموں کے مطالعہ سے بہت صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ جہاں ایک طرف اپنی طبیعت رومانی اُبھار سے متاثر ہیں وہاں دوسری طرف ابوالکلام آزاد کا اثر بھی ان پر غالب ہے اسلوب نگارش میں تو بہر حال ان کا سلسلہ ابوالکلام آزاد سے ملتا ہے۔ لیکن انکی جو نظ رومانی نہیں ہیں ان میں اکثر مواد اور موضوع میں بھی وہ ابوالکلام آزاد سے بہت قریب معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی اکثر نظمیں قومی اور ملی ہیں اور ان میں ابوالکلام آ کی آواز کے ارتعاشات بہت صاف طور پر محسوس ہوتے ہیں۔ نیاز کو بہت جلد محسوس ہو گیا کہ وہ شاعری کے لئے نہیں بنے ہیں اور پھر وہ نثر کی طرف اس مڑے کہ ان کی شاعری نہ صرف ہمارے لئے بلکہ ان کے لئے بھی آج ایک بھولا ہوا خواب ہے۔ یہ اردو ادب کے حق میں بہت مبارک ہوا۔ نیاز کا ذوقِ جمال اور ا حسن کارانہ شعور وہ دوسرا آہنگ چاہتا تھا جس کا غیر شاعرانہ نام نثر ہے۔ نیاز نے اردو زبان و ادب کی جو ناقابل فراموش خدمتیں نثر کے میدان میں کیں وہ ش شاعری کے میدان میں رہ کر نہ کر سکتے۔

نیاز کے نثری کارناموں کا آغاز جیسا کہ اشارہ کیا جا چکا ہے شعر منثور سے ہوتا ہے۔ کسی زمانے میں ان کے یہ ٹکڑے بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ ا نیا لکھنے والا ان کی تقلید کرتا نظر آتا تھا۔ یہ شعر نما منثورات زیادہ تر آسکر وائلڈ اور ٹیگور سے ماخوذ تھے لیکن انہوں نے اپنے تخیل کی اپج سے طبع زاد نمونے بھی پیدا ک جو رنگین اور لطیف ہیں۔ جہاں تک اسلوب کا تعلق ہے نیاز کی انفرادی فنکار شخصیت انھیں نثری پاروں سے واضح اور نمایاں ہو گئی تھی۔

۱۹۲۳ء سے پہلے نیاز کی حیثیت ایک خالص رومان نگار کی تھی۔ جن منثورات کا مجمل ذکر کیا جا چکا ہے ان سے الگ ہو کر اس زمانہ میں نیاز کا سب سے بڑا کا افسانہ نگاری ہے۔ پریم چند کے ساتھ نیاز فتحپوری نے بھی اردو زبان میں نہ صرف مختصر افسانہ کی بنیاد رکھی بلکہ ایک خاص منزل تک اس کی مکمل تعمیر بھی کی۔ نیاز ایک زبردست قوتِ اخذہ کے مالک ہیں وہ بڑے سلیقے کے ساتھ دوسری جگہ سے مواد لے سکتے ہیں اور اپنے انفرادی اسلوب سے اس کو اپنا بنا کر پیش کر سکتے ہیں۔ ایسا کرنا کوئی عیب نہیں کوئی اپنے تخلیقی اسلوب سے دوسری جگہ سے ماخوذ مواد کو بالکل نیا روپ دے سکے۔ شیکسپیر کا کوئی ڈرامہ ایسا نہیں جو دوسری جگہ سے نہ لیا گیا ہو۔ لیکن اس کے ڈراموں کے اصلی ماخذوں ک پوچھتا بھی نہیں اس کے ڈرامے آج تک دنیا کو متاثر کئے ہوئے ہیں۔ اول اول نیاز کے افسانے یونانی اساطیر و قصص اور مصر و عرب یا دوسرے قدیم ملکوں کے حسن و عشق کی سے ماخوذ ہوتے تھے بڑی رومانی سرگشتگی اور والہانہ دُھن کے ساتھ لکھے جاتے تھے۔ ان افسانوں کا موضوع بلا استثنا حسن و عشق ہے۔ محبت اور عورت کی جیسی رنگین اور دلفریب تص ان افسانوں میں ملتی ہیں اردو کے کسی دوسرے افسانہ نگار کے وہاں نہیں ملتیں۔ نیاز کے تمام افسانوں پر معدودے چند کو چھوڑ کر شروع سے آخر تک ایک رومانیت چھائی ہوئی ہے جو محض سطحی نہیں ہو دور تک جاری و ساری ہوتی ہے اس رومانیت کا تعلق کسی ہوائی یا تخیلی دنیا سے نہیں ہوتا۔ نیاز کے افسانے اسی ٹھوس اور سنگین عالم آب و گل سے وابستہ ہوتے ہیں۔ وہ جب حسن بیان پر آتے ہیں تو ہم کو ہوا اور بادل میں نہیں لیجاتے بلکہ جسم کی تمام چھپی ہوئی رنگینیوں اور کیفیتوں سے لذت آشنا کرتے ہیں۔

"کیوپڈ اور سائیکی" "ذاکرہ محبت" "حسن کی عیاریاں" "حمرا کا گلاب" "کہکشاں کا ایک سانحہ" "شاعر کا انجام" "تاجدار رقاصہ" "شہاب کی سرگزشت"۔ یہ جتنے افسا ہیں سب محبت اور عورت کو ایک لطیف راگ میں منتقل کر دیتے ہیں جس کا تجزیہ نہیں کیا جا سکتا اور جو پڑھنے والے کو اس طرح مبہوت کر لیتا ہے۔ کہ اس کو پھر کسی کا ہوش نہیں ہوتا۔ نیاز کے عشقیہ افسانے سوز و گداز اور تاثیر کے ایسے مرقعے ہیں جنکی مثال نیاز سے پہلے نہیں ملتی۔ لیکن نیاز کو محض رومانی افسانہ نگار سمجھنا غلطی ہوگی۔ میں وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے افسانے میں نفسیاتی تجزیے اور کردار نگاری کو اہمیت کے ساتھ داخل کیا۔

جوں جوں انکی افسانہ نگاری بالغ ہوتی گئی ان کے افسانوں میں یہ نفسیاتی میلان زیادہ نمایاں اور مستقل ہوتا گیا۔ "شہاب کی سرگزشت" اور اس کے بعد جتنے مختصر یا طویل سانے نیاز نے لکھے ہیں ان سب میں رومانیت کے ساتھ یہ نفسیاتی میلان بہت زیادہ اجاگر نظر آتا ہے ———

——— اس اعتبار سے وہ اردو افسانہ نگاری میں وہی حیثیت رکھتے ہیں جو انگریزی ناول اور افسانے میں جارج ایلیٹ کی ہے۔ لیکن نیاز محض نفسیاتی اشارہ کے رہ جاتے ہیں اور اپنے رجال داستان کے نفس کی گہری تہوں کا جائزہ لینے سے احتیاط برتتے ہیں۔

لیکن مجموعی حیثیت سے ہم پھر کہیں گے کہ نیاز کے افسانوں کی واقعیت اور ان کے نفسیاتی رجحانات کے باوجود ان کی سب سے نمایاں خصوصیت خالص رومانیت جمال پرستی ہے جس کا تعلق باطنی کیفیات سے زیادہ اور ظاہری حالات و حادثات سے کم ہے۔ وہ ایک بہت تیز اور جزرس قوت مشاہدہ کے مالک ہیں اور احول خارجی مواقع کے بہت صحیح نقشے پیش کرتے ہیں۔ لیکن یہ نقشے صرف پس منظر کی حیثیت رکھتے ہیں جن کے سامنے افراد کی انفرادی اور داخلی زندگی کو پھیلا کر پیش کیا ہے۔ ۱۹۲۶ء کے بعد انہوں نے کچھ ایسے افسانے بھی لکھے جن کا واسطہ رسمی طور پر سماج اور معاشرت سے ہے لیکن ان افسانوں میں نیاز کے اسلوب کی کشش تو پائی تی ہے مگر ان میں وہ جادو نہیں جن کی بنا پر ان کے دوسرے افسانے یادگار رہیں گے اور جن کی بدولت اردو ادب کا مورخ نیاز کا نام مختصر اردو افسانے کے وں کی فہرست میں گنانے کے لئے اپنے آپ کو مجبور پائے گا۔

نیاز ایک اونچے درجے کے رومان نگار ہوتے ہوئے بھی روز اول سے ایک سنجیدہ اور صاحب عقل و ہوش آدمی ہیں۔ انہوں نے اپنے کو نہ تو کبھی شعر میں کھویا نہ کبھی رومان میں ڈبویا۔ حالانکہ وہ شعر و رومان دونوں کی پھڑکتی ہوئی رگیں پکڑ لینے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔

نیاز کو علوم عربی اور فارسی میں تو گھر پر پورا ادراک حاصل ہو چکا تھا لیکن انگریزی میں بھی ان کا مطالعہ وسیع اور متنوع رہا ہے اور پھر وہ ایک خاص معیار لسی شعور بھی رکھتے ہیں جسکی بدولت وہ اونچی اونچی علمی صحبتوں سے فیضیاب ہو سکے ہیں۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اندر ایک خاص جامعیت پیدا ہو گئی صرف شعر و رومان بلکہ زندگی کے تمام پہلوؤں کو نگاہ میں رکھنے لگی۔ نیاز کی اس جامعیت کا پہلا مظاہرہ اس وقت ہوا جب کہ انھوں نے ۱۹۲۲ء میں بھوپال ے "نگار" جاری کیا۔ یہ غیر متوقع جامعیت اور قاموسی تبحر ایک طرف تو نیاز کی وسعت خلق و نظر کا ناقابل تردید ثبوت ہے لیکن دوسری طرف ان کی یہ قاموسیت زیادہ گہری نہیں ہے، انکی تخلیقی قوت کے لئے خسارہ بھی ثابت ہوئی۔ نیاز صحیح معنوں میں ایک فن کار ہیں۔ اس کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ آج جب ہم "نگار" کا یعنی نیاز کے "ملاحظات" پڑھتے ہیں تو موضوع سے زیادہ نیاز کا اسلوب تحریر ہم کو اپنی طرف کھینچے رہتا ہے۔ نیاز ایک صاحب طرز کے علاوہ اگر کچھ ہو سکتے تھے تو انہ نگار یا ایک خاص ——— نوع کے نقاد اور درحقیقت انکی مستقل حیثیت اردو ادب میں انھیں خصوصیات کی بنا پر قائم ہے۔ لیکن "نگار" کی ادارت کے سلسلے انھوں نے زندگی کے اور بہت سے مادی اور غیر مادی سنگین مسائل پر لکھنا شروع کیا جو دوسرے لکھنے والوں کے لئے چھوڑے جا سکتے تھے۔

مجھے وہ گھڑی بھولے گی نہیں جب کہ میں نے نیاز صاحب کو ۱۹۲۷ء یا ۱۹۲۸ء میں اپنی خوردانہ رائے دی تھی کہ مذہبی مباحث کو علمائے دین اور ہادیان متین لئے چھوڑ دیا جائے۔ اور "نگار" کے صفحات کو ان سے پاک رکھا جائے۔ لیکن نیاز کی طبیعت میں کچھ چلبلا پن بھی ہے۔ دوسرے وہ سنسنی خیز باتوں کی تجارتی قیمت کو معاملہ سنج کی حیثیت سے مجھ سے بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ اسی لئے انھوں نے میری بات سنی ان سنی کر دی اور آج تک وہ ان جھگڑوں سے حظ حاصل کر رہے ہیں جو سات لینے کے بعد بھی میں نہ کر سکوں۔ نیاز فطرتاً ایک صاحب اسلوب ہیں جس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ افسانہ نگاری یا ایک خاص قسم کی ادبی تنقید کے لئے موزوں ۔ لیکن اس کو کیسے بھلایا جائے کہ وہ زندگی کے اور معاملات اور مسائل پر بھی اپنے قلم کی جولانی دکھلاتے رہے ہیں اور ان کے تحریری کارناموں میں افسانے اور ادبی د کے علاوہ ایک ضخیم حصہ متفرقات کا بھی ہے جن میں اخلاق و حکمت، اقتصادیات و معاشرت ارضیات و فلکیات مذہب و تصوف، فحاشیات، جنسیات، سمرک علم فراست الید، علم نجوم اور پھر سیاسیات حاضرہ غرض کہ زمین اور آسمان کا کون سا قضیہ ہے جسکو نیاز صاحب نے نہ چھیڑا ہو اور جس کو اپنے طرز تحریر جادو سے بڑے بڑے مرتد پڑھنے والے کے لئے دل کش نہ بنا دیا ہو۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نیاز نے جب کبھی کسی موضوع کو اٹھایا تو کافی تحقیق چھان بین سے کام لے کر اس کو بڑے سلیقے کے ساتھ پیش کیا۔

نیاز کی تحریروں کی ایک مستقل خصوصیت وہ قرینہ ہے جو اردو کے بہت کم انشاپردازوں کو میسر ہوا ہے۔ نیاز کے علمی اور تحقیقی یا معاشرتی اور مذہبی مضامین سے ہمکو جو کچھ ا جس قدر بھی اختلاف ہو ہم ان کی کسی تحریر پر بے ترتیبی یا ناشائستگی کا الزام نہیں لگا سکتے۔ یہی شائستگی اور خوش ترتیبی ہے جس کا آج بیشتر نوجوان ادیبوں کی تحریروں میں کال نظر آتا ہے۔ ہم اب کیا کریں کہ نیاز کے اس [illegible] ہرکارہ پن نے خود ان کی اپنی خلاق طبیعت اور اصلی فنی اپج کو نقصان بھی پہنچایا۔ یہی نہیں بلکہ شاید اس سے نگار کو ایک تجارتی معاملے کی حیثیت سے بھی کچھ کم گھاٹا نہیں ہوا۔ مذہبی مسائل کو چھیڑ کر جو یقیناً ان کی روبہ انحطاط تخلیقی قوت کی علامت بھی ہے۔ انہوں نے اپنے لئے دشمنوں کا اچھا خاصا گروہ پیدا کر لیا ہے اور اس سے نگار کے شیدائیوں کی تعداد بھی گھٹتی ہی گئی ہے۔ لیکن نیاز کا بڑے سے بڑا منکر بھی ان کے اسلوب کی ساحرانہ قوت سے مبہوت ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

نیاز کے اسلوب کی ایک زبردست خصوصیت وہ ڈرامائی اچانک پن ہے جو انھوں نے آسکر وائلڈ اور اس کے بعد کے انگریزی نثر نگاروں سے سیکھا ہے اور جو ان کے ہمعصر یا ان کے بعد کی نسل کے کسی ادیب میں بھی نہیں پایا جاتا ہے۔ یہ اچانک پن ان کے کٹر سے کٹر دشمن کو ان کی انشاپردازی کی توانائی کا اعتراف کرنے کے لئے یقیناً کافی ہے۔ سجاوٹ اور بے ساختگی کو خوش آہنگی کے ساتھ ایک جگہ دیکھنا ہے۔ تو نیاز کے اسلوب کو دیکھئے۔ اور پھر یہ اسلوب محض جمالیاتی کیفیتوں سے معمور نہیں ہے۔ بلکہ اس کے اندر جرأت اظہار اور تاب سخن پائی جاتی ہے۔ جو اس سے پہلے کسی اور نثر نگار کو نصیب نہیں ہوئی۔

نئی نسل کو نیاز سے جو ترکہ ملا وہ اسلوب ہے۔ ایسا اسلوب جو طرح طرح کی توانائیاں اپنے اندر لئے ہوئے ہے اور جس پر پرانے اور از کار رفتہ ہونے کا الزام آج بھی نہیں لگایا جاسکتا۔

نیاز کے اسلوب میں بیک وقت ایک ٹھہری ہوئی سنجیدگی اور سنبھلی ہوئی شوخی باہم ملی جلی ہوئی پائی جاتی ہے۔ یہ اسلوب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نازک سے نازک رنگین مسائل پر شگفتگی اور دلآویزی کے ساتھ بحث کی جاسکتی ہے۔ موضوع کی خشکی یا تلخی کو اسلوبی کیفیتوں میں اس طرح لپیٹ لینا کہ محسوس نہ ہونے پائے معمولی ہنر نہیں ہے اردو نثر کی نئی نسل نے یہی ہنر نیاز سے پایا ہے اور جب تک اردو زبان کا کوئی ادبی مستقبل ہے اس کے ادیبوں کی کوئی نئی نسل نیاز کے اسلوب کے اثر سے بے نیاز نہیں برت سکتی۔ اردو نثر کی تاریخ میں نیاز کا اسلوب ایک زندہ قوت ہے جس کے اثرات کبھی فنا نہیں ہوسکتے۔

آخر میں ایک اہم بات کا احساس دلا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ نیاز اپنے دور کے بیشتر معاصرین کی طرح ان ادیبوں میں سے ہیں جن کو رجعتی اور ترقی پسند شبقوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ انھوں نے خود اپنے کو کسی جماعت کے ساتھ منسوب نہیں کیا۔ وہ ادب اور زندگی کے بارے میں اپنے متعین اصول و نظریات رکھتے ہیں جن پر انھیں وثوق ہے اور ہمیں ان سے بازپرس کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ اپنے وقت کا بڑے سے بڑا انسان نوجوان نسل اور نئے دور کے لئے گزشتہ شمارہ ہو جاتا ہے، کارلائل اور رسکن، ہارڈی اور سموئل بٹلر، مارکس اور والٹر پیٹر آج محض پارینہ کے لوگ ہو کر رہ گئے ہیں۔ شاعروں میں شیلی جیسا بیباک انقلابی شاعر آج اگلے وقتوں ہی کے لوگوں میں شمار کیا جائے گا لیکن شعر و ادب کی تواریخ میں ان ناموں سے تجاہل یا تنافر برتنا جہالت اور تنگ نظری سمجھی جائے گی۔ ان لوگوں کے اکتسابات کے زندہ عناصر آج کی نئی نسل کی روح میں کام کر رہے ہیں۔ اسی طرح نیاز کے نام سے اردو نثر کی جامع اور بے تعصب تاریخ کبھی تجاہل نہیں برت سکتی۔ نیاز میں ایک خصوصیت بڑی قابل قدر ہے۔ جو پرانی نسل کے لوگوں میں بہت نایاب ہے اور یہ انکی ادبی فراخدلی ہے۔ وہ خود کسی جماعت سے تعلق نہیں رکھتے اور ان کے خیالات و معتقدات اپنی جگہ کچھ اٹل سے ہیں لیکن وہ نئی نسل کو ادب اور زندگی میں نئے راستے اختیار کرتے ہوئے اور آگے قدم بڑھاتے ہوئے —— دیکھ کر جلتے اور کسی پر لعن طعن نہیں کرتے اور یہ بہت بڑی بات ہے۔ اگر گزرے ہوئے دور کے لوگ نئے دور کے نوجوانوں سے خلوص اور شفقت کے ساتھ حوصلہ افزائی کے لئے صرف اتنا کہہ سکیں:——

بہ سفر رفتنت مبارک باد

تو ہمیں یقین ہے کہ نئی نسل والے جو ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کی امنگ اپنے اندر رکھتے ہیں اسکو اپنے حق میں برکت سمجھیں گے۔

* * *

نیاز کا اندازِ تحریر

ڈاکٹر اعجاز حسین

موجودہ دور کی نثر نگاری مختلف راستوں پر گئی اور طرزِ تحریر کے اختیار میں جدت پسند طبیعتوں نے نمایاں طریقے پیش کئے۔ نیاز فتح پوری کا شمار بھی ان لوگوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اردو ادب میں اپنے رنگ سے ایک قابلِ قدر اضافہ کیا، الفاظ اور ترکیبوں کی خوبصورتی ایک خاص جوش سے مل کر ایک ایسا بیان اختیار کرتی ہے، جو صرف نیاز کی تحریر میں پایا جاسکتا ہے۔ انھوں نے مخزن اور نقاد میں جنم لیا۔ اور پھر خود "نگار" نکال کر ادبی دنیا میں اپنے لئے ایک مخصوص جگہ پیدا کرلی لکھنے کے لیے تو انہوں نے بہت سے موضوع پر مقالے اور مضامین لکھے لیکن ان کا خاص رنگ افسانہ نگاری میں پوری طرح ظاہر ہوتا ہے۔ سیرتِ انسانی کے باریک اور پوشیدہ راز، کیفیاتِ قلب کے مختلف اثرات اس قدر دلکش انداز میں بیان ہوتے ہیں کہ تھوڑی دیر کے لئے ذہن مسحور ہو کر اسی دنیا میں کھو جاتا ہے۔ ان کا طویل افسانہ "ایک شاعر کا انجام" اپنی انوکھی اور نادر ترکیبوں کے ساتھ ہی ساتھ ایک نئے طرز کی بنیاد ڈالتا ہے جس میں کردار نگاری پر خاص زور دیا گیا ہے۔ انکے کردار نفسیاتی نقطۂ نظر سے چند ایسی خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں جو ان سے کسی حالت میں علیحدہ نہیں ہوتے۔ انکی زندگی کے نشیب و فراز اسی حد تک ان میں تغیر پیدا کرتے ہیں جو فطرتِ انسانی کے لیے ضروری ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ نیاز کے افسانوں کا موضوع صرف محبت ہوتا ہے جس میں شاعرانہ رنگینیاں تو بہت کچھ پائی جاتی ہیں لیکن کوئی ایسا اخلاقی سبق جو موجودہ دور کشمکش کا حل پیش کر سکے نظر نہیں آتا۔

نیاز کے یہاں جو چیزیں امتیازی حیثیت رکھتی ہیں وہ ان کا مخصوص طرزِ بیان، جوش اور زورِ قلم ہے اور یہی وہ چیز ہے جو اکثر معمولی سی بات کو بھی اتنا رنگین بنا کر سامنے لاتی ہے کہ وہ ضرور دلکش نظر آنے لگتی ہے۔ ان کی "مذہبیات" سے قطع نظر کر کے ہم ان کے ادبی کارناموں کو دیکھتے ہیں تو وہ ادب کے لیے ایک عمدہ ذخیرہ ہیں۔ انھوں نے عربی اور فارسی کے بہت سے خیالات اور الفاظ کو اردو میں اس طرح ملا دیا کہ وہ زبان کا ایک جزو بن گئے ہیں۔ ان کی جدت پسندی انھیں ہمیشہ عام راستوں سے الگ لیجاتی ہے اس لئے ان کے مضامین عام مذاق کے نہیں ہوتے اور ان میں علمیت کا پہلو بہت نمایاں ہوتا ہے۔ ایک اچھے رسالہ کے اڈیٹر ہونے کے علاوہ کتابیں بھی لکھتے رہتے ہیں۔ اور اس وقت تک کئی کتابوں کے مصنف ہو چکے ہیں۔ افسانوں کے دو مجموعے "نگارستان" اور "جمالستان" "تاریخ الدولتین" "فراست الید" "گہوارہ تمدن" "شہاب کی سرگزشت" "المسئلۃ الشرقیہ" "جذباتِ بھاشا" "ترغیباتِ جنسی" وغیرہ اردو داں حضرات نہایت شوق سے پڑھتے ہیں۔

کتابوں کی یہ فہرست ہی بتاے گی کہ نیاز اکثر مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کرتے رہتے ہیں اور ہر جگہ وہ اس ادبی شان کو بھی برقرار رکھتے ہیں جو ان کے لئے مخصوص ہے۔ نیاز کی تحریر میں بے باکی اور آزادیٔ رائے قدم قدم پر موجود ہے۔

★

نیاز — کچھ رجحانات، کچھ نظریئے

پروفیسر عبدالقادر سہروردی

جناب نیاز اردو کے موجودہ ادیبوں اور انشا پردازوں میں غالباً سب سے معمّر اور سب سے زیادہ وسیع تجربے کے مالک ہیں۔ طویل عرصہ تک "نگار" کی ادارت کے فرائض کی انجام دہی کے سلسلے میں انھیں افراد اور حالات کا گہرا تجربہ حاصل ہو چکا ہے۔ وہ اس زمانے میں میدان ادب اور صحافت میں شہرت حاصل کر چکے تھے، جب کہ موجودہ نسل کے لکھنے والوں میں سے بہت سوں نے ابھی قلم سنبھالنا بھی نہیں سیکھا تھا۔

نیاز صاحب کی دلچسپیوں کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اس عہد کے لکھنے والوں میں سے شاید ہی کسی ایک ادیب اور انشا پرداز کا ہوگا۔ وہ عالم ہیں، صحیفہ نگار ہیں، ادیب ہیں، انشا پرداز اور نقاد ہیں، افسانہ اور ناول نگار ہیں، انشائیے بھی لکھتے ہیں غرض ہر صنف ادب میں ان کا قلم سہولت اور روانی کے ساتھ چلتا ہے۔ اس کے علاوہ پامسٹری یعنے علم فراست الید سے بھی انھیں دلچسپی رہی ہے، چنانچہ اس موضوع پر اردو میں سب سے پہلی کتاب غالباً انھوں ہی نے لکھی تھی۔ علم فراست الید کی اصطلاح بھی اردو کو انھیں کی دین ہے۔

بہ حیثیت ادیب کے نیاز صاحب کی خدمات اور ان کے رجحانات بظاہر متنوع اور مختلف معلوم ہوتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ بنیادی طور پر اردو کے جدید رومانی اسکول کے لکھنے والوں میں ان کا نام سر فہرست ہے۔ ان کے معاصرین میں ایک اور ادیب اور انشا پرداز سجاد حیدر یلدرم تھے، جو گہرے رومانوی رجحانات رکھتے تھے۔ مہدی افادی بھی اسی دبستان سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن زمانے نے ان کی ذہانت کو پوری طرح مثمر ہونے کی مہلت نہ دی۔ سجاد حیدر اور نیاز میں مناسبت صرف رجحان کی حد تک ہے۔ اس سے ہٹ کر دونوں کے میدان مختلف اور الگ الگ ہیں۔ نیاز اور یلدرم دونوں نے افسانے لکھے ہیں اور ناول پر بھی طبع آزمائی کی ہے، لیکن سجاد حیدر کے افسانے عموماً طبعزاد ہیں اور نیاز کے اچھے افسانے ترجمے ہیں ناول کی حد تک یلدرم نے ترکی سے استفادہ کیا تھا، لیکن نیاز کا ناول یا ناولٹ "شہاب کی سرگذشت" بظاہر طبعزاد ہے، گو بعض نقادوں نے اسے آسکر وائیلڈ کے "پکچر آف ڈورین گرے" کا چربہ بتایا ہے۔ دونوں صاحب اسلوب ہیں۔ لیکن دونوں کے اسلوب میں بڑا فرق ہے۔ نیاز (high brow) ادیب ہیں، جن کے مخصوص ذہنی معیار ہیں اور ان معیاروں سے نیچے اتر کر وہ نہیں لکھ سکتے۔ نیاز کی طبیعت کی اسی افتاد نے ان کی تحریروں کو بعض وقت غیر معتاد، ادق اور مشکل بھی بنا دیا ہے۔ سجاد حیدر کے یہاں ایک دبا دبا سا مزاح ہے۔ جس کی متحمل نیاز کی تحریریں نہیں ہو سکتیں ——

بہ حیثیت انشائیہ نگار کے، نیاز کا پایہ میری نظر میں ایک تخلیقی مصنف کا ہے۔ ان کی انشائیہ نگاری میں ادب لطیف کا رنگ نمایاں ہے۔ آج سے کئی سال پہلے ادب لطیف کے انداز کی تحریروں کو اردو میں بڑی مقبولیت حاصل تھی اور ادب لطیف کو مقبول بنانے میں خود نیاز کا بڑا حصہ تھا۔ ادب لطیف میں موضوع کی ندرت کے علاوہ، اسلوب میں بھی ایک لطافت ہوتی تھی۔ جناب نیاز کے انشائیوں میں بھی موضوع کی ندرت اور اسالیب کی لطافت موجود ہے۔ اسی لیے وہ انشائیہ نگار کی حیثیت سے بہت جلد افق ادب پر چمکے۔ ان کی تحریروں میں ایسی جاذبیت اور ایسا رس تھا کہ بہت سے نوجوان انشاپردازوں کو ان کی تقلید کی خواہش پیدا ہو گئی۔ چنانچہ اس صدی کے ربع اول میں ادب لطیف کی تحریروں کی بڑی بھرمار ہو گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ ہر نوجوان، فن کار نہیں ہو سکتا، اسی لیے گھٹیا ادب لطیف کے تخلیق کاروں کے خلاف اس زمانے میں اسی طرح شور بلند ہوا تھا، جس طرح ہم سے قریب تر زمانے میں سستی ترقی پسند تحریروں اور شاعری کے خلاف جذبات ابھرے تھے۔

نیاز دراصل اپنے انشائیوں کی بدولت منظرِ عام پر ابھرے۔ انھوں نے بہت سے انشائیے لکھے، لیکن یہ سب اکٹھے شایع نہ ہو سکے۔ آج سے کم و بیش چالیس برس پہلے ان کے انشائیوں اور افسانوں کا ایک مجموعہ "نگارستان" کے نام سے شایع ہوا تھا، جسے جناب قمر نے مرتب کیا تھا، اس میں اکیس۲۱ ادب پارے شامل ہیں، جن میں سے کچھ مختصر افسانے ہیں اور کچھ انشائیے یا مضامین۔ لیکن نیاز، پطرس اور بعض دوسرے انشاپردازوں کی تخلیقات میں، افسانے اور انشائیے کا فرق اتنا نہیں ہوتا ہے کہ نقاد انھیں اپنے اپنے تاثر کے مطابق اِس ذیل میں یا اُس ذیل میں شامل کر سکتے ہیں۔ "نگارستان" کے مرتب نے اسی مجموعے کے سارے ادب پاروں کو ادبی مضامین میں شامل کیا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ "نگارستان" میں کئی تحریریں ایسی ہیں، جنھیں ہم علانیہ افسانے کے سوا کسی اور صنف میں شامل نہیں کر سکتے۔ مثال کے طور پر "زائرِ محبت" "حمرا کا گلاب" "کیوپڈ و سائیکی" "کہکشاں کا ایک سانحہ" "قربان گاہ حسن" "ہذیانات افضال" "محبت کی دیوی" اور "ایک مصلح بت تراش" یہ آٹھوں واضح طور پر مختصر قصے ہیں۔ ان کے علاوہ دو اور تحریریں "چند دن بمبئی میں" اور "روح کی فریب کاریاں" افسانے اور انشائیہ کی سرحد پر ہیں۔ میرے خیال میں تو ان دونوں اور خاص طور پر موخر الذکر کو مختصر افسانے ہی میں شامل کرنا چاہیے۔ ادبی اصناف میں سرحدوں کا یہ ٹکراؤ کوئی انوکھی بات نہیں، ادیب، فن کار اور خاص طور پر تخلیقی فن کار کا ذہن صوری بندشوں کا متحمل نہیں ہونا چاہتا۔ تاہم ہمارے پاس سرحدوں کے تعین کے کچھ وسیع معیار ہیں۔ افسانہ بنیادی طور پر ایک بیانیہ ہوتا ہے، جو چند واقعات اور بعض وقت محض ایک واقعہ کی پیش کشی پر مشتمل ہوتا ہے۔ اسی لیے کسی واقعے (EPISODE) کی پیش کش کی قسم کی کوئی چیز مل جائے، تو ہم اسے بہ آسانی افسانے کے ذیل میں رکھ سکتے ہیں۔

بعض وقت تخلیق کار کے انداز پیش کش اور اسلوب کی نزاکت کی وجہ سے ان کی کسی تحریر کی شناخت مشکل بھی معلوم ہوتی ہے۔ نیاز کی تحریر "روح کی فریب کاریاں" اسی نوع کی ہے۔ اس میں واقعہ کی پیش کشی تخلیق کار کے ارتسامات کے تحت دب گئی ہے۔

محولۂ بالا ادب پاروں سے ہٹ کر، اس مجموعے میں کچھ تحریریں ارتساماتی ہیں، جیسے "ایک مصور فرشتہ" "ایک قافلہ صحرا کو دیکھ کر" اور "دل، زیرِ سنگ" ایک دو توضیح پارے یا مرقع ہیں۔ ان میں "ایک رقاصہ سے" "راز کشش" اور "طلوعِ آفتاب" قابلِ ذکر ہیں۔

• "برسات" کا انداز یلدرم کے "اگر میں صحرا نشیں ہوتا" سے بہت ملتا جاتا ہے۔

"نگارستان" میں نیاز صاحب کی ایک تحریر "اپنے چاند سے" قاضی عبدالغفار کی تصنیف "لیلیٰ کے خطوط" کی نوع کی ہے۔ "لیلیٰ کے خطوط" مکتوباتی ناول ہے، اور "اپنے چاند سے" ارتساماتی افسانہ۔ دونوں میں مناسبت یہ ہے کہ لیلیٰ اپنے خطوط کے ذریعے ہمارے سامنے آتی ہے، اور سارے واقعات خطوط ہی کی زبان سے ادا ہوتے ہیں۔ جناب نیاز کے افسانے کا کینوس مختصر ہے۔ یہاں واقعات محض ارتسامات کے انداز میں ادا ہوئے ہیں۔

انشائیہ اور مختصر قصّے کی یہ تخلیط نیاز صاحب ہی کے یہاں نہیں، بلکہ جدید عصر کے کئی اور انشاپردازوں کے یہاں بھی ملتی ہے۔ یلدرم کی "خیالستان" میں کئی تحریریں افسانے اور انشائیے کی سرحد پر واقع ہوئی ہیں۔ پطرس کی تحریروں کا جو مجموعہ "مضامین پطرس" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس میں کئی مزاحیہ مختصر قصّے شامل ہیں۔

نیاز صاحب کے ادبی افکار میں جو رجحان سب سے زیادہ نمایاں ہے، وہ "کلاسکیت" کا ہے۔ "کلاسیکی" اور کلاسکیت ایک مغربی اصطلاح ہے، جسے ہمارے مصنفین قدیم ادب کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صدر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی نے اپنے بعض مضامین جو قدیم ادب سے متعلق ہیں "کلاسیکی ادب" کے نام سے شائع کئے ہیں۔ ہمارے یہاں کلاسیکی ادب کے معیار اور اصول اس طرح معین اور مقرر نہیں ہیں، جس طرح مغربی ادب میں ہیں۔ مغربی ادب میں "کلاسیکل" اور کلاسکس کا ایک خاص مفہوم ہے، جس میں فکری نہج۔ منہاج و مقصد اور نظریات شامل ہیں۔ یہ دراصل مغربی ادب کے ارتقا کی تاریخ کا ایک مرحلہ ہے، جس میں یونانی اور رومی معیاروں کو نمونے کے طور پر سامنے رکھا جاتا تھا۔ موضوع کی ایک مخصوص مفہوم میں رفعت اور کارنامہ کی تکمیل کا سڈول پن، کلاسیکی تصور ادب کے اہم اجزا مانے جاتے تھے۔ اردو ادب کی تاریخ میں ظاہر ہے کہ ایسا کوئی مرحلہ نہیں آیا جب کہ ہمارے لکھنے والوں نے یونانی اور لاطینی معیاروں کی تقلید کرنے کی کوشش کی ہو۔ اس کے باوجود قدیم ادب کے مفہوم کو اصطلاحی انداز سے ظاہر کرنے کے لئے اس اصطلاح کو اردو میں مستعار لے لیا ہے۔

نیاز صاحب جدید عہد کے انشاپرداز ہیں، لیکن ان کے ذہن پر کلاسکیت کا جتنا گہرا اثر چھایا ہوا ہے، اس کا پرتو ہم ان کے موضوعات، تصورات اور اسلوبِ نگارش ہر جز میں پاتے ہیں۔ "نگارستان" کے قصّوں اور انشائیوں میں سے کئی موضوعات میں کلاسیکی ہیں۔ کیوپڈ اور سائیکی" تو حقیقتاً کلاسکی ہے، جو یونانی دیومالا سے لیا گیا ہے۔ یہ بات کہ نیاز صاحب نے دنیا میں وسیع ادبی محرکات میں سے، اس کلاسیکی موضوع کو منتخب کیا، ان کے ذہن پر کلاسکی ادب کے گہرے اثر کا ثبوت ہے یہی رجحان "حمرا کا گلاب"، "زانوئے محبت"، "ایک مصور فرشتہ"، کہکشاں کا ایک سانحہ اور "روح کی فریب کاریاں" میں بھی نمایاں نظر آتا ہے۔

نیاز صاحب کا اسلوبِ بیان بھی ان کے کلاسیکی رجحان سے بڑی حد تک ہم آہنگ ہے۔ کچھ مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

> "روشنی کی تیز کرنیں مجھ سے اک مودب فاصلے پر رکے ہوئے تڑپ رہی تھیں" اب سے بہت پہلے کروڑوں برس پہلے، جب تکوین عالم کی بالکل ابتدا تھی مذاقِ آفرینش یا تو امواجِ آب سے لاعب نظر آتا تھا یا وادی قاف کی نسرین و نسترن زار میں آسودہ"۔

> "شبستانِ ناز کے پُرلطف دقیقہائے برق کسی کی آرمیدہ مژگاں کی آغوش میں تھک کر سو گئے ہیں، مگر ایک حسرت آلود انتقامِ عشق ان لانبی گھنی پلکوں کا ماجرا، جو آسودہ آنکھوں کی لذت سے مست و سرشار ہیں،

سننے کے لئے بیتاب ہیں"

یہ موضوع اور تکنیک کے سلسلے کی بات تھی، جہاں تک رجحان فکر کا تعلق ہے، جناب نیاز علی الاعلان ——— رومانیت کے دلدادہ ہیں۔ اس کا بخوبی اندازہ ہم کو ان کے موضوعات اور ان کی پیش کش سے ہوتا ہے، عشق و محبت کی رنگین وارداتیں اور اظہار جذبات کا مبالغہ آمیز انداز، ان کے تخلیقی ادب کی نمایاں خصوصیت ہے۔

"نگارستان" کے ایک افسانے کی تمہید میں نیاز صاحب نے اس نظریۂ ادب کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ جس کے وہ پیرو ہیں۔ وہ ادب کے نظریۂ مسرت زائی کے معتقد ہیں، قدیم عہد میں دنیا کے ادب کا یہی مطمح نظر تھا، لیکن ہم سے قریب تر زمانے میں مسرت زائی کے نظریہ کو ادب برائے حیات کے نظریہ نے شکست دے دی تھی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسرت زائی کا نظریہ تمام و کمال رد نہیں ہو گیا تھا۔ چنانچہ بعض حالیہ نقاد، جیسے اسکاٹ، جیمسن وغیرہ کے یہاں یہ پھر ابھر رہا ہے

ادب اور افادیت کے بارے میں نیاز صاحب سنجیدہ شبہات رکھتے ہیں، "کیوپڈ و سائیکی" کے تمہیدی نوٹ میں وہ اپنے ادبی افکار کی غرض و غایت کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"میرا مقصود اس سے داد لینا نہیں بلکہ خود لطف اٹھانا ہے۔"

یہ اظہار حقیقت میں نیاز صاحب کے ادبی نظریہ کی تشریح و تفسیر ہے۔ تاریخی اور سیاسی لٹریچر ان کی نظر میں افادی ادب ہے، جس سے انھیں کسی طرح کا سروکار نہیں۔ مذہبی ادب، اعتقادی ادب ہے اور اسے "ادب" محض وسیع ترین اور تحریف کے معنوں میں کہا جا سکتا ہے۔ ان کے خیال کے مطابق ٹھیٹ ادب کے خد و خال، اس جملے میں نظر آتے ہیں، تاریخی سیاسی یا مذہبی لٹریچر پیش کرنے والے کے مقابلے میں :-

"ایک اور ہے، جو ان اصناف سے علٰحدہ ہو کر، اس لٹریچر کو رواج دینا چاہتا ہے، جو صرف روح کو متاثر کرتا ہے، اس شعبہ ادب کو پسند کرتا ہے، جس کا تعلق صرف ہمارے دل سے ہے ...."

آگے وہ یونانی اور ہندی فلاسفہ کی طرح ایسے ادیب کے بارے میں سوال کرتے ہیں :-

"کیا آپ کے نزدیک وہ بالکل بے کار وقت ضائع کرتا ہے؟" پھر وہ اپنا ذاتی خیال اس طرح ظاہر کرتے ہیں :-

"لیکن میرے نزدیک تو یہی ایک چیز ایسی ہے جو مادیات کی عظیم ترین فتوحات کے مقابلے میں روحانیت کی طرف سے پیش کی جا سکتی ہے۔"

افادی یا اعتقادی ادب اور تخلیقی ادب کا انھوں نے ذیل کے جملوں میں گویا موازنہ کیا ہے لکھتے ہیں :-

ایک واعظ میرے سامنے خانہ کعبہ کے تقدس کا اظہار کیسے ہی پر اثر لب و لہجہ میں کیوں نہ کرے لیکن جس عظمت و تقدس کا خیال میرے دماغ میں اس انداز سے پیدا ہوتا ہے کہ :-

در طوف حرم دیدی، دی مغبچہ می گفت
کیں خانہ بدیں خوبی آتشکدہ باستی

وہ ہزار واعظوں کے مواعظ سے بھی پیدا ہونا ممکن نہیں۔"

ان کے رومانی تصور ادب میں عورت کا مقام سب سے اہم اور مرکزی ہے۔ ایسے نقادوں سے جو یہ کہتے ہیں کہ ان کی تخلیقات میں "عورت اور اس کے متعلقات کا ذکر عنصر غالب ہے"، نیاز سوال کرتے ہیں :-

"مجھے حیرت ہوتی ہے کہ عورت اور اس کے ذکر کو نکال دینے کے بعد آپ کے پاس رہ کیا جائے گا؟ کائنات میں کون سی دوسری ایسی چیز ہے، جس سے آپ اس کی رونق کو قائم رکھ سکیں گے؟"

اس طرح سے ادب اور عورت، ان کی نظر میں لازم و ملزوم ہیں، اقبال کو "ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس" سے شکایت تھی کہ۔ "آہ بے چاروں کے اعصاب پر عورت ہے سوار۔" نیاز اپنے انشائیے میں جس کا عنوان "عورت ہے" اس کا گویا جواب دیتے ہیں کہ :۔

خدا معلوم اس سے قبل کتنی بار ارادہ کیا کہ خدا کی اس محترم ترین مخلوق پر کچھ لکھوں لیکن سوائے اس کے کہ جب تک ایسا خیال قائم رہا۔ ایک خاص نوع کا لطف تو ضرور اُٹھاتا رہا۔ یہ ہمت کبھی نہیں ہوئی کہ کچھ لکھتا ــــ دنوں گذر گئے ہیں کہ میں اسی فکر میں مستغرق رہا ہوں کہ آخر یہ حسن و محبت جس کے اثرات کا خلاصہ ہماری ناکامیوں اور کامرانیوں میں ایک طویل آہ یا اُف سے زیادہ نہیں، کیوں اس درجہ ہمارے نظام عصبی پر حکمران ہے، لیکن سوائے اس کے اور کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ حکمران ہے اور اس کو حکمران ہونا چاہیئے۔"

نثری تخلیقات کو ان کے خیال کے مطابق "نثر میں شاعری" ہونا چاہیئے۔ ادب میں عورت کے مقام کو واضح کرتے ہوئے اپنے نقادوں سے وہ یوں مخاطب ہوتے ہیں :۔

"جب شاعری سے، جو اس نوع کے ادب لطیف کا پاکیزہ ترین شعبہ ہے، صنف نازک اور اس کا ذکر جدا نہیں کیا جا سکتا تو کیا وجہ ہے کہ وہ لوگ جو نثر میں شاعری کرنا چاہتے ہیں اس جنس کے ذکر سے تائب ہو جائیں۔"

وہ اپنے محبوب موضوع کو بے نقاب پیش کرنے کے بھی قایل ہیں۔ ان کے معاصرین نے ان پر عریاں نگاری کا بھی الزام دیا تھا۔ لیکن نیاز صاحب فن کا منتہا عریانی سمجھتے ہیں۔ ایک رقاصہ کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"لوگ کہتے ہیں کہ تو عریاں ہے اور تیرا رقص اور زیادہ عریانی، مگر وہ نہیں جانتے کہ ہر صنعت کی تکمیل عریانی پر ختم ہوتی ہے اور عریانی خود ایک صنعت ہے۔"

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ اپنے عہد کے لئے، نیاز کے یہ ادبی تصورات، نہایت جری اقدام تھے، لیکن انھیں اپنے نظریوں اور تصورات پر ایقان تھا، اس لئے اپنے نقادوں کے شور و پکار کے باوجود انھوں نے اپنے ایقانات سے کبھی انحراف نہیں کیا جیسا کہ ذیل کے اقتباس سے اندازہ ہو گا۔

"جس وقت سے میں نے لکھنا شروع کیا ہے، (بلا لحاظ اس کے کہ زمانہ کیا چاہتا ہے) میں نے ہمیشہ اپنے انھیں حسیات کی پابندی کی، اور نظم ہو یا نثر، انھیں خیالات کے اظہار کو اپنا محبوب مشغلۂ خلوت قرار دے رکھا ہے۔"

* * *

قدیم وجدید شاعری

"نہ قدیم شاعری میں تمام باتیں خراب تھیں نہ جدید شاعری میں تمام باتیں اچھی ہیں۔
(نیاز)

نیاز کا مذہب

ڈاکٹر شوکت سبزواری

مولانا نیاز فتحپوری کی گوناگوں شخصیت کے رنگارنگ پہلوؤں میں سے ان کے مذہبی خیالات کو خصوصیت کیساتھ موضوعِ بحث بنانے کی دو بڑی وجہیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ نیاز صاحب کے مذہبی نقطہ نگاہ کا ان کی ادبی تنقید پر اور ان کے مذہب کا ان کے ادب و انشاء اور اسلوب پر بہت گہرا اثر پڑا ہے۔ اس فرصت میں میں بحث کے اس پہلو کے بارے میں کچھ نہ کہہ سکوں گا۔ دوسری وجہ جس کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ گمراہ کن پروپیگنڈا ہے جو ایک خاص طبقے کی طرف سے نیاز کے خلاف شد و مد کے ساتھ اس وقت سے کیا جا رہا ہے جب سے "نگار" جاری ہوا یا جب سے میں نے "نگار" پڑھنا شروع کیا۔ میں اس سے بھی بے نیازانہ گزر جاتا اگر مجھے یہ معلوم نہ ہوتا کہ نیاز کے خلاف اس پروپیگنڈے نے نیاز کو ہمارے معاشرے کو یا خود مذہبِ اسلام اور اس کی اشاعت ہی کو نقصان نہیں پہنچایا! بلکہ پاکستان میں اردو زبان و ادب کو بھی اس سے بڑا دھکا لگا ہے۔ داستان تلخ ضرور ہے لیکن سنانی ہی پڑے گی۔

مئی ۱۹۵۱ء میں نیاز صاحب میری کتاب "اردو زبان کا ارتقاء" شائع کرنا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں ڈھاکے سے میرٹھ جاتے ہوئے لکھنؤ میں ان سے نیاز حاصل ہوا تو انہوں نے فرمایا۔ "میں ترک وطن کرنا چاہتا ہوں۔ ڈھاکہ میں قیام کروں گا اور وہیں سے "نگار" نکالوں گا۔ "نگار" کے لئے ایک مکان کی ضرورت ہوگی۔ فضلی صاحب سے (جو اس وقت مشرقی پاکستان میں معتمد تعلیمات تھے) کہئے، میں کچھ نہیں چاہتا۔ "نگار" کے لئے کوئی مکان یا بدرجۂ اقل مقام کا انتظام کر دیا جائے جہاں بیٹھ کر میں اردو زبان و ادب کی خدمت کر سکوں"۔ نیاز صاحب کی یہ درخواست لے کر میں ڈھاکہ پہنچا تو ایک بزرگ سے جن کا میں احترام کرتا تھا اس کا ذکر آیا۔ میں نے کہا خوشی کی بات ہے۔ نیاز صاحب پاکستان آنا چاہتے ہیں اور انہوں نے غالباً اردو کی خدمت کی غرض سے پاکستان کے اس حصے کو منتخب کیا ہے۔ فضلی صاحب کے نام میں ان کا پیغام لایا ہوں۔ "نگار کے لئے کوئی مناسب مکان مل جائے تو وہ ڈھاکہ چلے آئیں گے۔ یہ سن کر وہ صاحب برہم ہوئے اور کہنے لگے "نیاز صاحب کا یہاں آنا مناسب نہیں۔ ان کے مذہبی خیالات سے تم واقف نہیں ہو، یہاں آکر وہ بے دینی پھیلائیں گے"۔ میں نے نیاز صاحب کی تائید میں کچھ کہنا چاہا تو انہوں نے یہ کہہ کر خاموش کر دیا۔ "تم ابھی مشرقی پاکستان کے حالات سے واقف نہیں۔ میں جانتا ہوں۔ ہرگز اس امر کی اجازت نہ دوں گا کہ تم فضلی صاحب سے اس کا ذکر کرو"۔

ہر چند میں ان بزرگ کی اس رائے سے متفق نہ تھا لیکن ان کا احترام مدنظر تھا۔ مجھے ان کی خاطر عزیز تھی۔ اسلئے ان کی اجازت کے بغیر فضلی صاحب تک نیاز صاحب کا پیغام پہنچانے کی میں جسارت نہ کر سکا۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ نیاز صاحب کو پاکستان آنے کے لئے گیارہ سال انتظار کرنا پڑا اور مشرقی پاکستان جسے نیاز جیسے اردو نواز انشاء پرداز کی سخت ضرورت تھی نیاز و نگار کی ادبی و لسانی خدمات سے محروم رہ گیا۔ کیا اس سے اردو کو نقصان نہیں پہنچا ——؟

میں اپنے بزرگ سے نیاز صاحب کے مذہبی معتقدات کے بارے میں جو کہنا چاہتا تھا اس فرصت میں "نگار" کے ذہین قارئین کی خدمت میں پیش کر دوں تو شاید بے محل نہ ہو۔ نیاز صاحب اہلِ قلم بھی ہیں اور اہلِ علم بھی۔ ان کے علم کی بنا "بصیرت" پر ہے جو متاعِ عزیز کی طرح آج کمیاب ہے۔

اسلام کے ابتدائی عہد میں یہ کمیاب نہ تھی بلکہ ہر مسلمان کا طرۂ امتیاز سمجھی جاتی تھی۔ جیسا کہ قرآن میں ہے " **علی بصیرۃ انا ومن اتبعنی** " میں (رسول کریم) اور میرے پیرو (مسلمان) ہم سب بصیرت کے مالک ہیں اور ہمارے مسلک کی بنیاد بصیرت ہے۔ بصیرت کا مقابل بصارت ہے۔ بصارت آنکھ کی روشنی یعنی بینائی یا مشاہدہ ہے جو معلومات حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ بصیرت دل کی روشنی ہے جس سے حقیقت تک رسائی حاصل کی جاتی ہے۔ قرآنِ حکیم نے ایک سے زیادہ مقامات پر سمع (سننے کی قوت) اور بصر (دیکھنے کی قوت) کے ساتھ قلب و فواد (دل) کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ قیامت کے روز آنکھ کان اور دل کو ذمہ دار ٹھہرا کر ان سے بازپرس کی جائے گی۔ "دل" سے قرآن کی مراد وہ صنوبری شکل کا گوشت کا لوتھ نہیں جو ہر شخص کی بائیں پسلی کے نیچے لٹکا ہوا رات دن دھڑ دھڑ کرتا رہتا ہے بلکہ قرآن کی زبان میں سوچنے سمجھنے کی قوت کا نام دل ہے اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بصیرت ہے۔ اس کا ثبوت ذیل کی آیت سے ملتا ہے:۔

لہم قلوب لا یفقہون بہا ولہم اعین لا یبصرون بہا ولہم اذان لا یسمعون بہا۔	کفار کے دل ہیں جن سے وہ نہیں سمجھتے، آنکھیں ہیں جن سے نہیں دیکھتے، کان ہیں جن سے نہیں سنتے۔

جس طرح آنکھ کا کام دیکھنا اور کان کا کام سننا ہے۔ اسی طرح دل کا کام سوچنا سمجھنا ہے۔ مسلمانوں نے دل سے کام لیا یعنی سوچ سمجھ کر اپنے لئے ایک راہ بنائی۔ کفار اپنے باپ دادا کی تقلید میں قدیم رسم و راہ پر جمے رہے۔ اس لئے نبی کی زبانی قرآن نے اعلان فرمایا کہ نبی اور اس کے ساتھی بصیرت والے ہیں۔

قرآن نے تین لفظ استعمال کئے ہیں جو عقیدے کے تین مدارج کو ظاہر کرتے ہیں: قدیم مسلک پر محض اس لئے جمے رہنا کہ وہ باپ دادا کا مسلک ہے، کفر ہے۔

انا وجدنا آبائنا علی امۃٍ وانا علی آثارھم لمھتدون۔	ہمارے باپ دادا کا ایک مسلک تھا۔ ہم انکے نقشِ قدم پر چلیں گے۔

اکابر قوم اور رؤسا و شیوخ کی دیکھا دیکھی سمجھے بوجھے بغیر کوئی راہ اختیار کرنا "اسلام" ہے۔

قالت الاعراب آمنا قل لم تومنوا بل قولوا اسلمنا۔	بدوی آکر آپ سے کہتے ہیں کہ ہم آپ پر ایمان لے آئے۔ آپ ان سے کہدیں تم ایمان نہیں لائے، اسلام لائے ہو۔

کیوں ـــ؟ اس لئے کہ

لما یدخل الایمان فی قلوبکم	ابھی ایمان تمہارے دلوں میں جاگزیں نہیں ہوا۔

اچھی طرح غور و فکر کرنے اور سوچنے سمجھنے کے بعد جب کوئی راہ اختیار کی جائے تو وہ ایمان ہے۔ ایمان اندھا نہیں علی بصیرت ہوتا ہے۔ اور بصیرت تفکر کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ قرآن نے اہل بصیرت کی شان یہ بتائی ہے۔ کہ

یتفکرون فی خلق السمٰوٰت والارض	اٹھتے بیٹھتے وہ زمین و آسمان کی تخلیق پر غور کرتے رہتے ہیں۔

بات میں سے بات پیدا ہوتی ہے۔ نیاز کے مذہبی نقطۂ نگاہ کو واضح کرنے کے لئے یہ بھی عرض کر دوں کہ اسلام کی رو سے فکر فی آیات اللہ ایک پکا اور سچے مومن بننے کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا ضروری ذکر اللہ ہے۔

فکر فی آیات اللہ کے دو معنی ہیں۔ انفس و آفاق یعنی حیات و کائنات کی پردہ کشائی اور ان کے گوناگوں اسرار و رموز اور حقائق و دقائق تک رسائی۔

وفی انفسھم سنریھم آیاتنا فی الآفاق	ہم اپنی آیات کائنات میں بھی انھیں دکھائینگے اور حیات میں بھی

دوسرے قرآنی نصوص میں غور و فکر اور ان کے معانی و مطالب کی دریافت۔ اول مطالعہ اعمال ہے۔ دوم مطالعہ اقوال اور شاید عام مطالعہ کرنے

والوں کو اس کا احساس نہ ہو کہ قرآن نے خصوصیت کے ساتھ ان لوگوں کی ستائش کی ہے جو اس کے کلام یعنی قرآن کا آنکھ کھول کر مطالعہ کرتے اور اس کے مطالب و معانی کی دریافت کے لئے فکر و نظر سے کام لیتے ہیں۔

اذا ذکروا بآیات اللہ لم یخروا علیہا صما و عمیانا۔ (خدا کے نیک بندے وہ ہیں) کہ جب انھیں خدا کی آیتیں یاد دلائی جاتی ہیں تو وہ بہرے اور اندھے ہو کر ان پر ٹوٹ نہیں پڑتے۔

بہرے اور اندھے ہو کر خدا کی آیات پر ٹوٹ پڑنا اس کے سوا کیا ہے کہ عوام کالانعام کی طرح ان پر اعتقاد ہو اور غور و فکر کو ان میں راہ نہ ہو۔

اس تفصیل کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ نیاز صاحب کے مذہب اور ان کے عقائد کو قرآن کی تعلیم کی روشنی میں سمجھا جا سکے۔ نیاز کا نقطۂ نگاہ علم و ادب کے باب میں تنقیدی رہا ہے۔ ان کی ادبی تنقید تاثراتی ہے جس نے ان کی اعلیٰ انشاپردازی کی آغوش میں پرورش پائی اور ان کی علمی و دینی تنقید تفکراتی ہے۔ ایک عام مسلمان اور عالم دین دونوں سے ان کی راہ الگ ہے۔ عام مسلمان سے اس لئے کہ نیاز کے اسلام کی بنیاد فکر پر ہے اور ایک عام مسلمان کے اسلام کی بنیاد جذبے پر۔ نیاز کا اسلام اپنا ہے جسے انہوں نے کائنات اور آیات کے گہرے مطالعے کے بعد حاصل کیا۔ ایک عام مسلمان کو یہ نعمت عظمیٰ آباواجداد سے ترکے میں ملی۔ عالم دین اور نیاز کے اسلام میں یہ فرق ہے کہ نیاز کے عقائد کے اجزاء و عناصر کا ایک بڑا حصہ اجتہادی ہے اور عالم دین کے مسلمات تمام تر تقلیدی ہیں۔ نیاز کے یہاں درایت کو روایت پر ترجیح ہے۔ اور ایک عام عالم دین کے نزدیک اس کے برعکس روایت درایت پر مرجح ہے۔ اور سطور بالا میں یہ ثابت ہو چکا ہے کہ نیاز کا نقطۂ نگاہ قرآنی آیات و نصوص کے مطابق اور اسلام کی اعلیٰ تعلیمات پر مبنی ہے۔ اگر میرا خیال صحیح ہے تو نیاز اور ان کے ہم خیال دوسرے اہل علم کو بے دین نہیں کہا جا سکتا۔ تفصیل کی گنجائش نہیں۔ توضیح کی غرض سے صرف ایک مثال پیش کروں گا۔

علمائے اسلام کا خیال ہے کہ قرآن کے مطالب اور اس کے الفاظ و کلمات و حروف منزل من اللہ ہیں۔ نیاز کہتے ہیں مطالب خدا کی طرف سے ہیں۔ الفاظ و کلمات رسول کے ہیں۔ مطالب کو الفاظ کا جامہ رسول نے پہنایا۔ یہ بحث آج کی نہیں۔ اس سے پہلے بھی علمائے دین کے مابین اس پر رد و قدح ہو چکی ہے اور بعض فرقوں نے علماء کے شدید اختلاف کے باوجود اس مسلک کو صحیح بتایا ہے، جو نیاز کا ہے۔ اس وقت اس کی صحت یا عدم صحت زیر بحث نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ نیاز اور ان کے ہم نوا غلطی پر ہوں اور صحیح وہی ہو جو اہل سنت کہتے ہیں۔ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ نیاز کا یہ عقیدہ ان کے ذہن کی تخلیق نہیں۔ قرآن کی آیات پر مبنی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن نے ایک سے زیادہ مقامات پر بصراحت لکھا ہے کہ

نزل بہ الروح الامین علیٰ قلبک روح الامین نے قرآن کو آپ کے قلب (دل) پر اتارا

اور یہ امر کسی سے مخفی نہیں کہ قلب پر لکھی لکھائی کتاب نازل نہیں ہوتی مضامین اور خیالات کا القا ہوا کرتا ہے جیسا کہ غالب نے لکھا ہے۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

میں پھر عرض کروں گا کہ اس استدلال کی قوت اور صحت سے بحث نہیں سوال یہ ہے کہ قرآن کی آیات اور احادیث سے غور و فکر کے بعد اگر کوئی رائے قائم کی جائے جو علمائے اسلام کے مسلک کے خلاف ہو تو کیا یہ رائے غلط ہو گی اور رائے رکھنے والا بے دین سمجھا جائے گا۔ اور اس کی یہ روش کہ علمائے اسلام کی تقلید کرنے کی جگہ وہ براہ راست قرآن اور اسلام کے مطالعے کے بعد ایک نتیجہ پر پہنچا ہے' بے دینی، الحاد، زندقہ اور گمراہی کہلائے گی۔ اگر جواب اثبات میں ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسلام کے معنی قرآن و حدیث پر ایمان رکھنا اور سمجھ کر ایمان رکھنا نہیں علمائے اسلام کی تقلید اور ان کی ہاں میں ہاں ملانا اسلام ہے۔

نیاز علما کی تقلید نہیں کرتے قرآن اور حدیث پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان کا اسلام خالص اسلام ہے۔ وہ نہ شیعی ہیں نہ سنی، نہ مقلد ہیں نہ غیر مقلد نہ دیو بندی ہیں نہ بریلوی، نہ قرآنی ہیں نہ اہل حدیث۔ وہ محض مسلمان ہیں اور چونکہ ان میں سے کسی فرقے سے بھی ان کا تعلق نہیں اس لئے ہر فرقہ انھیں بے دین

ٹھہراتا ہے۔ شیعہ سنی سمجھتے ہیں، سنی شیعہ تصور کرتے ہیں۔ مقلدوں کا خیال ہے کہ وہ غیر مقلد ہیں۔ غیر مقلد تقلید کا طعنہ دیتے ہیں۔

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا .. .. .. ∴ .. .. اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں

ان میں سے کسی فرقے نے بھی انھیں اپنے دامن میں پناہ نہ دی اور ان کے مسلک کی یہ خوبی ان کی سب سے بڑی خامی شمار ہوئی۔ یہ دور فرقہ بندی کا دور ہے۔ اس میں افراد ٹکڑیوں میں بٹ کر اور ٹولیاں بنا کر زندگی بسر کرتے اور کار زار حیات سر کرتے ہیں۔ حضور اکرم نے فرقہ بندی کو مسلمانوں کے لئے ناپسند کرنے کے باوجود یہ پیشین گوئی کی تھی کہ میری امت میں بہتر فرقے ہوں گے۔ چنانچہ آج یہ فرقے موجود ہیں۔ اسلام کا نام و نشان نہیں۔ جس طرح پاکستان میں بنگالی بھی ہیں، پنجابی بھی ہیں۔ پشتون بھی ہیں، بلوچ بھی ہیں، سندھی بھی ہیں، مہاجر بھی ہیں، سبھی ہیں لیکن پاکستانی کہیں نظر نہیں آتا اور اگر نظر آتا ہے تو پریشان و پشیمان اقبال کا یہ شعر زبان حال سے پڑھتا ہوا کہ

در جہاں یارب ندیم من کجاست
طور سینایم کلیم من کجاست

مذہب کی یہ روایت کہ سرچشمہ اسلام یعنی قرآن و سنت سے بے واسطہ ہدایت حاصل کی جائے بڑی پرانی روایت ہے قرآن کا فرمان ہے

فان تنازعتم فی شئی فردوہ الی اللہ والرسول اگر کسی مسئلہ میں اختلاف ہو تو خدا کی کتاب اور رسول (کی سنت) کی طرف رجوع کرو

حضور اکرم ارشاد فرماتے ہیں میں تمہارے لئے دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں۔ اگر تم نے انھیں جکڑ کر پکڑ لیا تو کبھی بے راہ نہ ہو گے۔ یہ دو چیزیں کیا ہیں ——؟ ایک اللہ کی کتاب (قرآن) دوسرے میری سنت (حدیث صحیح)۔ افسوس ہے اس روایت کا تسلسل تاریخ نے برقرار نہیں رکھا۔ ہدایت کے اصلی سرچشمے نظر انداز ہو گئے۔ ان کی جگہ اشخاص و افراد نے لے لی۔ اسلامی تاریخ کا یہ ایک باب ہے میں اس کے ورق الٹنا نہیں چاہتا۔ البتہ یہ عرض کروں گا کہ برصغیر پاک و ہند میں سب سے پہلے شاہ ولی اللہ صاحب اور اس کے بعد سر سید احمد خان نے اس مردہ روایت کو زندگی بخشی اور علماء کے کھینچے ہوئے حصار سے باہر آ کر قرآن و حدیث کا بے واسطہ مطالعہ کیا۔ اس مطالعہ میں سر سید احمد خان سے شاید لغزشیں بھی ہوئی ہوں اس لئے کہ جو چلتا ہے وہ ٹھوکر بھی کھاتا ہے۔ لوگ ان کی لغزشوں پر نظر رکھتے ہیں میں یہ دیکھتا ہوں کہ انہوں نے ایک اچھی روایت کو جو مر چکی تھی زندہ کیا۔ اور سوچنے سمجھنے والوں کو ایک راستہ دکھایا۔ نیاز سر سید کے پیرو نہیں، لیکن راستہ دونوں کا ایک ہے۔ نیاز بھی اسی راہ کے رہ سپر ہیں۔ سر سید مصلح قوم تھے۔ نیاز نقاد ہیں۔ سر سید نے اصلاح کے خیال سے عام عقائد کے چشمے کو خس و خاشاک سے پاک کیا۔ نیاز نے اس پر ناقدانہ نظر کی اور آج کے اسلام کو قرآن و حدیث کے معیار پر پرکھا۔

”ابتدائے آفرینش سے لے کر اس وقت تک انسان کی تاریخ اس نتیجہ پر پہونچنے میں مدد کرتی ہے کہ مذہب کا خیال بڑی حد تک فطری اقتضا ہے اور محض اس لئے کہ انسان بالطبع تمدن پسند ہے اور تمدن کا نظام بہت کچھ منحصر ہے کسی اعتقادی قانون پر —— یہ ضرور ہے کہ ماحول کے اثر سے مذہبی خیالات میں تغیر و تبدل پیدا ہوتا رہتا ہے، لیکن مذہب کا خلاق ماحول نہیں ہے بلکہ فطری اقتضا ہے۔ اس لئے ایک مذہب کے بہترین ہونے کی علامت اگر کوئی ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ وہ اصول فطرت کے مطابق ہو یعنی فطرت انسانی اپنے اکتسابات کے لحاظ سے جس قدر ترقی کرتی جائے، مذہب نہ صرف یہ کہ اس کا ساتھ دے بلکہ ہمیشہ ترقی کا ایک بلند نصب العین سامنے رکھے۔ قرآن میں مذہب اسلام کی حقیقت جن الفاظ میں بیان کی گئی یہ ہیں:۔

”فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا ولا تبدیل لخلق اللہ ذالک الدین القیم“ (یعنی اسلام نام ہے صرف اس فطرت الٰہی کا جس پر انسان پیدا ہوا ہے اور فطرت الٰہی یہ ہے کہ قانون نظام عالم کا اس نے بنایا ہے اس میں تبدیلی پیدا نہیں کرتا اور یہی مسلک و مذہب ایسا ہے جو ہمیشہ قائم رہنے والا ہے) ان الفاظ میں جو فلسفہ مذہب کا بیان کیا گیا ہے وہ اس قدر حاوی اور ایسا مکمل ہے کہ زمانہ خواہ کتنی ہی ترقی کرے اس کی صداقت سے انکار نہیں ہو سکتا۔“ (نیاز)

E3 JUL 1963

نیاز کی ادبیت کے بعض پہلو

پروفیسر آل احمد سرور

تنقید- ادب لطیف پر اعتراضات کرنا اب عام ہو گیا ہے۔ مگر اس انشا پردازی نے اردو کو ایک بڑا نقاد دیا۔ یہ نیاز ہیں۔ یوں بھی سجاد حیدر، مہدی افادی، سجاد انصاری اور قاضی عبد الغفار کے یہاں ادب کے ساتھ ایک سچا عشق اور شعریت کا ایک دلکش احساس بھی ملتا ہے۔ مگر نیاز کے یہاں —— ایک نازک جمالیاتی احساس کیساتھ قدیم ادبی سرمائے سے گہری اور جدید سرمائے سے خاص واقفیت ملتی ہے جسے ان کی انشا پردازی نے حسن دیا ہے۔ نیاز قدیم بھی ہیں اور جدید بھی۔ وہ لکیر کے فقیر نہیں، ان کی اپنی سوچی ہوئی ایک رائے ہے، وہ مومن کے تغزل کے دلدادہ ہیں اور شیفتہ کے قائل۔ وہ ہر مشہور و مقبول کے مداح نہیں ہو جاتے، تلج اتارتے اور شہرتیں عطا کرتے ہیں۔ جوش واصغر کے متعلق اُن کے اعتراضات اور فراق و علی اختر کی تحسین غور سے پڑھنے کے قابل ہے۔ نیاز کے یہاں تعمیری اور تخریبی دونوں صلاحیتیں ہیں وہ اس دور کی فنی تہی مایگی پر بجا طور پر معترض ہیں۔ مگر اُن کی تنقیدوں میں قدروں سے زیادہ شخصیات سے شغف ملتا ہے۔ نگار کے خاص نمبروں نے اردو تنقید کے متعدد خلاؤں کو پر کیا ہے اور کتنے ہی تاریک گوشوں کو روشن۔ اسی لیے حالی، سلیم اور عبدالحق کے بعد نیاز ہمارے بڑے نقادوں میں سے ہیں۔ بلکہ ادبی شعور کی گہرائی کے لحاظ سے وہ سلیم اور عبدالحق سے بھی بلند ہیں۔ "انتقادیات" ہماری تنقید میں ایک مفید اضافہ ہے۔ عبدالحق نے ہمارے کلاسکی ادب کو جسے ہم مردہ سمجھ بیٹھے تھے ہمارے لئے زندہ کیا مگر نیاز نے اسے آب و رنگ اور شگفتگی عطا کی۔

خطوط نگاری نیاز کے خطوط میں ایک دلکش اور دقیع ادبیت ہے۔ ان میں طنز بھی ہے اور ظرافت بھی۔ چھیڑ چھاڑ بھی ہے اور تیر و نشتر بھی۔ وہ ایک ادبی شعور کے آئینہ دار ہیں۔ جو بقول مہدی افادی کے دوم درجے کا ہرگز نہیں کہا جا سکتا مگر ان خطوں میں کہیں ان کا اسلوب نہیں بدلتا کہیں وہ شعر پڑھنا ترک نہیں کرتے، کہیں خاص خاص تلمیحوں سے کام لینا نہیں چھوڑتے، یہ چیز اُن کا مزاج بن

گئی ہے۔ مگر نہ معلوم کیوں اس میں کوئی ارتقاء نظر نہیں آتا۔ اس میں ہلکے اور گہرے رنگ نہیں ملتے۔ ان میں زندگی سے زیادہ کتاب ہے۔ بقول ترجنیف کے یہ وہ ادب ہے جس سے کسی اور ادب کی بو آتی ہے نیاز کے خطوں میں خط سے زیادہ مضمون کا اسلوب ہے۔ نیاز — افسانوں میں دراصل انشاپرداز تھے اور خطوں میں بھی وہ انشاپرداز ہی کے جوہر دکھلاتے ہیں یہ ان کا مزاج سہی مگر ان کے خطوں کی نوعیت دوعملی ہو جاتی ہے۔

افسانہ افسانے میں نیاز فتح پوری، سجاد حیدر، لطیف الدین احمد اکبرآبادی اس گروہ کی ترجمانی کرتے ہیں جو "شراب و شعر" میں ڈوبا ہوا تھا۔ نگار اور آگرہ کے نقاد کے ابتدائی پرچے ایک خاص قسم کے جذباتی سیلاب کو ظاہر کرتے ہیں۔ کیوپڈ و سائیکی، شاعر کا انجام، کہکشاں کا ایک سانحہ اور جمالی کے افسانے دراصل اتنے اچھے افسانے نہیں جتنے ایک خاص قسم کے انشاپردازی کے نمونے ہیں۔ وہ انشاپردازی جو ہر چیز کو آتش سیال ارتعاش رنگین اور آشوب خیال کے رنگ میں دیکھتی ہے۔ اور جس کی وجہ سے زندگی کی تلخ حقیقتوں پر ایک نرم و نازک، دھندلا دھندلا سا مگر پرفریب پردہ پڑ جاتا ہے۔ اونیسویں صدی کے آخر میں زندگی برائے ادب کا جو سنہرا نظریہ آسکر وائلڈ اور پیٹر نے انگلستان میں پیش کیا تھا اس کا عکس اردو میں ادب لطیف کے ان نمائندوں کے یہاں نظر آیا۔ اس میں ایک خود پسندی۔ ایک انانیت اور ایک صناعانہ پختگی کے ساتھ ساتھ ایک ذہنی تعیش بھی ہے۔ یہ لوگ دراصل شاعر تھے جو افسانے کی سرحد میں آزادانہ گھس آئے تھے۔ انھیں قصہ کی تنظیم اور کردار کے ارتقاء سے زیادہ دلچسپی نہ تھی۔

★

عہدِ اسلام کے سکّے: — ایام جاہلیت میں اہل عرب کا کوئی خاص سکہ نہ تھا بیع و شراء میں رومی، ایرانی اور حمیری درہم و دینار سے کام چلاتے تھے۔ عہد نبوی میں بھی اسکی طرف توجہ کرنے کی فرصت نہیں ملی اور خلیفہ اول کا زمانہ بھی اسی طرح گذر گیا۔

جب خلیفہ ثانی کے عہد میں عراق فتح ہوا اور ایرانی سکوں کے مختلف الاوزان ہونے کی وجہ سے ادائے زکوٰۃ میں دقت ہوئی تو آپ نے ۱۴ قیراط وزن کا درہم مسکوک کر دیا۔ اس کی شکل و صورت تو وہی رکھی لیکن سنہ ہجری کا اضافہ کر دیا اور حاشیہ پر "بسم اللہ ربی، الحمد للہ" خط کوفی میں نقش کرایا، اس کے بعد خلیفہ ثالث و خلیفہ رابع کے زمانہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔

عہد امیر معاویہ میں بھی ۷۵ھ تک کوئی تغیر نہیں ہوا۔ ۷۵ھ میں البتہ اتنا ہوا کہ نقوش کسروی کے بجائے والیوں اور امراء کے نام پہلوی خط میں منقوش ہونے لگے۔

عبدالملک بن مروان کے عہد میں سب سے پہلے خلیفہ کا نام درج کیا گیا اور حاشیہ پر بسم اللہ ربی بدستور قائم رکھا گیا۔ سکہ کی صورت وہی تھی۔ البتہ عبداللہ ابن زبیر کے زمانہ میں سب سے پہلے گول سکہ طیار کرایا گیا جس کی ایک طرف "محمد رسول اللہ" اور دوسری طرف "امر اللہ بالوفاء والعدل" منقوش تھا یہ بیان ابن خلدون اور مقریزی کا ہے لیکن آثاریین نے جو سکے برآمد کئے ہیں ان سے اس امر کی تصدیق نہیں ہوتی کہ یہ سکے گول تھے۔

(باقی)

نیاز فتحپوری ۔ چند تاثرات

پروفیسر سید احتشام حسین

یہ ۱۹۲۸ء کی بات ہے جب میں اعظم گڈھ (یوپی) میں آٹھویں نویں درجہ کا طالب علم تھا۔ شعروشاعری سے معمولی دلچسپی تو اس سے پہلے ہی پیدا ہو چکی تھی کیونکہ گھر پر اس کا چرچا تھا لیکن اعظم گڈھ کے دوران قیام میں کچھ ایسے ساتھی ملے جن کی صحبت میں اس پر جلا ہوئی۔ میرے خاص ساتھیوں میں سید فرید جعفری اور سید سعید جعفری تھے جو اس وقت پاکستان میں ممتاز زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان کے والد ڈاکٹر سید نجم الدین جعفری انھیں دنوں ڈپٹی کلکٹر کی حیثیت سے تبدیل ہو کر اعظم گڈھ آئے تھے اور ان دونوں بھائیوں کے نام وہاں کی مشہور درسگاہ ویسلی ہائی اسکول میں لکھے گئے تھے۔ میں وہاں دو تین برس پہلے سے پڑھ رہا تھا۔ ان کے آتے ہی تعلقات بڑھے اور مجھے پڑھنے کے لئے کتابیں ملنے لگیں۔ چونکہ ڈاکٹر جعفری خود ادبی ذوق کے مالک تھے اس لئے ان کے یہاں متعدد رسائل آتے تھے جنھیں دیکھنے کا موقع مجھے بھی مل جاتا تھا۔ میرا دوسرا ادبی مرکز دارالمصنفین کا کتب خانہ تھا جو میرے گھر سے بہت قریب تھا اور جن عزیزوں کے ساتھ میرا قیام تھا، ان کے ساتھ وہاں اکثر جانے کا موقع ملتا تھا، جہاں نہ صرف رسائل دیکھنے میں آتے تھے بلکہ ایک ادبی فضا بھی ملتی تھی جس میں سانس لے کر اپنی ادبی پیاس کے بجھنے اور بڑھنے کا احساس ہوتا تھا۔ ایک تیسرا ادبی اڈہ اور تھا جس کا خیال آتے ہی مجھے ڈاکٹر نذیر احمد کی توبۃ النصوح کی یاد آتی ہے۔ یہ خواجگان اعظم گڈھ کا ایک کھاتا پیتا گھرانا تھا جس کے بزرگ شہر میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اور جس کے نوجوان اپنے اپنے کمروں میں اپنے دوستوں کے ساتھ شطرنج، پچیسی، تاش اور شعروشاعری میں اپنا وقت گزارتے تھے۔ ان کے پاس چھوٹی چھوٹی لائبریریاں تھیں، جن میں ناول، داستانیں، دواوین اور رسائل کی تعداد زیادہ ہوتی تھی۔ اس سے پہلے میں زمانہ، نظام المشائخ، اور بعض مذہبی اخبارات ہی سے روشناس تھا، اس دوران میں نگار، پیمانہ، ہمایوں اور بعض دوسرے رسائل سے واقفیت ہوئی میری دلچسپیاں کھیل کود اور سیر و تفریح سے بہت کم تھیں اس لئے زیادہ وقت انھیں رسائل اور کتب کے درمیان گزرنے لگا۔ اسی زمانہ میں نگار اور نیاز صاحب کا جادو دل و دماغ پر چل گیا۔

فرید اور سعید جعفری (خاص کر فرید جو ہم سن تھے) کچھ لکھتے بھی تھے اور ان کی تحریریں بعض بچوں کے رسائل اور اخبارات میں چھپ جاتی تھیں، ان کے یہاں شاعروں اور ادیبوں کی آمد و رفت بھی رہتی تھی جنھیں دیکھنے کا موقع مجھے بھی مل جاتا تھا کیونکہ دوستانہ تعلقات کی وجہ سے میں بھی اس گھر کے ایک فرد ہی کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ ڈاکٹر جعفری مرحوم بے حد محبت فرماتے تھے اور ہم لوگوں کی چھوٹی چھوٹی ادبی بحثوں اور دلچسپیوں میں حصہ لیکر ہمت افزائی کرتے تھے۔ اسکول میں بعض ایسے اساتذہ (خاص کر مولوی محمد یوسف صاحب جو شبلی کے ہم وطن تھے اور مسٹر خان جو عیسائی ہو گئے تھے اور اردو شعروادب سے بڑی دلچسپی لیتے تھے بھی ملے جن کی نگاہ شفقت نے شعروادب سے دلچسپی لینے کے اور مواقع فراہم کئے۔ اس وقت اعظم گڈھ کا شہر تو چھوٹا اور معمولی سا تھا لیکن کچھ علمی روایات وہاں سے وابستہ ہو گئی تھیں۔ خود اس شہر میں مولانا اقبال سہیل، مرزا احسان بیگ، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا سلیمان ندوی کے قیام کی وجہ سے اکثر مشاعرے اور علمی صحبتیں ہوتی رہتی تھیں۔ اصغر گونڈوی اور جگر مرادآبادی اکثر آتے رہتے تھے۔ اپنی کم آمیزی کے باوجود میں ان محفلوں میں شریک ہونیکے مواقع نکال لیا کرتا تھا،

اور بڑی خاموشی سے اندر ہی اندر ایسا محسوس کرتا تھا کہ اگر ان سے دلچسپی نہ لوں تو صرف تعلیم ہی نہیں، زندگی بھی ادھوری رہے گی۔

خیر یہ داستان تو طویل ہے کہ میرے لئے وہ دُنیا کیا تھی لیکن اس کا تذکرہ اس لئے ضروری ہو گیا کہ نیاز صاحب کی تحریروں سے دلچسپی کے لئے جو فضا درکار تھی، وہ مجھے بالکل ابتدا ہی میں مل گئی۔ تھوڑے دنوں کے اندر ایک شاعر کا انجام، شہاب کی سرگزشت اور نگارستان (غالباً اس وقت تک یہی کتابیں شائع ہوتی تھیں) کے صفحے کے صفحے زبانی یاد ہو گئے۔ گفتگو میں اُن کی دلآویز ترکیبیں بے تکلفی سے استعمال ہونے لگیں اور گرد و پیش ایک ایسی فضا چھا گئی جس میں صرف رومانوں کا سحر تھا اور تخیل کی رنگین پُرکاری۔ یہ اچھی طرح یاد ہے کہ سنہ ۱۹۳۰ء میں جب اعظم گڈھ چھوٹا ہے تو اپنے ادبی شعور کے متعلق ایک غلط قسم کی خود اعتمادی پیدا ہو چکی تھی، مطالعہ اچھا خاصا لیکن سطحی تھا، پسند کی دُنیا محدود اور جذبات کے تابع تھی اور اس کا اظہار بھی واضح شکل میں نہیں ہوا تھا۔ آج یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اس عمر میں نیازؔ صاحب کے افسانوں سے اتنی دلچسپی کیوں تھی۔ نگار کے ملاحظات یا باب الاستفسار کیوں متوجہ نہیں کرتے تھے؟ یہ بھی اچھی طرح یاد ہے کہ مجھے سنہ ۱۹۳۰ء میں ہائی اسکول کا امتحان دینے کے بعد جب دو تین مہینے وطن میں قیام کا موقع ملا اور پڑھنے کے لئے وہ کتابیں اور رسالے نہ مل سکے جو اعظم گڈھ میں مل جایا کرتے تھے تو افسانہ نویسی کا شوق ہوا، جو کچھ لکھا وہ زندگی کے اُن تجربات اور گہرے مشاہدات کے بغیر جو نیاز صاحب کو حاصل تھے، انھیں کے افسانوں کا چربا تھا، اُسی قسم کے رومانوی عاشقانہ اور جذباتی قصے جو تخیل سے پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ یہ افسانے دو ایک دوستوں کے سوا نہ کسی نے پڑھے اور نہ کبھی شائع کرنے کے لئے محفوظ رکھے گئے۔ درحقیقت مزاج کی یہ رنگینی اور بیقراری صرف خیالوں تک محدود تھی، دل کے اندر جو طوفان اٹھتے یا اٹھ سکتے تھے اُن کے اظہار کے عملی ذرائع میرے گھر اور خاندان کے ماحول میں ممکن ہی نہ تھے شاید اسی وجہ سے نیازؔ کے افسانے اور زیادہ عزیز معلوم ہوتے تھے۔

سنہ ۱۹۳۰ء ہی میں الہ آباد آ گیا۔ فرید اور سعید جعفری بھی اتفاق سے یہیں پہونچ گئے اور پچھلی محفلیں ایک دوسری شکل میں پھر جمنے لگیں۔ جعفری بھائیوں کے بہت سے عزیز الہ آباد میں رہتے تھے، جن کا مشہور انوار احمدی پریس بھی تھا۔ کتابوں کی لالچ میں میرا بہت سا وقت وہاں گذرنے لگا۔ کتابیں خریدنے کی سکت نہ تھی، لائبریریاں پابندی سے کھلتی اور بند ہوتی تھیں اس لئے مانگے تانگے ہی کی کتابوں کا سہارا ہو سکتا تھا، فرید اور سعید کے عزیزوں میں ایک صاحب ضیاءالدین بھی تھے، میری ہی طرح خاموش طبیعت کے طالب علم اور پڑھنے کے رسیا، انوار احمدی پریس انھیں لوگوں کا تھا اس لئے وہاں کی اور بعض دوسرے مقامات کی شائع کردہ اردو کی کتابیں نہ صرف پڑھنے کے لئے بلکہ اپنے پاس رکھنے کے لئے آسانی سے ملنے لگیں، یہ سلسلہ کئی سال تک جاری رہا۔ یہیں پہلے پہل ضیاءالدین نے گیتان جلی کا وہ ترجمہ دیا جس میں نیاز صاحب کی ایک تصویر بھی شامل تھی جس کا مخصوص پوز گیتان جلی کے مترجم کے تصور سے تو مناسبت رکھتا تھا لیکن میرے ان خیالوں سے مختلف تھا جو میرے ذہن میں نیازؔ صاحب کے متعلق پیدا ہوا تھا۔

دو سال بعد جب میں یونیورسٹی میں پہونچا تو نیاز صاحب کے علمی اور تنقیدی مضامین بھی متوجہ کرنے لگے، دوستوں سے اُن کے خیالات اور عقائد کے متعلق بحثیں بھی ہونے لگیں، لیکن اُن کی انشا پردازی کا جادو اب بھی اپنا کام کرتا رہا، یہاں تک کہ اُس زمانے میں جو افسانے لکھے اُن میں نہ صرف ان کے انداز بیان کے نقل کرنے کی کوشش کی بلکہ خیالات اور واقعات کی ترتیب میں بھی انھیں کی پیروی کی۔ یہاں ایک دلچسپ واقعہ یاد آ گیا سنہ ۱۹۳۳ء کی بات ہے میں الہ آباد یونیورسٹی میں بی اے کا طالب علم تھا، گرمی کی تعطیل اعظم گڈھ کے ایک دیہات میں گذاری جہاں میرا وطن تھا، چھٹیوں میں گھومنا پھرنا، شکار اور تفریح میں وقت گذارنا، قرب و جوار کے دیہاتوں میں دور نکل جانا اور گویا اپنے خیال میں دوستوں کے ساتھ "رومانی زندگی" بسر کرنا ہی مشغلہ تھا۔ نہ دھوپ دھوپ تھی نہ لو لو۔ ایسے میں میں نے ایک افسانہ لکھا "ایثار"۔ آج کہہ سکتا ہوں کہ اس افسانہ میں محض ایک سطحی سا واقعہ افسانوی انداز میں پیش کیا گیا تھا لیکن اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس سے بہتر افسانہ نہ لکھا گیا ہے اور نہ لکھا جا سکتا ہے۔ دوستوں کو سنایا، کسی نے پسند کیا، کسی نے مذاق اڑایا، میں نے کہا جب یہ شائع ہو گا تو دیکھنا لوگ کیسی داد دیتے ہیں، کسی نے کہا اسے چھاپے گا کون؟ میں نے کہا جبھی اسے نگار میں شائع کراؤں۔ سب دوست ہنس پڑے کیونکہ نگار کے معنی تھے اردو کا سب سے اچھا اور معیاری رسالہ، اس میں کسی نو آموز طالب علم

کہ افسانے کے چھپنے کے معنی تھے، نیاز صاحب کی تنقیدی نگاہ میں اس کا کھرا ثابت ہونا۔ میں نے اُسے صاف کرکے نیاز صاحب کے پاس بھیج دیا اور سانس روک کر اس کی قسمت کا انتظار کرنے لگا۔ چند دنوں کے بعد نیاز صاحب کا لکھا ہوا خط، اُسی طرح جیسے وہ ہمیشہ لکھتے ہیں کارڈ کی لمبائی میں لکھا ہوا چند سطروں والا خط، آگیا، لکھا تھا افسانہ پسند آیا، فلاں مہینے میں نگار میں شائع ہوگا۔ افسانہ شائع ہو یا نہ ہو، یہ خط نکتہ چیں، حاسد مگر پیارے اور بڑے ظالم دوستوں کا منہ بند کرنے کے لئے کافی تھا۔ میری جیت ہوگئی تھی اور دماغ عرش معلّٰی پر پہونچ گیا تھا۔ افسانہ نیاز صاحب کو پسند آیا، اگر پسند نہ آتا تو نگار میں شائع کیوں کرتے۔ وہ مہینہ گذر گیا جس میں اس کے شائع ہونے کی بشارت تھی، نگار اپنے وقت پر نکلا لیکن اس میں اس افسانہ کا پتہ نہ تھا۔ پہلے حیرت ہوئی، پھر ندامت، پھر غصہ آیا اور نیاز صاحب سے ایک دلچسپ خط و کتابت شروع ہوئی۔

میں نے غصہ کو دباتے ہوئے جواب میں صرف یہ پوچھا تھا کہ میرا افسانہ جو حسب وعدہ اس مہینے میں نگار میں شائع ہونے والا تھا کیوں رہ گیا؟ بالکل ویسا ہی کارڈ جواب میں آیا تھا کہ میں نے اس وقت جلدی میں لکھ دیا تھا، بعد میں جب غور سے دیکھا تو اس میں بعض فنی خامیاں نظر آئیں، آپ میں افسانہ نگاری کی صلاحیتیں بدرجۂ اتم موجود ہیں اور افسانے لکھئے اور مجھے بھیجئے۔ بڑی تکلیف ہوئی۔ میں نے لمبے لمبے خط لکھے، نیاز صاحب نے مختصر جواب دیئے اور آخر کار غالباً عاجز آکر انھوں نے یہ لکھا کہ افسانہ اگلے شمارے میں شائع کر رہا ہوں۔ یہ خط طویل، مشفقانہ اور ناقدانہ تھا۔ جو جملہ یاد رہ گیا ہے وہ یہ ہے کہ "افسانہ سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ بنا کر پیش کرنے کا نام ہے"۔ یہ میری اس بات کے جواب میں تھا کہ اس افسانہ کے سارے واقعات صحیح ہیں اور اگر کوئی ایسی فنی خامی نہیں ہے جو اسے افسانہ ہی نہ بننے دے تو آپ اسے شائع کیوں نہیں کر سکتے۔ اور اگلے مہینے میں وہ افسانہ چھپ گیا پھر میرے چند افسانے نگار میں شائع ہوئے، غالباً نیاز صاحب ان افسانوں کو پسند کرتے تھے۔

۱۹۳۵ء میں میں کسی ضرورت سے لکھنؤ گیا تو شوق کھینچ کر نیاز صاحب کے یہاں بھی لے گیا۔ یہ پہلی ملاقات تھی، ایک بزرگ کی ایک خورد سے اور ایک مشہور ادیب کی ایک طالب علم سے۔ نیاز صاحب نے ہمت افزائی کے انداز میں نگار کے سالنامہ (ہندی شاعری نمبر) کے لئے مضامین کی فرمائش کی اور میں نے تعمیل کی، مجھے معلوم تھا کہ نیاز صاحب عام طور سے اپنے رسالہ کے لئے مضامین کی فرمائش نہیں کرتے، وہ افسانے، ڈرامے تنقیدی مضامین، علمی مقالات، لطائف اور چٹکلے، نظم اور غزل، تاریخی، سیاسی، سائنٹیفک مضامین سب کچھ خود لکھ سکتے ہیں اور جب ضرورت ہوتی ہے تو پورا رسالہ اپنی ہی تخلیقات سے بھر سکتے ہیں، اس لئے اُن کے فرمائش کرنے کے معنی رسالہ کے مدیر کی رسمی فرمائش نہیں ہو سکتی، اس خیال نے خود اعتمادی میں اضافہ کیا، جس کی اس وقت بڑی ضرورت تھی۔ اسی زمانے میں (غالباً ۱۹۳۶ء) ایک اور پر لطف واقعہ پیش آیا۔

محمود فاروقی صاحب جو ان دنوں کہیں پاکستان ہی میں ہیں، گھر کی فضا سے کچھ بددل ہو کر اور طالب علمی کی زندگی کو خیرباد کہہ کر قسمت آزمائی کے لئے الٰہ آباد آئے، اُن کے پاس کچھ روپے تھے جسے وہ کسی تجارت میں لگانا چاہتے تھے۔ یہاں اُن کی ملاقات طالب الٰہ آبادی صاحب، وقار عظیم صاحب (دونوں پاکستان میں ہیں) اور راقم الحروف سے ہوگئی۔ یہ ملاقات اچھی خاصی دوستی اور بے تکلفی میں تبدیل ہوگئی اور انہوں نے طے کیا کہ ایک رسالہ نکالیں گے اور کتابوں کی اشاعت کا کاروبار کریں گے۔ رسالہ کا نام "انیس" طے ہوا، سرپرست سر شاہ محمد سلیمان (چیف جسٹس ہائی کورٹ الٰہ آباد) اور سر تیج بہادر سپرو قرار پائے، اڈیٹر طالب صاحب اور محمود فاروقی (جو ان دنوں اپنا نام شفاعت محمود طالبی لکھنے لگے تھے) قرار پائے اور پہلا نمبر بڑے اہتمام سے نکلا۔ ہم سب کی تصویریں تھیں اور مضامین۔ رسالہ صاف ستھرا اور خوبصورت چھپا تھا اور میں نے اس کے لئے خاص طور پر ایک افسانہ لکھا تھا جس کا عنوان تھا "دوسرا نکاح"۔ یہاں اتنی بات عرض کردوں کہ ٹھیک اسی زمانے میں ترقی پسند تحریک شروع ہوئی تھی اور میں اس کا سرگرم ممبر بن گیا تھا، افکار و خیالات میں زبردست انقلاب آرہا تھا، مطالعہ کے موضوعات بدل گئے تھے، ادبی اقدار کا تصور بدل گیا تھا اور کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اندھیرے سے روشنی میں آگیا ہوں، خود نیاز صاحب کی تحریروں پر تنقیدی نگاہ پڑنے لگی تھی اور خالص پرستاری اور استحسان کے جذبے میں ہوش و حواس کے ساتھ ردّ و قبول کی آزادی کا جذبہ بھی شامل ہوگیا تھا۔ ایسے میں جو افسانہ لکھا جائے اس میں بعض ایسی باتوں کا ہونا ضروری تھا

جو کچھ لوگوں کو غیر رسمی اور انقلابی "معلوم ہوں۔ لیکن ہوا یہ کہ اس سے ہماری مومن برادری کے کچھ کم پڑھے لکھے پرجوش نوجوان اس قدر برانگیختہ ہوئے کہ مجھے مارنے اور قتل کرنے کی دھمکیاں دینے لگے۔ مہینوں یہ سلسلہ جاری رہا۔ رسالہ انیس کے دفتر میں آگ لگا دی گئی اور محمود فاروقی صاحب کے ساتھ بہتان روا برتاؤ کیا گیا، یہاں تک کہ اگلے مہینہ میں انھیں معافی نامہ شائع کرنا پڑا۔ اس افسانہ میں کوئی ایسی بات نہ تھی لیکن آل انڈیا مومن کانفرنس کی بیداری کا زمانہ تھا اور الہ آباد اس کا مرکز تھا اس لئے جوشِ عمل نے یہ صورت بھی اختیار کرلی۔ رسالہ یہ چوٹ کھا کر تھوڑے دنوں میں بند ہو گیا اور محمود فاروقی نے الہ آبا چھوڑ کر علی گڑھ یونیورسٹی میں نام لکھا لیا۔ کہنا صرف یہ تھا کہ جب یہ واقعات ہو رہے تھے میں نے ساری خط و کتابت اور افسانہ کی نقل نیاز صاحب کو بھیج دی اور لکھا کہ جب یہ صورت ہو تو افسانے کیا لکھوں! موصوف نے جواب میں لکھا کہ تم نے غلطی کی جو ایسا افسانہ وہاں چھپوایا، ایسی ساری چیزیں نگا کو بھیج دیا کرو، میں ایسے معرکے روز ہی جھیلا کرتا ہوں — اس جملہ میں نہ صرف بڑی بلاغت ہے بلکہ نیاز صاحب کے افکار و خیالات کے ارتقاء کی پوری داستان پوشیدہ ہے۔ سرسید کی اصلاحی اور ترقی پسندی کی انقلابی تحریکوں کے درمیان جس قسم کی عقلیت پرستی اور روایت شکنی کی نمو ہوئی اس کی سب سے نمایاں مثال نیاز فتحپوری ہیں۔ مذہب، اخلاقیات، معاشرت اور ادب کے وہ پہلو جو سرسید، حالی، آزاد، نذیر احمد چراغ علی، شبلی اور ان کے معاصرین کے زیرِ فکر آئے تھے یہ انھیں کا ارتقائی تسلسل تھا جو نیاز، سجاد حیدر یلدرم، ابوالکلام آزاد، مہدی افاد سجاد انصاری اور بعض دوسرے ادیبوں کے یہاں ظہور پذیر ہوا۔ اصلاحی طور پر اسے رومانی اندازِ نظر سے تعبیر کیا جا سکتا ہے لیکن درحقیقت یہ ایک نئے قسم کے اعتزال اور شاعرانہ جمال پرستی کے وفور کا نتیجہ تھا۔ نیاز صاحب کے غور و فکر کے اصل مراکز مذہب اور ادب تھے، جو یوں تو الگ الگ رہتے ہیں لیکن ان کے طرزِ فکر میں آزادیٔ خیال کی منزل پر پہونچ کر یکجائی حاصل کر لیتے ہیں۔ ان کے یہاں یزداں اور اہرمن پر مذہب کا کوئی عکس نہیں پڑتا تھا جیسا کہ آج کی بعض اسلامی تحریکوں کا تقاضہ ہے۔ اُن کے یہاں یزداں اور اہرمن دونوں کے جلال و جمال سے محبت کرنے کی رومانی اور وجدا خواہش موجود تھی لیکن وہ دونوں کو اپنے ہی انداز میں دیکھنے پر مُصر تھے۔ جب انہوں نے اپنے کسی دوست کو خط میں یہ لکھا تھا کہ آپ اگر حج کو جا رہے ہیں تو ذرا اسلامی ممالک کی سیر بھی کر لیجئے گا اور اگر آرمینیا بھی جانے کا موقع ملے تو وہاں سے میرے لئے کسی حور وش کی تصویر لیتے آئیے گا لیکن اس کا ضرور خیال رکھیئے گا کہ وہ تصویر آب زمزم سے دُور ہی رہے کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کے چھلکنے سے خراب ہو جائے، تو یہ محض شوخیٔ تحریر کا تقاضا نہیں تھا اس میں نیاز کا ذہن بھی منعکس ہو رہا تھا۔ انہوں نے روایتی مذہب کے بعض پہلوؤں کی جس طرح مخالفت کی اس کی ایک شکل روایتی تصوف کا بھیس بدل کر رونما ہو سکتی تھی اور اس کی موجودگی دنیا کے اکثر رومانی ادیبوں کے یہاں دیکھی جا سکتی ہے لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ ادب میں تصوف کی آمیزش بھی نیاز صاحب نے پسند نہیں کی۔ اس حقیقت کا صحیح ادراک اسی وقت ہو سکتا ہے جب ہم انکی عقلیت پسندی کا تجزیہ کریں۔ جو شخص بھی نیاز صاحب کی علمی تحریروں اور افسانوں کا مطالعہ کرے گا اسے سب سے بڑی الجھن کا سامنا اس وقت ہو گا جب وہ ان کے مذہبی اور فلسفیانہ مضامین میں حکمت کی کارفرمائی دیکھے گا اور افسانوں میں جنوں کی، جب وہ انھیں عقل اور دل دونوں سے آنکھ مچولی کھیلتا ہوا پائے گا۔ ان کے مضامین مدلل، تحقیقی، خیال اور معلومات سے پُر ہیں اور افسانے تخیلی، رومانوی، جذباتی اور انشائی حُسن سے معمور۔ سطحی نظر سے دیکھنے والوں کو یہ باتیں تضاد کی حامل نظر آئیں تو کوئی تعجب نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں باتیں بیک وقت ایک پُرشور رومانی شخصیت کی خصوصیت ہو سکتی ہیں اور ان میں رشتہ قائم کرنے والے عناصر روایت شکنی، جدت، انفرادیت اور آزادیٔ خیال کے روپ میں پہچانے جا سکتے ہیں۔

یہ باتیں ۱۹۳۶ء میں تو شاید میرے پیشِ نظر نہ رہی ہوں لیکن کچھ دنوں کے بعد نیاز صاحب کی ادبی اہمیت کا اندازہ ہونے لگا تھا، ایک نئی منز کی طرف بڑھتے ہوئے ملک اور نئے سانچوں کی تلاش میں جد و جہد کرتے ہوئے ادب میں ان خصوصیات کا پیدا ہونا ان تاریخی، سیاسی اور سماجی حالات میں بڑی آسانی سے سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ نیاز صاحب یہی تاریخی فرض انجام دے رہے تھے۔ اسی لئے ترقی پسند تحریک کے مورخ اس حقیقت کو نظر اندا نہیں کرتے کہ رومانی، جذباتی اور تاثراتی اندازِ نظر رکھنے کے باوجود نیاز صاحب نے ادب اور فکر کو وہ بے باکی سکھائی جس کے بغیر نئے لکھنے والوں کے قلم میں

وہ شوخی اور قدم میں وہ طاقت مشکل سے آسکتی تھی جس کی اس وقت ضرورت تھی۔

دو سال بعد جب لکھنؤ یونیورسٹی میں میرا تقرر ہوگیا تو نیاز صاحب نے بڑی مسرت کا اظہار کیا اور مجھے بھی اس سے بڑی تقویت تھی کہ نیاز صاحب میری ادبی زندگی میں دلچسپی لیتے ہیں۔ حالانکہ اس بات کا اظہار کر دینا ضروری ہے کہ اُن کی بزرگی کے احترام اور اُن کے ادبی کارناموں کی عزت کرنے کے باوجود اُن کے خیالات سے اختلاف بھی ہوتا رہتا تھا لیکن وہ نہ تو کبھی ذاتی تعلقات کے درمیان میں حائل ہوا اور نہ کبھی اس نے کوئی نامناسب شکل اختیار کی۔ بعض دوست کبھی کبھی یہ کہتے تھے کہ تم نیاز صاحب کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتے ہو حالانکہ اُن کا علم انسائیکلو پیڈیا اور معلومات کی عام کتابوں تک محدود ہے۔ مجھے اس سے بڑی تکلیف ہوتی تھی اور میں انہیں جواب دیتا کہ تنقید، انشائیہ، افسانہ اور ناول میں اُن کی خدمات اتنی ہیں جو انھیں زندہ جاوید بنانے کے لئے کافی ہیں، نگار محض ایک رسالہ نہیں ایک ادارہ ہے جس نے ہزارہا ذہنوں کی تشکیل کی ہے اور نیاز صاحب کی حیثیت ایک معلّم کی ہے، اگر اُن کی مذہبی، تاریخی، علمی معلومات صرف چند لغات یا انسائیکلو پیڈیا تک محدود ہیں تو اردو کے ادیبوں میں کون ہے جو اس سے زیادہ جانتا ہے، بعض لوگوں کو تو یہ بھی نہیں معلوم ہوگا کہ کسی سوال کا جواب کہاں اور کس قسم کی کتابوں میں تلاش کیا جائے اور میں انھیں نیاز صاحب کا احترام کرنے پر مجبور کرتا۔

لکھنؤ کے بائیس تئیس سال کے قیام میں نیاز صاحب کی شخصیت کے بہت سے پہلو سامنے آئے، بہت سی خوبیوں اور خامیوں پر نظر کی گئی، اس کا ذکر کسی دوسری صحبت میں ہوگا۔

* * *

لکھنؤ کی شاعری میں الفاظ کی طلسم بندی، کنگھی، چوٹی، انگیا، آنچل، آرسی، سرمہ، بے معنی صنائع و بدائع اور اسی قسم کی بہت سطحی و غیر سنجیدہ خصوصیات کے پیدا ہونے کا سبب یہی تھا کہ اُس وقت کی زندگی ہی ایک جھوٹی زندگی تھی اور رات دن اُن کو انھیں چیزوں سے واسطہ تھا اور انھیں پر اُن کے تسلط کی بنیاد قائم تھی، ان کی شاعری کا موضوع عہد وحشت کی وہ عورت تھی جب اس سے صرف ہوس رانی کا کام لیا جاتا تھا اور جس کو اسباب آرائش و زیبائش کی دوسری کم مایہ جنسوں کی طرح قابل بیع و شریٰ جنس قرار دے دیا گیا تھا، لکھنؤ کی سرزمین میں قصر شاہی سے لیکر فقیر کے جھوپڑے تک یکساں طور پر جذبۂ شہوت پرستی کارفرما تھا، نہ فرمانرواؤں کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس رہ گیا تھا اور نہ رعایا کو تحسین تمدن کا، ہر شخص اپنی جگہ عیش کوشی و نشاط اندوزی میں مصروف و منہمک تھا اور نسائیت جو معیت زندگی کا لازمی نتیجہ ہے بلا تفریق ہر طبقہ کے مردوں میں پیدا ہوتی جا رہی تھی، سرکار انگریزی نے شاہ و رعایا سب سے عسکری روح چھین لی تھی اور اُن کے جذبات عزّت و شجاعت کو صرف بیٹر بازی، کنکوے بازی اور تیتر بازی میں تبدیل کر دیا تھا اور وہ بالکل غیر معلوم و غیر محسوس طور پر انسانیت کی اس نیچی سطح پر آرہے تھے جو حیوانیت تک پہونچنے کے لئے حد فاصل درمیان نہیں رکھتی۔"

(نیاز)

* * *

نیاز فتحپوری سے نیاز

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی

نیاز صاحب یا "نگار" (کیونکہ نیاز صاحب نگار ہیں اور نگار نیاز ـــ شہر لکھنؤ کی ذہنی زندگی کے عجائبات میں سے ہے۔ اونچے طبقے میں صاحب علم اور صاحب ذوق ہونیکی پہچان یہ بھی تھی کہ نگار کا خریدار ہو اور نیاز صاحب کی رایوں پر بحث کر سکتا ہو۔ نگار محض ادبی جریدہ نہیں بلکہ ایک ادارہ ایک رجحان اور ایک قدر تھا۔ نگار کا نام ندوۃ العلما، سلطان المدارس اور لکھنؤ یونیورسٹی کے ساتھ لیا جاتا تھا اور نگار میں مضمون چھپ جانا ویسا ہی تھا جیسے کہ ان علمی اداروں سے سند مل جائے۔ چنانچہ جب ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی نے مجھ سے کہا "نیاز صاحب نگار کا انتقاد نمبر نکال رہے ہیں، تم یورپ میں تنقید کے ارتقاء پر ایک مضمون لکھ دو۔" تو میں اچھل پڑا۔ "ارے بھئی نگار میں مضمون اور میں اور پھر مجھے اردو لکھنا بھی نہیں آتی، تم جانتے ہو کہ میں انگریزی میں ہی لکھتا رہا اور اب تک اردو کا ایک جملہ بھی سیدھا کھڑا نہ کر پایا۔" نور صاحب خاموش ہو گئے، مگر کچھ دن بعد پھر بولے "نیاز صاحب نے کہا ہے جیسی بھی اردو لکھ سکتے ہوں ویسی اردو میں لکھ دیں ہم ٹھیک کر لیں گے۔" اور میں نے اردو میں لکھنے کی کوشش شروع کر دی اور مضمون لکھ ڈالا۔ وہ مضمون اردو میں یہاں تک تھا کہ جو اردو میں گھر میں بولتا آیا تھا اسے لکھنے کی کوشش کی گئی تھی۔ مگر اس میں فقرے، الفاظ اکثر جملے انگریزی کے تھے۔ یہ مضمون لیکر میں نیاز صاحب کے پاس گیا اور نہایت انکساری سے عرض پرداز ہوا۔ "مجھے اردو بالکل نہیں آتی۔" نیاز صاحب نے مضمون پر نظر ڈال کر کہا "کیا ہے آجائیگی، انگریزی میں لکھنے کی کافی مشق ہے اور پھر اردو آپ کی مادری زبان ہے آخر۔" یہ بات نیاز صاحب نے ایسے لہجہ میں اور اس اطمینان کے ساتھ کہی کہ مجھے ایک قسم کا یقین ہو گیا کہ میں بھی اردو لکھنے لگ جاؤں گا۔ جب میں واپس آرہا تھا تو مجھے خیال آیا کہ نیاز صاحب سچ مچ زوردار ہستی کے مالک ہیں اور ان میں وہ قابلیت ہے جس سے دوسرے کے دل میں اعتماد پیدا ہو جائے۔ یہ میری نیاز صاحب سے پہلی ملاقات تھی۔ میں نے انہیں خود اعتمادی کا مجسمہ پایا اور ان سے مل کر مجھ میں بھی ایک مخصوص اعتماد کی لہر دوڑ گئی۔ میرا وہ مضمون انتقاد نمبر کا سب میں پہلا مضمون تھا۔ اس امر نے بھی میرے اعتماد کو ترقی دی۔ میں نے اس مضمون کو پڑھا اور یہ محسوس کیا کہ میری انگریزی زدہ اردو کو کس آسانی سے مستند اردو میں تبدیل کیا جا سکتا ہے اور مجھے یہ شوق ہوا کہ اردو میں بھی لکھوں۔ اب سے میں نیاز صاحب کے پاس ہر دوسرے تیسرے جاتا رہا۔ ان سے مختلف قسم کی باتیں کرنے ہی سے ان کی ہستی کا اثر مجھ پر غالب آتا رہا۔ ایک دن باتوں باتوں میں میر انیس کا ذکر آیا اور انگریزی کی ایک اور ڈرامائی شاعری سے مراثی کے تعلق تک بات پہونچی۔ میں نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ نیاز صاحب نے فرمایا "انکو لکھتے کیوں نہیں" میں ہچکچایا۔ وہ کہنے لگے "جیسے بھی ہو لکھ لکھ کر مجھے دیتے رہیں، میں دیکھ لونگا" چنانچہ آٹھ مہینے تک میں مرثیہ نگاری اور میر انیس کے حصے لکھ لکھ کر نیاز صاحب کو دیتا رہا۔ اور وہ ضروری اصلاح کے بعد انہیں نگار میں چھاپتے رہے۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں یکدم سے مشہور ہو گیا۔ اردو کے جرائد میں میرا ذکر ہونے لگا۔ اردو کے پروفیسر میری رایوں پر اظہار خیال کرنے لگے۔ لکھنؤ میں مرزا جعفر علی خاں اثر نے طویل الرد لکھی جو مجھے انجمن ارباب ذوق کی ایک نشست میں بلا کر سنائی گئی۔ شہر لکھنؤ میں مجھے قاتل انیس کا لقب دیا گیا اور ایک روز میری موٹر کو گھیر کر مجھے اچھی طرح مارنے کی بھی کوشش کی گئی۔ کچھ عرصے میں وہ ہنگامہ فرو ہو گیا، مگر اس سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے اردو لکھنا آگئی۔ یہ سب نیاز صاحب کا کرشمہ تھا۔ میں نے انہیں استاد مانا اور ہمیشہ مانتا رہوں گا۔ مجھے محسوس ہوا گویا وہ ہاتھ پکڑ کر مجھے اردو ادب میں گھسیٹ لائے سہارا دیکر بٹھایا اور اس مقام پر پہونچایا کہ میری تصانیف کی کوئی وقعت ہو یا نہ ہو میں اردو کا نمایاں مصنف ضرور ہو گیا۔

ساتھ ہی ساتھ نیاز صاحب کی زوردار انفرادیت نے مجھ پر ایک اخلاقی یا روحانی اثر بھی کیا۔ میں ان کے یہاں اس طرح جاتا رہا جیسے پرانے زمانے میں مرید لوگ

اپنے پردوں کے یہاں جایا کرتے تھے۔ ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی خاص ادبی مسئلہ پر بات چیت ہوتی اور نیاز صاحب کی ہستی کے کوئی نہ کوئی پہلو پر روشنی پڑتی۔ نیاز صاحب مجھے اپنی تصانیف دیتے رہے اور میں ان کے پڑھنے کے بعد ان پر اپنی رائیں دیتا رہا۔ اس طرح مجھے ان کی علمی اور ادبی حیثیت کا پورا اندازہ ہو گیا۔ ان کی کتابیں ہر علم اور ادب کے ہر شعبہ سے تعلق رکھتی تھیں اور مجھے یہ محسوس ہوا کہ ایک Encyclopaedist ہیں۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے ہمارے جدید اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم نہیں پائی مگر وہ تمام مضامین جو ان سب اداروں میں لاحاصل طریقہ پر زیر درس لائے جاتے ہیں، نیاز صاحب کی نظر میں اس طرح سے آئے کہ انہوں نے ان سے متعلق بہترین کتابوں کا مطالعہ کیا اور پھر ان پر اپنی انفرادی نظر ڈال کر انہیں اس طرح پیش کیا کہ ایک طرف وہ ان کا اپنا علم معلوم ہوتا ہے اور دوسری طرف اردو داں طبقہ کے مذاق اور سمجھ کے مطابق ہو گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ نیاز صاحب کی مختلف موضوعات پر کتابیں ہمیں علمی اداروں سے زیادہ علم سے قریب لے آتی ہیں۔ مثلاً جنسی نفسیات پر ان کی کتاب "شہوانیات" بظاہر تو ہمیں وہ سب کچھ دیتی ہیں جو اس موضوع پر انگریزی کتابوں میں بھی ملتا ہے۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس میں جدید ترین نظریات کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی ہے مگر جس عمدہ طریقہ پر اس کتاب میں جنسی نفسیات کے بنیادی اصول ہمارے سامنے لائے گئے ہیں وہ ہمیں کہیں اور نہیں ملتا۔ ہر علم کے سلسلے میں انکی خاص قابلیت "اپنانا" جو جدید تعلیم سے حاصل ہو جانا ضروری نہیں۔ یہ ایک انفرادی اور خداداد صفت ہے۔ اسکی بنا پر نیاز صاحب کی سب علمی کتابیں ان کی بالکل اپنی معلوم ہوتی ہیں۔ انہیں پڑھتے وقت یہ محسوس ہوتا ہے کہ ایک مخصوص روشنی جو ہمیں پہلے کہیں نہیں دکھائی دی تھی علمی مسائل پر اس طرح پڑ رہی ہے کہ ان کی باریکیاں ہمارے سامنے آتی چلی جا رہی ہیں رہے ان۔ Popularizer کی بھی قابلیت کا زبردست مظاہرہ ہوتا ہے اس دور میں علم کے لئے اس قدر مواد جمع ہو گیا ہے کہ ہر علم کچھ مخصوص لوگوں کا ہوا جا رہا ہے۔ اس لئے یورپ کے مصنفین نے یہ ضرورت محسوس کی کہ علوم پر عام فہم کتابیں دلکش طرز پر لکھیں۔ برنارڈ شا، ایچ جی ویلز تک نے تاریخ اقتصادیات۔ سیاسیات۔ سائنس وغیرہ پر ایسی کتابیں چھوڑی ہیں جو نیاز صاحب کی علمی کتابیں بھی اس دائرے میں آتی ہیں۔ یہ بھی مصنف کی علمی دلچسپ کا علم کو دلچسپ بنانے کی قابلیت کا اظہار کرتی ہیں اور اس طرح جدید اردو ادب میں بڑا اہم اضافہ ہیں۔ علمی کتابیں جلد فرسودہ ہو جاتی ہیں کیونکہ علم آجکل بڑی تیز رفتار سے بڑھ رہا ہے۔ نیاز صاحب کی کتابوں میں بھی اکثر جگہ جدید ترین اضافے معدوم نظر آتے ہیں مگر یہ کمی نگار سے پوری ہو جاتی ہے جس میں ہر علم کے جدید ترین مسائل اور نظریوں پر نیاز صاحب کے مضامین نکلا کرتے ہیں۔ ان سب کو ملا کر اگر دیکھا جائے نیاز صاحب ایسے انفرادی قسم کے عالم اور معلم معلوم ہوتے ہیں جیسا کہ ہمارے یہاں اب تک شاید ہی کوئی ہوا ہو۔ وہ ہمارے ادب کی پہلی ہستی ہیں جنہوں نے علم کو کتب خانوں اور مکتبوں سے باہر لا کر شاہراہ عام پر کھڑا کیا اور ہر فرد بشر کو اس کی روشنی سے لطف اندوز ہونے کا سامان بہم پہونچایا۔ کچھ عرصے ہوا کہ لکھنؤ کے ایک ناشر نے مجھے بتایا کہ سب سے زیادہ کتابیں نیاز صاحب کی بکتی ہیں۔ مجھے تعجب ہوا کہ محض علمی کتابیں عامیانہ ناولوں سے زیادہ کیونکر بک سکتی ہیں۔ مگر پھر بھی مجھے احساس ہوا کہ نیاز صاحب میں مقبول ہونے کی کتنی قابلیت ہے۔ اور جس سے انہوں نے قوم کو کس قدر فائدہ پہونچایا ہے۔ اگر اسی بنا پر ان کی جتنی قدر کی جائے کم ہے۔

مگر میری نگاہ میں نیاز صاحب ایک مذہبی عالم کی حیثیت سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں پرانے مذہبی لوگ انہیں برا کہتے ہیں۔ یہ کوئی بات نہیں ہے ایسا ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی "من و یزداں" والی جلدیں بڑی اہم ہیں۔ مجھے انہوں نے یہ سب جلدیں دیں اور میں نے ان سب کو پڑھا۔ ان میں زیادہ تر مضامین ان غلط فہمیوں کو صحیح کرنے کے لئے لکھے گئے تھے جو ہمارے یہاں کم علمی اور توہم پرستی کی وجہ سے عام ہو گئی ہیں۔ نیاز صاحب نے ان پر عقل اور فلسفہ کی روشنی ڈالی ہے۔ فرد فرد مضامین سے زیادہ میں پوری تصنیف کے مجموعی اثر سے مرعوب ہوا۔ یعنی نیاز صاحب کی ہستی کے مذہبی پہلو سے، اسلام اخلاقی مذاہب میں سے ہے اور محض عقائد سے زیادہ عمل الصالحات پر زور دیتا ہے۔ ہمارے یہاں آخرالذکر کو پس پشت ڈال کر اول الذکر جس عوامی اور توہم پرست طریقہ پر برتا جا رہا تھا اس کے خلاف — نیاز صاحب نے قلم اٹھایا۔ مشہور واقعہ ہے کہ انہوں نے اسلام کے مختلف فرقوں کے پچاس عالموں کے نام خطوط بھیجے اور دریافت کیا کہ نیک عمل کافر اور بدعمل مسلمان، ان دونوں میں سے کون بخشا جائے گا۔ سب عالموں نے یہی جواب دیا۔ کہ مسلمان بخشا جائے گا چاہے وہ کتنا ہی بدعمل ہو۔ اس معاملہ پر نیاز صاحب نے میری بھی رائے لی۔ اور میں نے بھی یہی رائے دی کہ مسلمان ہی بخشا جائے گا۔ عرصہ گزر گیا۔ میں لکھنؤ سے کراچی آیا اور یہاں پر مسلمانوں کے عمل کی جن جن صورتوں

سے دوچار ہوا ان سب نے مجھے نیاز صاحب کا استدلال یاد دلایا۔ اس سال جب نیاز صاحب کراچی آئے اور میں ان سے ملنے گیا تو پہلی بات جو میں نے ان سے کہی وہ یہ تھی کہ اس معاملے میں میں اب بالکل آپ کی رائے پر آگیا ہوں۔ اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ مذہب کے سلسلے میں نیاز صاحب کتنی بلند نظر رکھتے ہیں۔ کیونکہ وہ مجموعۂ اخلا غیر مسلم کو بداخلاق مسلم سے زیادہ بخشش کا اہل سمجھتے ہیں۔ اس لئے مسلمان انہیں مسلمان کہنے سے انکار کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مسلمان کو اخلاق و عمل سے کو غرض نہیں ہے محض پارٹی بندی اور چار آنے کی ممبری ہی خدا کے یہاں بھی چلے گی۔ کیونکہ میں مسلمانوں میں پیدا ہوا تھا میں بھی لاشعوری طور پر اس بات پر عقی کرتا تھا اور اس کو صحیح ثابت کرنے کے لئے عقل اور دلائل سے کام لیتا تھا، مگر مسلمانوں اور مذاہب کا اور قریب سے مطالعہ کرنے پر میں نیاز صاحب کی رائے سے زیادہ سے زیادہ قریب آتا گیا۔ غرض میں نیاز صاحب کو بڑے کھرے مسلمانوں میں سے ایک سمجھتا ہوں۔ ایک دفعہ میں نے ان سے دریافت کیا کہ آپ کے مذہب کی کیا تعریف کی جائے تو انہوں نے کہا "میں بالکل سنّی مسلمان ہوں اس سے نہ کچھ زیادہ نہ کم۔" اور اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ خالص سنّیت کی مثال بتاؤ تو میں نیاز صاحب کا نام لے دوں گا۔ انکی سنیت وہی ہے جو مولانا روم کی ہے یعنی کامل غیر جانب داری۔ مذہب بندی اور فرقہ بندی سے بالاتر۔ ایک دفعہ میں نے نیاز صاحب سے پوچھا کہ محمد صلعم کے جانشین کی بابت آپ کی کیا رائے ہے۔" انہوں نے اپنے زوردار طریقہ پر کہا۔ "رسول اللہ صلعم علی کو اپنا جانشیں بنانا چاہتے تھے اور علی ان کے مناس جانشین ہوتے۔" میں نے کہا "پھر حضور صلعم نے صاف صاف اس طرح پر علی کو اپنا جانشین کیوں نہ بنایا جیسا کہ اکبر مرتے وقت جہانگیر کو بنا گیا تھا۔ نیاز صاحب نے کہا "اس کے حالات سے آپ واقف نہیں ہیں۔ عربوں کے حالات ایسے ہو گئے کہ اگر اکبر کا سا قدم اٹھایا جاتا تو اسلام میں رخنے پڑ جاتے۔" میں نے کہا مگر ا معاملے میں آپ شیعہ نقطۂ نظر سے بہت قریب ہیں۔" وہ بولے "آپ کی طرح میں اسے مذہب کا جزو نہیں سمجھتا۔ آپ کے لئے علی کی ولایت مذہب کا حصہ بغیر اس کو مانے مذہب پورا نہیں ہوتا۔ میرے لئے اللہ اور رسول اللہ سے آگے اور کچھ ماننا ضروری نہیں ہے۔ چنانچہ اکثر ان سے رسول اللہ کے بابت بھی باتی ہوئیں۔ اور انہوں نے ہمیشہ آنحضرت کو کامل ترین انسان مگر انسان بتایا۔ خدا کے بابت بھی بڑی دلچسپ باتیں رہیں۔ وہ خدا کے بابت ہر قسم کے نظریات سے بہت اچھی طرح واقف نظر آئے مگر اسی سلسلے میں ایک روز انہوں نے عرفی کا یہ شعر پڑھا۔

؎ حد کنہ تو بادراک نہ شاید دانست وین سخن نیز باندازۂ ادراک منست

اور بولے "پہلا مصرعہ تو کچھ نہیں دوسرا مصرع کمال ہے۔ بات اسی دوسرے مصرع سے بنتی ہے۔" اور پھر مذہب سے ادب کی طرف گریز ہو گیا۔ عرفی پر باتی ہونے لگیں۔ عموماً میرے اور نیاز صاحب کے درمیان موضوع بات چیت ادب ہی ہوتا تھا۔ مذہب۔ سیاسیات۔ گھریلو باتیں اور بزنس بھی باتوں میں آ جاتا تھا۔ مگر خدا پر عقیدہ کے سلسلے میں میں نے بہت پڑھا بہت سوچا اور بہت بحث کی۔ لیکن آخر کار مجھے نیاز صاحب کا یہ شعر سنانا یاد آتا ہے اور ان کا اس بات پر زور کہ خاص بات دوسرے مصرع میں ہے۔ اس سے آگے کوئی شاعر نہیں جا سکا" اور پھر میں ادب کی طرف آجاتا ہوں جو میرا مخصوص دائرہ ہ اور جو نیاز صاحب کا بھی اتنا ہی مخصوص دائرہ ہے۔

انکی فطرت کی ہمہ گیری جیسی علم کے سلسلے میں نمایاں ہوئی ویسی ادب کے سلسلے میں بھی مجھ پر روشن ہوئی۔ نیاز صاحب نے شاعری بھی کی مگر اپنی شاعری کو میرے سامنے کبھی اہمیت نہیں دی —— تاہم، نقاد کی حیثیت سے وہ اس وقت تمام نقادوں سے آگے نظر آئے۔ شعر کی پرکھ، الفاظ کی خوبی کی پہچان، فصاح اور بلاغت کے مذاق میں ان سے آگے مجھے کوئی نقاد نہ دکھائی دیا۔ انہوں نے مجھے "انتقادیات" کی بھی ایک جلد دی جس کو پڑھ کر مجھے محسوس ہوا کہ ذوق شعر کسے کہتے ہیں اور اس ذوق سے ہمارے جدید نقاد جو انگریزی تنقید سے ایک ہلدی کی گرہ لیکر پنساری بن گئے ہیں کس قدر بے بہرہ ہیں۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ مجھے خاص طور پر یاد آتا ہے۔ ایک دن میں نیاز صاحب کے یہاں پہونچا تو وہ اپنے یہاں برآمدے میں بیٹھے ہوئے پی جی وڈ ہاؤس — P.G. Wodehouse کی ناول یوکرج UKERIDGE پڑھ رہے تھے۔ میں نے کتاب کو دیکھ کر کہا۔ "پی جی وڈ ہاؤس کا مزاح دیر اثر نہیں ہے۔" نیاز صا نے کہا "جگر صاحب کی شاعری کی طرح" میں نے کہا "جگر صاحب کی شاعری تو مجھ پر بالکل اثر نہیں کرتی۔" نیاز صاحب مسکرائے اور بولے "یہ بات ہر ایک سے کہتے پھرنے کی نہیں ہے۔" غرض دوسرے موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ پھر ایک دن جگر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ باتوں باتوں میں جگر صاحب نے اپنے پسندیدہ

اشعار میں یہ شعر سنایا ؎

اپنی اپنی وسعت فکر و نظر کی بات ہے
جس نے جو دنیا بنا ڈالی اسی کا ہو رہا

دوسرے دن میں نیاز صاحب کے پاس جا پہونچا، جگرؔ صاحب سے ملاقات ہونے کا حال بیان کرکے یہ شعر سنایا اور بولا "مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اس شعر کے دوسرے مصرعے نے سارا مزہ کرکرا کر دیا ہے۔" نیاز صاحب نے کہا "میں اس شعر پر تنقید کر چکا ہوں۔" اور "نگار" کا ایک پرانا نمبر لاکر میرے ہاتھ میں دیدیا۔ اس میں جو مضمون تھا اس میں یہ دکھایا گیا تھا کہ قواعد اور محاورے سے الگ ہو جانے پر شعر کا اثر کس طرح جاتا رہتا ہے۔ اس وقت تک میں جدید نقاد کی ہمنوائی میں الفاظ اور عروض پر نکتہ چینی کو ایک فرسودہ عمل سمجھتا تھا مگر اس مضمون نے پھر متعدد بار نیاز صاحب سے بات چیت نے یہ ثابت کر دیا کہ شاعری پر تنقید کے سلسلے میں زبان پر تنقید سب سے زیادہ بنیادی چیز ہے۔ اس بات نے میری انگریزی تنقید پر نظر کو بھی گہرا کر دیا۔ میں نے دیکھا کہ انگریزی کا ہر نقاد پرانے زمانے سے لیکر آجکل کے ٹی۔ ایس ایلیٹ تک شروع زبان ہی سے کرتا ہے اور اس سے اصول کلیات اور نظریات تک پہونچتا ہے۔ ہماری سطحی اور سرسری تعلیم ہمیں محض اصول سے مس کرتی چلی جاتی ہے اور ان ہی اصولوں کو ہم الٹا سیدھا سر پر لاد کر نقاد بنے پھرتے ہیں اور جدید تنقید کا ڈھونگ رچا کر زبان پر تنقید کو مطعون کرتے ہیں۔ نتیجہ میں ہماری نظر سطحی رہ جاتی ہے اور اگر کوئی شعر ہمارے سامنے رکھ دیا جاتا ہے، تو بغلیں جھانکنے لگتے ہیں بر خلاف اس کے نیاز صاحب قطعی رائیوں پر پہنچ جاتے ہیں اور اپنی رائیوں کو نہایت زور کے ساتھ استدلال سے ثابت بھی کر دیتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ انکی تنقید جدید تنقید کی ہچکچاہٹ اور گول مول باتوں سے بالکل خالی ہے اور انکی اس صفت نے مجھے بہت زیادہ متاثر کیا۔ جب میری تصنیف مرثیہ نگاری اور میرانیس "قسط وار "نگار" میں چھپ رہی تھی تو میں لکھنؤ میں اس کے بابت ہنگامہ برپا تھا۔ میں نے اس کے آخری ابواب نیاز صاحب کو دئے انہوں نے پڑھنے کے بعد کہا "کچھ زور کم ہو گیا۔ شاید ہنگامے سے متاثر ہو گئے۔" میں نے اس وقت کچھ جواب نہ دیا مگر بعد میں سوچتا رہا کہ کیا جس جسارت سے میں نے اس کتاب کو شروع کیا تھا وہ رفتہ رفتہ کم ہوتے ہوتے آخر کو ختم ہو گئی بہرحال میں کچھ ہوں مگر نیاز صاحب کے بابت مجھے یقین ہے کہ ان سے زیادہ جسارت اردو کے کسی نقاد نے نہیں دکھائی۔ یہ جسارت ان میں اپنے تنقیدی اصولوں پر کامل اعتماد سے پیدا ہوئی ہے مگر زیادہ اس کی بنیاد انکی زوردار انفرادیت معلوم ہوتی ہے۔ جدید تعلیم نے جو بے یقینی پیدا کر دی ہے اس سے وہ بہت دور ہیں۔ جس زمانہ میں میں نیاز صاحب کے یہاں جایا کرتا تھا اسی زمانہ میں میری سرور صاحب سے بھی گاڑھی چھنتی تھی سرور صاحب کو میں جدید طریقۂ تنقید میں سب سے زیادہ آگے سمجھتا تھا اور نیاز صاحب اور سرور صاحب کا تقابل کچھ شعوری اور کچھ لاشعوری طور پر کرنے لگا تھا۔ سرور صاحب کا گول مول باتیں کہہ کر ٹھہر جانا اور قطعی رائے دینے سے انکار کرنا اور نیاز صاحب کے زور کے ساتھ اٹل رائے دیدینا ایک ایسا تضاد تھا جو مجھے نیاز صاحب کو ان پر ترجیح دینے پر مجبور کرتا۔ ایک معاملے میں مجھے نیاز صاحب کی تنقید کمزور نظر آئی وہ یہ کہ سرور صاحب اور میں ساتھ ان کے یہاں گئے۔ انہوں نے سرور صاحب کو ایک موٹی سی کتاب واپس دیتے ہوئے کہا۔ "زبان کے لحاظ سے یہ کتنی ہی بڑی کتاب ہو مگر مجھے اس سے دلچسپی نہیں ہوئی۔" میں نے اس موٹی کتاب کو ہاتھ میں لے لیا۔ وہ دوستوفسکی کی "برادر کاراماز اف" تھی۔ میں نے تعجب سے نیاز صاحب کو دیکھا اور کہا۔ "اول تو ناول کے سلسلے میں زبان کی خوبی کوئی معیار نہیں پھر اس ناول کی زبان سے ہمیں کوئی تعلق نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہ ترجمہ ہے روسی زبان سے، جس کی الف بے تک سے ہم واقف نہیں۔ اس کی خوبی کردار نگاری کی گہرائی میں ہے، جس تک دنیا کا کوئی اور ناول نگار نہیں پہونچ سکا۔" سرور صاحب نے کہا "اسے دنیا کی عظیم ترین ناول کہا گیا ہے۔" میں نے کہا "وسعت نظر میں ٹولسٹوئے کی وار اینڈ پیس اس سے زیادہ عظیم ہے مگر گہرائی میں یہی آگے مجموعی طور پر میں اسے دنیا کی ناول نگاری میں دوسرا مقام دونگا ناول کے فن سے بدمذاقی کی دلیل ہے۔"

خیر موضوع سخن بدل گیا، مگر میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ یورپ کے مخصوص فن کی روح سے نیاز صاحب دور ہی رہے۔ ان کا دائرہ ہماری روایات کے فن تک محدود ہے مگر اس دائرے کے اندر وہ کامل ضرور ہیں اور اس لئے ہماری تنقید نگاری میں ان کا مستقل مقام ضروری ہے۔

اس کے علاوہ نیاز صاحب نے افسانہ نگاری کے بھی اچھے نمونے پیش کئے ہیں۔ انہوں نے مجھے "شہاب کی سرگزشت" خاص طور پر پڑھنے کے لئے دی۔ "شاعر کا انجام" "جمالستان" کے افسانے بھی میں نے پڑھے۔ ظاہر ہے کہ نیاز صاحب واقعاتی ناول اور افسانہ کی مخصوص صفات سے بہت دور ہیں۔ ان کی زندگی پر نظر اسی ڈھنگ کی ہے، جیسی نذیر احمد اور شررؔ کی تھی۔ ان کا مقصد درس اخلاق ہے اور اس قسم کی نفسیات نگاری سے جس کا عظیم ترین شاہکار برادر کاراماز اف ہے، ان کو کوئی دلچسپی نہیں۔ ان افسانوں میں بیانات اور مسائل کی وضاحت ہی ہماری توجہ کا مرکز ہوتے ہیں۔ یہاں ایک راز کھلتا ہے جو نیاز صاحب کی

جینیس Genius کے مخصوص رجحان کو ہمارے سامنے لے آتا ہے۔ ان کی فطرت اگر کسی صنف ادب کے لئے مخصوص طور پر موزوں ہے تو وہ صنف —— ESSAY ہے۔ انہوں نے جو کچھ بھی لکھا وہ گھوم پھر کر مضمون نگاری کے دائرے میں آجاتا ہے اور اس صنف کا اگر میں ان کو اپنے ادب میں سب سے بڑا ماہر کہوں تو بے جا نہ ہوگا۔ سرسید نے جس کام کو شروع کیا تھا وہ نیاز صاحب کی تصانیف میں کمال پر پہونچتا ہے۔ ان کے افسانوں کے مخصوص حصے بیانیہ مضامین کے وہ شہ پارے ہیں جن کی مثال اردو میں ملنا مشکل ہے۔ ان کے مذہبی اور سیاسی مضامین بحث اور وضاحت کرنے والے مضامین کے شاہکار ہیں۔ جن جن، اقسام کے مضامین ہمیں دنیا کے ادب میں نظر آتے ہیں ان سب کی بہترین مثالیں اگر ہمارے یہاں ڈھونڈی جائیں تو وہ نیاز صاحب ہی کی تصانیف میں ملیں گی یوں تو ان کے سب ہی مضامین دلچسپ ہیں مگر ان میں سے بہترین کو چھانٹ کر ایک جلد تیار کی جا سکتی ہے۔ جو ان کی مضمون نگاری ہی کی نمائندگی نہ کرے گی۔ بلکہ یہ بھی دکھائے گی کہ اس صنعت میں ہمارے ادب میں کہاں تک کمال حاصل کیا گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ نیاز صاحب کے بہترین مضامین دنیا کے مضمون نگاروں کے بہترین مضامین کے مقابلہ میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ ان میں مضمون اور خیالات میں وہ زور ملے گا جو بیکن Bacon کے مضامین میں ہے۔ اخلاقی [illegible] اور طنز و مزاح کا وہ رنگ ملے گا جو اڈیسن کے مضامین کی جان ہے اور انفرادیت کا وہ اثر ملے گا جو ولیم ہزلٹ کے مضامین کو اعلیٰ مقام دیتا ہے۔ مضمون کی صنف (جسے اب کچھ لوگوں نے انشائیہ کے نام سے جمانا چاہا ہے) ہمارے یہاں مختصر افسانے میں اور تنقیدی مضمون میں غائب ہو گئی۔ پھر مذہب اقتصادیات۔ سیاسیات وغیرہ عام ادب سے خارج کر دئیے گئے اور ان کے الگ الگ دائرے بنا دئیے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مختصر صنف جو انفرادی طور پر کسی مصنف کی دلچسپ ذاتی رائے دینے کے لئے مخصوص تھی۔ اور جو بقول "بیکن" تمام علوم کو اپنے دائرے میں لے لیتی تھی" توجہ کا مرکز نہ رہ گئی۔ تنقیدی مضمون ہی کو مضمون کہا جانے لگا۔ نیاز صاحب کے یہاں تنقیدی مضمون بھی ہیں مگر ان سے کہیں زیادہ تعداد زندگی کے مسائل پر مضامین کی ہے اور ان کی طرف توجہ کرنے سے ہمارے ادب مضمون نگاری کی ایک نئی لہر دوڑ جائے گی۔

ان سب معاملات میں نیاز صاحب کو اہمیت دیتا ہوں۔ مگر سب سے زیادہ میں انہیں زباندان کی حیثیت سے اہم سمجھتا ہوں۔ اس دور میں ان سے بڑا زباندان مجھے کوئی نہ ملا۔ زبان دانی بڑی وسیع اصلاح ہے اور اس کے ہر پہلو سے میں نے نیاز صاحب کو دیکھا اور کامل پایا۔ ہماری زبان عربی اور فارسی کی مرہون منت ہے اور ان دونوں زبانوں کا ان سے بڑا استاد مجھے کوئی نہ ملا۔ آج کل ہم لوگ انگریزی زبان سے خیالات حاصل کرتے ہیں جو انگریزی الفاظ میں ہوتے ہیں۔ ان الفاظ کے ترجمہ کے لئے عربی دانی ضروری ہے اور مجھے جب بھی کسی انگریزی لفظ کے ترجمہ کی ضرورت ہوئی تو میں نیاز صاحب کے پاس گیا اور انہوں نے جو لفظ مجھے بتایا وہی میرے دل کو سب سے زیادہ لگا۔ سب میں پہلا لفظ جس کا انہوں نے میرے لئے ترجمہ کیا وہ انگریزی لفظ Sensuous مرثیہ نگاری اور میرانیس کے سلسلے میں یہ لفظ میرے ذہن میں بار بار آیا۔ اس کے ترجمے موجود تھے مگر سب نامکمل معلوم ہوتے تھے۔ نیاز صاحب نے اس کا ترجمہ "احساسی" اور میرے خیال میں اس سے بہتر ترجمہ ممکن نہیں۔ اصطلاحیں بنانے کے سلسلے میں بھی میں انکی مدد لیتا رہا۔ جب سے میں پاکستان آیا، ان کی اس مدد سے محروم ہو گیا تھا، مگر اب وہ بھی پاکستان آگئے اور میرے ہم محلہ ہیں، لہذا کل کا ہی ذکر ہے کہ میں ان کے پاس جدید نفسیاتی اشارتی —— ناول کے لئے ایک اصطلاح قائم کرانے گیا۔ میں نے عرض کیا کہ ناول کا لفظ عجیب عجیب چیزوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اور زیادہ تر سست اور سنسنی خیز قصہ گوئی سے وابستہ ہو گیا۔ جدید معنی خیز فلسفی ناول نگاری کے لئے میں کوئی اور لفظ چاہتا ہوں۔ میں نے یہ بھی کہا کہ جدید ناول Symbolic ہوتی ہے اور Symbol کے لئے لفظ اشارہ استعمال ہوتا ہے اگر میں اسے اشاریہ کہوں تو کیسا رہے گا۔ انہوں نے فرمایا کہ اشاریہ — Index کے لئے استعمال ہوتا ہے وہ ٹھیک نہیں رہے گا اور کچھ غور کر کے کہا: "آپ اسے رمزیہ کہیئے۔" میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بہتر لفظ نہیں ہو سکتا اور رمزیہ کے عنوان پر ایک مضمون لکھنے والا ہوں۔ زباندانی دوسرے امور جیسے محاورے، قواعد، ترتیب الفاظ، تراکیب، سکون اور تحرک حروف وغیرہ کے بابت بھی وہ میری بہترین رہنمائی کرتے ہے مگر زباندانی کا سب سے اونچا درجہ طرز ادا ہے۔ اور اس میں مجھے اردو کا کوئی نثر نگار ان سے آگے نہ دکھائی دیا۔ ان کی طرز میں ایک عجیب رنگینی کے ساتھ ایک عجیب شگفتگی اور عجیب رعنائی ہے جو کسی نثر نگار کے یہاں نہیں ملتی۔ مغلق موضوعات کو ان کا قلم جس طرح دلچسپ بناتا ہے وہ سرسید تک کو نصیب نہ ہوا۔ اس وقت میں انکی سحر بیانی کی تنقیدی تحلیل نہیں پیش کرنا چاہتا مگر یہ ضرور کہونگا کہ ہماری نثر سرسید سے شروع ہو کر جس اعلیٰ ترین درجہ پر پہنچ سکتی تھی اس پر نیاز صاحب قلم سے پہنچا۔ ان کے یہاں ہمارے تمام نثاروں کی خوبیاں یکجا ہو گئی ہیں اور انہی پر یہ مصرع پورا اترتا ہے۔ ع آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری۔ ہم نثر کاملین کو دوسرے پہلوؤں پر ترجیح دینے سے ڈرتے ہیں اور جب میں نیاز صاحب کو اردو کا بہترین نثر نگار کہتا ہوں تو لوگ بھڑک جاتے ہیں مگر یہ میری اٹل رائے ویسی ہی اٹل ہے جیسی نیاز صاحب کی ہوتی ہے ★

اردو ادب میں آزادیٔ فکر کا رجحان اور نیاز فتحپوری

خان رشید

اردو ادب کی بڑی بدقسمتی ہے کہ اس کے ادباء اور شعراء بالعموم آزادیٔ فکر سے محروم رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں دوسروں کی تقلید پر مجبور ہونا پڑا۔ دراصل آزادیٔ فکر ہی ادب کا وہ عنصر ترکیبی ہے جس کی بدولت کورانہ تقلید کی گھٹن سے نجات ملتی ہے۔ اور ادب پروان چڑھتا ہے۔ تخلیقی ادب آزادیٔ فکر ہی کا کرشمہ ہے جس سے جمود اور تعطل پناہ مانگتے ہیں۔ آزادیٔ فکر ہر شعبہ حیات کے لئے ناگزیر ہے۔ کائنات کا سارا ارتقاء ایسے تصورات کی تجریدی حرکت ہی کا مرہونِ منت ہے۔ جو آزادیٔ افکار کی نمائندگی کرتے ہیں۔ فطرت کے جبر سے بغاوت کا احساس فکر ہی سے بیدار ہوتا ہے۔

اس جبر پر مطمئن اور قانع افراد کی اس دنیا میں کمی نہیں لیکن ایسے افراد جو ان بندھنوں کو توڑ ڈالیں، شاذ ہی پیدا ہوتے ہیں۔ یہی وہ باغی ہوتے ہیں جو اپنے لائحہ عمل کی مناسبت سے اعلیٰ علیین یا بصورت دیگر اسفل السافلین کا اعزاز پاتے ہیں۔ باغی دونوں ہیں خدا پرست بھی اور خود پرست بھی۔ مگر چونکہ بندگی انسانی تقدیر ہے۔ اس لئے مشیت الٰہی کا جبر ہو یا فطرت کا جبر ہم کسی ایک سے بغاوت کر کے دوسرے کی غلامی پر مجبور ہیں۔ مشیت الٰہی کی غلامی فطرت کے جبر سے آزادی کی ضمانت دیتی ہے لیکن فطرت کی غلامی دراصل انفس و آفاق کی متنوع غلامیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ ایک سجدے سے گریز ہزاروں سجدوں، پر مجبور کرتا ہے! ابلیست، اور 'انسانیت' میں صرف سجدے کا تفاوت ہے۔ خدا پرست عرفانی باغی ہے اور خود پرست شیطانی باغی۔

اسی اعتبار سے ابلیست، آزادیٔ فکر، کا پہلا اعلان ہے یا بالفاظ دگر فطرت کی غلامی کا اعتراف ہے۔ جس کے بعد نفس اور ماحول دونوں کی غلامی کرنی پڑتی۔ یہی دونوں مل جل کر جب معاشرے کی عرفانی ارتقاء کی راہیں مسدود کر دیتے ہیں تو حسب ضرورت باغی پیدا ہوتے ہیں۔ معاشرے کے ساتھ ادبیاتِ ادب بھی ایسے سر پھروں کی ہمیشہ محتاج رہتی ہے جو فرسودہ روایات اور غیر افادی افکار کے خلاف بغاوت کریں اور اس میں ایک انقلاب برپا کر دیں۔ نیاز صاحب ایسے ہی ایک انقلابی ہیں۔ اور اگر اردو ادب میں تاریخ میں آزادیٔ فکر کا سراغ لگایا جائے تو یقیناً وہی اس کے بانی قرار پائیں گے۔ آزادیٔ فکر کا جو شعور اور بیباکیٔ اظہار کی جو شان نیاز صاحب کے یہاں پائی جاتی ہے وہ ان سے پہلے کہیں اور مشکل سے نظر آئے گی۔

یوں سمجھئے کہ نیاز صاحب حقیقی معنوں میں اردو ادب کے منصور ہیں — ! اس میدان میں وہ 'انا الحق' اور 'سبحانی لا اعظم شانی' کے رموز کا نہ صرف گہرا ادراک رکھتے ہیں بلکہ اس کے بیباک اظہار میں ذرا تکلف نہیں برتتے۔ یہی ان کا سب سے بڑا کارنامہ اور غالباً یہی سب سے بڑا گناہ بھی ہے۔ دنیا ان ی 'آزادیٔ افکار' کی قائل ہے مگر 'آزادیٔ گفتار' کا گلا گھونٹنے کے لئے ایک مدت سے دار و رسن تیار کر رہی ہے۔ موخر الذکر کا کام پورا ہو چکا دیکھیں دار کی نوبت ب تک نہیں آتی — ! تاہم یقین ہے کہ ایسا ہوا بھی تو ہر قطرہ خون سے یہی آواز آئیگی کہ ؎

قلب او مومن دماغش کافر است ——— !

میں نے انہیں اردو ادب کا منصور کہا ہے اس لئے منصوریت کی وضاحت کی بھی اجازت دیجئے تا کہ آپ میرے مافی الضمیر کو سمجھ سکیں۔ خدا پرستی (جس ذکر اس سے پہلے کیا گیا) نبوت ہے اور خود پرستی شیطنت انہی دونوں کے درمیان ایک چیز ہے جسے ہم 'خودی پرستی' کہہ سکتے ہیں۔ میرے نزدیک منصوریت اسی کا نام

ہے۔ نیاز صاحب کے افکار میں بڑا تنوع ہے اور اظہار میں بے باکی کہیں کہیں تا حد گستاخی ہے (یاد رہے گستاخی ایک اضافی چیز ہے) بات یہ ہے نیاز صاحب کہیں کہیں جس ذہنی سطح سے بات کرتے ہیں عام اذہان وہاں تک نہیں پہنچے اور نتیجہ کفر کے فتووں کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ ورنہ منصور کے لئے کون کہہ سکتا ہے کہ اس کا دل ایک مومن کا دل نہیں۔ نیاز صاحب کا بھی یہی حال ہے۔ اپنے زمان و مکان میں وہ عالم کو جیسا دیکھتے ہیں بلا تکلف بیان کر دیتے ہیں غیر معمولی حساس دل و دماغ کے حامل ہیں اس لئے بھرپور تاثر قبول کرنے کے بعد جذبات کی رو میں بہہ جاتے ہیں۔ پھر نہ خود فریبی میں مبتلا ہوتے ہیں نہ دنیا کو فریب دینے کے قائل اس لئے جو کچھ اور جیسا دیکھتے ہیں محسوس کرتے ہیں بلا کم و کاست بیان کر دیتے ہیں اور پھر کبھی جب عالم حال کی کیفیت سُکر یقال پر مجبور کرتی ہے تو زمانہ دار و رسن لے کر دوڑ پڑتا ہے —— عالم بالا میں 'انا الحق' مقبول ہی کیوں نہ ہو اس دنیا والے اسے کیوں برداشت کریں —!

نیاز صاحب کی آزادیِ فکر، 'من و یزداں' کی چیستاں سلجھانے کی کوششوں میں اکثر اس سُکر کا شکار ہوتی ہے تو اس کا نتیجہ بھی کچھ اسی قسم کا ہوتا ہے کہ ؎

اے دریغا کیں شریعت ملّت ایمائی است　　ملّت ما کافری و ملّت ترسائی است
کفر و ایماں زلف و روئے آں پری زیبائی است　　کفر و ایماں ہر دو اندر راہ ما یکتائی است

یہی وجہ ہے کہ کفر کے فتووں نے نیاز صاحب کی تحریروں کا تعاقب جس بے جگری اور تواتر کے ساتھ کیا ہے اردو کے کسی اور ادیب کو نصیب نہیں ہوا۔ اور سچ پوچھئے تو یہی ان کے ایمان کی دلیل ہے ؎ قیاس کن زگلستان من بہار مرا ——! نیاز صاحب مضبوط کردار کے آدمی ہیں۔ نڈر بے باک اور صاف گو رائے عامّہ کے بھڑکانے میں انہیں بڑا مزہ آتا ہے۔ اپنے علمی تبحر پر اتنا اعتماد ہے کہ اپنی تحریروں کے جواب میں معترضین اور مخالفین کی نگارشات بھی بجنسہٖ پیش کر دیتے ہیں۔ کشادہ دلی اور ادبی دیانت ان کا شیوہ ہے۔ مخالفتوں سے ذرا بھی نہیں گھبراتے۔ بارہا لعن طعن کی بوچھار ہوئی۔ تعزیر و تادیب کی دھمکیاں دی گئیں۔ مگر نیاز صاحب کا انداز نہ بدلنا تھا نہ بدلا۔ انہوں نے خود کبھی اعتذار تک کی ضرورت نہیں سمجھی۔ رمز شناس کا جی چاہا تو ان کی طرف سے وضاحت کر دی۔ اسی قبیل کی کوششوں کا نتیجہ محب عارفی کی ایک نظم ہے جو ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی۔ "دشمنان نیا سے خطاب" کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں۔

ہونے لگے آزادیِ گفتار کے چرچے　　تحریر میں پائے گئے الحاد کے آثار
جو دیکھ رہا ہوں اسے لاتا ہوں زباں پر　　اس بات پہ بگڑے ہیں قدامت کے پرستار
اس ذہن کے پردے میں نہاں اور بھی کچھ ہے　　جو ذہن نہیں وہم کی لعنت میں گرفتار
اے مفتیِ دیں کیا اسے پرکھا بھی ہے تو نے　　جس شخص کو سمجھا ہے غلط بین و سیہ کار
آتا ہے ابھی مجھ کو تو میدانِ عمل میں
ہونی ہے ابھی مجھ سے تو تزئینِ سرِ "دار" ——!

مجھے محب عارفی کے خیالات سے بڑی حد تک اتفاق ہے۔ پھر بھی مذہبیات اور معتقدات کے ضمن میں بعض باتیں کھٹکتی ہیں۔ اس لئے ک میں ابھی اس ذہنی ارتفاع پر نہیں پہنچ سکا جہاں نیاز صاحب پہنچ چکے ہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ انہیں میں آج بھی شجر ممنوعہ جانتا ہوں یہی وجہ کہ اقبال کا ایک شعر جسے نیاز صاحب کا ذکر آنے پر میرے ایک بزرگ نے پڑھا تھا آج تک مجھے نہیں بھولا کہ ؎

ہو فکر اگر خام تو آزادیِ افکار　　انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

مگر ایک مدت کے مطالعہ کے بعد اب یہ شعر قدرے تصرف کے ساتھ یاد آتا ہے ؎

پختہ ہو اگر فکر تو آزادیِ افکار　　حیوان کو انسان بنانے کا طریقہ

نیاز صاحب کی نیت کا سراغ لگائیے تو مجھے یقین ہے آپ بھی اس تصرف سے اتفاق کریں گے۔ ان کی "آزادیٔ فکر" اور خلوص کا مظاہرہ عام تحریروں کے مقابلے میں خطوط میں کہیں زیادہ نمایاں ہے۔ اس سلسلے میں صرف ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں۔ ایک خط میں وہ لکھتے ہیں۔

"لیکن تاریخ شاہد ہے لوگوں نے عقل سے کام لیا اور مصائب جھیلے ...... انسان ایک حال پر قائم نہیں رہ سکتا۔ اگر دنیا فردوس ہو جائے تو بھی ایک نہ ایک دن وہ اسے جہنم میں ڈال کر باہر نکل آئے گا۔ انسان کے ابتدائی عہد کا حال تو معلوم ہے لیکن اس کا مستقبل کا کیا ہوگا کسی کو خبر نہیں۔ بندگی کے دروازے سے گذر کر وہ خدائی کے مرتبہ تک تو فرعون ہی کے زمانہ میں آچکا تھا، لیکن وہ خدا بننا بھی اپنی توہین سمجھتا ہے۔ اس سے پوچھئے کہ اس سے زیادہ ارتقاء اور کیا ہو سکتا ہے؟ وہ کہتا ہے یہ عہد تاریکی کی باتیں تھیں جب انسان جاہل تھا تو خدا بنانے میں اپنا وقت ضائع کرتا رہا لیکن اب عقل آئی ہے اور وہ انسان بننا چاہتا ہے۔ خدا کی تعمیر میں تو بڑی آسانی تھی کہ جو چیز سمجھ میں نہ آئی اس کو خدا کہہ دیا۔ لیکن انسان تو وہی چیز بن سکتی ہے جو سمجھ میں آجائے، پھر سمجھ جتنی زیادہ ہوتی جائے گی اتنا ہی بہتر انسان بنتا جائے گا، یہاں تک کہ خدا کا وجود جو اس وقت کائنات میں صرف بادل کے چھوٹے سے دھبہ کی طرح نظر آرہا ہے وہ بھی ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا اور انسانیت بالکل پہلی مرتبہ صحیح معنی میں آزادی کی سانس لے گی!

سنا آپ نے یہ ہے آج کل کی رو اور یہ ہے زمانہ کا رجحان! پھر کیا آپ اس کا ساتھ دینے کے لئے طیار ہیں؟

اس میں شک نہیں کہ انسانیت سخت مصیبت میں مبتلا ہے لیکن اس کا درد ابھی اس حد سے نہیں گزرا کہ دوا ہو جائے فی الحال تو اسے اسی طرح تڑپنا ہے اور ہم کو آپ کو بھی، کیونکہ شاید اس مرتبے کے نہیں کہ منبر سے دار تک پہنچنے کی جرأت کر سکیں" ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں۔

"...... آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ جن کے "توبہ و استغفار" سے آپ اس قدر مرعوب ہیں، ان کے "سجدۂ ریائی" کا راز دار مجھ سے زیادہ کوئی نہیں ہے۔ آپ تو صرف نشان سجدہ دیکھتے ہیں اور میں ان کا دل دیکھتا ہوں جو اس سے بڑے سیاہ داغ کا مالک ہے!" میں ان اقتباسات کی وضاحت نہیں کرنا چاہتا۔ آپ خود اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر غور کر لیجئے کہ نیاز صاحب نے کیا کہا اور کیوں کہا —؟

یہ باتیں ضمنی طور پر آگئیں مگر فی الحال میں انہیں نہ ایک مذہبی مبلغ کی نظر سے دیکھنا چاہتا ہوں نہ خود کو اس کا اہل جانتا ہوں۔ نیاز صاحب کی ایک عمر مختلف اور متعدد مسائل اور افکار کو سلجھاتے اور الجھاتے گذری ہے۔ ان کی وسعت نظر، عمق مطالعہ، بے عدیل محاکمہ، اعلیٰ جمالیاتی احساس اور گہرے سماجی شعور کا حریف کم از کم اس زمانہ میں کوئی اور نہیں ہے۔

لفظ علامہ میں نے بارہا سنا تھا۔ خسروؔ کی تصانیف سے اس کی تعبیر سمجھ میں آئی اور نیاز صاحب کی شخصیت نے اس کی چلتی پھرتی تصویر دکھلائی۔ ایسے شخص کی طرف ہونا، کسی فرد واحد کے بس کی بات نہیں ہے۔ جو شخص نہ ہو بلکہ اشخاص بن جائے اور پھر اشخاص بھی کیسے؟ جنھوں نے دنیا کی فکری تاریخ کے رخ ہی موڑ دئے ہوں —!

نیاز صاحب نے بے شمار موضوع چھیڑے اور انہیں انتہا تک پہنچا کر ہی دم لیا۔ ہر جگہ ان کی فکر میں ایک مخصوص قسم کی خدمت اور آن بان ہے۔ ایسا بانکپن اردو کے کسی دوسرے ادیب کو نصیب نہیں ہوا۔ ان کی آزادیٔ فکر کا احاطہ کرنا تو درکنار اس کی جھلکیاں دکھانا بھی کارے دارد۔ اس لئے میں صرف ادبیات پر اکتفا کرتا ہوں اور ان میں بھی صرف ادبی تنقید پر اس لئے کہ میرے نزدیک دوسری اصناف کے مقابلے میں تنقید مصنف کے فکری رجحان کی بڑی حد تک صحیح نمائندگی کرتی ہے اور تنقید بغیر غور و فکر کے معرض وجود میں آ بھی نہیں سکتی۔

اردو تنقید کے بانیوں میں حالیؔ اور شبلیؔ کا نام سر فہرست آتا ہے۔ انھوں نے اردو ادب میں فکر کا آغاز کیا۔ لیکن دونوں بزرگوں کے خیالات اور افکار کا جائزہ لینے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر ان میں نہیں تو ان میں سے بیشتر مستعار ہیں۔ انفرادی فکر دونوں کے یہاں کچھ اس قدر مفقود ہے کہ ان کی تصانیف تالیفات سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔

حالیؔ کے مقدمۂ شعر و شاعری ہی کو لیجئے۔ وہ صحیح معنوں میں ایک تالیف ہی ہے۔ حالیؔ خود بھی اسے تالیف کہتے ہیں۔ مگر پرستاروں نے اسے

ان کی منکسر المزاجی اور حلیم الطبعی پر محمول کیا۔ حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہ اسے تصنیف کیونکر کہہ سکتے تھے جب کہ پوری کتاب میں جابجا ابن رشیق، ابن خلدون، ابن قدامہ اور ابن رشیق کی کتابوں کے صفحات کا ترجمہ ہے یا چربہ، اور سب سے زیادہ حیرت ناک امر یہ ہے کہ حوالے تک نہیں دیئے ——!

حالی کے مقدمہ کی جان صرف وہی حصے ہیں جن میں غور و فکر موجود ہے لیکن جہاں غور و فکر ہے وہ اجزاء حالی کے اپنے نہیں۔ حالی کی اپنی کوئی انفرادیت نہیں ہے۔ ان سے آزادیٔ فکر کی توقع بھی نہیں کرنی چاہیئے جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے سرسید کے افکار کے سامنے بلا پس و پیش سر تسلیم خم کر دیا۔ مقدمہ حالی کی اہمیت بس اس قدر ہے کہ اس کے ذریعہ اردو ادب تنقید سے متعارف ہوا۔ اور پہلی مرتبہ فکر کی اہمیت کا احساس پیدا ہوا پھر بھی حالی کی یہ صدائے بازگشت اردو ادب میں آزادیٔ فکر کی بنیاد نہیں کہی جا سکتی۔ حالی کے مقابلے میں شبلی اس اعتبار سے کہیں زیادہ قابل توجہ ہیں ان میں انفرادی فکر تھی جس نے علیگڑھ تحریک سے بغاوت کی اور دار الندوہ کی بنا ڈالی۔ مگر تنقید کے میدان میں وہ بھی مستعار خیالات پر اکتفا کر گئے۔ کی "شعر العجم" اسی رجحان کی غماز ہے۔ کہیں کہیں آزادیٔ فکر کا احساس بھی ہوتا ہے تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے سرسید کی ہمنوائی کے باوجود کبھی اپنے خیالات کی پیروی بھی کر لی —— ایسے عناصر "موازنہ انیس و دبیر" میں جھلکتے ہیں اور اس اعتبار سے "موازنہ"، "شعر العجم" سے بلند ہے۔ شبلی ندوہ کی طرح تنقید کو بھی تعمیری فکر سے مزین کر سکتے تھے۔ مگر ان کی توجہ سیرت نگاری کی طرف منعطف ہو گئی اور تنقید میں اضافے نہ کر سکے۔ سرسید کے یہاں غور و فکر اپنے معاصرین کے مقابلے میں سب سے زیادہ ہے۔ مگر ان کا بھی میدان عمل مختلف تھا۔ نقد و نظر کے رجحانات ان کے بعض خطبات میں دکھائی دیتے ہیں مگر ان کی کوئی مستقل بنیاد نہیں۔ محمد حسین آزاد کا ۱۱ر اگست ۱۸۶۷ء کا لکچر بھی (جس کی تاریخ بھی مشتبہ ہے) کوئی ایسا تنقیدی کارنامہ نہیں جسے آزادیٔ فکر کی اساس کہا جا سکے۔

ان حالات میں نیاز صاحب کی تنقیدی کوششیں ہی اردو ادب میں آزادیٔ فکر کے رجحان کا پہلا نمونہ قرار پاتی ہیں۔ ان کے افکار کا معتدبہ حصہ ان کی اپنی انفرادیت کا نتیجہ ہے۔ وسعت مطالعہ نے ان کے ذہن میں بالیدگی اور شعور میں جلاء پیدا کی۔ انھوں نے اغیار کے افکار و تاثرات کو آنکھیں بند کر کے کبھی قبول نہیں کیا۔ اور پھر جو کچھ پڑھا اسے بجنسہ نہیں اگل دیا بلکہ اسے ہضم کرنے کی بھی کوشش کی۔ غور و خوض فکر اور تامل کے بعد اپنے نظریات خود قائم کئے اپنے خیالات پر بھروسہ کیا اور بڑی جی داری اور خود اعتمادی کے ساتھ جو صحیح سمجھا اسے علی الاعلان پیش کر دیا۔ دنیا خواہ کچھ ہی کیوں نہ کہتی رہے۔ انہیں اس کی ذرا بھی پروا نہ ہوئی۔ بے بنیاد مخالفتوں اور عصبیت زدہ مخاصمتوں نے ان کے لب و لہجہ میں درشتی اور زہرناکی پیدا کی۔ پھر مخالفین اور نکتہ چینوں کی سطحیت نگاہ اور لوچ دلائل نے خود اعتمادی کو احساس برتری میں ڈھال دیا۔ عام ذہنی انحطاط اور فکری بے مائیگی نے اس احساس کو اور ہوا دی۔ اور ایسا ہونا لازمی تھا۔ اس لئے کہ گزشتہ پچاس برس سے نیاز صاحب کے علاوہ اردو ادب کا ایک بھی ایسا نقاد نظر نہیں آتا جو انفرادی شعور سے کام لیتا ہو۔ ہر شخص اپنی رائے کو محفوظ رکھتا ہے اور اس بات کا منتظر رہتا ہے۔ پہلے کوئی اور کچھ کہہ دے تاکہ وہ بھی مصرع اٹھا کر شہیدوں میں نام لکھوا لے۔ ایسے عالم میں نیاز صاحب ہی ہیں جو جس کے لئے جو چاہیں بلا تکلف لکھ جاتے ہیں۔ بعد میں لوگ بحثیں کرتے رہتے ہیں۔ پھر اردو تنقید کی عمر ہی کتنی ہے؟ اس لئے یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ اب تک اردو ادب میں صرف ایک نقاد ہی پیدا ہو سکا ہے اور وہ نیاز صاحب ہیں۔ زمانہ حال کے نقادان ادب بالعموم نہ روایت سے آگاہ ہیں نہ بغاوت اور جدت کا شعور رکھتے ہیں۔ وہ اپنے ادب و زبان کے مزاج سے بے خبر مغربی افکار کے گرویدہ ہیں۔ ان کی تنقید بے بنیاد ہے اس لئے صرف مغربی نقادوں کے خیالات کی خوشہ چینی ان کا شعار ہے۔ آزادیٔ فکر سے بے نیاز ہو کر ان کی قوت تمیز بھی زائل ہو گئی ہے۔ کچے، پکے اور سڑے ہوئے پھلوں میں بھی امتیاز نہیں کرتے اور کوڑا کرکٹ سب بٹور کر اپنے تنقیدی مضامین تیار کرتے رہتے ہیں۔ عوام کی جہالت اور علامانہ مغرب زدگی سے فائدہ اٹھانے کا اس سے بہتر کوئی زمانہ شاید ہی آئے۔

آج جب کہ اہل مغرب اپنے آپ پر بھی اعتماد نہیں کر سکتے تو ان کی کس بات پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ ان حالات میں نیاز صاحب کا دم غنیمت ہے جن کی وجہ سے اردو تنقید اور آزادیٔ فکر کا رجحان زندہ ہیں۔ نیاز صاحب ایک مخصوص نوع کی فکر و نظر کے حامل ہیں۔ وہ کھرے اور کھوٹے کو اسی فکر و نظر سے تولتے ہیں پھر ایک تاثر قبول کر کے دو ٹوک حکم لگا دیتے ہیں۔ ان کی رائے آج بھی اتنی وقیع ہے کہ جسے چاہا اس طرح اٹھا دیا کہ وہ پھر کبھی نہ گر سکا اور جسے گرا دیا وہ کبھی نہ اٹھ سکا لیکن اب

کے بے شمار ستارے ایسے تھے جن کی آب و تاب کو زمانہ صرف اس وجہ سے نہ دیکھ سکا کہ نہ تو سازشی تھے نہ صاحب جاہ —— مگر نیاز صاحب کی ژرف نگاہی نے گمنامی کے گوشوں سے نکال کر انہیں بام عروج پر پہنچا دیا۔ نظیر، مومن، مصحفی، مومن، حسرت، کو لوگ نہ جانے کب کے بھول چکے ہوتے اگر نیاز صاحب ان پر قلم نہ اٹھاتے۔ نیاز صاحب کی آزادی فکر نے غور و فکر کے سامان بہم پہنچائے۔ شعور کو نکھارا، ادب کو ادبیت عطا کی اور ابھرتے ہوئے دماغوں کی تربیت کی۔ یہ ان کی آزادی فکر ہی تھی جس نے اردو تنقید کو مجنوں، فراق اور سرور جیسے مشاہیر عطا کئے۔ جن کا ثانی اب تک تو پیدا نہیں ہو سکا۔

نیاز صاحب کا تنقیدی شعور بڑا منجھا ہوا ہے۔ توضیح و تشریح کا جو ملکہ رکھتے ہیں ان کے ایک ایک لفظ سے مترشح ہے مگر ہر جگہ توضیح اور تشریح سے کام نہیں لیا جا سکتا اور بالخصوص ایسے شخص کے لئے بڑی مشکل ہوتی ہے جس کا علم بھی غیر معمولی ہو۔ اگر وہ اس سے گریز نہ کرے تو ایک مضمون بھی پورا نہ کر پائے۔ نیاز صاحب اکثر تشریح سے پہلو بچا جاتے ہیں۔ ورنہ نیاز صاحب جو کچھ کہتے ہیں اسے ثابت کرنا بھی جانتے ہیں۔ باوجودیکہ گہرا تاثر اسباب و علل سے گہرے ربط کے بغیر پیدا نہیں ہوتا، اس کی داخلیت تعبیر کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ نیاز صاحب میں جیسا کہ کہا جا چکا تاثر قبول کرنے کی صلاحیت غیر معمولی نوعیت کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر وہ تاثر کے غلبہ کی وجہ سے جذبات کی رو میں بہہ جاتے ہیں۔ ایسے عالم میں ان کے قلم سے جو فقرے نکلتے ہیں بلاشبہ ان کی کہنہ تاثراتی ہے جذباتیت، حکمت کے منافی ہے اسلئے ایسی ہی باتوں پر قیاس کر کے انہیں تاثراتی نقاد کہا جاتا ہے اور ان کی تنقید کو سائنٹفک نہیں مانا جاتا۔ گو ان کی تنقید کے بھی چند سوچے سمجھے اصول ہیں مگر بدنصیبی یا خوش نصیبی سے ان کا فنکارانہ اور جمالیاتی شعور بہت بڑھا ہوا ہے۔ وہ پہلے درجہ میں ایک ادیب اور پھر ایک نقاد ہیں۔ اس لئے فن پاروں کا سائنٹفک جائزہ لینے سے پہلے ہی اکثر انہیں میں کھو جاتے ہیں۔ ایسے ہی مواقع ہیں جب وہ بے ساختگی کا شکار ہوتے ہیں۔ مثلاً فراق پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

“میں شاعری میں کیا چاہتا ہوں اس کا جواب مشکل ہے۔ اور اگر اسے شاعری نہ سمجھا جائے تو میں کہوں گا کہ میں وہ کچھ چاہتا ہوں جسے بتا نہیں سکتا”

ایک جگہ لکھتے ہیں “شاعری صرف تاثرات کی زبان ہے، یہ گفتگو کوئی معنی نہیں رکھتی کہ ان تاثرات کی نوعیت کیا ہے”

کہیں کہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعری سے کسی افادیت کے قائل نہیں ہیں۔ مثلاً سیماب کے مذکور میں لکھتے ہیں۔ “ہر فطری شاعری کسی نہ کسی پیغام کا حامل ہوا کرتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ پیغام دنیا کے لئے مفید اور ضروری بھی ہو”

“فنون لطیفہ کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کا تجزیہ نہیں کیا جا سکتا”

“ہم لاکھ نکتے نکالیں پھر بھی واضح طور پر نہ خود جانتے نہ دوسروں کو بتا سکتے ہیں کہ فلاں شعر ہم کو کیوں اچھا معلوم ہوتا ہے”

“بیمار کا یہ شعر ان اشعار میں سے ہے جو داد سے مستغنی ہیں اور جن کی کیفیت کا بیان الفاظ سے ناممکن ہے”

نظام رامپوری کے شعر کی تعریف یوں کی ہے۔

“پھر اسی کے ساتھ معنوی کیفیت جو اس میں پنہاں ہے اس کو صاحبان ذوق ہی سمجھ سکتے ہیں”

“اس کا جواب نہیں ہو سکتا” “کیا خوب کہا ہے” “اس کا کون مقابلہ کر سکتا ہے” اس قسم کے متعدد فقرے ہیں جن میں ان کا تنقیدی شعور جذبات کی نذر ہو کر رہ گیا۔ اسی طرح اکثر فن پارے جب ان کے ذوق پر گراں گزرتے ہیں تو تنقید تنقیص کا انداز اختیار کر لیتی ہے۔

سیماب کے سلسلہ میں رقمطراز ہیں۔

“میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ میں ہر نظم پر علیحدہ علیحدہ تبصرہ کروں اور نہ اس کی ضرورت، لیکن جہاں تک میں نے غور کیا ہے۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس قسم کے اسقام سے ان کی کوئی نظم خالی نہیں”

اصغر گونڈوی کے لئے لکھتے ہیں۔

“اصولاً انہیں شاعری سے کوئی لگاؤ نہ ہونا چاہیئے تھا لیکن خوش قسمتی سے وہ صاحب حال و قال صوفی بھی ہیں اور ظاہر ہے کہ جب ایک صوفی حال سے گزر کر قال میں آتا ہے تو اکثر شعر ہی کہتا ہے اور صرف اپنے لئے، یعنی وہ خود کہتا ہے اور خود ہی اس کو سمجھنا چاہتا ہے”

"آپ اگر خدا کا جلوہ بلکہ عین ذات خدا کو ہر ہر چیز میں ساری و طاری دیکھتے ہیں تو دیکھئے، شوق سے دیکھے جائیے لیکن آپ اسے اس زبان میں کیوں بیان کرتے ہیں جس کے لطف کی ابتدا ہی خدا کے بھول جانے سے ہوتی ہے"

"یہ جھاڑ پھونک" والی شاعری مجھے کبھی پسند نہیں آئی اور باوجود انتہائی غور و فکر کے آج تک اس کا مصرف میری سمجھ میں نہیں آیا۔"

ایک خط میں لکھتے ہیں: "اگر شاعری وہی ہے جو آپ کے دوست کرتے ہیں تو ؎

لرزتا ہے مرا دل زحمت مہر درخشاں پر

"ایک مہمل گو شاعر کی سب سے بڑی جائے پناہ تصوف ہے لیکن اس غریب کے کلام میں یہ بھی نہیں"

"جوش کی اہمال سرائیاں اور" اصغر اور جگر پر مضامین میں تنقیص کا پہلو نمایاں ہے۔ تاثر پذیری اور جذباتیت کی بنا پر ذاتی پسند یا ناپسند ان پر غالب آجاتی ہے۔ اسی لئے ان کی تنقید تاثراتی بن جاتا ہے۔ ورنہ ان کے اصول تنقید بڑے متوازن اور وقیع ہیں۔ عملی تنقید سے ہٹ کر ان کے اصول نقد کا جائزہ لیجیے تو کچھ اس قسم کے نظریات سامنے آتے ہیں۔ "فن تنقید کی غرض صرف یہ ہے کہ تصانیف اور ان کے موضوع سے بحث کی جائے اور مصنف اور زمانہ تصنیف کی باہمی مناسبت ظاہر کر کے ان کتابوں سے مقابلہ کیا جائے جو اس موضوع پر مختلف زمانوں اور ملکوں میں لکھی گئی ہیں ...... ہر عہد اور ہر ملک کی علمی تاریخ سے اس کو آگاہ ہونا چاہیئے کیونکہ فن تنقید اور تاریخ علم و ادب کے درمیان شدید مناسبت پائی جاتی ہے۔ تنقید سے پہلے کتاب کا گہرا مطالعہ کرنا ضروری ہے کہ جس موضوع پر کتاب ہو اس پر متعدد کتابیں پڑھنی چاہیئں ...... جدید تنقید میں علاوہ تفسیر سطحی کے یہ بھی بتانا ضروری ہے کہ علم و ادب کی تاریخ میں کتاب کس ...... درجہ میں رکھی جانے کی مستحق ہے۔ کتاب کے مضامین کو موضوع سے کہاں تک مناسبت ہے۔ عصر حاضر سے کتاب کا کیا تعلق ہے۔ اور مصنف اور ماحول سے کتاب کو کیا نسبت حاصل ہے۔ مصنف کے سوانح، احول، اور حالات کا مطالعہ کرنا اور اس کے ذہنی ارتقا پر پوری نگاہ رکھنا چاہیئے۔ کتاب پر تنقید موضوع کو پیش نظر رکھ کر کرنی چاہیئے۔ مقابلہ اور موازنہ سے کام لینا چاہیئے —— حکم لگانے کے لئے ضروری ہے کہ نقاد اپنے میلان طبعی اور ذوق شخصی کو چھوڑ کر انصاف سے کام لے۔ اگر اس کی طبیعت ڈرامہ کو پسند کرتی ہو تو خواہ مخواہ ناول کی برائی نہ کرے —— دنیا میں ہر شخص تنقید کا اہل نہیں بلکہ یہ خصوصیت صرف ان لوگوں کی ہے جو وسعت معلومات کے ساتھ قوت تمیز بھی رکھتے ہیں اور قدرت نے انھیں حسن و قبح معلوم کرنے کا صحیح ذوق عطا کیا ہے ——"

یہ اصول بڑے سائنٹفک ہیں اور ان میں معقولیت بدرجۂ اتم ہے۔ ان کے یہاں فکری تضاد بھی ملتا ہے۔ مگر یہ صرف اس وجہ سے کہ ان کی شخصیت کے دو پہلو ہیں۔ وہ بیک وقت ادیب بھی ہیں اور نقاد بھی۔ اس سے پہلے چند نظریات یہ شبہ پیدا کرتے ہیں کہ غالباً وہ صرف "ادب برائے ادب" کے حامی ہیں لیکن خیالات کی دنیا سے ہٹ کر جب حقیقت پر ان کی نگاہ پڑتی ہے تو یہ کہنے میں ذرا تامل نہیں کرتے کہ

"ادب سماجی اور معاشی زندگی سے متاثر ہوتا ہے —— فنون لطیفہ بالخصوص ادبیات کسی نہ کسی حد تک قوموں کے عروج و زوال کا آئینہ ضرور ہوتے ہیں —— ادب زندگی کی تنقید ہے —— ادب بھی زندگی کا ایک شعبہ ہے اور زندگی نام ہے جدلیاتی حرکت کا جس کے ہمیشہ دو متضاد پہلو ہوتے ہیں۔ خارجی:۔ عملی یا افادی —— داخلی تخیلی یا جمالیاتی اور دونوں میں توازن ضروری ہے۔" اصولی طور پر وہ مشرقی فن تنقید کو ناپسند فرماتے ہیں مثلاً۔

"عربوں میں فن تنقید صرف ابتدائی مدارج تک محدود رہا۔ اگر اسماء الرجال اور اصول حدیث کو صرف مذہبی لٹریچر سمجھ کر علیحدہ کر دیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کی تنقید کا موضوع صرف لغت تھا —— پہلے تنقید کا مدار صرف وہ اصول اور قواعد تھے جو متقدمین کے علوم و فنون سے اخذ کئے گئے تھے۔"

مگر عملی طور پر وہ قدیم مشرقی اصول سے مفر نہیں پاتے۔ بلکہ ان کی تنقیدوں میں جو موشگافیاں اور نکتہ سنجیاں اس ضمن میں ملتی ہیں وہ مغربی اصولوں کے سلسلے میں نہیں ملتیں۔ فن اور اسلوب دونوں کی اہمیت تسلیم کرتے ہیں بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اسلوب سے انہیں خصوصی شغف ہے۔

"میں پہلے عرض کر چکا کہ شاعری کے لئے الفاظ کا انتخاب اور طرزِ ادا نہایت ضروری ہیں لیکن اگر اسی کے ساتھ خیال بھی پاکیزہ ہو تو کیا کہنا اس کو دو آتشہ، مہ آتشہ جو کچھ کہیئے کم ہے"

"جب میں کسی شاعر کے کلام پر نظر ڈالتا ہوں تو اس سے بحث نہیں کرتا کہ اس کے جذبات کیسے ہیں بلکہ صرف یہ کہ اس نے ان کے ظاہر کرنے میں کیا اسلوب اختیار کیا ہے۔ شاعر جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ الفاظ سے ادا بھی ہوا یا نہیں —"

اس قسم کی باتیں خالصتاً مشرقی اندازِ فکر کی نمائندگی کرتی ہیں اور یہ اس وقت اور واضح ہو کر سامنے آتی ہیں۔ جب اپنی عملی تنقید میں زبان و بیان کے مختلف نکات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ مشرقی ادبیات کے غائر مطالعہ نے انہیں ان رموز و نکات سے بڑی فراخدلی کے ساتھ آشنا کیا ہے۔ ان کا ذہن ہر وقت متعدد اقتباسات اور مثالوں سے معمور رہتا ہے اسی لئے ایسے معاملات میں ان کا محاکمہ بے مثال ہوتا ہے ——

ایسی باتیں خاص مرعوب کن ہیں اور چونکہ اس میدان میں کوئی بھی ان کا حریف نہ بن سکا اس لئے ایک طرح کا احساس برتری ان کی شخصیت میں رچ گیا۔ ظاہر ہے کہ انانیت کے ساتھ رعب و طنطنہ کی ہرزہ کاریاں پسند نہیں کی جاسکتیں کہ آدمی اپنی جہالت کا اعتراف کبھی نہیں کرتا۔ نیاز صاحب کی نکتہ سنجی —— اور نکتہ آفرینی بے بسی کے اعتراف پر مجبور کرتی ہے اس لئے ان کی علمیت بھی ان کی شخصیت سے محبت نہیں ہونے دیتی۔

اس سے پہلے میں نے لکھا ہے کہ ادبی حیثیت سے ان کی شخصیت کے دو پہلو ہیں۔ وہ ادیب بھی ہیں اور نقاد بھی۔ وہ جب بھی صرف ایک روپ میں سامنے آتے ہیں نامکمل رہتے ہیں اور اسی لئے ناپسندیدہ بھی —! مگر ان کے اصل جوہر اس وقت ظاہر ہوتے ہیں جب وہ بیک وقت ادیب اور نقاد بن کر سامنے آتے ہیں۔ یہی وہ روپ ہے جس میں ان کی بھرپور شخصیت کھل کر سامنے آتی ہے۔ ایسی شخصیت جس پر وہ جتنا بھی ناز کریں کم ہے۔ اس عالم میں کانٹے بھی پھول محسوس ہوتے ہیں۔ آزادیٔ فکر اور پرواز خیال مل جل کر جس ادبیت کا نمونہ پیش کرتے ہیں وہ بیک وقت دل و دماغ دونوں کو مسحور کر لیتی ہے۔ یہی وہ عنصر ہے جو ان کی ساری فنکاری اور ساری بلند نظری کی جان ہے — یہی وہ عالم ہے جہاں پہنچ کر وہ ہر خیال کو عقل و شعور کی کسوٹی پر پرکھنے کا ادراک پیدا کرتے ہیں۔ اور بہ جبر نہیں بلکہ والہانہ انداز میں فرسودہ اور غیر افادی روایات کی دھجیاں بکھیرتے ہیں۔ یہاں روایت سے ان کی بغاوت ببنائے مخاصمت نہیں ہوتی بلکہ وجدان اس کا محرک ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ لاکھ جدتوں کو دعوتیں دینے کے باوجود وہ اپنی ثقافت، تمدن اور مشرقیت کو نظر انداز نہیں ہونے دیتے۔ بغاوت کے باوجود روایات کا احترام کوئی نیاز صاحب سے سیکھے۔ ان کے یہاں دونوں کا ایک حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔

روایت کا تعلق کلچر سے ہے اور کلچر کا تہذیب سے۔ تہذیب کسی قوم کے ترقی یافتہ سوشل نظام سے عبارت ہوتی ہے۔ اسی نظام کا ذہنی اور ذوقی عنصر کلچر کہلاتا ہے جو کسی تمدن سے بے ساختہ ابھرتا ہے کسی بھی تمدن کے زیرِ اثر بعض عادتیں خود بخود پیدا ہو کر قبولیت عام کی سند حاصل کر لیتی ہیں، ان میں رہن سہن کے طریقے۔ آداب معاشرت، اخلاق و عادات، رسوم و تقریبات فنون لطیفہ اور پسندیدہ مشاغل سبھی کچھ شامل ہیں۔ یہی عادتیں جو اجتماعی یا قومی رنگ اختیار کر لیتی ہیں کسی قوم کا کلچر کہلاتی ہیں اس کے بھی مختلف مدارج ہیں۔ ادنیٰ درجہ میں عام آداب معاشرت یا عام اظہار اخلاق قسم کی باتیں ہیں مگر کسی تمدن کا حقیقی کلچر اس کے فنون لطیفہ اور ادبیات عالیہ ہی میں نظر آتا ہے۔

ممکن ہے نیاز صاحب اپنی صاف گوئی اور ریاکاری سے نفرت کی بنا، پر بعض طبائع کے نزدیک کلچرڈ نہ قرار پائیں لیکن حقیقی معنوں میں ان سے زیادہ کلچرڈ دوسرا ادیب اس دور میں شاید ہی ملے۔

تہذیب سیاسی، عمرانی اور اجتماعی زندگی کے لئے جبری قوانین نافذ کرتی ہے۔ ان کا مقصود نظام حکومت ہے جو تقاضائے عصر کے مطابق بدلتا رہتا ہے مگر روحِ عصر ان تغیرات سے بہت کم متاثر ہوتی ہے یہی روحِ عصر ہے جسے کلچر بھی کہا جاتا ہے۔ اس کی اساس کسی جبری نظام پر نہیں ہوتی بلکہ روایات پر ہوتی ہے جو کسی بھی نظامِ فکر میں از خود پیدا ہوتی ہیں روایات جو دماغوں کے تھوپے ہوئے قوانین کا نتیجہ نہیں ہوتیں بلکہ دلوں کی امنگوں اور آرزوؤں کا ماحصل ہوتی ہیں۔ ان کا مقصود نظام حکومت نہیں بلکہ ایک مخصوص نظام حیات ہوتا ہے۔ جس کی تہ میں انسانیت ہی کارفرما

ہوتی ہے۔

روایات اور کلچر کی روح بنیادی قدریں ہیں جو بجائے خود صدہا تجربات کا نتیجہ ہیں۔ بہر حال روایات ہی کسی معاشرے کی جان ہیں وہ اس کی رگ رگ میں سرایت کئے رہتی ہیں۔ اجتماعی ذہن اور دردِ مشترک انہیں جنم دیتے ہیں مگر ان سے تخریبی قسم کی بغاوت نئے تجربہ کے بہانے اسی درد کا علاج کرنے پر مصر ہو جاتی ہے تو بیچارہ ادب چیخ اٹھتا ہے ؎

درد ہے جان کے عوض ہر رگ و پے میں ساری
چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا

دورِ جدید کے ادیب اور نقاد بالعموم روایت کی اس اہمیت سے واقف نہیں ہیں۔ مغربی افکار و خیالات نے انہیں اس درجہ مسحور کر دیا ہے۔ ان کی اپنی کوئی فکر ہی باقی نہیں رہی وہ اپنی ثقافت اور تمدن سے ذرہ برابر واقفیت نہیں رکھتے۔ اور اپنی لاعلمی پر پردہ ڈالنے کے لئے مشرقیت سے بیزار اور مغربیت کے پرستار بن کر سامنے آتے ہیں۔ پھر مغربی افکار کو بھی نہیں سمجھ پاتے اور جا و بیجا انہیں اپنی تنقیدوں میں سمیٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نتیجہ میں ان کی تنقید خود ان کی ذہنی الجھنوں کا مرقع بن کر رہ جاتی ہے۔ اپنی زبان و ادب کے مزاج سے ناواقفیت انہیں دن بدن ادب سے دور کر جاتی ہے۔ مغرب کی اندھی تقلید نے ندرتِ فکر کے وہ سوتے خشک کر دیئے ہیں جن کی آبیاری سے ادب و ثقافت کے چمن پروان چڑھتے تھے۔ انہیں نہ تجربہ کا شعور ہے نہ روایات کا پاس۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کا ادب فکری اضمحلال کی نذر ہو کر رہ گیا ہے —— روایات سے بیگانگی کی بناء پر وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ ادب صرف انسانیت کے پرچار کا دوسرا نام ہے ؎

اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است

نیاز صاحب اس رمز سے اچھی طرح واقف ہیں وہ ایک سچے روایت پرست بھی ہیں اور ایک اچھے باغی بھی —— !

وہ خوب جانتے ہیں کہ ادب زندگی کا ترجمان اور رہنما ہے۔ ترجمان کی حد تک روایات کا سہارا لیتا ہے مگر رہنمائی بغیر بغاوت کے ممکن نہیں۔ روایت اور بغاوت دونوں اس کے عناصر ترکیبی ہیں۔ روایت ماضی کی ایک خوشگوار یاد ہے۔ سماجی شعور کے داخلی اور خارجی تجربات کا ایک شاہکار —— تاہم دنیا کی ہر اچھی چیز کی طرح روایت کبھی اپنی افادیت کھو بھی سکتی ہے اور جب ایسا ہوتا ہے تو تجربہ بغاوت کا طلبگار ہوتا ہے۔ بعض روایات خلقی طور پر کھوکھلی ہوتی ہیں جن کی افادیت ہنگامی اور عارضی ہوا کرتی ہے وہ زندگی کے آئندہ امکانات سے عہدہ برآ نہیں ہو پائیں ان سے بغاوت نہ کی جائے تو زندگی کا مستقبل ہی تاریک ہو جائے —— مگر روایات کی ایک قسم تخلیقی بھی ہے جو ہر زمانہ میں زندہ جاوید ہوتی ہیں۔

ہر زبان کا کلاسیکی ادب دراصل ایسی ہی روایات پر مشتمل ہوتا ہے۔ اگر کوئی ادیب کلاسکیت سے فائدہ نہیں اٹھاتا تو اس کا تجربہ بے روح ہوگا۔ صحیح سماجی شعور روایات ہی کا رہینِ منت ہے۔ سماجی حقیقت انفرادی حقیقت سے بلند تر ہے۔ ہر تجربہ خارجی حقائق ہی کا نتیجہ ہے۔ مگر شخصی تجربہ اگر سماجی تجربہ نہیں بنتا تو غیر معتبر ہوگا اور خواہ کتنا ہی نیا اور اچھوتا کیوں نہ نظر آئے ایک بیمار ذہن کا آئینہ دار ہوگا اور اسی اعتبار سے ادب کے لئے مہلک بھی۔

نیاز صاحب اچھی طرح جانتے ہیں کہ روایات سے فائدہ کیونکر اٹھایا جا سکتا ہے اور بغاوت کی ضرورت کب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں فکر اور فن میں بڑی ہم آہنگی اور رچاؤ پایا جاتا ہے۔ مگر جیسا کہ کہا جا چکا یہ رچاؤ ایک بھرپور وحدت تاثر کا رنگ اسی وقت اختیار کرتا ہے جب وہ ایک 'ادیب نقاد' بن کر سامنے آتے ہیں۔ ان کی یہ صفت خطوط میں بڑی نمایاں ہے اور تنقیدوں میں ان مواقع پر جھلکتی ہے جب وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ تنقید کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر خطوط کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمایئے ——

"لیکن ہمیں کیا! دمشق میں قحط سالی ہو یا نہ ہو۔ لیکن تمہاری 'فراموشکاری' تو بہر حال قائم ہے تمہارے "گیسو دراز" آج کل کہاں ہیں اگر وہاں ہوں تو کہہ دو کہ یہاں آجائیں تو ایک ٹھکانا میں نے ان کے لئے ڈھونڈ لیا ہے۔ "خرما" اور "ثواب" دونوں کا ٹھکانا۔"

"بجا ہے یہ "لن ترانیاں" اسی وقت تک ہیں جب تک وہ "رشک آفتاب بالائے بام" نہیں آیا۔ اس کے بعد میں جانتا ہوں کہ تم کیا کرو گے اور کیا کہو گے ۔"

"آپ بھی عجیب چیز ہیں "لب ولعل و خط زنگاری" کی فکر تو اتنی لیکن کاروبارِ دلداری میں جو اور ہزاروں نکتے پوشیدہ ہیں، ان کو خبر نہیں۔ انسان یوں تو ہر وقت اپنے آپ کو دھوکا دیتا رہتا ہے۔ لیکن عورت اور مذہب کے باب میں اس کا دھوکا ایک مستقل فتنہ ہے۔ کوئی ان میں سے ایک میں مبتلا ہوگا آپ ماشاءاللہ دونوں کے مارے ہیں۔"

"بندہ نواز! محبت کی نگاہ بھی الگ ہوتی ہے اور زبان بھی پھر کیونکر یقین کروں کہ آپ کو میرے ساتھ لاگ نہیں لگاؤ ہے"

"دنیا میں کسی پر احسان کرنا اتنا دشوار نہیں ہوتا جتنا اعتراف احسان!"

یہ مشتے نمونہ از خروارے ہے۔ مکتوبات نیاز میں فکر و فن کے دلکش امتزاج کے ایسے صدہا نمونے ملیں گے۔ اسی طرح ادبی تنقید میں بھی ان کی آزادیٔ فکر کی بیباختگی ایک قابل تحسین ادبیت میں ڈھل کر سامنے آتی ہے۔

مجنوں کے افسانوں پر تبصرہ یوں کرتے ہیں۔

"ان میں تازہ شراب کی سی تیزی و تلخی نہیں بلکہ مئے دیرینہ سال کی سی کیفیت ہے جو آہستہ آہستہ لیکن دیرپا رنگ میں دل و دماغ کو متاثر کرتی ہے یا دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ وہ حسن ملیح ہے۔ جو دفعتاً آنکھوں میں چکاچوند تو پیدا نہیں کرتا لیکن بعد کو وہ رگ رگ میں نشتر توڑ جاتا ہے۔۔۔ اگر مختصر سے مختصر الفاظ میں ان کی افسانہ نگاری پر کوئی جامع اور مانع رائے مجھ سے طلب کی جائے تو میں بلا تامل کہدوں گا کہ اگر بیدلؔ کے اس شعر کو متن قرار دیدیا جائے کہ

ہمہ عمر با تو قدح زدیم و نرفت رنج خمار ما۔
چہ قیامتی کہ نمی رسی زکنار ما بہ کنار ما۔

تو مجنوں کی افسانہ نگاری اس کی بہترین تفسیر ہے اور شاید مجنوں سے بہتر کوئی مفسر اس کا ہو بھی نہیں سکتا تھا"

اکثر تنقید کرتے کرتے جب فکر کا غلبہ ہوتا ہے تو بڑے پتہ کی باتیں کہہ جاتے ہیں۔

اگر یہ صحیح ہے کہ دنیا کی حقیقتیں نہیں بدل سکتیں تو پھر ذوق انسانی کے اختلافات بھی صرف تعبیرات کے اختلافات ہیں۔ شاعری حقیقت نہیں ہے، بلکہ حقیقتوں کا اظہار ہے، صداقت نہیں ہے بلکہ صداقتوں کی تعبیر ہے۔ خود کوئی کیفیت نہیں ہے بلکہ کیفیت کا بیان ہے اور تعبیر و بیان کا اختلاف فطرت انسان ہے ــــ "

اور جب ادبیت انگڑائی لیتی ہے تو انداز بالکل بدل جاتا ہے۔

"سورج وہی ایک چیز ہے اور اس کا طلوع و غروب وہی ایک ــ لیکن ایک دل میں وہ مسرت و نشاط ہے اور دوسرے دل میں حیرت و حیرت، وہ اس کو دیکھ کر گنگنانے لگتا ہے اور یہ معبود سمجھ کر سجدے میں گر پڑتا ہے پھر نہ شاعر گبر ہے نہ گبر شاعر، حالانکہ اس کی شاعری اور اس کی پرستش دونوں کا سرچشمہ وہی ایک آفتاب ہے۔ موسم برشگال کا وہی ایک پپیہا ہے جو کسی شادکام کے لئے شیریں پیام سرخوشی ہے اور کسی جگہ کوئی برہن یہ کہنے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ "ڈاروں گی پنکھ مروڑ" اسی خیال کو اور وسیع کیجئے اور داد دیجئے۔"

لکھنؤ اور دِلّی اسکول کے شعراء کا جائزہ یوں لیتے ہیں۔

"دہلی کا شاعر خراب الفت ہونے کے بعد ایک دنیا اپنی علیحدہ قائم کر لیتا ہے جہاں وہ کائنات سے بے نیاز ہو کر شعر نہیں کہتا بلکہ اپنے جذبات ایک حزیں راگنی میں گنگنایا کرتا ہے اور لکھنؤ کا شاعر طالع ناساز کی تمام یاس آفرینیاں دیکھنے کے بعد بھی کوچۂ محبوب کو نہیں چھوڑتا ــــ"

نیازؔ صاحب کے یہاں خطابت اور انفعالی سپردگی ملی جلی نظر آتی ہیں۔ مطالعہ کائنات اور مطالعۂ نفس دونوں کا ایک ادراک ہے۔ پارسائی کو لذت گناہ کے لئے "ترستے" ہوئے تو آپ نے بارہا دیکھا ہوگا لیکن رندی کو پارسائی کے لئے تڑپتے ہوئے دیکھنا ہے تو نیازؔ صاحب کو دیکھئے۔

"تحقیق سے تخلیق تک"

مجتبیٰ حسین

کراچی کی ایک ادبی نشست میں ایک بزرگ جو نہایت علم دوست اور ادب نواز ہیں۔ اردو ادب کی موجودہ صورت حال پر تشویش کا اظہار فرما رہے تھے ان کے خیال میں اردو ادب برسوں سے یعنی گذشتہ بیس پچیس سال سے نہایت چھوٹے درجے کی چیزیں پیش کر رہا ہے۔ ناول، ڈرامے، افسانے، غزلیں، نظمیں، ادبی تنقیدیں بہت لکھی جا چکی ہیں اور اب ضرورت ہے کہ ان ہلکی پھلکی چیزوں سے ہٹ کر دوسری زبانوں کی اہم کتابوں کے ترجمے کئے جائیں، ادب پر تحقیقی کتابیں لکھی جائیں اور علمی اور فنی کتابوں کی تصنیف کی طرف توجہ دی جائے تاکہ اردو ادب میں ٹھوس اور سنجیدہ کام ہو سکے۔

یہ رائے بظاہر بڑی صائب معلوم ہوتی ہے۔ مگر کس حد تک صائب ہے۔ آپ اس کا اندازہ بڑی آسانی سے لگا سکتے ہیں ان تمام سربرآوردہ ناموں کی ایک طویل فہرست مرتب کر لیجئے۔ جنھوں نے ترجموں، تحقیق اور ٹھوس علمی اور فنی کتابوں سے اردو کے دامن کو مالا مال کیا ہے۔ ان کے علاوہ ان بہت سے معلموں کے نام بھی شامل کر لیجئے (اگر یاد ہوں) جو مدتوں سے اعلیٰ اور ادنیٰ دونوں درجوں کے نصابوں کے لئے معاشیات، تاریخ، فلسفہ، نفسیات، مذہبیات، جنسیات اور سائنس پر ہزاروں کتابیں، ترجمہ، تالیف اور تصنیف کرتے آئے ہیں۔ اس کے بعد ان چند ناموں کی بھی ایک نہایت مختصر سی فہرست مرتب کر لیجئے جنھوں نے ہمیں "ہلکا پھلکا" ادب دیا ہے۔ اول الذکر فہرست کے ناموں کو یہاں لکھنے کی ضرورت نہیں اس لئے کہ یہ نام بڑے قابل احترام ہیں اور ممکن ہے موخر الذکر فہرست کے ناموں کے سامنے انھیں رکھنے سے ان کی قدر و منزلت کو صدمہ پہونچے۔ لہذا دوسری فہرست کے صرف چند ناموں کو دیکھئے۔ میر، سودا۔ نظیر، آتش۔ مومن۔ غالب۔ انیس۔ اقبال۔ جوش۔ آزاد۔ حالی۔ شبلی۔ سرشار۔ رسوا۔ پریم چند۔

اب سوچئے کہ اگر ان ناموں کو ہم اردو ادب کی فہرست سے خارج کر دیں تو اردو ادب ہی نہیں اردو زبان میں کیا رہ جاتا ہے؟ دراصل اردو زبان کے دامن کو "مالا مال" کرنے کی بات کو اردو ادب کی بحث سے غلط ملط کرنے کا نتیجہ یہی ہوتا ہے ترجموں کی ضرورت اور اہمیت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ لیکن کسی زبان کا بھی ادب ہو، اس کی عظمت کا احساس دوسری زبانوں کے ادب کے ترجموں سے نہیں بلکہ اس کے اپنے تخلیقی ادب سے ہوتا ہے۔ تحقیقی ادب کا معاملہ بھی کچھ اس سے مختلف نہیں ہے۔ آزاد کے یہاں سن ولادت اور سن وفات اور بعض واقعات کی غلطیوں کی طرف توجہ دلانے والوں نے بڑا نیک کام کیا ہے مگر صاحب "گل رعنا" ادب کی اس صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ جس میں آج کا کوئی نیا لکھنے والا بھی کھڑا ہونا شاید پسند نہ کرے۔ شعر العجم اور تنقید شعر العجم دونوں ناموں کو یاد کیجئے (موخر الذکر نام غالباً آپ کو جلد یاد نہ آئے) اور آپ کو

محمود شیرانی کا حشر معلوم ہو جائے گا۔ قاضی عبدالودود صاحب بڑے عالم فاضل بزرگ ہیں۔ مگر ہماری شدید محرومی اور بدقسمتی ہے کہ اُردو کے ننانوے فیصدی قاری ان کے نام سے واقف نہیں ہیں یہ سراسر ہماری کم علمی کی دلیل ہے۔ لیکن اس میں یکسر ہمارا قصور نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ ادب کے چند مخصوص شعبے ہوتے ہیں (قواعد، عروض، لسانیات اور ریسرچ سے متعلق) جن سے صرف ماہرین کو دلچسپی ہوتی ہے اور وہ عام لوگوں کی دلچسپی کا باعث نہیں ہو سکتے یہ ماہرین "ستائش کی تمنا" اور صلہ کی پروا" سے بے نیاز ہو کر خاموشی کے ساتھ اپنے کام میں منہمک رہتے ہیں۔ اور ان کے نادیدہ ہاتھ اُردو ادب کی بنیاد کو پختہ تر کرتے رہتے ہیں۔ یہ تمام باتیں اپنی جگہ درست ہیں لیکن ان ناموں سے ادب کے عام قاری کی عدم دلچسپی اور عدم واقفیت کا سبب یہی نہیں ہے۔ آزاد، حالی، شبلی بڑے عالم فاضل بزرگوں میں سے تھے مگر ادب کے عام قاری انھیں اپنے سینوں سے لگائے ہوئے ہیں ـــــ ایسا کیوں ہے؟

جب ہم اس سوال پر غور کرتے ہیں تو چند باتیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ آزاد، حالی اور شبلی ادیب ہو کر ادب کے بارے میں سوچتے تھے۔ یہ تحقیق اور تنقید کی طرف اس لئے نہیں آئے تھے کہ انھیں بعض شعرا کی صحیح تاریخ وفات معلوم کرنا تھی۔ حالی نے مقدمہ شعر و شاعری، ادب سے باہر رہ کر نہیں لکھا ہے۔ بلکہ ادب ہی میں رہ کر ادب ہی کے لئے لکھا ہے۔ "آب حیات"، ادب کی حیثیت سے معتبر کتاب ہے جبکہ "گل رعنا" غیر معتبر۔ شعر العجم کا مطالعہ صرف تذکرے کا مطالعہ نہیں ہے بلکہ شعر و ذوق کی تعمیر بھی ہے۔ شعر العجم خوش ذوقی کی طرف لے جاتی ہے اور تنقید شعر العجم کا تعلق شعری ذوق کی تربیت سے مطلقاً نہیں ہے مقدمہ شعر و شاعری باقی ہے۔ اودھ پنچ کے اعتراضات کو کوئی جانتا بھی نہیں۔ دراصل آزاد، حالی اور شبلی خالقِ ادب ہیں تحقیقی ادب ان کے ادب کا محتاج ہے۔ یہ تحقیقی ادب کے محتاج نہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ بڑی شخصیتیں ہیں۔ ہمارے ادبی محققین اپنی تمام وقتِ نظر کے باوصف بڑی شخصیت تو درکنار ابھی معتبر ادبی شخصیت بھی نہیں بن پاتے اور تیسری بات یہ بھی ہے کہ غالب کو یاد رکھنے اور قاضی عبدالودود کو بھول جانے میں چنداں ہرج نہیں۔ لیکن غالب کو یاد رکھنا اور حالی کو بھول جانا یقیناً ادبی ارتقاء سے بے خبری ہو گی۔ پنجاب میں اُردو ـــ دکھن میں اُردو بڑی مفید کتابیں ہیں ہماری بدقسمتی سے "ادبی کتابیں" بمشکل ہی ثابت ہوتی ہیں اس لئے ادب سے بیگانہ ہو کر صرف ادبی تحقیق کو ادب کی خدمت سمجھ لینا اور اس کے بعد ناقدری زمانہ یا اُردو ادب کی شکایت کرنا تقریباً ایسی ہی بات ہوئی جیسے ہم ادب کے قاری سے یہ مطالبہ کریں کہ وہ جنتری کا بڑے غور و خوض سے مطالعہ کیا کرے اور جب وہ گریز کرے تو ہم اُسے "ہلکے پھلکے" ادب کا دلدادہ کہہ کر ناقابلِ اعتنا سمجھ لیں۔ عام پڑھنے والوں سے بے اعتنائی (عام پڑھنے والوں سے مراد ادب کے طالب علم ہیں) اور ان کے ترقی پذیر ذوق سے بے خبری اردو دوستی نہیں، اُردو دشمنی ہے۔ اُردو کی توسیع اور ترویج زندہ ادب دیئے اور عام پڑھنے والوں کے ذوقِ ادب کی تشفی کئے بغیر ممکن نہیں، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جن کا سرمایہ صرف تحقیق رہا ہے وہ ادب پر کوئی خوشگوار اثر اب تک نہیں چھوڑ سکے ہیں۔ اور ان کا علم و فضل اُردو کے لئے کوئی فیضان نہیں بن سکا۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو کی توسیع اور اس کو پُر مایہ بنانے میں (کیا بلحاظ زبان کیا بلحاظ ادب) ان کا دخل کم رہا ہے۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ اس تمام بحث کا نیاز صاحب سے کیا تعلق ہے؟ لیکن اگر آپ اس بحث کے (جو نہایت تشنہ اور مختصر ہے) پس منظر کو پیشِ نظر رکھیں تو آپ کو اس میں نیاز صاحب کی شخصیت اپنے مختلف پیچ و خم کے ساتھ

ابھرتی نظر آئے گی۔ ادب میں نیاز صاحب کے مرتبے کے تعین کے لئے یہ بحث ضروری ہے اس کے بغیر وہ منفرد مقام جہاں آج وہ کھڑے ہیں واضح طور پر ہمیں شاید نظر نہ آسکے۔ آیئے اب ذرا اس پر غور کریں کہ اردو ادب میں آج وہ کون سے افراد ہیں جو تحقیقی ادب اور تخلیقی ادب دونوں میں یکساں طور پر احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان افراد کے نام آپ دل میں دہرائے جائیے اور آخر میں آپ کو معلوم ہوگا کہ نیاز صاحب اس دور کے وہ واحد آدمی ہیں جنھوں نے تاریخی اور تحقیقی ادب پر قلم اٹھانے کے ساتھ ساتھ ہمیں اردو کا وہ ادب بھی دیا جس میں اپنے زمانے کے فکری رجحانات کو سمجھنے، پرکھنے اور پیش کرنے کا حوصلہ بھی پایا جاتا ہے۔ ان کا ایک قدم تحقیق کے دائرے میں ہے اور دوسرا تخلیق کے دائرے میں۔ یہ بڑی بات ہے۔ جو آج اردو کے شاید ہی کسی ادیب میں پائی جاتی ہے۔

نیاز صاحب کی بڑائی اس میں ہے کہ وہ "نرے محقق" نہیں بن گئے۔ اگر انھوں نے چند تاریخی، علمی اور تحقیقی مقالے لکھنے ہی پر اکتفا کر لیا ہوتا تو وہ ایک ادبی شخصیت کی حیثیت سے اتنے معتبر اور دلکش نظر نہ آتے، یہ اور بات ہے کہ خود نیاز صاحب اب اردو کی بقاء اور توسیع کے لئے ترجموں اور تحقیقی ادب کے نسخے تجویز کرنے لگے ہیں بلکہ اب تو وہ نام خدا فقہ کی وادیٔ پرخار میں بھی قدم دھرتے نظر آتے ہیں۔ ادھر کئی سال سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نیاز صاحب دو حصوں میں بٹ چکے ہیں۔ ایک نیاز ادب سے وابستہ ہے۔ دوسرا ادب سے گریزاں۔ ایک ادب کی عظمت کا مقر ہے۔ دوسرا منکر دیکھنا یہ ہے کہ دونوں میں سے کس نیاز کی شخصیت بالآخر غالب رہتی ہے۔

نیاز صاحب کی شخصیت کی یہ اندرونی کشمکش کچھ آج کی نہیں ہے۔ یہ ابتداء سے ان میں پائی جاتی تھی مگر پہلے یہ اتنی نمایاں اور عروج پر نہ تھی۔ اور جو کچھ باہمی تصادم ہوتا تھا۔ اس کا اظہار ادبی اسلوب اور ادبی انداز فکر لئے ہوتا تھا۔ عبدالماجد دریا آبادی اور سلیمان ندوی سے نبرد آزمائی میں حریف ان کے جس حربے کی تاب نہ لاسکے وہ ادب ہی تھا۔ اسی لئے نیاز صاحب کی اب ادب سے بے نیازی کچھ اچھی چیز نہیں معلوم ہوتی۔ نیاز صاحب کے علمی، تاریخی اور تحقیقی مضامین سب کے سب بڑی عرق ریزی اور غور و فکر کے بعد لکھے گئے ہیں۔ ان کو نظر انداز کرنا مشکل ہے۔ لیکن ان کے علاوہ بھی انھوں نے "بہت کچھ" لکھا ہے۔ اور اس "بہت کچھ" کا تعلق براہ راست ادب سے ہے۔ اگر یہ چیز ان کے یہاں نہ پائی جاتی تو ان کے علمی مقالے ہمارے ذہن پر کچھ بہت خوشگوار اثرات نہ مرتب کرتے۔ ان مقالوں کے پیچھے ان کی ادبی نگارشات کی سفارش ہے۔ ان کے علمی مقالوں کے ساتھ ہی ہماری نظروں میں 'نگارستان'، جمالستان، شاعر کا انجام، شہاب کی سرگذشت، اور ان کی بہت سی ادبی تنقیدیں پھر جاتی ہیں۔ اور ان کی شخصیت بوجھل، بے کیف، بے روح، بے فیض اور جامد ہونے کی جگہ دفعتاً دلکش، دلچسپ اور متحرک نظر آنے لگتی ہے۔

نیاز صاحب کا ادب گذشتہ نصف صدی سے "خانہ نشیں" ہونے کی جگہ زندگی کے ہر سرد و گرم میں حصہ لیتا رہا ہے اس ادب کی آنکھیں برائے مخطوطات کا سن تصنیف پڑھتے پڑھتے اپنی بصارت کھو نہیں بیٹھیں بلکہ ان میں بصارت کے ساتھ ساتھ بصیرت بھی ملتی ہے۔ اس میں گرد و پیش کی زندگی سے دلچسپی لینے کی امنگ پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نیاز صاحب کی تحریریں اردو ادب کی تاریخ کو برٹش میوزیم کے نقطۂ نظر سے پڑھنے پر اتنی مائل نظر نہیں آتیں۔ جتنی وہ اسے ہزار چہرہ زندگی کے ہر آن ابھرتے۔ مٹتے، بنتے، بگڑتے خد و خال میں تلاش کرتی نظر آتی ہیں۔ نیاز صاحب کی تصانیف میں وہ آدمی نہیں ملتا جو خود نہیں سوچتا بلکہ دوسروں کے سہارے سوچتا کم ہے دیکھتا زیادہ ہے (ملاحظہ ہوں برائے مخطوطات)۔

نیاز صاحب کی تحریروں کا ایک بڑا وصف یہ ہے کہ وہ خود بھی سوچتی معلوم ہوتی ہیں اور دوسرے کو بھی سوچنے پر تیار کرتی ہیں۔ خواہ اسے نیاز صاحب کے خیالات سے کتنا ہی اختلاف ہے۔ آج سے تقریباً نصف صدی کی ادبی فضا کو اپنے ذہن میں تازہ کرنے کی کوشش کیجیے۔ اردو ادب اپنے رومانی دور میں داخل ہو چکا تھا۔ یہ ایک لحاظ سے نثر کے اس کلاسیکی دور کا ردِ عمل بھی تھا جو آزاد، حالی اور شبلی سے شروع ہوا تھا۔ مہدی افادی، ناصر علی اور خود مولانا ابوالکلام آزاد کی خطیبانہ تحریریں ایک رومانی انداز فکر کی بنا ڈال رہی تھیں۔ یلدرم نے اس رومانی فکر کو بیرونی عناصر کی آمیزش سے اور چمکایا۔ نیاز صاحب کی فکر نے اسی فضا میں پرورش پائی۔ اس فضا میں رومان کے ساتھ ساتھ ایک اور چیز بھی پروان چڑھ رہی تھی جسے جمالیات کہا جاتا تھا۔ دراصل یہ جمالیاتی انداز فکر رومان کی ایک شاخ تھا۔ نیاز صاحب کی اس وقت کی تحریروں میں یہ دونوں عناصر بڑے رچے ہوئے انداز میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن ان کی فکر یکسر رومان اور جمالیات کی پروردہ نہیں تھی۔ اس میں معاشرتی مسائل اور انسانی رشتوں کو سمجھنے کی کوشش بھی ملتی تھی۔ اسی لیے وہ زیادہ سخت جان ثابت ہوئی۔ ان کی رومانی اور جمالیاتی تحریریں ایک لحاظ سے اس دور کے مذہبی حبس اور روایاتی انداز فکر کے خلاف اعلان بغاوت تھیں۔ اپنے انوکھے اسلوب کے اعتبار سے بھی اور فکر کے اعتبار سے بھی۔ لیکن نیاز صاحب کی اس تمام بغاوت کے پیچھے ہمیں مذہب کی بنیادی اقدار سے کوئی انحراف یا عداوت نہیں ملتی بلکہ رومان اور جمالیات کا رنگین نقاب ہٹا کر اگر دیکھا جائے تو ہمیں اس وقت بھی ان کی تحریروں میں ایک حسین مگر مقدس چہرہ ملتا ہے۔ نیاز صاحب ہمیں اس دور کے ایک جدید صوفی کے لباس میں نظر آتے ہیں۔ قدیم ہندوستان اور یونان کے اصنام میں انھوں نے اسلام کی روح کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ نیاز صاحب کی بنیادی فکر جن عناصر سے ترکیب پائی ہے ان میں مذہب اور حسن پرستی کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ اور یہ حسن پرستی خود ایک مذہب بن کر ان کے یہاں ابھری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آگے چل کر رفتہ رفتہ جب وہ تجربات اور پختہ فکر کی منزل سے گذرنے لگے تو ان کی حسن پرستی سمٹ کر مذہب میں آگئی۔ اور وہ چہرہ جو ان کی تحریروں میں پہلے حسین اور مقدس نظر آتا تھا۔ صرف مقدس بن کر رہ گیا بلکہ اب اس کے خدوخال میں زندگی کی خشکی بھی کہیں کہیں نظر آجاتی ہے۔

بہر حال نیاز صاحب کا وہ دور جو "جمالستان اور نگارستان" سے شروع ہوتا ہے، بڑا ہنگامہ خیز رہا ہے۔ اس دور میں وہ کئی محاذ پر لڑتے رہے اور بڑی بے جگری کے ساتھ! ۔ مذہب کے فرسودہ اور رسمی تصورات سے انھوں نے ٹکر لی۔ معاشرے کی تنگ نظری کے خلاف انھوں نے آواز اٹھائی۔ تاریخ کی بے جان تاویلات کو انھوں نے ہدف بنایا۔ ادب کو نئے عنوان سے پڑھنے اور سمجھنے کی تبلیغ کے سلسلے میں انھوں نے ادبی معرکوں میں قدم رکھا۔ ان تمام محاذوں پر وہ مدت تک لڑتے رہے اور اس طرح ان کی مجموعی جدوجہد نے اس دور کی آزادیٔ فکر کو آگے بڑھانے اور نڈر بنانے میں بڑا کام انجام دیا ہے۔ ان کی تحریریں کبھی طنز بن کر ہمیں چونکاتی رہیں کبھی المیہ افسانوں کی صورت میں ہمارے اندر دردمندی پیدا کرتی رہیں۔ کتنے دریچے ان کی تحریروں سے کھلتے نظر آتے ہیں ان دریچوں سے ان کی تحریریں اس وقت کے نئے لکھنے والوں کے دماغوں میں تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح در آئی تھیں۔

نیاز صاحب کی تحریروں نے آج سے نصف صدی پہلے کے بدلتے ہوئے معاشرے کا تقریباً ہر پہلو سے جائزہ لیا ہے تاریخ، ادب، جنس، مذہب خواہ کسی موضوع پر وہ لکھ رہے ہوں۔ ان کی تنقیدی نظر برابر کام کرتی رہتی ہے۔ ان کی تحریروں کا غالب جوہر غالباً تنقید نگاری کی صورت میں ابھرتا ہے۔ ادبی تنقیدوں میں انھوں نے عموماً بت شکنی سے کام لیا ہے۔

لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک بت کو توڑ کر انھوں نے اس کی جگہ "حسن خلیل" کو کھڑا کیا۔ وہ بعد میں علی اختر حیدر آبادی ثابت ہوا۔ نیاز صاحب کی تنقیدیں شاعر یا ادیب کی صرف فکر ہی نہیں بلکہ زبان و بیان کا بھی محاکمہ کرتی ہیں۔ اور اس طرح وہ اس بڑی کمی کو پورا کر دیتی ہیں جو ہمیں آج نئے ناقدوں میں کبھی کبھی محسوس ہوتی ہے۔ ہمارے نئے ناقد تنقید کے اس فنی شعبے سے کم واقف ہیں جہاں زبان کے حسن و قبح سے بحث کی جاتی ہے۔ نیاز صاحب نے ایک واقف کار تنقید نگار کی حیثیت سے ادب کا دونوں پہلوؤں سے جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے خواہ وہ معاصرین ہوں یا نئے لکھنے والے۔ دونوں کو ان کی لغزشوں پر ٹوکنے میں کہیں بخل سے کام نہیں لیا ہے۔ نیاز صاحب تعریف و تنقیص دونوں میں بخل سے کام لینے کے قائل نہیں ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی زبان کا محتاط انداز اور پنہاں طنز کی کرشمہ سازی کی بنا پر ان کی رائے دوسروں کی نظر میں بخل سے کام لیتی معلوم ہو۔ اردو تنقید نگاری نے ان سے تنقید کا مدبرانہ اور ٹھہرا ہوا لہجہ سیکھا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نیاز صاحب کی تحریر میں جا بجا ایک طرح کی خود نمائی اور ادعا پایا جاتا ہے۔ یہ چیز ان کی شروع کی تحریروں میں زیادہ تھی۔ اب تقریباً معدوم ہو چکی ہے لیکن ان کی تحریر کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ قاری کو اپنی بات کا یقین دلاتی (CONVINCING) معلوم ہوتی ہے ان کی عبارت میں متانت، جا بجا طنز اور ایک چھپا ہوا سنجیدہ آہنگ پایا جاتا ہے۔ وہ ہر موضوع پر یکساں چابکدستی کے ساتھ لکھنے پر قادر ہیں۔ اور ہر موضوع ان کی تحریر میں ڈھل کر ان کی شخصیت بن جاتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ اس دور کے ان چند لکھنے والوں میں سے ہیں جو اپنا ایک اسلوب رکھتے ہیں۔ نیاز صاحب کا یہ اسلوب تحقیقی، فنی اور علمی مضامین میں بھی کھپتا ہے اور ادبی اور تخلیقی مضامین کی مدح سے بھی ہم آہنگ ہے۔ بنیادی طور پر اس اسلوب میں ادبیت زیادہ ہے اور تحقیقی مزاج کی بے کیفی اس پر غالب نہیں آسکی

نیاز صاحب کے اسلوب میں "گورکنی" کی خو کم ہے اور زندگی سے دلچسپی لینے کا حوصلہ بہت ہے۔ اسی لیے جب نیاز صاحب تحقیقی "گورکنی" کی طرف بھی آتے ہیں تو بہت سے مردے ان کے مسیحا نفس قلم سے جی اٹھتے ہیں۔ ان کی عبارت کا لطف، ان کا "قم باذنی" قسم کا لہجہ خشک مباحث کو بھی گوارہ بنا دیتا ہے۔ بات یہ ہے کہ وہ ادیب پہلے ہیں اور محقق بعد کو۔ اسی لیے وہ ایسے محقق ہونے سے صاف بچ گئے جو زندہ ادب کو بدگمانی کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ نیاز صاحب کی شخصیت ایک وسیع احاطے کی صورت میں نظر آتی ہے۔ جس کے ایک حصے میں تحقیق کا "کلبۂ احزاں" بھی بنا ہے۔ مگر دوسرے حصے میں خوشنما باغات بھی ہیں۔ جہاں صاف ہوا ملتی ہے۔ جہاں طرح طرح کے پھول کھلے ہیں۔ اور طرح طرح کی عمارتیں ہیں۔ یہاں مختلف قسم کے آدمیوں کی بات چیت سنائی دیتی ہے۔ موت کا سناٹا نہیں ہے۔ نیاز صاحب کی شخصیت کا یہ حصہ زیادہ پر معنی اور پائیدار ہے۔ اگر ہم ان کے تخلیقی ادب کو بالائے طاق رکھ کر ان کی تحقیقات ہی کو ان کا اصل سرمایہ سمجھ لیں تو پھر نیاز صاحب کی شخصیت کا کوئی نقش مشکل ہی سے ہمارے ذہن میں ابھر سکتا ہے نیاز صاحب کی شخصیت اپنے "جزو" میں نہیں "کل" میں پوری اہمیت کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ وہ افسانہ نگار ہیں، ناول نگار ہیں (اگر شہاب کی سرگذشت کو ناول کہا جا سکتا وہ طنز نگار ہیں، تنقید نگار ہیں۔ ان تمام چیزوں سے مل کر ان کی شخصیت تعمیر ہوتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ اردو افسانہ نگاری میں بڑا نام پریم چند کا ہے ناول نگاری میں رسوا۔ پریم چند، قرۃ العین حیدر (جی ہاں قرۃ العین حیدر!) بڑے نام ہیں یہ سچ ہے کہ طنز نگاری میں رشید احمد صدیقی منفرد ہیں۔ یہ بھی کچھ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ آج تنقید نگاری پختہ فکری کے لحاظ سے بہت آگے بڑھ چکی ہے۔ مگر سوال نیاز صاحب کو الگ الگ کر کے دیکھنے کا نہیں ہے بلکہ مجموعی طور پر ان کی شخصیت کا جائزہ لینے کا ہے۔ اگر ہم مجموعی طور پر ان کی شخصیت کو دیکھیں تو تحقیقی اور تخلیقی دونوں قسم کے ادب میں نیاز صاحب کی جامعیت کا دوسرا آدمی نظر نہیں آتا۔

نیاز صاحب کی شخصیت اردو ادب میں پہلے ایک تحریک بن کر ابھری اور آج وہ ایک ادارے کی حیثیت رکھتی ہے اس لحاظ سے وہ ہمیں عبدالحق کی یاد دلاتے ہیں۔ عبدالحق نے ہمیں انجمن ترقی اردو دی۔ نیاز صاحب نے "نگار" دیا۔ اور اسی کے ساتھ نگار میں لکھنے والوں کا ایک پورا حلقہ اس حلقے کے بعض افراد آج اردو ادب میں بڑی اہم جگہ رکھتے ہیں۔ اس لحاظ سے نگار نے ہمیں زندہ ادیب دیئے۔ دوسری حیثیت سے نیاز صاحب ہمیں عبدالحق سے بلند مقام پر نظر آتے ہیں۔ ان کا ادبی سرمایہ بہت بڑا ہے اور نسبتاً زیادہ قدر و قیمت رکھتا ہے۔

ادب حقیقتاً ایک ریکارڈ ہے ان تمام تجربات و احساسات کا جن سے ایک انسان اپنی زندگی میں دوچار ہوتا ہے۔ گویا بالفاظ دیگر یوں کہہ سکتے ہیں کہ ادب زندگی کا اظہار ہے۔ الفاظ کے ذریعہ سے اور اس لئے جس طرح ادب کی تخلیق زندگی سے ہوتی ہے اسی طرح زندگی کی تخلیق بہت کچھ ادب پر منحصر ہے۔

ہرچند اقوام کے مختلف خصایص، افراد کے مختلف مزاج اور ملکوں کے مختلف سیاسی و معاشرتی حالات ادب کی مختلف شکلیں پیدا کرتے رہتے ہیں، لیکن ان میں ادب کی کوئی شکل ایسی نہیں ہے جس میں رواج انسانی کا اظہار نہ کیا گیا ہو، جس میں میلانات حیات کی تشریح نہ کی گئی ہو اور تجربات زندگی کے تجزیہ سے جس میں کوئی نہ کوئی نتیجہ خیز بات نہ پیش کی گئی ہو۔

تصنیف ادب نہ صرف اس لحاظ سے اہم ہے کہ وہ ہمارے جمالیاتی ذوق کو پورا کرنے والا ہے بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ قوم کے ایک تخلیقی ادب (Greatine Litratuare) کا صحیح اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ وہ فنون ہوں یا ادبیات، لطافت سے ان کو اسی وقت نسبت دی جا سکتی ہے جب کوئی قوم انتہائی عروج پر پہونچکر محض جذبات کے لئے زندہ رہنا چاہتی ہے اور ادب کا ذوق ایک قوم کی تاریخ میں اس وقت پختہ ہوتا ہے جب وہ تنازع البقا کی منازل سے گزر کر اپنے جسمانی اور ذہنی خستگی دور کرنے کے لئے سکون کی طلبگار ہوتی ہے اور چونکہ جمالیاتِ قومی کا یہ دور صرف نزاکت خیال سے تعلق رکھتا ہے اس لئے ہم ایک قوم کے ادب لطیف کو دیکھ کر بآسانی سمجھ سکتے ہیں کہ کارزار عالم میں کتنی مصیبتیں جھیلنے کے بعد اس نے کتنی جلا ذہنی حاصل کی اور اس کے احساس، جذبات کی نزاکت و خیال اس کی زندگی کے کن کن نشیب و فراز کی ممنون ہے۔

(نیاز)

---

*

افسانہ نگاری: اس سے قبل افسانہ نگاری نام تھا صرف خیال سے لذت اندوز ہونے کا لیکن اب وہ عملی زندگی کی چیز ہے۔ پہلے صرف تصور سے کام چل جاتا تھا جس کے لئے مخصوص فرصت درکار تھی۔ اور اب معاملہ "حقائق" کا ہے جن کے لئے خاک چھاننا ضروری ہے۔

(نیاز)

*

نگارشات نیاز پر ایک نظر

فضل حق قریشی دہلوی

لوگوں سے سنا ہے، کتابوں میں پڑھا ہے کہ جب سندباد جہازی رُخ کے پنجوں میں بندھ کر ایسے جزیرے میں پہنچا جس کی زمین کا چپہ چپہ لعل و یاقوت او نیلم و پکھراج سے پٹا پڑا تھا تو لالچ کی تیز آنچ اس کے سینے میں بھڑک اٹھی اور اس نے دوڑ کر اپنی جیبیں ان جواہرات سے بھر لیں جو اس کے قدموں کے قریب بکھرے پڑے تھے لیکن جب وہ آگے بڑھا تو بہتر قسم کے اور جواہرات دکھائی دیئے اس نے فوراً اپنی جیبیں خالی کیں اور ان کو دوبارہ اپنی دانست میں بعد کی بہترین اشیا سے بھر لیا لیکن وہ جوں جوں آگے بڑھتا رہا، یہی صورت پیش آتی رہی حتیٰ کہ غروب آفتاب کے وقت تک اسے کئی بار اپنی جیبیں بھر بھر کر خالی کرنی پڑیں اور انجام کار وہ ایک خلش پیہم میں مبتلا ہو کر یہ فیصلہ قطعی نہ کر سکا کہ کون سی چیز اپنے ساتھ لے اور کسے نظر انداز کر دے۔ وہاں کی ہر چیز اس کے لئے جاذب نگاہ تھی۔

بالکل یہی صورت نیاز کی بلند نگارشات پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ سب سے پہلے منظومات کا جائزہ لیا جائے لیکن نظموں او غزلوں کی تعداد بہت کم ہے، اس لئے نثر کے میدان کو زیادہ وسیع و بسیط پا کر توجہ خود بخود اس طرف مبذول ہو جاتی ہے۔ اس ضمن میں حسن و عشق کی جادو اثر رومانوی افسانوں کے جال میں پھنساتی ہے تو دیویوں اور دیوتاؤں کی الوہیت دامن خیال کو ضیائی کہانیوں کی طرف کھینچ لیتی ہے۔ مزاح لطیف اپنا رنگ دکھاتا ہے تو طنزیات کی شوخیاں اور تلخیاں اپنے مقابلے میں اسے جمنے نہیں دیتیں۔ اصلاحی افسانے کہتے ہیں کہ ہم سے بھی کچھ سیکھئے تو تاریخی قصے اپنی اولیت کا دعویٰ پیش کرتے ہیں۔ انتقادات کا پہلوان سب پر تبصرہ کر کے اپنا لوہا منواتا ہے تو تحقیقات کے ساتھ روح کی گہرائیوں میں پہنچ کر اپنا سکہ بٹھانے لگتے ہیں مذہبیات کی دنیا ان سب سے نرالی معلوم ہوتی ہے جس کی ساری فضا زاہدان تنگ نظر اور کافران وسیع خیال کے باہمی تنازع سے معمور دکھائی دیتی ہے، غر یہ ہے کہ ہر اسلوب "جا ایں جا است" کہہ کر "دامن دل" کھینچتا ہے اور پہلے آپ کے لکھنوی انداز سے قطع نظر ہو کر "پہلے میں" کا نعرہ لگانے لگتا

ان ہمہ گیر خوبیوں کے ہوتے ہوئے مغرب کے ادب نواز کار لائل کا فیصلہ یاد آتا ہے جس نے کہا تھا کہ اگر شیکسپیئر کے ڈرامے ایک طرف اور برطانیہ کے تمام مقبوضات دوسری طرف رکھ کر ہمیں صرف ایک چیز کے انتخاب کا موقع دیا جائے تو ہم بلا تامل حکومت و سلطنت کو ٹھکرا کر شیکسپیئر کے کلام کو پسند کر لیں گے کیونکہ وہ ہماری قوم کے نام و نمود کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے۔ بالکل اسی طرح اگر یہ سوال ہمارے ملک میں اٹھے اور شیکسپیئر کے ڈراموں کی بجائے نیاز کی نگارشات کو موضوع بنایا جائے تو کون خرد دماغ ہوگا جو یہ نہ کہہ دے کہ ہمیں نگارشات نیاز درکار ہیں کیونکہ ان کے ہر جملے میں وہ ذہنی آزادی او بیداری کروٹیں لیتی نظر آتی ہے جو سیاسیات کی دنیا میں یا کہیں اور میسر آنی ممکن نہیں۔

نگار کے صفحات یا ان مجموعوں پر جن کو نیاز اس وقت تک مرتب کر چکے ہیں، سرسری نظر ڈالنے کے بعد یہ اندازہ لگا لینا آسان ہے کہ ان کی ہمہ گیر و جدت پسند طبیعت اور نادر خیالات کی ضوفشانیوں میں ان کا زور قلم مختلف موضوعات پر ایسے ایسے کمالات دکھا چکا ہے کہ ہر نقش تحریر کا مطالع کرنے کے بعد عقل انسانی ورطۂ استعجاب میں غرق ہو جاتی ہے اور نیاز کی اعلیٰ قابلیت کا لوہا ماننا پڑتا ہے۔ ان الفاظ کی نئی نئی ترکیبوں، تشبیہوں اور استعا

کے حسین امتزاج سے انہوں نے عبارت کو اس درجہ دلپذیر بنا دیا ہے کہ اس کی جادو اثری صرف انہی کا حصہ ہو کر رہ گئی ہے۔

ان ہمہ گیر خوبیوں کو تسلیم کرنے کے بعد نیاز کی کسی خاص طرزِ نگارش کو فوقیت یا ترجیح دیتے ہوئے اس پر اظہارِ خیال کرنا آسان کام نہیں ہے۔ تاہم ان کی افسانہ نگاری پر سب سے پہلے نظر ڈال لی جائے تو دشوار کام کسی قدر آسان ہو جاتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ نیاز کی افسانہ نگاری نے اس وقت اپنا رنگ جمایا جب کہ دنیا پہلی جنگ عظیم کی تباہ کاریوں اور بعدِ جنگ نازل ہونے والے قحط کی اندوہناکیوں کے باعث ایک معمورۂ غم بنی ہوئی تھی اور اس وقت ضرورت تھی کہ اگر جسم کے لئے پوری خوراک ممکن نہیں تو کم سے کم دل و دماغ کے لئے صحیح غذا ہی میسر آ جائے تاکہ روحانی سکون و طمانیت حاصل کرنے کے بعد دماغ کی قدرتی صلاحیتیں ان مسائل کی عقدہ کشائی کر سکیں جن پر ایک قوم کی فلاح و بہبود منحصر ہوتی ہے۔ پھر یہی نہیں کہ نیاز نے لطیف قصوں کی رنگین فضا دکھا کر خاموشی اختیار کر لی ہو، بلکہ انہوں نے قوم کو خوابِ گراں سے بیدار کر کے اس حقیقت و واقعیت سے دوچار کیا جس کے بغیر اصلاح و ترقی ممکن نہیں ہو سکتی۔ یہ رنگ ان کی نگارشات کے دوسرے باب میں نمایاں طور پر اپنی جھلک دکھاتا ہے۔

آج سے تقریباً پینتیس سال پہلے جب کہ دنیا میری نگاہ میں صرف بقدر بیس سال جوان تھی اور ادبی نزاکتوں کی سوجھ بوجھ کا کچھ زیادہ مادہ مجھ میں پیدا نہیں ہوا تھا، میں دہلی کی ہارڈنگ لائبریری کے ایک پُرسکون گوشے میں خاموش و مبہوت بیٹھا اِن تاثرات کی گہرائیوں میں گم تھا جو علامہ نیاز کے قلم سے لکھے ہوئے رنگین افسانے "کیوپڈ اور سائیکی" کو پڑھنے کے بعد طاری ہوئے تھے۔ میں اس افسانے کی رنگین فضا اور حسنِ بیان کی رنگین لطافت میں اس درجہ غرقِ تحیر تھا کہ مجھے اپنے اردگرد کا مطلق احساس باقی نہ رہا تا وقتیکہ دار المطالعہ کے چوکیدار نے مجھے جھنجھوڑ کر اس خوابِ بیداری سے چونکا دیا۔ مجھے خواہ مخواہ اس پر غصہ آنے لگا کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ اعلیٰ قسم کی نگارشات کو شروع سے آخر تک پڑھے بغیر ترک کر دینا طبیعت پر ہمیشہ گراں گزرتا ہے۔ پھر جب میں لائبریری سے نکل کر باغ کی روش پر پہنچا تو میرے قدم ڈگمگا رہے تھے اور تمام جسم پر وہ لطیف سی کیفیت طاری تھی جو اعلیٰ شراب پینے یا اچھی صورت دیکھنے کے بعد ہی ممکن ہو سکتی ہے۔

یہ اس زمانہ کا ذکر ہے جبکہ مبلغ علم زیادہ وسیع نہ ہونے کے باعث میں اس رنگین عبارت میں استعمال ہونے والے بہت سے لفظوں کے معنے اور بعض جملوں کا صحیح بھی سمجھنے سے قاصر تھا اور اب جب کہ اس کا عمیق تاثر تمام جزئیات کو پوری طرح سمجھ لینے کے بعد میرے دل و دماغ پر حد درجہ حاوی ہے تو میں اکثر تنہائی کے لمحات میں سوچا کرتا ہوں کہ اگر نیاز "کیوپڈ اور سائیکی" کے علاوہ کوئی اور چیز قلمبند نہ کرتے تب بھی انکو دنیائے ادب میں ایک ممتاز مرتبہ حاصل ہوتا۔ ارباب ذوق میری اس رائے سے یقیناً متفق ہوں گے۔

"کیوپڈ اور سائیکی" اور اسی نوع کے دوسرے افسانے رفعتِ خیال اور حسنِ بیان کے اعتبار سے نہایت بلند ہیں۔ ان میں بیک وقت شاعری، مصوری اور موسیقی کا امتزاج بدرجۂ اتم محسوس ہوتا ہے۔ برسبیل تذکرہ ایک ادبی پارہ ملاحظہ ہو جس میں اس دعوے کا ثبوت بیّن طور پر موجود ہے:

> "اپنی آنکھوں کی وہ شراب جو ابھی ابھی تیری لانبی سیاہ پلکوں کی آغوش میں سو رہی تھی اور اب صبح کے وقت تیری بادہ خوار آنکھوں کے چاروں طرف پھیلے ہوئے سرمہ کی صورت میں پڑی چھلک رہی ہے، مجھے نہ پلا۔ ہر چند میری روح تیری نگاہوں کے ان ہلکے ہلکے جرعوں کے لئے تشنہ ہے، مگر یہ تشنہ ہی رہے گی، کیونکہ انہیں ہر شخص چکھ سکتا ہے اور میں اس لذت کو صرف اپنے لئے مخصوص کرنا چاہتا ہوں۔
>
> اپنی جوانی کا وہ نشہ جو تیرے بستر کی شکنوں پر ہر شخص کو میسّر آ سکتا ہے، مجھ پر نہ ڈال۔ یہ کہرا کے وقت آسودگیٔ خواب کی وجہ سے تیرے خونِ صالح کی اور زیادہ پھوٹ نکلنے والی سرخی، وہ تیرے گالوں میں بھرا ہوا رنگِ شباب جس کو میں بلورِ شعلہ رنگ یا شعلۂ بلوریں کہہ سکتا ہوں ——— اور پھر وہ تیرے سینے پر دہرائے ہوئے آنچل کے پلو کا چہرے تک پہنچ جانا اور وہاں اس کی زرین باریک جھالر کا دمکتے ہوئے چہرے پر برقی روشنی میں جھل مل ہونا، اس میں ایک روشن تھرتھری پیدا ہونا ——— آہ، کیا قیامت ہے کہ تم ان چیزوں کے سامنے بھی مجھ سے میرے ایمان، میرے صبر و تقویٰ، میری متانت و سنجیدگی کی قیمت پوچھتی ہے، تجھے کیا خبر کہ اس وقت میں انہیں کس قدر ارزاں دیدینے کے لئے بیتاب ہو جاتا ہوں۔

ان سطور میں تشبیہ و استعارات کی پختگی، تاثرات و جذبات کی فراوانی، مشاہدات کی گہرائی اور حسنِ بیان کی روانی، غرض انشائے لطیف کے جملہ لوازمات کو کچھ اس خوبی کے ساتھ سمو کر ہم آہنگ کیا ہے کہ تعریف نہیں کی جا سکتی اس کلامِ موزوں کو پڑھنے کے بعد عقل یہ تسلیم کرنے کے لئے زور دیتی ہے کہ اسے نثر کا ٹکڑا نہیں بلکہ ایک مرصع غزل سمجھا جائے۔

اگر بعض منکرین کے قول کے مطابق یہ تسلیم کیا جائے کہ شعر کے لئے وزن اور ردیف و قافیہ کی ضرورت نہیں بلکہ ہر شاعرانہ اندازِ بیان ایک مکمل شعر کہلا سکتا ہے تو لا محالہ یہ بھی ماننا پڑیگا کہ نیاز کا ہر افسانہ بلحاظ رنگینیٔ بیان ایک نظم ہے — ایک ایسی نظم جس پر سے متقدمین شعرا کا کلامِ موزوں قربان کیا جا سکتا اور یہ تسلیم کر لینے کے بعد صنفِ سخن کے جملہ لوازمات کو ملحوظ رکھتے ہوئے نیاز کے افسانوں کا جائزہ لینا پڑیگا یہ معلوم کرنے کے لئے کہ وہ اس کسوٹی پر کس حد کھرے ثابت ہوتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ شاعری میں تین چیزوں کا ہونا ضروری ہے — محاکات، تخیل اور حسنِ بیان — اور ان کا بیک وقت اجتماع کلامِ شاعر کو چار چاند لگا سکتا ہے۔ نیاز کے رشحاتِ قلم میں یہ تینوں خوبیاں موجود ہیں اور اس وقت انہی پہلوؤں پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالنی مقصود ہے۔

شاعری میں محاکات دراصل اس لفظی مصوری کا نام ہے جس کے ذریعہ کسی واقعہ یا موقع کی صحیح تصویر نگاہوں کے سامنے غیر مرئی رنگوں سے بنا کر اس طرح پیش کر دی جائے کہ پڑھنے یا سننے والے کا ذہن واضح طور پر اس کا ادراک کر سکے۔ نیاز کے افسانوں پر سرسری نظر ڈالنے سے ایسی صدہا مثالیں مل سکتی ہیں۔ ایک لطیف نمونہ ملاحظہ ہو۔ ایک خاص مقام پر صنفِ نازک کی رنگینی کا زبردست اجتماع ہے۔ تمام عورتیں "دشمنِ ایمان و آگہی" کی — تصویر بن کر اور خوب سنور کر آتی ہیں۔ فرماتے ہیں!

"وہ ہلکی ہلکی ریشم کی ساریاں اور ان ساریوں کے آنکھوں کو خیرہ کر دینے والے زرکار پلو، وہ صدف آسا کانوں میں رنگین رخساروں سے چھو کر کانپ کانپ اٹھنے والے آویزے اور ان آویزوں کے وہ درخشاں و تابندہ الماس، وہ پیشانیوں کی محدود و مختصر فضا میں ناقابلِ شمار اداؤں سے گیسوؤں کی آرائشیں اور ان آرائشوں کی وہ مبہوت و دیوانہ بنا دینے والی نکہت باریاں — یہ معلوم ہوتا تھا کہ آج یہ قلعۂ زمین پر لگا کر اڑ جائے گا۔"

لطف یہ ہے کہ اس ادبی پارے میں عورت کا ذکر صاف لفظوں میں بالکل نہیں کیا گیا، بلکہ محض ساریوں، ان کے پلوؤں، صدف آسا کانوں، رخساروں، پیشانیوں اور گیسوؤں وغیرہ کی دلکش زینتوں اور ان کی جمالیاتی کیفیتوں سے اس کا تعین کیا گیا ہے جو حد درجہ لطیف اور نادر پیرایۂ بیان ہے۔

ایک محفلِ رقص و غنا کی تصویر پیش کرتے ہوئے نرت کی کیفیت اور گانے کے انداز کو پوری جزئیات کے ساتھ اس درجہ مکمل حالت میں بیان کیا ہے کہ ناظر اور سامع، دونوں قوتیں اس کیفِ عمیق میں ڈوب کر پورا لطف اٹھانے لگتی ہیں، ملاحظہ ہو!

"یہ وقت وہ تھا جب وہ رقص کے لئے آمادہ ہو کر دونوں ہاتھوں کو ملائے ہوئے عرف گھونگروؤں میں ساز کے ساتھ جنبش پیدا کر رہی تھی۔ یہ جنبش اس کی نازک کمر اور حسین گردن میں ہلکی سی موج پیدا کرتی ہوئی مقیش کی اس جھالر میں جا کر قرار لیتی تھی جو سفاکانہ بانکپن کے ساتھ اس کے گوشۂ ابرو پر پڑی ہوئی مچل رہی تھی۔ وہ اسی طرح اپنے پاؤں کو جنبش دیتی رہی، وہ اسی طرح ارتعاشِ خفی کا افسوں اپنے جسم کے ہر ہر ریشے سے پیدا کرتی رہی، یہاں تک کہ کی ساری فضا اس کیفیت سے معمور ہو گئی اور ہر دیکھنے والے کی روح اس لرزش سے بیتاب۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ شانے کی سطح تک لا کر کئی جگہ نشیب پیدا کرتے ہوئے ایک طرف سیدھا کر دیا اور نرم و نازک کلائی میں ایک ہلکا سا بل نمایاں کرتے ہوئے ہاتھ کی انگلیوں کو ان کی پوری درازی تک تان کر پنجہ کو اس طرح ڈھیلا چھوڑ دیا جیسے اس کو کسی نے دکھا دیا ہو۔ وہ آگے بڑھی لیکن چاندنی کی طرح غیر محسوس طور پر، وہ پیچھے ہٹی لیکن سائے کی طرح غیر معلوم طریقے سے — اس نے اپنا بایاں ہاتھ الٹ کر سر پر رکھ لیا اور اپنی لانبی گردن میں خفیف سا متکبرانہ خم، سر میں ہلکی سی مغرورانہ کشش، ابروؤں میں ایک سفا

بانکپن اور آنکھوں میں شاہانہ استغنا ظاہر کر دینے والی نیم خوابانہ کیفیت پیدا کر کے دیر تک اہلِ محفل کے صبر و ضبط کا امتحان لیتی رہی۔ اور پھر ایک فاتحانہ تبسم کے ساتھ اس نے ایسے نغمے کی ابتدا کی جو یکسر تصویرِ شباب و مستی تھا۔ اس کی آواز، جس میں علاوہ کششِ نسائی کے تکمیلِ فن کی بھی پوری جاذبیت موجود تھی، بلند ہوئی اور موسیقی کی وہ لذتیں جو ایک پُرشباب حسن ہی کی طرف سے پیش کی جا سکتی ہیں، اس کے ایک ایک بول سے فضا میں منتشر — ہونے لگیں جس وقت وہ اپنی آواز میں — اس آواز میں جو سُننے والوں کی ایک ایک رگ میں جھنکار پیدا کر رہی تھی، نشیب — پیدا کرتے کرتے آہستہ آہستہ سرگوشی کی حد تک کھینچ لاتی تو معلوم ہوتا تھا کہ روح اس گم ہو جانے والے نغمے کی جستجو میں باہر نکل جانے کو ہے۔ اور جب اس کی بلندی کو گونج کی حد تک کھینچ لاتی تو ہر شخص محسوس کرتا کہ شاید اب سازوں کے تار ٹوٹ جائیں گے اور تھیٹر کی دیواریں شق ہو جائیں گی۔“

اس طویل شہ پارے کے بہت سے پہلوؤں پر فاضل ادیب کے ہمہ گیر و جزرس اندازِ بیان سے خود بخود روشنی پڑتی چلی گئی ہے اور اس لئے مزید حاشیہ آرائی کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ تاہم بعض باتوں پر داد دینے کے انداز میں اظہارِ خیال ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ سکوتِ سخن شناس کا الزام عائد نہ ہونے لگے۔

ایک گہری نظر ڈالنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ اس ٹکڑے میں ناچ اور گانے کی دلپذیر اداؤں کو پیش کرنے کے علاوہ نیاز نے رقاصہ کے ذہنی تاثرات کا نفسیاتی تجزیہ بھی کر دکھایا ہے۔ یہ عام بات ہے کہ کمالِ ہنر کے ساتھ ساتھ ہر فنکار میں غرور و نخوت اور ایک قسم کی بے نیازی پیدا ہو جاتی ہے اور محفل میں مظاہرۂ فن کرنے کے وقت تمام حاضرین کو اپنے مقابلے میں حقیر و ذلیل جان کر قدرتی طور پر ایک شانِ استغنا ظاہر کی جاتی ہے۔ اس کے برعکس سامعین پر جو کیفیت گزر رہی ہے، اُسے بھی نظر انداز نہیں کیا گیا اس رنگِ تغافل کی توقع نیاز جیسے باریک بیں اور صاحبِ نظر ہی سے ممکن ہو سکتی ہے۔ علاوہ ازیں سُروں کے زیر و بم کے ساتھ ایک بار روح کا اس سرگوشی کی حد تک گم ہو جانے والے نغمے کی جستجو میں نکلنے لگنا اور پھر بلند ہو جانے کے بعد لوگوں کا یہ محسوس کرنا کہ شاید اب سازوں کے تار ٹوٹ جائیں گے، اس قدر عین فطرت ہے کہ اسے ہرگز فریبِ احساس یا مبالغہ آرائی سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ نیاز چونکہ پاکیزہ ذوق رکھنے کے ساتھ ساتھ خود بھی ایک اچھے ماہرِ موسیقی اور نقادِ فنِ رقص ہیں، اس لئے ان باریکیوں کو کماحقہ سمجھ سکتے ہیں۔ اس حقیقت کو تسلیم کر لینے کے بعد یہ راز بھی خود بخود کھل جاتا ہے کہ نیاز کی تحریر میں اس قدر شگفتگی اور دلآویزی کس سبب سے موجود ہے۔

محاکات کے ضمن میں کسی شخص کے حلیے یا کسی خاص مقام کے قدرتی منظر کو بھی کافی اہمیت دی جا سکتی ہے۔ اگر حلیہ لکھتے وقت تمام جزئیات کو مدِ نظر رکھا گیا ہے تو اس شخص کی ذہنی تصویر ہی نگاہوں کے سامنے نہیں آتی بلکہ ہم اس کے ذوق و شوق، عادات و اطوار، چال چلن بلکہ مشاغلِ حیات تک کی بابت آسانی سے رائے قائم کر سکتے ہیں۔

نیاز کے قلم کے لکھے ہوئے حلیے زیادہ تر مضحک یا طنزیہ ہوتے ہیں اور حقیقتاً معمولی خد و خال یا عام وضع قطع کی ترجمانی ادب میں کوئی لطفِ خاص پیدا نہیں کرتی۔ نیاز کو اس ضمن میں یہ کمال حاصل ہے کہ چند لفظوں میں پوری شخصیت کو اس طرح واضح کر دیتے ہیں کہ کسی تعارف کے بغیر یہ اندازہ لگا لینا آسان ہو جاتا ہے کہ یہ ذکرِ خیر کس ہستی یا جماعت کے کس رُکن کا ہو رہا ہے۔ مثال کے طور پر یہ الفاظ ملاحظہ ہوں:

”اس کی ہیئت وضعی، جس میں اس کا بے تکا عمامہ، الجھی ہوئی زلف (گاہے تا گوش اور گاہے تا بنا گوش) لانبی پریشان ڈاڑھی، زمین دوز بروت، سیاہ داغدار پیشانی، شیروانی نما کرتہ، نیم ساقی پاجامہ اور غیر دباغت شدہ متعفن چمڑے کا جوتا مع تسبیح و جریب و رومال اور ناسدانی کے سب کچھ شامل ہے، ایک واضح مرقعِ اختراع مستجل ہے۔“

اس کے بعد اسی قبیل کی ایک برگزیدہ ہستی سے ملئے۔ اس نوع کے لفظی خاکے کہیں کہیں مکتوبات میں اور ”نقاب اٹھ جانے کے بعد“ والے افسانوں میں بکثرت موجود ہیں۔ پڑھئے اور لطف اٹھائیے۔

”صورت دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ فطرت کا شاید اولیں نقشِ ناکام کچھ ایسا ہی رہا ہوگا۔ وہ چھوٹی چھوٹی اندر دھنسی ہوئی گول گول آنکھیں کہ کیا کوئی

پرکار سے ایسا صحیح دائرہ کھینچ سکتا ہے۔ وہ تنگی ”چشم حسود“ رکھنے والی پیشانی، وہ رخسارو، ابرو کی ہڈیوں کا افقی ابھار، وہ ٹیبل لینڈ قسم کی چوڑی چکلی ناک، وہ کچی کلیجی کی طرح کالے کالے ہونٹ اور اس پر وہ دیمک خوردہ مونچھ اور ڈاڑھی......“

ایسے حلیے کے لوگ عموماً اپنے ظاہری تقدس سے لوگوں پر اپنا اثر جما لیتے ہیں جس کا کوئی واضح سبب سمجھ میں نہیں آتا۔ اس لئے ان الفاظ کو تلمبند کر سے قبل نیاز مکتوب الیہ سے پوچھتے ہیں ”ان میں آخر وہ کون سی بات ہے جس نے آپ کو اتنا گرویدہ کر لیا ہے“ اور اس ہستی کے بارے میں خود ان کی رائے یہ ہے: ”میں نے ایسے مجرمانہ قیافہ کا انسان آج تک نہیں دیکھا۔“

موسم کی دلکش لطافتوں کے نقشے تقریباً ہر صاحب قلم نے اپنی اپنی تحریریں پیش کئے ہیں۔ لیکن نیاز نے اس ضمن میں بھی اپنی انفرادیت کو قائم رکھ ہے۔ انہوں نے عام سطح سے کسی قدر بلند ہو کر اور بالکل ہی مختلف زاویوں سے نظر ڈال کر مطالعہ قدرت کیا اور تاثرات کو ایسے حسین پیرائے میں بیان کیا ک اس کی مثال کسی دوسری جگہ ملنی مشکل ہے۔ ایک مختصر سا ٹکڑا ملاحظہ ہو۔ بظاہر اس میں کوئی خوبی محسوس نہیں ہوگی، کیفیات صبح کو شاید اس سے بھی بہتر طریقے پر دوسرے لوگوں نے پیش کر دیا ہو۔ لیکن غائر نظر ڈالنے کے بعد نیاز کی اس معجز بیانی کا لوہا ماننے پڑیگا کہ انہوں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں انسان کے ایک نہ دو پورے چار حواس کو بیک وقت متاثر کر دیا۔ لامسہ نے بہار کی خنکی محسوس کی تو شامہ نے صحرا کی عطریت۔ باصرہ کو آفتاب کی شعاعوں سے شبنم کے قطروں میں جگمگاہٹ پیدا ہو جانے کا احساس ہوا تو سامعہ کو چڑیوں کے نغموں سے فضا کے سکوت میں موسیقی کی غیر مرئی امواج کا۔ ان کی تحریر کا نمونہ حسب ذیل ہے:-

”صبح کا وقت تھا، بہار کی خنک ہوا عطریت صحرا سے لبریز آہستہ آہستہ چل رہی تھی، آفتاب کی گرم نرم شعاعیں شبنم کے قطروں میں جگمگاہٹ پیدا کر کے درختوں کو بادلے کا زریں لباس پہنا رہی تھیں اور چڑیاں اپنے نغمہ ہائے رنگا رنگ سے فضا کے سکوت میں موسیقی کی غیر مرئی امواج پیدا کر رہی تھیں۔“

محاکات کا ذکر کرتے ہوئے تشبیہ و استعارے کی نزاکتوں پر بھی نظر ڈال لینی چاہیئے۔ کیونکہ ان سے واقعہ نگاری میں رومانیت کی شان پیدا ہوتی ہے اور انشائے لطیف کا صحیح کیف اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب پھول کی اس خوشبو کی طرح جو پھول کو مرکز بنانے کے باوجود چمن کے ہر گوشے میں پھیلی رہتی ہے، ذہن انسانی بھی ایک شے کے حسن و قبح پر غور کرتے وقت اس سے مشابہہ اور ملتی جلتی چیزوں کو، جو اس سے خواہ کتنی ہی دور کیوں نہ ہوں، نظر انداز نہ کرے۔ تشبیہ اگر مکمل اور جامع ہے تو یقیناً تصور دو آتشہ کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ نیاز فرماتے ہیں:

”اس کی خاموش زندگی اس طرح گذر رہی تھی جیسے ایک سایۂ متحرک یا ایک غیر محسوس آواز بازگشت۔“

غور کیجئے۔ ایک شخص کی بے کیف و بے رنگ زندگی کو ایک سائے سے تشبیہ دینا جس کے گھٹنے اور بڑھنے کی کیفیت کا احساس بمشکل ہوا کرتا ہے یا اسے آواز بازگشت کہنا جو اصل آواز سے کہیں زیادہ مدہم۔ مبہم اور ایک حد تک بے سری ہوتی ہے۔ ایسا نادر خیال ہے کہ اس پر غور کرتے ہی زندگی کی وہ خاموشی جسے بیان کرنا مقصود ہے، متشکل ہو کر نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔ پھر اس خاص قسم کی خاموشی کو ایک آواز بازگشت سے مشابہت دینا ایک لحاظ سے حسن تضاد بھی پیدا کرتا ہے جو بجائے خود نہایت لطیف ہے۔

ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو جس میں تصور بلیغ کے ساتھ ساتھ احساس عمیق کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہے:-

”نوجوان کنیز کا زرکار سینہ بند آب رواں کی ہلکی چادر کے نیچے ایسا نظر آتا ہے جیسے شفاف موجوں کے نیچے سورج کی تڑپتی ہوئی کرنیں۔“

موجوں کی تڑپ کا اشارہ ذہن انسانی کو اس حقیقت کی طرف مبذول کرتا ہے کہ کنیز نوجوان ہے اور جوشش شباب سے اس کے سینے میں ہلچل مچی ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی، دوسری کنیز کے جمال دلنشیں کا نظارہ کیجئے:-

”دوسری کنیز جس کے عریاں شانہ و دوش پر بکھرے ہوئے سنہرے بال ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے آئینہ میں دور سے کسی آبشار زریں کا نظارہ“

نیاز کی تحریروں میں بعض تشبیہات ایسی بھی ہیں جو مکمل ہونے کے علاوہ نہایت اچھوتی بھی ہیں اور شاید انہیں نیاز نے ایک ایسی فضا میں رہ کر تراشا ہے

جہاں دوسروں کے خیال کی رسائی بھی ممکن نہیں ہوتی۔ مثلاً آرزوؤں کی پامالی کے بعد بھی محبت کی ایک رمق کا باقی رہ جانا عین فطرت ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں ملتہب تمناؤں کی کیفیت کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں:

"جیسے پگھلے ہوئے سونے پر پانی ڈال دیا جائے اور وہ ٹھنڈا ہونے کے بعد بھی دیر تک گرم رہے۔"

یہ بات وسیع مشاہدات اور عمیق غور و فکر کے بغیر ممکن نہیں ہو سکتی۔ علاوہ ازیں پگھلے ہوئے سونے کی تخصیص کرنا ان کی بلند معیاری پر دلالت کرتا ہے۔ ورنہ وہ لوہا یا فولاد بھی لکھ سکتے تھے۔

وہ "سمندر میں چاند کے انعکاس" کو ایک "ڈبڈبائی ہوئی آنکھ کی کیفیت" سے تشبیہ دیتے ہیں۔ سمندر میں چاند کا عکس موجوں کے تموج کے باعث بالکل صاف نظر نہیں آتا بلکہ جھلملاتی ہوئی سی ایک شکل دکھائی دیتی ہے۔ اسی طرح ڈبڈبائی ہوئی آنکھ میں آنسوؤں کے پس پردہ پُتلی کچھ چھپی چھپی سی نظر آتی ہے۔ کسی اضطراری کیفیت کے ماتحت سارے جسم کے کپکپا اٹھنے کو وہ ایسی "شاخ بید" سے تشبیہ دیتے ہیں جو کسی "طائر کے اڑ جانے کے بعد دیر تک تھرتھراتی رہ جائے"۔ وہ رقص کو ایک "نغمۂ خراماں یا خرام نغمہ" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور "پیشانی کی شکن" انہیں ایک "موج بلوریں" نظر آتی ہے۔ اکثر شعراء نے جمالیاتی محبوب کو بجلی کی چمک سے تشبیہ دی ہے لیکن فضا اور ماحول کی پوری کیفیات کے بغیر اسے مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ "کیوپڈ اور سائیکی" میں نیاز نے اس رعنائی خیال کی تکمیل کی ہے۔ یعنی سائیکی جب چپکے چپکے رات کے وقت باغ میں آکر اپنا نقاب الٹ الٹ کر پھول توڑتی ہے تو بہت دور سے دیکھنے والوں کو بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کنجوں میں بجلیاں سی کوند رہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جھک کر پھول توڑنے کی حالت میں نقاب بار بار چہرے پر آپڑتا ہوگا جسے مسلسل الٹنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہوگی اور یہ بھی معلوم ہے کہ حسین عورتوں کے نقاب عموماً سیاہ ہوتے ہیں جو ظلمتِ شب کے ساتھ مل کر ان بادلوں کے ہم رنگ ہو جاتے ہیں جن کے شگافوں میں بجلی چمکا کرتی ہے۔ پھر جس طرح بجلی چمکنے کے وقت بادلوں کا تھوڑا بہت وجود محسوس ہوتا ہے، اسی طرح چہرے کے بار بار نظر آجانے پر نقاب کی حقیقت بھی واضح ہوتی ہے۔ ایسی تشبیہات - فنی اعتبار سے مکمل ہونے کے علاوہ نہایت لطیف بھی ہوتی ہیں اور جب ان پر غور کیا جائے تو روح کو ایک قسم کی تازگی سی محسوس ہونے لگتی ہے۔

محاکات میں اگر تخیل سے کام نہ لیا جائے تو بیان میں جان نہیں پڑ سکتی۔ اس سلسلے میں خاص ترتیب، تناسب اور توافق سے کام لینا پڑتا ہے۔

نیاز کی قوتِ تخیل کی کارفرمائی بعض اوقات اس درجہ عمیق ہوتی ہے کہ وہ عام مفروضات اور طے شدہ اصولوں سے الگ ہٹ کر بعض حقائق کو ایسے برعکس بلکہ ایک حد تک متضاد رنگ میں بیان کرتے ہیں کہ اگر منطقی استدلال سے کام لیا جائے تو ثبوت پیش کرنا محال بلکہ غیر ممکن ہو جائے۔ لیکن ایسے موقعوں پر چونکہ ان کا اسلوب بیان نہایت لطیف اور دلآویز ہوتا ہے، اس لئے قارئین کا دماغ اس کی صحت یا غلطی پر غور کرنے کی بجائے صرف اس کی جادو اثری سے مسحور ہو جاتا ہے اور تنقید کرنے کی بجائے سر دھننے لگتا ہے۔

تشبیہ و استعارے سے کام لیکر شعراء نے جب کبھی بلند پروازی کی اور قوتِ بیان کا اظہار چاہا، ان کے تخیل کی رفعت نپی تلی حدود سے آگے نہ بڑھ سکی نتیجہ یہ کہ اکثر تشبیہات اس قدر عام ہوئیں کہ انہوں نے ایک لحاظ سے کلیہ کی صورت اختیار کر لی۔ مثلاً عارض کو برگِ گل سے، زلف کو شب دیجور سے، ابرو کو خنجر سے، آنکھ کو نرگس شہلا سے، قامت کو سرو چمن سے، چال کو رفتار نسیم سے یا اسی انداز کے مطابق ملتی جلتی دوسری چیزوں سے مشابہت دینے کا دستور بالکل عام اور اس لئے ایک حد تک فرسودہ ہو چکا ہے۔ نیاز جو ہمیشہ عام روش سے الگ ہٹ کر اپنی راہ اختیار کرتے ہیں، تشبیہات کی دنیا میں بھی ندرت کا لحاظ رکھے بغیر نہ رہ سکے۔

وہ خیال کی معنوی نزاکتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے حسنِ تضاد پیدا کرنے کے لئے "مشبہ بہ" کو مشبہ کے تابع قرار دیتے ہیں۔ گویا ان کی نگاہِ دور رس حسن و قبح کا مرکز مشبہ بہ کی بجائے مشبہ میں قائم کرتی ہے۔ یعنی وہ عارض کو برگِ گل سے تشبیہ دینے کی بجائے یہ کہتے ہیں کہ خود برگِ گل نے تمام رعنائیاں عارضِ محبو

سے مستعار لی ہیں اور نرگس شہلا نے چشم محبوب کو دیکھ کر ہر وقت نیم وا رہنے کی کیفیت اپنے اندر پیدا کی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ منطقی استدلال سے ان مفروضات کو بھی تسلیم نہ کیا جائے لیکن تخیلات کی نگرانی میں، جہاں سرحدِ ادراک سے دُور ہزاروں بستیاں آباد کی جاتی ہیں، یہ انداز بیان نہ صرف جائز بلکہ لائقِ تحسین ہے۔ چنانچہ نیازؔ فرماتے ہیں :-

"...... وہ اس کے نازک لب جن کو دیکھنے کے بعد ہی گلاب کی ملفوف پنکھڑی کا مفہوم ذہن میں آسکتا ہے۔ ایسا سرچشمۂ حیات ہیں جن سے سیراب ہونے کے لئے جان کی قربانی حد درجہ ناقص تعبیرِ شوق ہے — وہ اس کا ملیح رنگ، جس سے آفتاب طلوعِ صباح کا استعارہ کرتا ہے — وہ اس کے سیاہ بال، جن سے برسات اپنی بھیگی ہوئی خنک رات طلب کرتی ہے — وہ خوبصورت دانت جن سے الماس اپنے سرمایۂ ضیاء کا آرزومند ہے — وہ رخسار جن سے شمع کسبِ نُور کرتی ہے......"

ان الفاظ کو پڑھنے کے بعد انسان کا ذہن پامال راستوں پر نہیں بھٹکتا بلکہ ایک نئی فضا میں اپنے آپ کو محسوس کرتا ہے، درانحالیکہ فضا کے عناصر اور ماحول کے تقاضے وہی پرانے ہیں، صرف ترتیب اچھوتی اور نادر ہے۔ سیاہ بال کو برسات کی رات سے تشبیہ دیکر ظلمتِ شب کو مبہم طریقے پر قائم رکھا ہے کیونکہ برسات کی راتیں قدرتی طور پر کالی ہوتی ہیں۔

ایسی نازک خیالیاں نیازؔ کے افسانوں میں اکثر و بیشتر موجود ہیں۔ ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو :

"جسم کی انتہائی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ وہ سانچے میں ڈھلا ہو لیکن شیریں کے قد و قامت کو دیکھ کر اسکم ایسا محسوس کرتا کہ شاید سانچے کا مفہوم اس کو دیکھنے کے بعد ہی سمجھ میں آسکتا ہے اور اس کا معیار یہی ہے کہ وہ شیریں کے قد و قامت پر ٹھیک اُترے"

تخیل کی کارفرمائی امکان نا ممکنات کی تخلیق کرتی ہے۔ حواس سے ایسے ایسے کام لئے جاتے ہیں جو ان کی قوتوں سے بعید ہوں۔ نیازؔ کا اسپ خیال اس ضمن میں بھی عجیب جولانیاں دکھا گیا ہے۔ وہ ذی حیات کو بے جان اور نظر نہ آنے والی چیزوں کو مرئی بنا کر پیش کرتے ہیں تاکہ انسان کی ایک حس کی بجائے کئی حسیں بیک وقت متاثر ہوں اور عمیق کیفیات سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کا موقع مل جائے۔ دیکھئے، عورت کی تعریف کیسے انوکھے اور نازک انداز میں کرتے ہیں کہ اس کی موجودگی کے بغیر ہی اس کے صحیح وجود کا ادراک آسان ہو جاتا ہے :

"عورت ایک روحانیت ہے قابلِ لمس، نورانیت ہے صاحبِ نطق، ایک روشنی ہے جسے ہم چھو سکتے ہیں، ایک نکہت ہے جس سے ہم گفتگو کر سکتے ہیں، ایک حلاوت ہے جو ہاتھوں سے چکھی جاتی ہے، ایک موسیقی ہے جو آنکھوں سے سُنی جاتی ہے"

اسی طرح ایک اور جگہ فرماتے ہیں :

"عورت ایک لذت ہے مجسّم، ایک تسکین ہے متشکل، ایک سحر ہے مرئی، ایک نور ہے مادّی"

ان شاعرانہ نزاکتوں کے مقابلے میں بہت سے شاعروں کا کلامِ موزوں بے آب و رنگ ہو کر رہ جاتا ہے اور یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ شعرِ منثور بھی واقعی ایک صنفِ کلام ہے۔ کیونکہ شعر کا مقصد اگر دوسروں پر اصل کیفیات طاری کرنا ہے تو وہ نیازؔ کی بے مثل نثر سے بھی ممکن ہے۔

اس انداز بیان سے ذرا مختلف لیکن لطف و نزاکت کے لحاظ سے یکساں ایک ادبی پارہ ملاحظہ ہو جس میں خاموشی ایک متکلم بلیغ بن کر آپ سے ہم کلام ہوتی محسوس ہوگی :-

"میں بعض اوقات محسوس کرتا ہوں کہ تیری خاموشی مجھ سے گفتگو کرنا چاہتی ہے۔ تیری لانبی سیاہ پلکوں کو کھول کر تیری نگاہ میرے قلب تک پہنچنے ہی والی ہے اور میں سراپا انتظار، ہمہ تن حیرت ہو کر رہ جاتا ہوں"

یہ فریبِ تخیل نہیں، فراوانیٔ جذبات کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے جسے پوری طرح سمجھنے کے لئے عام سطح سے کسی قدر بلند ہو جانا پڑتا ہے۔

نیازؔ کا حسنِ بیان مذکورہ بالا نمونوں میں اکثر جگہ اپنی جھلک دکھا چکا ہے، اس لئے اس پہلو پر علیحدہ اظہارِ خیال کی چنداں ضرورت محسوس نہیں ہوتی

تاہم ایک خصوصیت جو نیاز کے رشحاتِ قلم میں سب سے زیادہ نمایاں ہے — اور جس کی مثال اب تک کسی زاویۂ نظر سے پیش نہیں ہوئی ہے وہ کیفیت ابہام ہے جو تحریر میں قوت و زور پیدا کرنے کے علاوہ حسن و نزاکت تخلیق کرتی ہے۔

عام لوگ جن باتوں کو پوری وضاحت کے ساتھ نمایاں کر دینے کے عادی ہیں، نیاز اسی کو مبہم پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔ ایسے ابہام کی مثالیں شاعری میں تو بہت مل سکتی ہیں، لیکن نثر میں شاید نیاز کے سوا کہیں نظر نہ آئیں۔ "دنیا کا اوّلین بت ساز" علم الاصنام کے رنگ میں لکھا ہوا ایک رنگین افسانہ ہے جس کا ہیرو — زرقا — ایک بت ساز ہے۔ وہ سنگِ مرمر کی ایک چٹان سے مورت تراش کر چاہتا ہے کہ اسے جیتے جاگتے ایک پیکرِ نسائیت میں تبدیل کر دے۔ چنانچہ جب شام کی سیاہی طاری ہو جاتی ہے اور ارغوانی سائے کا دامن تمام کوہ و دشت پر پھیل جاتا ہے تو وہ آسمان و زمین کے بادشاہ کو مخاطب کر کے کہتا ہے:-

"تیرے دامن سے میں صرف تھوڑا سا رنگ چاہتا ہوں اور ذرا سی گرمی اور اگر تو عنایت کرے تو کچھ وہ چیز بھی جس سے تو جنگلوں میں پھلوں کو پختہ کرتا ہے اور سنہرا۔"

پھلوں کو پختہ اور سنہرا کرنیوالی تابشوں کا نام ظاہر نہ کرنا اور صرف قارئین کی فہمِ رسا پر چھوڑ دینا وہ اسلوبِ بیان ہے جس کی شعریت تعریف سے مستغنی ہے، پھر یہ بتلانے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کہ اس نسوانی پیکر کے کن اعضاء کو پھلوں کی مانند پختہ اور سنہرا کرنا مقصود ہے۔ اسی طرح "کیوپڈ اور سائیکی" میں حسن کی بے پناہ جاذبیتوں کو مبہم طریقے پر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"اسے کیا خبر تھی کہ جب حسن سو جاتا ہے تو کیا ہو جاتا ہے اور جب لباس بے ترتیب اور بال برہم ہو جاتے ہیں تو عورت کیا قیامت بن جاتی ہے"

سطحی نظر رکھنے والے حسن و جمال کی ظاہری زینتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے اس کا معیار قائم رکھتے ہیں لیکن جو باریک بین اور عمیق النظر ہیں، وہ اس سادہ حسن پر جان دیتے ہیں جو تصنع اور بناوٹ سے کوسوں دور ہو۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ خود صنفِ نازک تکلفات کی دلدادہ اور عواملِ رسمیہ کی پابند رہنا چاہتی ہے اور اس کی کوشش ہوتی ہے کہ منظرِ عام پر آنے سے قبل اچھی طرح نوک پلک کو درست کرے۔ البتہ سوتے وقت وہ قدرتی طور پر ان ظاہر فریبیوں سے — خالی الذہن رہتی ہے اور سو کر اٹھنے پر بھی اسے اپنے منتشر بالوں کی اصل کیفیت کا احساس نہیں ہوتا۔ ایسی حالت میں نظر آنے والے حسن کی کیفیات کو نیاز نے اس طرح بیان کیا ہے کہ پوری طرح واضح ہونے پر بھی وہ حسن کی ایک شرحِ بسیط سے کم نہیں ہے۔

کبھی کبھی نیاز اپنے لطیف خیالات کو ان پہیلیوں کی طرح پیش کرتے ہیں جن کی بوجھ انہی کے اصل الفاظ میں کہیں مضمر ہوتی ہے اور جس کو سمجھ لینا زیادہ دشوار نہیں ہوتا۔ اس قسم کی ایک مثال ملاحظہ ہو!

"تم، کہ تمہاری نگاہ سطح کے اندر سوئی کی نوک کے برابر بھی نفوذ نہیں کر سکتی — تم، کہ تمہاری دنیا لذتِ کام و دہن سے آگے نہیں بڑھتی — تم کہ تمہارے نزدیک حسن کا مفہوم ایک سطحِ رنگین سے زیادہ نہیں — تم، کہ تمہارے پندار میں محبت کا مقصود صرف اتصالِ جسم کا نام ہے — کیا سمجھ سکتے ہو کہ میں اسے کس نگاہ سے دیکھتا ہوں؟"—

کیا اس سوال کا جواب انہی الفاظ میں پوشیدہ نہیں ہے اور اس سے کہنے والے کے معیارِ حسن و عشق کا پتہ نہیں چلتا؟ دوسرے کے خیالات و جذبات پر حرف زنی کر کے درحقیقت اپنے جمالیاتی ذوق کی ترجمانی کی گئی ہے اور یہ اندازِ بیان اتنا لطیف ہے کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

ظرافت کا مفہوم اس قدر وسیع ہے کہ اس کے ضمن میں ہر قسم کی ہرزہ سرائی تک آ جاتی ہے۔ حتیٰ کہ پھکڑپن اور گالی گلوج بھی اس میں شامل ہے۔ آج کل ہندوستان کے بہت سے مزاح نگاروں کے مضامین اور بعض ہزل گو شعراء کے کلام میں یہ رکیک عنصر پایا جاتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ خیالات کا تعلق تربیت سے ہے اور ماحول کا بہت گہرا اثر خیالات و اقوال پر پڑتا ہے۔ اس لئے جن لوگوں نے ذہنی پستی اور اخلاقی فرومایگی کی فضا ہی میں نشوونما حاصل کی ہو، ان کے رجحان

طبعی کا معیار ظاہر ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ مزاح نگاری کا درجہ مقصد قارئین کو ہنسا دینا ہے اور ایسے ہی مذاق کو کامیاب ترین تصور کیا جاتا ہے لیکن حقیقت میں وہ ظرافت سب سے زیادہ بلند اور لائق تحسین ہے جس میں طنزیات کا عنصر غالب ہو کہ اس میں اصلاحی پہلو بھی مضمر ہوتا ہے۔ انگریزی ادبیات میں تھیکرے مشہور ترین طنز نگاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس کی تحریریں پڑھ کر بہت کم ہنسی آتی ہے۔ بیشتر مضامین میں اس نے اپنی قوم کا، تہذیب وتمدن کا اور رسم و رواج کا مضحکہ اتنے طنزیہ پیرائے میں اڑایا ہے کہ بعض لوگوں کے سینوں میں نشتر سے چبھ جاتے ہیں اور اصحاب عقل وفہم اس سے عبرت حاصل کرتے ہیں۔ نیاز کے ایسے مضامین کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا جاتا ہے کہ ان کے ہاں بھی طنزیات کا بحرِ بیکراں ہے جس کی رَو میں صدہا ایسی ادبی شوخیاں بھی مطالعہ میں آجاتی ہیں، جو حقیقی ظرافت کی جان ہیں۔ اس لئے بلاشبہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو ادبیات میں نیاز کو وہی درجۂ قبول میسّر ہے جو انگریزی میں تھیکرے کو حاصل رہا ہے۔

مجھے اصولاً سب سے پہلے نیاز کے ان طنزیات کا ذکر کرنا چاہیئے جو صرف انہی کا مخصوص رنگ ہے لیکن بادلِ ناخواستہ ان سے احتراز کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ ایک طرف زمانے کی فضا سازگار معلوم نہیں ہوتی اور دوسری طرف ماحول کے تقاضے اس کی اجازت نہیں دیتے۔

ذرا دیکھئے، بیوی پر ظلم وستم روا رکھنے کے سلسلے میں اپنے ایک دوست کو کس قدر طعن آمیز خط لکھتے ہیں:-

"خدا کی قسم کیا کام کیا ہے۔ رستم و اسفندیار کی روحیں کانپ اٹھی ہونگی۔ سکندر اور نپولین کی قبروں پر لرزہ طاری ہو گیا ہو گا۔ آج کل کے سینڈو اور گاما کا کیا ذکر۔ وہ لوگ بزدل ہیں جو اپنے سے قوی کو لوٹتے ہیں، نامرد ہیں جو زبردست دشمن کے ساتھ معرکہ آرا ہوتے ہیں۔ بہادری نام ہے صرف کمزور کو ستانے کا۔ ضعیف کو پامال کر دینے کا۔ پھر ظاہر ہے کہ بیوی سے زیادہ کمزور ہستی تمہیں اپنی شجاعت دکھلانے کے لئے کہاں مل سکتی ہے۔

ع آیں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند"

"جمالستان" میں ایک افسانہ دوزخ سے متعلق لکھا ہے جس کا عنوان ہے: "دو گھنٹے جہنم میں"۔ اس کے بہت سے حصے طنز و ظرافت کا اعلیٰ نمونہ ہیں لیکن سب سے زیادہ لطف اس وقت آتا ہے جب غالب بھی دوزخ میں نظر آتے ہیں۔ دوسرے شعراء کے ساتھ ان کا دوزخ میں موجود ہونا ایک عجیب و غریب لطیفے کے ماتحت ہے۔ یعنی یہ پہلے جنت میں تھے اور خوب مزے اڑاتے تھے۔ ایک فرشتے نے دریافت کیا کہ اگر کبھی ناکردہ گناہ کی حسرت کا صلہ لینا ہے تو کہدو۔ ان کے منہ سے نکل گیا "کوئی ایک"۔ پھر کیا تھا، فوراً ان کے قصر کو جہنم میں ڈال دیا گیا، کیونکہ فرشتوں نے کسی قدر چالاکی سے کام لیتے ہوئے خدا کے سامنے غالب کا صرف یہ مصرع پڑھ دیا تھا ع

"دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو"

اگر مصرعِ اولیٰ بھی پڑھ دیا جاتا تو شاید غالب کو فردوس کے اعلیٰ ترین حصے میں جگہ مل جاتی۔ جس طرح مشاعروں میں یہ ہوتا ہے کہ سخن ناشناس ہستیاں صرف ایک مصرع سن کر شاعر کو ایسی بے دریغ داد دینے لگتی ہیں کہ دوسرا مصرع نعرہ ہائے تحسین میں گم ہو کر رہ جاتا ہے، اسی طرح بعض لوگ صرف ایک مصرع پڑھ کر اور دوسرے کو نظر انداز کر کے غلط مفہوم اخذ کر لیتے ہیں۔

"مذاکرات" میں سب سے زیادہ دلچسپ "چاند کا سفر" ہے جو ایک پُرلطف طنز ہے علمائے سائنس کے ان نظریوں پر جو محض قیاساتِ ذہن کی بنا پر دعویٰ کرتے ہیں کہ کرۂ ارض کی طرح دوسرے ستاروں پر بھی آبادی ہے اور وہاں تک پہنچنا انسان کے لئے کسی نہ کسی دن ممکن ہو جائیگا۔ اس سفر کی پوری کیفیت خصوصاً راستے کا حال نہایت دلچسپ ہے۔ تاہم وہاں کی عجیب و غریب مخلوق کی جو ہیئت کذائی پیش کی ہے، وہ حد درجہ پُرلطف ہے۔ اگر ان کی جسمانی ساخت یہی ہوتی جو اس دنیا میں بنی نوعِ انسان کی ہے تو کوئی لطیف بات نہ ہوتی۔ اس لئے مزاح کا رنگ پیدا کرنے کے لئے نیاز لکھتے ہیں:

"ان کا جسم صرف ایک ٹانگ پر قائم تھا جو لکڑی کی طرح سیدھی اور بے جوڑ تھی، تاہم اسے جسم سے الگ بھی کر سکتے تھے۔

چاند کے لوگ پھیپھڑوں سے بھی بے نیاز تھے کیونکہ بقائے حیات کے لئے وہاں ہوا کی ضرورت نہیں تھی، دانت نہیں تھے کیونکہ کوئی سخت چیز کھانے کے لئے نہیں تھی، صرف مشروبات پر گذارا ہوتا تھا۔ اسی لئے آنتیں نہیں تھیں اور شکم بہت چھوٹا تھا۔ پیشانی پر صرف ایک کان تھا۔ دو آنکھیں رخساروں پر اور دو گدی پر

تھیں۔ تعلقات جنسی کا طریقہ معلوم ہی نہ ہو سکا جس سے افزائش نسل کا اصول پردۂ راز میں رہا۔ ان کے علاوہ اور بہت سے دلچسپ "مشاہدات" ہیں اور خاتمہ یہ کہ چھوٹی بچی انہیں جھنجھوڑ کر اٹھا دیتی ہے۔ سارا طلسم خواب خاک میں مل جاتا ہے۔

"لکھنویات" میں اہل لکھنؤ کی بعض مذموم رسموں اور عادتوں کو طنزاً بیان کیا ہے۔ ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو۔ لکھنوی طرز سلام کی تصویر کس قدر لطیف الفاظ میں پیش کی ہے:۔

"سر و گردن کے ایک ایسے خم کے ساتھ جو پشت تک موثر ہوتا ہے، داہنے ہاتھ کو سینے کے محاذ میں لا کر ہتھیلی اور انگلیوں کو پورا پھیلا کر، گردن تان کر، کلائی کے جوڑ کو ڈھیلا کر کے مسلسل کئی بار جلدی جلدی جنبش دینا اور اس طرح سارے ہاتھ میں تھرتھری پیدا کرنے کو رسم سلام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔"

اس کے برعکس ذرا حیدرآباد کی ایک خاتون کے سلام کرنے کی لفظی تصویر بھی ملاحظہ ہو۔ "دکن کی ایک دلنواز شام" میں اسے کس قدر شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے:۔ "فرقِ نازک تک ساعدِ سیمیں کو زحمتِ جنبش دی گئی — ادھر سلام کے لئے سر جھکا کہ یہ رسم خیر مقدم تھی اور ادھر میں ذبح و قتل کے لئے کہ میرے مذہب میں اسے رسم شہادت کہتے ہیں۔"

نگارشات نیاز کے مزاحیہ حصے میں ادبی شوخیوں اور بے باکیوں کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہ رنگ خصوصیت کے ساتھ مکتوبات میں نمایاں ہے اردو ادب میں یہ طرز خاص بہت ہی کمیاب ہے۔ غالب اور شبلی کے خطوط کے سوا شاید ہی کوئی اور مجموعہ اتنا قابل ذکر ہو۔ خیالات کا انوکھا پن اور تحریر کی بے ساختگی اس صنف ادب میں یا پھر روزنامچوں میں نظر آ سکتی ہے۔ قمر مرحوم جو غالباً رسالے کی ترتیب کے سلسلے میں کبھی دفتر نگار سے متعلق تھے، مکتوبات نیاز کی نقلیں "داشتہ آید بکار" کے مصداق جمع کرتے رہے۔ یہ مجموعہ کئی جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔ ہر چند علامہ نیاز نے اصولاً ان احباب کے نام ظاہر نہیں کئے جن کو وہ خطوط تحریر کئے جاتے رہے ہیں تاہم کسی کسی میں نقاب اتنا دبیز نہیں رہتا کہ اس سے مکتوب الیہ کے خد و خال کی پردہ پوشی ہو سکے مثلاً اس خط کو پڑھنے کے بعد کون نہیں کہہ سکتا کہ یہ مشہور ادیب ل۔ احمد اکبرآبادی کے نام ہے:۔

"...... اگر کشمیر چلنے کا عزم راسخ ہو گیا ہو تو لکھئے، میں بھی "عمر رفتہ" کے واپس بلانے کا اہتمام کروں اور لالہ رخ کے ویران باغ میں کسی جگہ دفن ہو جانے کی دعا مانگوں۔"

انگریزی شاعر ٹھامس مور کی مثنوی لالہ رخ کا ترجمہ کرنے والے ل۔ احمد اس خط کے مکتوب الیہ ہیں۔ اور "عمر رفتہ" کا اشارہ بھی بہت لطف دیتا ہے جو صفی لکھنوی کے اس شعر کی طرف ہے ؎

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا   ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

مکتوبات نیاز میں ایک سب سے بڑی خوبی جس سے ان کی انفرادیت قائم ہو سکتی ہے یہ ہے کہ نیاز جگہ جگہ اپنے خطوط میں اردو اور فارسی کے مشہور شعر یا مصرعے حد درجہ دلاویز طریقے سے اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ اصل کلام کی خوبیاں زیادہ اجاگر ہو جاتی ہیں۔ یہ خصوصیت تقریباً ہر خط میں موجود ہے لیکن ان کی خوش ذوقی اس وقت اور بھی زیادہ نمایاں ہوتی ہے جب وہ کسی شعر کے ٹکڑوں کو نثر کے ساتھ مربوط کر کے انشائے لطیف کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتے ہیں۔ ایسے رنگین جملے کیفِ دو آتشہ کے حامل بن کر حافظے کی لوح پر اس طرح مرتسم ہو جاتے ہیں جیسے کوئی موثر شعر کسی کاوش کے بغیر خود بخود یاد آ جاتا ہے اور اس وقت ماننا پڑتا ہے کہ نیاز کی نثر بہت سے شعراء کے کلام پر بھاری ہے۔ ایک لطیف نمونہ ملاحظہ ہو!

"عتاب نامہ کا شکریہ — شکریہ اس لئے کہ حسن اتفاق سے "جو تری خوشی، وہی میرا مدعا" ہوا ورنہ ظاہر ہے کہ گالی سے کون خوش ہو سکتا ہے۔ ...... ہوش میں پہنچ کر دیکھا خدا جانے کہاں سے کہاں پہنچ گئی اور آپ ابھی تک "روئے محمود و خاک پائے ایاز" والے زمانہ کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ ایک صدی قبل کی بات ہے کہ دلی کے ایک شاعر نے کہا تھا "عشق و مزدوری عشرت کدہ خسرو کیا خوب" لیکن یہ بات نشے کی ترنگ ہو کر رہ گئی۔ اب اس دور اقتصادی

میں جب کہ ایک ایک ذرّے کی قیمت متعین ہو چکی ہے، آپ کی مہرتابیاں کسی کا حق نہیں چھین سکتیں۔ "شبنم" اور "پرتو رُخ" اب بھی دونوں پلئے جلتے ہیں لیکن فلکی کا عملی نام اب جذبِ انجذاب ہے یعنی دونوں ایک دوسرے کے محتاج"۔

مختلف مصرعوں اور مصرعے کے ٹکڑوں کا اتنا اچھا امتزاج شاید ہی کسی دوسری جگہ نظر آئے۔ غالب نوازی کا ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو!

"آپ ویرانی اور بے سروسامانی کا حال کیا پوچھتے ہیں۔ غالب گھر رکھتا تھا اور دربان بھی۔ چنانچہ جب گھر کی گھاس زیادہ بڑھ جاتی تھی تو وہ دربان کو حکم دیتا تھا کہ گھاس کھود کر گھر صاف کر دے۔ یہاں معاملہ ہے خالص "کاو کاو سخت جانی ہائے تنہائی" کا جس میں اگر کوئی شرکت کرے بھی تو اپنے کو گوارا نہیں۔"

اس ٹکڑے میں مختلف لفظوں سے کئی شعروں کی طرف اس طرح اشارہ ہو گیا کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ ایک اور نمونہ ملاحظہ کیجئے:-

"او میاں تجمل حسین خاں! میں پوچھتا ہوں کہ کیا عیش تمہارے ہی لئے بنا ہے اور کسی کے لئے نہیں۔ کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا، تمہیں یاد ہو کہ نہ ہو۔"

مکتوب الیہ کا نام تجمل حسین خاں ہے لیکن ساتھ ہی غالب کے اس مصرعے کی طرف بھی اشارہ ہو گیا۔ ع "بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے" اور پھر ظفر کا مصرع تو خود بول رہا ہے کہ مجھے کس نے ترتیب دیا تھا۔ اس کے علاوہ ذرا اندازِ تخاطب کی بھی داد دیجئے۔ کس قدر بے باکی اور بے تکلفی ہے۔ ایک اور خط میں الفاظ کے محض الٹ پھیر سے ایسا حسنِ تضاد پیدا کیا ہے کہ تعریف نہیں کی جا سکتی۔ لکھتے ہیں:-

"غالب وفاداری پر استواری چاہتا ہے۔ میں کہتا ہوں، کاش آپ بے وفائی پر استوار ہو جائیں اگر وہ اصلِ ایماں ہے تو یہ بھی حسنِ کافری کی جان ہے"

ایک خط میں کسی دوست سے تعویقِ جواب کی شکایت کرتے ہیں لیکن کتنے اچھے پیرائے میں؛

"کاش! آپ بیمار ہوتے کہ میں خود آپکی طرف سے عذرِ سکوت ڈھونڈھ لیتا۔ عدیم الفرصت ہوتے کہ اس سمی بہلانے سے اپنے آپ کو دھوکا دید یا کرتا۔ یہ نہ تھا تو کسی جگہ مبتلائے عشق ہو جاتے کہ خرابیٔ دماغ کا یقین کر کے صبر کر لیتا۔ لیکن جب یہ نہیں تو پھر سوائے اپنی شومیٔ قسمت کے اور کیا کہہ سکتا ہوں۔"

ایک دوسرے شخص کی طرف سے خط میں تاخیر ہونیکو اپنی شومیٔ قسمت بتانا ایک ایسی ادبی گدگدی ہے کہ اس مکتوب الیہ کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اور اگر وہ فوراً جواب لکھنے کے لئے آمادہ ہو جائے تو کوئی تعجب نہیں۔ ایک اور خط میں یہی شکایت کرتے ہیں لیکن دوسرے لطیف انداز میں!

"برسبیلِ شکایت نہیں بلکہ بطریقِ حکایت کہتا ہوں کہ ایک زمانہ وہ تھا جب میرے ایک حرف لکھنے کا جواب دینے کی کوشش آپ سو سو طرح کرتے تھے یا ایک یہ زمانہ ہے کہ ؎

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں   واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں

سوچتا ہوں کہ اس انقلاب کا سبب کیا ہو سکتا ہے تو حیران رہ جاتا ہوں کیونکہ اس سے قبل میں یہاں "یہی چشم خوں فشاں تھی، یہی دل یہی جگر تھا۔"

غور کیجئے۔ جواب دینے کے لیے سو سو طرح کی کوشش کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ شعر میں لاکھ لاکھ نظم کیا گیا ہے۔ اس طرح اصل لطافت کے علاوہ یہ ہندسی رعایت بھی مزا دے رہی ہے۔

علامہ نیاز خط میں القاب لکھنے سے عموماً احتراز کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک خط میں اس امر کی شکایت بھی موجود ہے۔ لکھتے ہیں:-

"خدا جانے وہ کون تھا جس نے یہ رسم ڈالی کہ کسی کو خط لکھو تو ابتدا القاب و آداب سے کرو۔ تم ہی بتاؤ کہ تمہیں کیا لکھوں؟"

کبھی کبھی یہ ضرورت زیادہ محسوس ہوتی ہے لیکن کس خوش اسلوبی سے نباہ جاتے ہیں۔ دیکھئے ایک خاتون کو لکھتے ہیں:-

"میں جب کبھی آپ کو خط لکھتا ہوں تو دیر تک سوچتا رہتا ہوں کہ آپ سے خطاب کس طرح کروں۔ آپ تو محترم لکھ کر اس فرض سے بہ آسانی سبکدوش ہو جاتی ہیں۔ تصنع و تکلف ہی ٹھہرا نا؟ ـــ لیکن میں اس کے جواب میں آپ کو محترمہ لکھنا نہیں چاہتا کیونکہ احترام زیادہ سے زیادہ حرمِ کعبہ تک ہے۔ اور میں آپ کو اس وقت کی چیز سمجھتا ہوں جب کعبہ کعبہ نہ تھا بلکہ بتکدہ تھا۔"

اور اپنی اس عام روش سے قطع نظر اگر کسی کو کبھی القاب لکھا تو اس قدر لطیف کہ پورے ایک خط کی لذت اسی ایک خطاب سے حاصل ہو گئی۔ سرسری طور پر ایک نظر ڈال کر چند القاب جمع کئے ہیں جو تفننِ طبع کے لئے ہدیۂ قارئین کئے جاتے ہیں:-

"قبلۂ روحانیاں ـــ جانِ عالم ـــ کرم گسترا ـــ اے صاحب مکارم اخلاق کردگار ـــ مطاعی الاجل ـــ الفت پناہا مودت دستگاہا صاحب الطاف عمیم ـــ غارت گر تمکین و ہوش ـــ قبلۂ مستمنداں اور نیاز نواز" وغیرہ۔

ان میں سے بعض القابات کے متعلق قیاس بھی لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کس شان میں استعمال کئے گئے ہیں۔

کسی مخلص دوست نے خط کے ذریعے خیریت معلوم کی ہے۔ دیکھئے ـ اپنا احوال کس قدر دلچسپ پیرائے میں قلمبند فرماتے ہیں:۔

"آپ نے جس قدر جوش مسرت سے میرا حال پوچھا ہے۔ اس کا اقتضا تو یہی تھا کہ میں واقعی تباہ حال ہوتا اور چندے اور درخور التفات رہتا۔ لیکن افسوس ہے کہ زندہ ہوں، خوش ہوں اور ایسی پر سکون زندگی بسر کر رہا ہوں کہ

ع تو گوئی موجے از دریائے نور است"

یہ تو میں نے اس لئے لکھ دیا کہ اگر آپ یہ تحریر کسی اور کو دکھائیں تو اس کو مجھ پر رشک آجائے۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ دُنیا میں اب میرا اتنا حصہ بھی نہیں ہے جتنا آپ کا عقبیٰ میں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ آپ اس منزل پر پہنچے ہیں اسباب بادہ نوشی کی فراوانی سے اور میں اپنی تشنہ لبی اور بے سرو سامانی سے:"

دین و مذہب اور اعتقادات کے بارے میں جو کچھ نیازؔ نے لکھا ہے اور جسے "من و یزداں" کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع بھی کر دیا گیا ہے، ایک علیحدہ موضوع چاہتا ہے۔ فی الحال ان سطور پر اکتفا مناسب ہے۔

باغِ ارم کی حقیقت

ارم کو مقام قرار دینے میں بعض مفسرین نے بھی غلطی کی ہے اور غالباً اسی کا اثر ہے کہ اکثر لوگ ارم کو کسی شہر یا مقام کا نام سمجھے ہوئے ہیں۔ کلام مجید کی آیت ہے:۔

"الم تر کیف فعل ربک بعاد ارم ذات العماد التی لم یخلق مثلہا فی البلاد"

بعض مفسرین نے اس کے یہ معنے سمجھے ہیں:۔ "کیا دیکھا نہیں تو نے کہ کیا کیا تیرے رب نے ارم کی قوم عاد کے ساتھ (والے ارم کیا، ستونوں والا جس کا مثل (اس حقیقت کے) بلاد میں کوئی نہ تھا" حالانکہ ارم نام تھا سام کے بیٹے اور نوح کے پوتے کا اور عاد اسی ارم کا پوتا تھا۔ کلام مجید کی اس آیت میں عاد کو ارم کے ساتھ نسبت دیکر عاد اولیٰ کی تخصیص کی ہے تاکہ عادِ ثانی سے ممتاز ہو جائے اُن کے خوش قد اور توانا ہونے کو ظاہر کیا گیا ہے اس لئے آیت کا صحیح مفہوم یہ ہوا کہ:۔

"کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے رب نے ارم کی اولاد عاد اولیٰ کے ساتھ کیا کیا جو بڑے خوش قد و توانا تھے اور جن کا مثل اس وقت کسی ملک میں نہ پایا جاتا تھا"

ممکن ہے کہ ارم نے کوئی باغ بھی بنایا ہو اور وہ باغ خاص شہرت رکھتا ہو۔

نیازؔ

نقوشِ ذہنی

پروفیسر ممتاز حسین

مکرمی فرمان صاحب

میں بے حد نادم ہوں کہ آپکی متواتر یاد دہانیوں کے باوجود کوئی مضمون اس موقع کے لئے نہ لکھ سکا۔ اس میں جہاں اس بات کو دخل تھا کہ میں بے حد مشغول رہا وہاں اس کو بھی دخل تھا کہ میں کوئی مضمون رواروی میں لکھنا نہ چاہتا تھا۔ یہ خواہش بھی کہ کچھ لکھنے سے پہلے ایک بار پھر مطالعہ کرلوں، لیکن اس کا موقع نہ مل سکا اور جو کچھ کہ پہلے پڑھا تھا اس کا بہت کچھ حصّہ ذہن سے محو ہو چکا ہے۔ یہ فطرت کا ایک عمل ہے اس میں نہ تو انکی تصانیف کا قصور ہے اور نہ میرے حافظے کا۔ بہرحال اب یہ خط اس غرض سے لکھ رہا ہوں۔ جو نقوش میرے ذہن پر انکی تصانیف کے مطالعے سے قائم ہوئے ہیں، انہیں اجاگر کردوں۔ وہ نقوش یا تاثرات اس قابل تو نہیں کہ وہ شائع ہوسکیں لیکن اگر، آپ مناسب سمجھیں تو انہیں شائع کر سکتے ہیں۔ اسی خط کی صورت میں۔ معلوم نہیں یہ شعر غالب کا ہے یا کسی اور کا۔ بہرحال مجھے غالب ہی کی تصانیف سے ملا ہے۔ ؎

با من مبادیز اے پدر فرزند آذر را نگر !
ہر کس کہ شد صاحب نظر، دینِ بزرگاں خوش نکرد

یہ سنتِ ابراہیمی — ہر مفکر اور ادیب کے حصّے میں آئی ہے۔ ہم نے مانا کہ نیاز صاحب اپنی بت شکنی میں اتنے سبک دست نہیں جتنے کہ غالب اور شاید یہی سبب ہے کہ وہ غالب بت شکن سے اسقدر متاثر نہیں ہیں جتنا کہ مومنِ صنم پرست سے، لیکن اس رومانیت اور ونیت کے باوجود انہیں ایک نسبت اس سنت ابراہیمی سے بھی ہے جس کی طرف اشارہ کیا گیا۔ اور اگر انکے اس عمل سے کچھ مغتیانِ دیر نوش ہوئے تو اس پر ہمارا آپ کا ملال بیجا ہے کہ جب کوئی بت خانہ گرتا ہے تو اس کے ساتھ اس کے متعلقین کا رزق بھی جاتا ہے۔ میر تقی میر نے ذکرِ میر میں لکھا ہے کہ۔

کفر جلالِ عشق است، ایمان جمالِ عشق است"

چنانچہ مردہ ادیب جو کشتۂ ناز عشق ہوتا ہے وہ عشق کی ان دونوں منزلوں سے گزرتا ہے۔ لیکن تقدم جیسا کہ اصغر گونڈوی نے کہا ہے ؎

اے شیخ وہ بسیط حقیقت ہے کفر کی
قید و رسوم نے جسے ایمان بنا دیا

اور یہ اسی عرفان نصیب کفر کا فیض تھا کہ غالب نے تحلیل ادیان سے تکوینِ ایمان کا منصوبہ باندھا۔

ہم مُوحّد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

فارسی اور اردو ادب کی اس انسان دوستی کی روایت کے پس منظر میں نیاز فتحپوری کی آزاد خیالی اور انسان دوستی کوئی ایسی نئی چیز نہ تھی جو شیخ کے لئے تکلیف کا باعث بنتی۔ لیکن جن کا گذارہ ہی امتیازِ ملت پر منحصر ہو، اس کے لئے ہر ایسا خیال تکلیف کا باعث بن جاتا ہے جس کا مقصد ابنِ آدم کو تقسیمِ ملت سے آزاد کرانے کا ہوتا ہے۔ مذہب انسان کے لئے ہے نہ کہ خدا کے لئے، خدا تو اس جذبے سے بھی بے نیاز ہے۔ کہ لوگ اس کی طاعت کریں جیسا کہ ہمارے کسی شاعر نے کہا ہے ؎

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں

نیاز فتحپوری نے مذہب اسلام کو اسی آئینے میں دیکھا اور اسی آئینے میں اس کے رموز و علائم کی تفسیر بیان کی ہے۔ اس سلسلے میں سرسید کے بعد نیاز فتحپوری نے تاریخی تنقیدی شعور کو پوری قوت کے ساتھ استعمال کیا ہے اور یہی ان کا کارنامہ ہے، جہاں تک کہ نیاز صاحب کے جذبے کا تعلق ہے جس کے تحت کہ انہوں نے مذہبی مباحث پر معقولات کو استعمال کیا، وہ بھی وہی ہے جو سر سید احمد خاں کا تھا۔ یعنی اسلام کو زمانہ حاضر کے افکار سے مطابقت دینے کا۔ اور اگر اس کوشش میں انہوں نے حافظ کے اس شعر کی تفسیر ؎

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند
چوں بہ خلوت می روند آں کارِ دیگر می کنند

ذرا شوخ حرفوں میں لکھ دی ہے تو یہ بھی کوئی ایسی بات نہ تھی کہ شیخ اسکا برا مانتا۔ سوداؔ اور میرؔ نے تو اس سے بھی زیادہ شیخ سے "آزادی لے لی ہے۔" یہ تو سادہ لوح حالیؔ کی غلط فہمی تھی جو یہ بات انہوں نے کہی کہ بالخصوص ذاتی شیخ کی پگڑی اچھالنی نہ چاہیئے، کیونکہ ہمارے شعراء کی مخالفت شیخ سے کسی خاصمت کی بنا پر نہ تھی بلکہ اس بنا پر کہ وہ ایک ایسے سماجی ادارے کی نمائندگی کرتے ہیں جو ہر قسم کی ترقی کو "مداخلت فی الدین" سے تعبیر کرتا ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر نہ صرف شیخ علامہ اقبال نے صوفی اور مُلاّ کی مخالفت کی ہے بلکہ سید اکبر حسین الہ آبادی نے بھی انکی مخالفت کی ہے ؎

صاف کہتا ہوں رہیں خوش یا ہوں ناخوش مولوی
آسماں اب چاہتا ہے مولوی کُش مولوی

کیا عجب جو نیاز فتحپوری کو آسمان نے ایک مولوی کُش مولوی بنا کر بھیجا ہو۔

میں نیاز فتحپوری کو اس وقت سے پڑھ رہا ہوں جب سے کہ ہوش سنبھالا۔ لیکن میں کبھی بھی انکے مذہبی خیالات سے متاثر نہ ہوا۔ لیکن اگر نکے مذہبی افکار سے متاثر نہ ہوا تو اس کے یہ معنے نہیں کہ میں انکی معقولات، منطقیات اور ادبی اور تنقیدی نگارشات سے متاثر نہیں ہوا۔ میری س شخص کو کسی نہ کسی منزل میں نیاز صاحب نے متاثر کیا ہے جنہوں نے زندگی کو وسیع النظری سے دیکھا ہے۔

اردو ادب کی تاریخ میں مختصر افسانہ تمام تر بیسویں صدی میں رائج ہوا، اس صنفِ ادب کو فروغ دینے میں جہاں چند اس ہستیوں کو دخل ہے وہاں ز فتحپوری کو بھی دخل ہے۔ اس سلسلے میں اردو ادب کا کوئی بھی مورخ انکے نام کو بھلا نہیں سکتا ہے لیکن میرے نزدیک اس سے زیادہ اہم کارنامہ ان کی نقید نگاری ہے۔ بیسویں صدی میں فنِ تنقید کو عروج دینے میں نیاز فتحپوری کا ایک بہت بڑا حصہ ہے۔ جو نہ صرف بہ اعتبار کمیت ہی وقیع ہے بلکہ بہ اعتبار یت معتبر بھی ہے۔

اس مسئلہ میں کہ انکا مذاقِ سخن کلاسیکی ہے اور وہ ایسے اشعار زیادہ پسند کرتے ہیں جن میں کوئی پُر مغز خیال یا کوئی نکتہ ہوتا ہے اور انہوں نے دورِ حاضرہ

گے نئے مذاقِ سخن کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی لیکن اس سے انکی خدمات پر حرف نہیں آتا ہے۔ ہر شخص کے اس کے اپنے حدود ہوتے ہیں۔

کچھ لوگ نیاز صاحب کے اسلوب کو اس لیے ثقیل بتاتے ہیں کہ وہ اردو الفاظ کی صحت عربی لغات سے کر دیتے ہیں۔ اسے ایک صاحب خندہ کرنا بھی بولتے ہیں۔ یعنی وہ نقد کو غلط اور انتقاد کو صحیح بتاتے ہیں۔ یا پھر اس لئے کہ عربی تعلیم کے زیرِ اثر، عربی الفاظ کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ لیکن یہ رائے انکے اسلوب کے بارے میں بڑی سطحی ہے۔ نیاز فتحپوری کا اسلوب بڑا متنوع ہے۔ وہ ایک طرف انشاء لطیف کے لکھنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں تو دوسری طرف، ایک منطقی کی حیثیت سے مدلل گفتگو کرنے میں بھی کمال رکھتے ہیں۔ آج اردو زبان میں فلسفیانہ خیال کے اظہار کی جو صلاحیت پیدا ہو گئی ہے اس کے ابھارنے میں نیاز صاحب کے اسلوب کو بڑا دخل ہے۔

نیاز صاحب کی خدمات کو رقم کرنے کے لیے ایک دفتر چاہیئے، اردو ادب میں بالاستثنار شاعری کے کون سی ایسی صنفِ سخن اور ادبی تحریک ہے جسکو نیاز صاحب نے اپنی نگارشات سے قوت نہیں بخشی ہے ۱۹۳۶ء میں نیاز صاحب نے ترقی پسند تحریک کے منشور پر بھی دستخط کی تھی۔

* * *

”اگر یہ صحیح ہے کہ دنیا میں حقیقتیں نہیں بدل سکتیں، تو پھر ذوقِ انسانی کے اختلافات سوائے تعبیرات کے کسی اور چیز سے متعلق ہو ہی نہیں سکتے۔ شاعری حقیقت نہیں ہے، بلکہ حقیقتوں کا اظہار ہے، صداقت نہیں ہے بلکہ صداقتوں کی تعبیر ہے، خود کوئی کیفیت نہیں ہے بلکہ کیفیت کا ایک بیان ہے اور تعبیر و بیان کا اختلاف فطرتِ انسانی ہے۔

انسان کی قوتِ شعور بہ حیثیت ایک فطری قوت ہونیکے سب میں مشترک ہے لیکن بلحاظ کیفیاتِ احساس و نقوشِ تاثر وہ ایکدوسرے سے مختلف ہو سکتی ہے انسان کا دماغ اپنی ساخت کے لحاظ سے مختلف زوایا رکھتا ہے اور انھیں زوایا کے لحاظ سے اس کے خطوطِ نظر میں انحراف پیدا ہوتا ہے اور یہی وہ نظامِ فطرت ہے جس نے امیال و عواطف، کیفیات و جذبات، خواہشات و داعیات میں تمایز پیدا کر کے ایک ہی جنس کے مختلف افراد میں خطوطِ تفریق و امتیاز کھینچدئے اور کسی کو مومنؔ بنا دیا، کسی کو غالبؔ، کسی کو میرؔ کر دیا اور کسی کو سوداؔ۔

سورج وہی ایک چیز ہے اور اس کا طلوع و غروب وہی ایک منظر، لیکن ایک دل میں وہ مسرت و نشاط ہے اور دوسرے دل میں ہیبت و جبروت، وہ اس کو دیکھ کر گنگنانے لگتا ہے اور یہ معبود سمجھ کر سجدے میں گر پڑتا ہے، پھر نہ ہر شاعر گبر ہے اور نہ ہر گبر شاعر، حالانکہ اس کی شاعری اور اس کی پرستش دونوں کا سرچشمہ وہی ایک آفتاب ہے، موسمِ برشگال کا وہی ایک پپیہا ہے جو کبھی دل شاد کام کے لئے شیریں پیامِ سرخوشی ہے اور کسی جگہ طعنِ جدائی پر کوئی بروگن یہ کہنے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ ”ڈارو نگی پکھ مروڑ“ اسی خیال کو اور زیادہ وسیع کیجیے اور داد دیجیے، اس کی جس نے ان تمام طوفان کو سمیٹ کر صرف اس ایک فقرہ میں بھر دیا ہے :۔

”حسنک واحد و عبار اتنا شتّی“

پھر جن اصول کے تحت جذبات و کیفیات میں اختلاف پیدا ہوتا ہے، انھیں اصول کے زیرِ اثر ان کے سمجھنے میں بھی اختلاف ہونا ضروری ہے اور اسی بنا پر نہ میں اپنی پسندیدگی پر آپکو مجبور کر سکتا ہوں اور نہ آپ مجھ سے اپنی عدم پسندیدگی کو بجبر تسلیم کرا سکتے ہیں اور سب سے پہلے یہی دشواری ایک نقاد کے سامنے آتی ہے جو بسا اوقات اسے سیدھے راستہ سے ہٹا دیتی ہے لیکن جن لوگوں نے ان پر عمل کئے بغیر دشواریوں کو محسوس کر کے اصولِ تنقید منضبط کئے ہیں وہ بہت محفوظ ہیں اگر ان پر عمل کیا جائے اور حقیقت یہ ہے کہ ان پر عمل کئے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔“ (نیاز)

* * *

نیاز فتح پوری

ایک غیر فانی انسان

(بھم ناتھ دت)

بجہانِ جلوہ رسیدہ ام زہزار پردہ دمیدہ ام
ثمرِ نہالِ حقیقتم چمنِ بہار خدائیم
(بیدل)

نیاز فتح پوری، اپنے اس انسانی جامے میں ایک فردِ واحد نہیں بلکہ "انجمن نابغہ ہائے روزگار" ہیں۔ برائیوں اور خوبیوں کا وہ رقع۔ جو فانی انسانوں کو غیر فانی بنا دیتا ہے۔ ان کے متعلق بہ ارتجالِ حقیقت گزاری یہ کہا جا سکتا ہے کہ قدرت نے انسانی ارتقا کی تمام منزلیں مارنے کے بعد ان کی تخلیق کی

اے تو مجموعۂ خوبی بہ چہ نامت خوانم ؟

فضیلت اپنا احساس کرائے بغیر نہیں رہتی۔ ہم متاثر ہو کر ان کے نزدیک ہو بیٹھتے ہیں۔ انہیں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں ان کی فکر و نظر کی گہرائیوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ وہ ہمیں مسحور کر لیتے ہیں۔ ہمارے فہم کو آسودگی بخشتے ہیں۔ ہمارے تصورات پر چھا جاتے ہیں۔ ہمارے اخلاق پر اثر انداز ہوتے ہیں، ارادوں کو استواری دیتے ہیں، جذبات کو تحریک و حرکت۔ اپنی دانائی، توانائی، ہمہ دانی، خوش اخلاقی، نیک خواہی سے گرویدہ بنا لیتے ہیں حتیٰ کہ ہمارے روئیں روئیں میں سما جاتے ہیں، لیکن یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی، ہم ان سے بیگانہ رہتے ہیں۔ ظرف کی کمی سمجھیے یا یوں کہیے کہ۔

نظر کو تاب تماشائے حسن یار نہیں !

انسانی عظمت و بلندی کی تین علامتیں بتائی گئی ہیں، کردار کی بلندی کہ مستحقِ تقلید و اعتراف ہو، تحریر کی خوبی کہ شوق مطالعہ پیدا کرے، عمل کی فراوانی کہ ابرِ رحمت بن کر زندگیوں پر چھا جائے۔ نیاز کی دوسری لاتعداد تصانیف کو چھوڑیے "نگار" جس پر ان کا گرامی نام ثبت ہے، جیتا جاگتا ثبوت ہے ان کی بلندیٔ کردار کا، ان کی خوبیٔ تحریر کا، فراوانیٔ عمل کا وہ اس منزل پر۔ اوقات کی پابندی کے ساتھ متواتر ۴۲ سال مردانہ وار، تن تنہا چلے آ رہے ہیں، اسی "نگار" میں مذہب سے لے کر الحاد تک۔ ادب سے لے کر حکمت و فلسفہ تک، قرآن سے لے کر موسیقی تک، کوئی موضوع و مضمون نہیں، جس پر انھوں نے خطیبانہ نظر نہ ڈالی ہو۔ صحیح رہنمائی نہ کی ہو، گرتوں کو اٹھایا نہ ہو، لڑکھڑاتوں کو سہارا نہ دیا ہو، اور شکستہ دلوں کو اپنے قول و عمل سے تلقین نہ کی ہو کہ۔

بعزم مرحلۂ عشق پیش نہ قدمے

نیاز صاحب کی علمی و ادبی صلاحیتوں کا اندازہ لگانا کارے دارد! ان مباحث میں ان کا نظریہ قول فیصل کا حکم رکھتا ہے وہ صاحب طرز ہیں اور ان کی انشا پردازی معجزۂ ادب سے کم نہیں، الفاظ ان کے قلم سے نکل کر، پر طاؤس، در شہوار اور لعل شب چراغ بن جاتے ہیں۔

آپ کا علم، آپ کی فراست، آپ کی ذہانت، آپ کی قوت استدلال کا کوئی ٹھکانا نہیں، ایک زمانہ قائل و معترف ہے، بلکہ وسعت خیال سے وہ انتہائی نقطہ پر مسلط رہتے ہیں۔

اخلاق کے لحاظ سے انسانیت پرست ہیں، مذہب کو اسی معیار سے جانچتے ہیں۔ انسان کے لئے بے پناہ جذبۂ ہمدردی و رفاقت رکھتے ہیں۔ یہ عقیدت و عصبیت نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ وہ یکتائے روزگار ہیں۔

نگار جولائی سنہ ۱۹۶۰ء سے متعلق میں نے انہیں ۱۰ اگست سنہ ۱۹۶۰ء کو اپنے خط میں یہ لکھا تھا۔

"نگار" کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ آج سے ۴۰ برس پیشتر جس عمر میں تھے، ابھی اس سے آگے نہیں بڑھے، وہی رعنائی، وہی شوخی وہی قدرت تحریر، وہی ترجمانی شباب وہی بایرنیت[1]، وہی ادبی و انتقادی عبقریت، جو پہلے تھی سو اب بھی ہے ——

تم سلامت رہو ہزار برس"

اس میں آج مجھے صرف یہ ایزاد کرنا مطلوب و منظور ہے کہ: ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد ——

اعتقادات، نظریات، واردات روزگار کے باب میں۔ مجھے یہ بھی لکھنا مقصود ہے کہ[2] بنارس کا مرتاض برہمن "قشقہ بر جبیں ہاتھ میں سمرن لئے اٹھتا ہے اور کہتا ہے "میرے مندر میں آؤ، صدائے ناقوس سنو اور مورتی کے سامنے جھک جاؤ تاکہ یہ جلن دور ہو" دیوبند اور فرنگی محل کا عبا پوش مولوی جریب و تسبیح لئے ہوئے رونما ہوتا ہے اور کہتا ہے "میری مسجد میں آؤ، اذان کی آواز سنو قبلہ کی طرف منھ کر کے سجدہ میں گر جاؤ تاکہ سوزش دفع ہو" ایک راہب کہن سال نمودار ہوتا ہے اور تلقین کرتا ہے میرے عالیشان کلیسا میں آؤ، گھنٹہ کی صدا پر متوجہ ہو، پیمبر مصلوب کی شبیہ سے التجا کرو تاکہ یہ بے چینی دور ہو —— جاتریوں کا گروہ جوق در جوق مندروں سے نکلتا ہوا نظر آتا ہے۔ لیکن ان کے قشقہ کا صندل بھی خشک نہیں ہو سکتا کہ ان کے سر جنگ و جدل سے رنگین نظر آنے لگتے ہیں۔ جماعت کی جماعت مسجدوں سے باہر نکلتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ مگر ان کی پیشانی سے سجدہ کا نشان خاک بھی محو نہیں ہو چکتا کہ ایک دوسرے پر کثافت اچھالتا ہوا نظر آتا ہے —— گروہ کا گروہ کلیسا سے باہر آتا ہے اور ابھی عود و عنبر کے بخور کی خوش بو بھی ان کے لباس سے جدا نہیں ہوتی کہ معصیت پر عفونت آغوش اُن کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ ایک رند لاابالی۔ ایک مرد ژولیدہ مو۔ جو نہ کسی مندر میں گیا۔ نہ مسجد میں۔ نہ جس نے کبھی دیر میں سر جھکایا، نہ کلیسا میں —— انسان کی اس بے چارگی کا مطالعہ کرتا ہے اور اس قوت کے سامنے جس کو اس نے ہمیشہ تمام علائق مذاہب و مسالک سے بے نیاز ہو کر پہچانا، متحیرانہ و متفکرانہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ آسمان کا ایک تارا ٹوٹ کر روشن لکیر بناتا ہوا اس کی آغوش میں گر جاتا ہے اور یہ اُسے سینے سے لگائے اپنی راہ لے لیتا ہے۔ صبح کو قدسیوں کی جماعت اس کو خاک بسر و چاک گریباں دیکھ کر منھ پھیر لیتی ہے"

---

[1] Pertaining to Lord Byran

[2] "من و یزداں" مصنفہ نیاز فتح پوری سے لیا گیا

کہ یہ کوئی شرابی ہے۔ یقیناً وہ شرابی ہے وہ مست ہے لیکن ایسا کہ۔

مستیش را بنود نغمہ و صہبا ساماں

دوسرا گروہ آتا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ تو فاسق و فاجر ہے ملحد و بے دین ہے۔ بے شک وہ ایسا ہی ہے مگر اس شان کے ساتھ کہ

نازد بہ کفر خود کہ بہ ایماں برابر ست

اس کے مجروح جسم، اس کے داغدار سر و سینہ کو دیکھ کر لوگ نفرت کرتے ہیں اور جب وقت وہ بے تاب ہو کر چیخ اٹھتا ہے کہ

دردیست در دلم کہ بدرماں برابر است ”

تو سماج کے روندے ہوئے انسانوں کا ایک گروہ، دہلانے والی اس ہوک کو سن کر بیک زباں چلاتا ہے۔ ”تھامنا! تھامنا! نیاز۔ مسیح الزماں — غیر فانی انسان۔ یہی ہے۔ یہی — !

3 JUL 1963

”خدا کو جاننے کے لئے انسان نے دو راستے اختیار کئے۔ ایک کا تعلق دل سے ہے اور دوسرے کا دماغ سے۔ جب دماغ تھک گیا تو دل سے کام لیا اور جب دل نے ساتھ نہ دیا تو دماغ سے، یہاں تک کہ دل و دماغ کی یہ جنگ خدا کے بارے میں ابھی تک جاری ہے۔ دماغ یا عقل سے کام لینے والوں نے فلسفہ و حکمت کے ذریعہ خدا کی حکمت معلوم کرنی چاہی اور جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو وہ ملحد و منکر ہو گئے۔ دل والوں نے جذبات سے کام لیا اور وہ بھی آخرکار ماعرفناک کی حد سے آگے نہ بڑھ سکے اور صوفیہ کا تعلق اسی جماعت سے ہے۔ اس خیال کے لوگ مختلف قوموں میں پیدا ہوئے ہیں۔ ہندوستان میں یہی چیز فلسفۂ ویدانت کہلائی۔ یونان و روم میں باطنیت (MysTic iSM) کے نام سے مشہور ہوئی اور اسلام میں تصوف کے نام سے۔“

(نیاز)

نیاز کی انشا پردازی

منظور حسین شور

صحت کی ناسازگاری کی بنا پر اس قابل نہ تھا کہ کسی خصوصی موضوع پر اظہار خیال کروں اس لئے میرے اس "مقالہ" کی ذمہ داری یا غیر ذمہ داری کو پروفیسر فرمان فتحپوری سے منسوب کیا جائے ؎

ایں شرفم بس کہ شوی مشتری ہیچ مدہ قیمتِ کالائی من

عجیب بات ہے نیاز صاحب سے ملنے کا اتفاق مجھے آج تک نہیں ہوا، لیکن فکر و ہوش کی دنیا میں بعض شخصیتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن سے زمان و مکان کی دوری کے باوجود قرب محسوس ہوتا ہے مجھے یہ احساس اپنے عہد ہوش میں سب سے پہلے علی گڑھ یونیورسٹی کے دوران تعلیم میں نگار کی وساطت سے ہوا، اس کے بعد میرے اندر یہ احساس نیاز صاحب کے ان گوناگوں افادات کی بنا پر مستقل ہوتا چلا گیا جن کی گیرائی میں ادب فنونِ لطیفہ، تنقید، تاریخ، فقہ، فلسفہ، مذہبیات، جمالیات، جنسیات، "جنیات"، فراست الید اور الہیات کے علاوہ "باب الاستفسار" کے لیے متعدد مسائل شامل ہیں جن کی افادی حیثیت اپنی جامعیت کے لحاظ سے کچھ دائرۃ المعارف کی سی ہے، میں سمجھتا ہوں ان موضوعات پر سیر حاصل تنقید و تبصرہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ ان کا علیحدہ علیحدہ تجزیہ نہ کیا جائے۔ میری گفتگو کا مقصد نیاز صاحب سے متعلق چند شخصی تاثرات کا اظہار ہے کسی خصوصی موضوع سے بحث نہیں، جہاں تک فکر کی صحت اور بقا کا تعلق ہے میرے نزدیک شوپنہار کا یہ خیال اپنی جگہ بہت درست ہے کہ مفکرین اور دانشمند تین قسم کے ہوا کرتے ہیں۔ ایک وہ جن کی تب و تاب کا دوام شہاب ثاقب کی طرح عارضی ہوتا ہے دوسرے وہ جن کی تابانی سیاروں کی طرح نسبتاً زیادہ بادوام ہوتی ہے اور تیسرے وہ جن کی تابانی کا دوام عرصۂ عالم پر ثوابت کی طرح ہمیشہ کے لئے ثبت ہوتا ہے۔ نیاز صاحب کی حیثیت تیسری قسم کے مفکرین کی ہے۔ وہ اپنی اسی سال کی زندگی میں آج تک کم و بیش ساٹھ سال تصنیف و تالیف میں صرف کر چکے ہیں، زندگی کے اس طویل عرصہ میں وہ ادب اور زندگی کے کثیر التعداد موضوعات پر آج تک ہزاروں صفحات لکھ چکے ہیں۔ وقت کی اعصاب شکن تھکن قوائے جسمانی کے اضمحلال اور حوادث کی صعوبتوں کے باوجود وہ آج بھی اسی ثبات اور استقلال کے ساتھ تصنیف و تالیف میں مصروف ہیں۔ جس طرح کوئی تند اور تیز سیلاب چٹانوں سے ٹکراتا، وادیوں کو کاٹتا اور بیابانوں کا سینہ چیرتا ہوا بہے اور مسلسل بہتا ہی چلا جائے۔ بالکل اسی طرح وہ ایک آہنی عزم اور شکست ناپذیر حوصلہ کے ساتھ اپنے مسیر پر برابر رواں دواں ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی تصنیفی اور تالیفی زندگی میں اکثر ایسے طوفان آئے ہیں کہ جن کی یورش سے کم از کم نگار کا چراغ یقیناً بجھ گیا ہوتا اگر اس میں تند ہواؤں کے مقابلے کی بے پناہ سکت نہ ہوتی،

واقعہ یہ ہے کہ ادب کی بقا کا دار و مدار اس کی زندہ اور پائندہ اقدار پر ہوتا ہے، یہ اقدار اپنی نوعیت میں یقیناً مذہبی بھی ہوتی ہیں

اخلاقی بھی، افادی بھی اور جمالیاتی بھی، نیاز صاحب کی نگارشات کا دائرہ اپنے تنوع کے اعتبار سے اتنا وسیع ہے کہ ان کی اقدار ایک ہی وقت میں سماج، انسانیت، مذہب، تمدن اور فن و ادب کا احاطہ کر لیتی ہیں، اگر غور سے دیکھا جائے تو نیاز صاحب کے افکار ان کے معاصرین میں سب سے زیادہ کثیر الاطراف ہیں لیکن ان کے افکار کی ہمہ گیری سے قطع نظر میرے نزدیک وہ بنیادی خصوصیات جو ان کو ایک مصنف کی حیثیت سے ان کے معاصرین میں سب سے علیحدہ کر دیتی ہیں فن انشاء کا کمال، ان کا مذہبیاتی تعقل اور ادب و انتقاد ہیں

تاریخ ادب میں صاحب طرز کی حیثیت سے مرزا غالب مولوی محمد حسین آزاد اور سرسید کے بعد جن لوگوں نے فنِ انشا پردازی کو منتہائے کمال کو پہنچایا ہے ان میں مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا نیاز آئمہ فن کی حیثیت رکھتے ہیں، جہاں تک نیاز صاحب کے طرزِ تحریر کا تعلق ہے اس کی امتیازی خصوصیت محمد حسین آزاد کی سلاستِ زبان اور سرسید کی سادگیٔ بیان نہیں، بلکہ عبارت کی رنگینی، اظہار کی شوخی اور فن انشاء کی ریزہ کاری ہے، لیکن نیاز صاحب کی انشا پردازی کا کمال ان کے ظاہری اندازِ تحریر تک محدود نہیں اس کی اصلی روح مطالب کی ادبی اور اعتقادی اہمیت ہے، اور سچ پوچھیے تو ہیئت اور مواد کا یہی امتزاج ان کی انشاء پردازی کو مے دو آتشہ بنا دیتا ہے ان کی عبارت آرائی کا ایک اور کمال جس کی حیثیت ضمنی ہے، نثر نگاری میں شعر کی پیوند کاری ہے ، وہ اپنے مافی الضمیر کے اظہار میں جس بے ساختہ اور غیر شعوری طریق پر شعر صرف کرتے ہیں اس سے ان کا اظہار کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مطالب اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔ ان کا یہ ملکہ نہ صرف یہ کہ مطالب کے تاثر کو شدید سے شدید تر کر جاتا ہے بلکہ عبارت کی بلاغت کا بھی ضامن ہوتا ہے، بعض اوقات ان کے اندازِ بیان کا تاثر خاص طور پر جہاں وہ محاکات سے کام لیتے ہیں انتہا درجہ ڈرامائی ہوتا ہے۔ ایک جگہ حیدرآباد دکن کی سرزمین پر موکبِ شاہانہ کے تزک و احتشام کے ساتھ خلق خدا کے کثیر ازدحام میں جہاں تماشائیوں کے اس استعجاب کو دکھانا مقصود ہے جس پر جبروتِ شاہی نے گہرے سکوت کی مہریں ثبت کر دی ہیں وہاں نیاز صاحب نے لکھا ہے ؎

نظارہ ز جنبیدن مژہ گلہ دارد،

میرے نزدیک فن انشاء میں اظہاریت (EXPRESSIONISM) کی تردستی نیاز صاحب کا طرۂ امتیاز ہے۔ بالعموم اُن کے افسانے اور بالخصوص ان کے مکتوبات اردو ادب میں انشاء پردازی کے بہترین نمونے ہیں۔ جہاں تک ایک مصنف کی حیثیت سے نیاز صاحب کے مذہبی افادات کا تعلق ہے وہ ایک مجاہدانہ حیثیت کے حامل ہیں، دراصل وہ تعصب اور تنگ نظری کے محاذ پر عمر بھر مصروفِ جہاد رہے، اس باب میں اگرچہ ملک کا ایک خاص طبقہ اپنی پوری توانائی کے ساتھ ان سے برسرِ پیکار رہا۔ لیکن ؎

چراغی را کہ ایزد بر فروزد
ہر آنکس تف زند ریشش بسوزد

نیاز صاحب اعلانِ حق کے معاملے میں کبھی خاموش نہ رہ سکے، عقل اور تعصب کی معرکہ آرائی میں اکثر یوں بھی ہوا کہ ملک کے بعض حصوں میں نگار کا داخلہ بند ہو گیا اور مدیر نگار کے مجاہدات پر کفر و الحاد کی مہریں ثبت کی گئیں لیکن ایک متفقہ اکثریت کی شدید مخالفت کے باوجود نیاز صاحب انتہائی خود اعتمادی اور عالی ظرفی کے ساتھ اتمام حجت میں مصروف رہے، تاریخ تمدن میں اس نوعیت کے واقعات اکثر رونما ہوئے ہیں، عقل و تعصب کی آویزش کا حادثہ کوئی نیا حادثہ نہیں، سقراط، برونو، گیلیلیو، لوتھر، والٹیر، روسو سے لے کر جمال الدین افغانی، ابوالکلام آزاد اور سرسید کو اپنے اپنے ماحول میں اکثریت سے متصادم ہونا پڑا ؎

آن شوخ حدیثی کہ حلال است در دین ✻ بردار تواں گفت و بہ منبر نتواں گفت

مذہبی معتقدات کے معاملے میں کسی فرد کا اکثریت سے متصادم ہونا نہ صرف یہ کہ ہر دور میں کفر کے مترادف تصور کیا گیا ہے، بلکہ "نقل" کے خلاف "عقل" کے ہر اجتہاد کو کچلنے کے لئے سیاسی اور روحانی اقتدار نے بڑے بڑے جتن کئے ہیں۔ پانچویں صدی ہجری کے بعد

خراسان، عراق اور دیگر ممالک اسلامی کے نواح میں اسی اہتمام کے تحت تمام علوم عقلی کو خواص و عوام سب کے لیے شجر ممنوع قرار دے دیا گیا تھا اور بقولِ مورخ ملائیت کی کافرگری صرف ایک بوعلی سینا یا ابوریحان تک محدود نہیں تھی بلکہ ہر آزاد فکر و دانش مند کی سزا کفر و الحاد سے شروع ہو کر صلیب و دار پر ختم ہو جاتی تھی۔

اس باب میں اگرچہ نیاز صاحب ایک طبقہ سے ایک عمر معرکہ آرا رہے لیکن انہوں نے کبھی ہادیٔ دین یا پیغمبرِ ملت ہونے کا ادعا نہیں کیا، ان کے اجتہاد اور افادات کا محرک فی الحقیقت دیانتِ فکر کے ساتھ اپنے نقطۂ نظر کا اظہار رہا ہے "من و یزداں" کا فلسفہ ہو، یا "مولوی ضرغام الدین اور گنہگار امام" کی تمثیل ہو یا "نقاب اٹھ جانے کے بعد" کا عالم ہو ان کے معتقدات اور افادات میں فکر و سالوس نہیں بلکہ ہر جگہ خلوصِ نیت اور دیانتِ فکر کارفرما ہے، جہاں تک میرا اندازہ ہے ان کا مسلک انسانیت عظمیٰ کا احترام اور انسان دوستی کے سوا کچھ نہیں، وہ دنیا کے تمام دانش مندوں کی طرح اس بنیادی اصول، اخلاق پہ کے سختی سے قائل ہیں کہ ؎

بہر مذہب کہ باشی باش نیکو کار و بخشندہ ٭ کہ کفر و نیک خوئی بہ ز اسلام و بد اخلاقی

ان کے نزدیک ہر "ضرغام الدین" کا کردار روح اسلام کے منافی ہے، ان کا اندازِ تفکر تھوڑی دیر کے لیے انسان کو سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ دین و مذہب واقعی جہل و تعصب سے زیادہ قریب ہیں یا عقل و دانش سے، اس خاص نقطہ کی عقلی و دینی اہمیت پر زور دیتے ہوئے مولانا رومیؒ نے ایک جگہ بڑی چونکا دینے والی بات کہی ہے ؎

بس نکو گفت آں رسولِ خوش نواز
ذرّہ عقلت بہ از صوم و نماز

ضمناً اس نکتہ کا تذکرہ بے محل نہیں کہ نیاز صاحب کے افادات کا ایک اہم رخ سماج کے پکے پھوڑوں پر نشتر کاری اور طنز و مزاح کے پردے میں پیرانِ طریقت کی خلوت و جلوت کی نقاب کشائی ہے۔ میرے نزدیک اخلاقی اور سماجی نقطۂ نظر سے نیاز صاحب کا یہ انتہائی مخدوش اور جرأت آزما مجاہدہ معاشرہ کی ایک مثبت خدمت ہے۔ جو اپنی جگہ صرف افادی ہی نہیں بلکہ بے حد دلچسپ بھی ہے۔

جیسا کہ میں نے اس سے قبل عرض کیا نیاز صاحب کی گوناگوں تصنیفات میں اردو کی جس خصوصی صنف ادب کو بنیادی اہمیت حاصل ہے وہ ان کا افسانوی یا "رومانوی" ادب ہے، ہر چند اس موقع پر رومانی' ادب کے تاریخی محرکات اور سماجی عوامل گفتگو کا موضوع نہیں تاہم ضمنی طور پر یہ نکتہ کافی اہم ہے کہ خصوصاً بیسویں صدی کا اردو "رومانی ادب" شعوری یا غیر شعوری طور پر یورپ کی انیسویں صدی کی "تحریک رومانی" سے بڑی حد تک متاثر ہوا۔ اردو کے ان ادبا نے مغرب کی اس ادبی تحریک سے خاص طور پر اثر قبول کیا۔ جو مغربی ادب سے بخوبی آشنا تھے۔

انقلاب فرانس کی تباہ کاریوں کے بعد اجتماعی زندگی کی شکست و ریخت میں مغربی ذہن نے جب محسوس کیا کہ یورپ کی خالص مادی زندگی اپنی تمام ارتقاء کے باوجود انسان کے لیے سکون روح کی ضامن نہیں۔ اور مشینی تہذیب کا "مصنوعی انسان" بقول روسو ایک طویل مصنوعی تمدن کے زیر اثر اپنی باطنی ہم آہنگی کو کھو کر روحانی اعتبار سے بالکل مسخ ہو چکا ہے" تو مغربی تمدن کو اپنے اندر جس چیز کا سب سے بڑا فقدان محسوس ہوا وہ زندگی کے شدید بحران میں' "روح کا سکون" تھا۔ سکونِ روح کی تلاش اور اس کے عالمگیر خلفشار نے اگرچہ مغرب کے خواص و عوام سب ہی مبتلا تھے لیکن اس کا ردِ عمل فرانس اور جرمنی کے ادیبوں پر سب سے زیادہ ہوا کیونکہ فرانس اور جرمنی یورپ کے بہترین کلچر اور فلسفہ کا گہوارہ تھے۔ جرمنی کے مشہور شاعر گیٹے نے اپنے دیوانِ شرقی میں جہاں یورپ کے عام ذہنی خلفشار اور "سکونِ روح" کی تلاش کا ذکر کیا ہے وہاں اپنے

سکونِ روح کی بے پایاں آرزو کے اظہار میں حافظ شیراز کا یہ شعر صرف کیا ہے۔

آرزو می کنم از توچہ پنہان دارم
شیشہ بادہ و کنجی و رخِ زیبائی

درحقیقت تاریخِ انسانیت میں جہاں جہاں سیاسی انقلابات سے حیاتِ اجتماعی کا شیرازہ منتشر ہوا ہے وہاں "سکونِ روح" کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس ہوئی ہے اور جہاں اس آفاقی ضرورت کے وسائل مادّی فارغگی سے فراہم نہ ہو سکے وہاں مفکروں اور ادیبوں نے فنِ ادب کو اکثر روح کی آسودگی اور قلب کے سکون کا وسیلہ بنایا ہے ورڈس ورتھ، کیٹس، شیلے اور بائرن کی "رومانیت" خیام کا فلسفۂ نشاطیت اور حافظ کی وجدانیت درحقیقت ایک ہی عالمِ خیال کی مختلف راہیں ہیں۔ اس "عالمِ خیال" کو گیٹے اپنی روح کی "گریزگاہ" سے تعبیر کرتا ہے۔

جہاں تک اردو کے "رومانی" ادب کا تعلق ہے اس کے عام محرکات اور عوامل کو بھی درحقیقت ہندوستان کی سیاسی تاریخ سے گہرا ربط ہے چونکہ اور ملکوں کی طرح اس سرزمین پر بھی زندگی برسوں سکون کو ترسی ہے اس لئے "نتیجۃً" یہاں کے مفکرین اور ادیبوں نے بھی فنِ ادب ہی کی وساطت سے سکونِ روح کی تلاش کی ہے۔ اردو میں اس خاص مکتبِ خیال کے "تاریخی" اور داخلی عوامل سے قطعِ نظر اس کے خارجی عوامل کو مغربی ادب کی تحریک رومانی سے بڑا تعلق ہے۔ میرے نزدیک نیاز صاحب اس مکتبِ خیال کے سب سے زبردست علم بردار ہیں۔ "رومان" جس کو "بائرن" سنہرے خوابوں کا خالق[1] کہتا ہے چونکہ ادبی اقدار کے لحاظ خالص جمالیاتی ہوتا ہے، اس لیے اس کے مقصد کو اصلاح و اخلاق دین و سیاست یا انسانیت اور ارتقاء سے اصولاً کوئی تعلق نہیں، رومانی ادب کا مقصد مثبت طریقہ پر مادی زندگی کے تلخ حقائق سے ماورا ایک عالمِ کیف و سرور میں حسن و عشق کا وجدان اور روح کی آسودگی ہے، اس خصوصی صنفِ ادب میں ناولیں، ڈرامے، افسانے اور نظمیں سب کا مقصد بطور مشترک ایک ہے، میرے خیال میں مذہبِ رومانیت کی رُو سے خصوصاً "نگارستان" اور "جمالستان" صحائفِ مقدسہ کی حیثیت رکھتے ہیں، نیاز صاحب کی یہ تخلیقات اپنے مواد اور ہیئت دونوں کے اعتبار سے ادبِ اردو کے لازوال شاہکار ہیں، رومانی نثر کی طرح نیاز صاحب شعر و تنقید کے اصول میں بھی جمالیاتی اقدار کے سختی سے قائل ہیں۔ اگرچہ "تنقید" کے باب میں مجھے اس خاص نقطۂ نظر کی قطعیت سے کسی حد تک اختلاف ہے لیکن میں نے نیاز صاحب کی رائے سے استفادہ کیا ہے اور میں ان کی رائے کا احترام کرتا ہوں۔

Parent of golden dreams

---

[1] "باپ" کی بجائے بالقصد "خالق" ترجمہ کیا گیا۔

گھڑی گھڑی نہ اِدھر دیکھئے کہ دل پہ مجھے
ہے اختیار پر اتنا بھی اختیار نہیں (نیاز)

کچھ نیاز صاحب کے بارے میں

نظر صدیقی

ایک ہم قلم بزرگ نے برسبیل گفتگو مجھ سے پوچھا۔ آج کل آپ کیا لکھ رہے ہیں۔ میں نے کہا۔ نیاز صاحب پر ایک مضمون لکھنے کی فکر میں ہوں۔ یہ جواب سنتے ہی بولے۔ تضیع اوقات ہے۔ میں نے ان سے اختلاف کرتے ہوئے کہا۔ آپ کا خیال بڑا غیر منصفانہ ہے۔ نیاز صاحب اس کے مستحق ہیں کہ ان پر مضامین اور کتابیں لکھی جائیں، ان کی علمی اور ادبی خدمات کا اعتراف کیا جائے اور ان کا جائزہ لیا جائے۔ کہنے لگے، میرا مطلب یہ ہے کہ نیاز صاحب پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ان کی خدمات کا اعتراف کیا جا چکا ہے۔ ان کی اہمیت مسلم ہو چکی ہے اس لئے اب ان پر لکھنا بیکار ہے۔

میں نے محسوس کیا کہ ایک لحاظ سے ایک حد تک وہ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔ نیاز صاحب پر اب تک نہ جانے کتنے مضامین شائع ہو چکے ہیں، ان کی شہرت کی عمر بھی پچاس ساٹھ سال سے کم نہیں اور ہمارے یہاں کسی ادیب کے مشہور ہو جانے کے معنی اس کے مسلم ہو جانے کے ہیں۔ شہرت کو اہمیت سے خلط ملط کرنے کا جیسا رواج یہاں ہے شاید ہی کسی اور ملک یا کسی اور زبان کے لکھنے والوں میں ہوگا۔ جو ادیب لکھنے والا اپنی بعض امتیازی خوبیوں کی وجہ سے مشہور یا مقبول ہو جاتا ہے ہم لوگ اسے ایک اہم ادیب یا شاعر مان لیتے ہیں، اس کے بعد حتی الامکان اس کی اہمیت کا تجزیہ نہیں کرتے۔ وراثت کی طرح ایک نسل کی ادبی رائیں دوسری تیسری نسلوں میں منتقل یا منقسم ہوتی چلی جاتی ہیں، ایسی صورت میں نیاز صاحب جیسے مشہور و ممتاز اہل قلم پر لکھنا اگر کسی کو تضیع اوقات معلوم ہوتا ہے تو وہ اپنے اس احساس میں بھی حق بجانب ہے۔

لیکن اس احساس یا انداز نظر کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ اگر آپ نیاز صاحب پر کوئی مستقل کتاب ڈھونڈھیں تو آپ کو مایوسی ہوگی۔ اگر آپ نیاز صاحب پر مختلف مضامین کا مجموعہ ڈھونڈھیں تو آپ کو مایوسی ہوگی۔ اگر آپ نیاز صاحب پر اردو کے مشہور و ممتاز نقادوں کے تنقیدی مقالات ڈھونڈھیں تو آپ کو مایوسی ہوگی۔ اگر آپ یہ جاننا چاہیں کہ نیاز صاحب کی طرف بیسویں صدی کی چار پانچ نسلوں کے رویے میں کیا فرق رہا ہے تو آپ کو مایوسی ہوگی اگر آپ یہ جاننا چاہیں کہ نیاز صاحب کی گوناگوں خدمات کے پیش نظر اردو ادب میں ان کی اہمیت کی صحیح نوعیت کیا ہے تو آپ کو مایوسی ہوگی۔ مختصر یہ کہ نیاز صاحب کے بارے میں جتنے ضروری سوالات آپ کے ذہن میں پیدا ہوں گے ان میں سے بیشتر کا جواب حاصل کرنے میں آپ کو مایوسی ہوگی اس لئے کہ ہمارے یہاں ادیبوں اور شاعروں (غالب اور اقبال مستثنیات میں سے ہیں) پر مضامین کم لکھے جاتے ہیں اور کتابیں بالکل نہیں لکھی جاتیں۔ ——— بڑے لکھنے والوں پر مضامین بھی نہیں لکھتے اور اگر دو چار مضامین لکھے بھی جاتے ہیں تو ان کا مجموعہ شائع نہیں ہوتا، نہ جانے اس قسم کی مفید رسمیں اردو ادب میں کب رائج ہوں گی۔ ہمارے یہاں مشہور و ممتاز لکھنے والوں کو مختلف زاویوں سے سمجھنے اور بار بار پرکھنے کی ذہنی عادت بھی ابھی تک پیدا نہیں ہوئی۔ کسی چائے خانے یا کیفے میں گھنٹوں بیٹھ کر گپیں ہانکنا تضیع اوقات نہیں، مگر کسی مشہور و ممتاز ادیب یا شاعر کے ادب یا شاعری کو دوبارہ سہ بارہ جانچنا تضیع اوقات ہے۔

بہرحال جب فرمان صاحب نے مجھے نیاز نمبر کے لئے لکھنے کی دعوت دی تو میں نے بڑی خوشی سے اس دعوت کو قبول کر لیا تھا — یہ سوچ کر کہ مجھے نیاز صاحب پر لکھنے کی جو دیرینہ آرزو رہی ہے وہ اس نمبر کی بدولت پوری ہو جائے گی۔ لیکن یہ دعوت میں نے ایک ایسے وقت میں قبول کی تھی جب میں اپنی کتاب "تاثرات و تعصبات" (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) کی طباعت کے سلسلے میں بے حد مصروف تھا۔ اس مصروفیت کے پیش نظر میں نے فرمان صاحب سے دسمبر کے آخر تک کا وقت لے لیا تھا۔ لیکن نہایت افسوس ہے کہ اس کام کے لئے میں نے جتنا وقت لیا، اسے میری کتاب کی طباعت نے ہضم کر لیا۔ اب جو وقت رہ گیا ہے۔ (یہ سطریں ۲۸ دسمبر کو لکھی جا رہی ہیں) وہ نیاز صاحب جیسے وسیع موضوع اور میرے جیسے مفصل نگار کے لئے بالکل ناکافی ہے۔ اب میرے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ میں محض خراج تحسین ادا کرنے کی حد تک نیاز نمبر میں شریک ہو جاؤں اور نیاز صاحب کے ہمہ جہتی مطالعے کو نگار کے آئندہ شمارے یا شماروں کے لئے اٹھا رکھوں۔

نیاز صاحب سے زیادہ مختلف الحیثیات اہل قلم اردو میں کوئی اور غالباً نہ تھا نہ ہے۔ ان کا نام لیتے ہی ذہن میں کئی نیاز ابھر آتے ہیں، ان کے متعلق یہ نہیں سوچنا پڑتا کہ وہ کیا کچھ ہیں، بلکہ یہ کہ وہ کیا نہیں ہیں۔

نیاز صاحب کی ہر قسم کی تحریروں کو پڑھ چکنے کے بعد ان کا سب سے پہلے جو تصور میرے ذہن میں آتا ہے وہ انشا پرداز کا تصور ہے۔ فی الحقیقت وہ اول و آخر انشا پرداز ہیں۔ بیچ میں افسانہ نگار، ناول نگار، تنقید نگار، صحافت نگار، مکتوب نگار اور نہ جانے کیا کیا کچھ!

یوں تو ان کے اسلوب کی جادوگری ان کی تخلیقات سے لیکر ان کے ترجموں تک یعنی ہر قسم کی تحریروں میں پائی جاتی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ اگر ایک صاحب طرز نثر نگار کی حیثیت سے نیاز صاحب کو ان کی انتہائی بلندی پر دیکھنا ہو تو مکتوبات نیاز کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ نیاز صاحب کے خطوط ایک ایسے اسلوب کی معراج ہیں جس میں نثر کی لطافت اور شعریت خود شعر کی لطافت اور شعریت سے منزلوں آگے نکل گئی ہے۔

مکتوبات نیاز میں اکثر مقامات پر یہ فیصلہ کرنا بھی دشوار ہو جاتا ہے کہ نثر نے بہترین شعر کی شکل اختیار کر لی ہے یا شعر نے بہترین نثر کی۔ محمد حسین آزاد کے بعد نیاز صاحب دوسرے شخص ہیں جنکی شاعرانہ شخصیت کا مکمل اظہار ان کی شاعری کی بجائے ان کی نثر میں ہوا ہے۔ نیاز صاحب نے اپنے خطوط میں جتنے خوبصورت جملے لکھ دئے ہیں اتنے خوبصورت شعر بھی بہت کم شاعروں کے مجموعۂ کلام میں مل سکیں گے۔ ان کا ہر خط ایک مرصع غزل کا مزا دیتا ہے۔ دلچسپی اور حسن انشاء کے اعتبار سے ان کے خطوط غالباً اردو کے بہترین مکتوب نگار غالب (جن کو دنیا کے بہترین مکتوب نگاروں میں شمار کرنا بیجا نہ ہوگا) کے خطوط پر بھی سبقت لے گئے ہیں۔ لیکن ان کو دلچسپ اور حسین بنانے کی کوشش سطح پر نظر آتی ہے اور غالباً مکتوبات نیاز کی سب سے بڑی کمزوری یہی ہے ان کے خطوط میں انکی شخصیت کا اظہار کم اور مظاہرہ زیادہ ہے۔ الفاظ کا صرفہ کم اور اسلوب کی نمائش زیادہ ہے۔ ذاتی حالات کا بیان کم اور جذبات کا بہاؤ زیادہ ہے ان کے خطوط روزمرہ ضروریات کی بجائے زندگی کے مخصوص لمحات کی تخلیق ہیں — ایسے لمحات جن کو Inspired Moments کہہ سکتے ہیں، یعنی ایسے لمحات جن میں کسی فن کار کا شاعرانہ وجدان اور اس کا تخلیقی جذبہ حرکت میں آجاتا ہے یہی وجہ ہے کہ نیاز صاحب کے خطوط خطوط سے زیادہ تخلیقی ادب پارے معلوم ہوتے ہیں ظاہر ہے کہ ایسے خطوط نہ ہر شخص کو لکھے جا سکتے ہیں نہ ہر روز لکھے جا سکتے ہیں، لیکن نیاز صاحب نے جس کثیر تعداد میں ایسے خطوط لکھے ہیں وہ بجائے خود ایک کارنامہ ہے۔ اگرچہ ان خطوط کا سب سے نمایاں اور سب سے اہم پہلو ان کا انداز بیان ہی ہے، بلکہ بعض اوقات یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ ان خطوط میں انداز بیان کے سوا اور ہے ہی کیا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ مواد و موضوع کے اعتبار سے بھی ان کا دائرہ (Range) بہت وسیع ہے۔ اس وسعت کا اندازہ کرنے کے لئے نیاز صاحب کے ان خطوط کا مطالعہ کافی ہے، جنہیں نگار کے "انشائے لطیف نمبر" میں عائشہ خان نے بہ اعتبار موضوع عنوان کے ساتھ شائع کئے تھے۔ غالب کے خطوط میں انکی زندگی اور زمانے کے سارے اہم نقوش محفوظ ہیں، نیاز صاحب کے خطوط میں نہ ان کی عام زندگی ملتی ہے نہ ان کے زمانے کا عام عکس، لیکن ان کے خطوط میں ان کی رومانی زندگی کے بہت سے گوشے یقیناً پوشیدہ ہیں

جن کی بنیاد پر ان کا کوئی رازدار سوانح نگار رومانی نیاز کی اچھی تصویر تیار کر سکتا ہے۔ ان کے خطوط میں انکی عام زندگی نہ سہی انکی ذہنی اور جذباتی زندگی ضرور مل جاتی ہے۔ جذباتی کیفیات سے قطع نظر ان خطوط میں جو مختلف قسم کے علمی، فکری اور ادبی نکات ملتے ہیں، ان کی بنا پر ان خطوط کا مطالعہ ہمیشہ مسرت بخش بھی ثابت ہوگا اور مفید بھی۔

نیاز صاحب اپنے ناول اور افسانوں میں بھی انشا پرداز پہلے ہیں۔ ناول نگار اور افسانہ نگار بعد میں۔ انہوں نے اپنے ناول اور افسانوں میں جو اسلوب اختیار کیا ہے اگرچہ وہ ہے تو سو فی صدی نیاز صاحب ہی کا اسلوب، لیکن اس میں اور مکتوبات نیاز کے اسلوب میں ایک فرق واضح ہے یہ کہ ناول اور افسانوں میں نیاز صاحب کے خیالات کے ساتھ ساتھ انکی زبان و بیان میں بھی بڑی رنگینی نظر آتی ہے، اس کے برعکس مکتوبات کے اسلوب میں وہ کیفیت پائی جاتی ہے جسے حسرت موہانی نے سادہ رنگیں کہا ہے۔ ع پیراہن اس کا ہے سادہ رنگیں۔

خیال کی رنگینی اور بیان کی سادگی کا ایسا امتزاج جو سحر حلال بن جائے کم از کم مجھے تو کہیں اور نظر نہیں آتا۔

نیاز صاحب کی ادبی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو ان کی رومانیت ہے۔ وہ اردو افسانہ نگاروں کے رومانی اسکول کے ایک ممتاز نمائندہ تصور کیئے جاتے ہیں۔ شاید انہیں سب سے بڑا رومانی کہنا بھی غلط نہ ہوگا کیونکہ جتنی رسیلی اور رچی ہوئی رومانیت نیاز صاحب کے یہاں ملتی ہے اتنی کسی اور کے یہاں نہیں ملتی، ان کے یہاں رومانیت اپنی بہترین اور بدترین دونوں شکلوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اسی رومانیت نے انہیں جمال پرست بھی بنایا اور عورت پرست بھی۔ ان کی جمال پرستی اور عورت پرستی کے طفیل اردو ادب کو رنگ و نور کے سانچے میں ڈھلے ہوئے فن پارے ملے ہیں لیکن انکی جمال پرستی اور عورت پرستی انہیں خالص محبت کے جس نظریے تک لیگئی وہ مضحکہ خیز بھی ہے اور قابل رحم بھی۔ یہ میری ذاتی کمزوری ہے کہ قابل رحم کرداروں پر مجھے رحم کم آتا ہے اور غصہ زیادہ۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے نیاز صاحب کے کردار شہاب اور آسکر وائلڈ کے کردار ڈورین گرے سے جتنی نفرت ہے اتنی نفرت میں آج تک کسی اور سے نہ کر سکا۔ خدا کرے شہاب کے پردے میں کہیں نیاز صاحب نہ ہوں اور اگر ہوں بھی تو مجھے یقین ہے کہ شہاب کے فلسفۂ حیات پر خود انہوں نے بھی عمل نہیں کیا ہوگا۔

نیاز صاحب کے ناول اور افسانوں پر مفصل بحث کسی اور موقع کے لئے اٹھا رکھتا ہوں۔ اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو ان کی شہرت میں ان کی افسانہ نگاری اور ناول نگاری سے بھی زیادہ انکی تنقید نگاری کو دخل رہا ہے۔ عام طور پر ان کے نام کے ساتھ ایک نقاد ہی کا تصور ابھرتا ہے۔ اگرچہ ان کے تنقیدی مضامین سے ادبی ذوق کی تہذیب و تحسین میں مدد لی جاسکتی ہے اور یہ بھی واقعہ ہے کہ کئی پرانے شاعروں کو دوبارہ زندہ کرنے میں ان کا بڑا ہاتھ رہا ہے پھر بھی یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ اردو تنقید نے نیاز صاحب کی رہنمائی میں آگے سفر کرنے کی بجائے پیچھے سفر کیا ہے۔ پروفیسر کلیم الدین احمد نے شبلی کی تنقید کے پیش نظر کہا تھا کہ وہ قدیم و جدید کے درمیان معلق ہو کر رہ گئے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نیاز صاحب کے بارے میں اتنا بھی نہیں کہہ سکتا۔ تنقید کے معاملے میں حالی تذکروں سے آگے بڑھے، شبلی قدیم و جدید کے درمیان معلق ہو کر رہ گئے اور نیاز صاحب تذکروں کی طرف لوٹ گئے۔ وہ ساری زندگی یا تو کسی شاعر کے انداز بیان اور اعجاز بیان پر سر دھنتے رہے، یا پھر یہ بتلاتے رہے کہ فلاں کے یہاں زبان و بیان کی یہ کمزوریاں ہیں اور عروض و قواعد کی وہ غلطیاں۔ نیاز صاحب کی تنقید اگر تذکروں کی تنقید پر اضافے کی حیثیت رکھتی ہے تو صرف اس لحاظ سے کہ تذکرہ نگاروں کو زبان و بیان کی خوبیوں اور خامیوں پر سر دھننا اور سر پیٹنا بھی نہیں آتا تھا۔ تنقید کے باب میں انہوں نے اپنے مغربی معاصرین سے قطعاً استفادہ نہیں کیا۔ یہ سوچ کر افسوس ہوتا ہے کہ وہ اعلیٰ درجے کی ناقدانہ صلاحیت رکھنے (جس کا ثبوت انکے بعض تنقیدی جملوں سے ملتا ہے) مغربی ادب سے حالی اور شبلی کی بہ نسبت زیادہ واقف ہوتے اور شاید ان سے زیادہ ذہین ہونے کے باوجود اردو تنقید کو کسی نئی منزل تک نہیں پہنچا سکے۔

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ جہاں تنقید کے معاملے میں نیاز صاحب اپنے زمانے سے پیچھے رہ گئے وہاں مذہبیات کے معاملے میں وہ اپنے زمانے سے آگے نکل گئے اور اس حد تک آگے نکل گئے کہ غالباً ہر زمانے سے آگے رہیں گے۔ ہر زمانے سے آگے رہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب تک مذہب کے

معاملے میں نیاز صاحب کی سی آزاد خیالی، وسیع المشربی اور حقیقت پسندی عام نہ ہو جائے (مجھے یقین ہے کہ کبھی عام نہ ہوگی) اس وقت تک نیاز صاحب (دنیا کے سارے نیاز فتحپوریوں کی طرح جن کی تعداد ہر زمانے میں بہت کم رہی ہے) نہ صرف اپنے زمانے سے بلکہ ہر زمانے سے آگے رہیں گے۔ افکار و خیالات کے اعتبار سے نیاز صاحب کی تمام تحریروں میں مجھے ان کی وہی تحریریں سب سے زیادہ اہم اور پائیدار معلوم ہوتی ہیں۔ جن کا تعلق مذہبیات سے ہے۔ بعض لوگ ایمان سے الحاد یا الحاد سے ایمان تک سارے مرحلے طے کر جاتے ہیں لیکن دوسروں کے لئے کچھ نہیں چھوڑتے۔ نیاز صاحب ان لوگوں میں سے نہیں ہیں۔ انہیں مذہب کے معاملے میں نفس مطمئنہ حاصل ہوا یا نہیں، لیکن اتنا ضرور ہے کہ مذہب ان کی زندگی کا بہت بڑا مسئلہ رہا ہے۔ انہوں نے مذہب کے بارے میں بہت کچھ پڑھا اور سوچا ہے اور اپنے وسیع مطالعے اور گہرے تفکر دونوں میں ساری دنیا کو شریک ہونے کا موقع دیا ہے۔ ان کے روحانی تجسس نے مذہبی تفتیش میں جس انہماک کا اظہار کیا ہے وہ اردو ادب میں اپنی مثال آپ ہے۔

نیاز صاحب سر سید کے بعد کی ادبی نسل کے فرد ہیں۔ جہاں وہ اپنی رومانیت کے اعتبار سے سر سید کے خلاف ردعمل کی حیثیت رکھتے ہیں وہاں اپنے مذہبی نقطۂ نظر کے اعتبار سے وہ بڑی حد تک سر سید کے رفیق راہ معلوم ہوتے ہیں۔ انہوں نے سر سیّد کی طرح مذہبی معاملات و مسائل میں نہ صرف عقلی تعبیر و توجیہ سے کام لیا بلکہ مذہب کا مفہوم متعین کرنے میں سر سید سے کچھ آگے بھی گئے۔ ان کے نزدیک مذہب اصول اخلاق اور آئین معاشرت سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ مذہب کا یہ تصور ایک ایسا تصور ہے جو ملحدوں کی سمجھ میں تو آ سکتا ہے۔ لیکن مولویوں (حقیقت یہ ہے کہ مذہب کے معاملے میں عام لوگوں کی ذہنیت مولویوں سے مختلف نہیں ہوتی) کی سمجھ میں کبھی نہیں آ سکتا۔ سر سیّد ہی کی طرح مذہب کے باب میں نیاز صاحب کی جنگ ملحدوں سے نہیں بلکہ مولویوں اور ملاؤں سے رہی ہے۔ انہوں نے تمام عمر مذہب کو اہل مذہب سے بچانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے مذہبی خیالات کی بناء پر انہیں ملحد، مرتد، کافر سبھی کچھ کہا گیا ہے۔ اگر نیاز صاحب ملحد، مرتد اور کافر ہیں تو کاش یہ دنیا ایسے ملحدوں مرتدوں اور کافروں سے بھری ہوتی۔ مذہب کے متعلق نیاز صاحب نے جس قسم کے خیالات ظاہر کئے ہیں۔ اُن سے ان کی عافیت بارہا خطرے میں پڑ چکی ہے، لیکن ان کی عاقبت یقیناً خطرے سے باہر رہے گی۔ مذہبیات کے بارے میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اس میں ان کی سب سے اہم تحریریں من و یزداں' کی دو جلدیں ہیں جو مستقل کتابیں نہیں ہیں بلکہ مختلف مضامین کے مجموعے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ مذہب کی غرض و غایت کو سمجھنے، مذہب سے متعلق غلط تصورات و توہمات سے بچنے اور ایک اچھا انسان بننے میں جتنی مدد ان کتابوں سے مل سکتی ہے اتنی مذہبی صحیفوں سے بھی نہیں ہر آدمی کو چاہیئے کہ اپنی روحانی صحت کے لئے روزانہ ان کتابوں کے چند صفحے پڑھ لیا کرے۔

*

"تصوف ہمیشہ میری پریشاں خیالی کی جائے پناہ رہا ہے۔ لیکن اس کا علمی یا فلسفیانہ پہلو نہیں
جسمیں لطائف قلب یا حقیقت و معرفت وغیرہ کی اصطلاحوں سے بحث کی جاتی ہے
بلکہ اُس کا اخلاقی پہلو، اس کا والہانہ مشرب، اس کا نعرہ ہمہ اوست،
اس کا آوازہ "پندارم توئی"، کہ اگر آپ عملی زندگی میں اس کی تفسیر کریں
تو نتیجہ وہی انسانیت پرستی نکلتا ہے۔"

(نیاز)

نیاز صاحب

محمد طفیل

میں نے نیاز صاحب کا نام اُس وقت سنا تھا جب خود بچہ تھا مگر آج مجھے باتیں کرنی پڑیں گی ایک بوڑھے بچے کے بارے ہیں۔ لوگ بچے اور بوڑھے کو برابر سمجھتے ہیں مگر نیاز ایسے بوڑھوں میں نہیں جنہیں بچہ کہا جا سکے۔ کُلیہ غلط ہو گیا۔ بچپن ہی میں یہ سنا تھا ک لکھنؤ میں ایک کافر، نیاز نامی ہے۔ جو ایسی باتیں لکھتا ہے جو اسلام کا بدترین دشمن بھی نہیں لکھ سکتا۔ اُس وقت ان کے خلاف جلسے ہوتے تھے۔ تقریریں ہوتی تھیں۔ ایک ہنگامہ بپا تھا۔ مولانا سید سلیمان ندوی آنجہانی اور مولانا عبدالماجد دریا بادی ابن جہانی نیاز صاحب کو کافر اور ملحد قرار دے رہے تھے۔ کیا خبر تھی کہ جب اسی کافر اور ملحد سے ملاقات ہو گی تو وہ کئی عابدوں سے بہتر انسان ثابت ہوگا ——

میری کوئی شامت تھوڑی آئی ہے جو میں یہ کہوں کہ علما بلا وجہ ہی برہم تھے۔ بات یہ ہے کہ نیاز صاحب کی شرارت آمیز باتوں نے انہیں جو گرمایا تو وہ آپے میں نہ رہے۔ دوسرے ہمارے علما مذہب کے معاملے میں عقل کو دخل دینے بھی تو نہیں دیتے۔ بس اتنی سی غلطی تھی جو نیاز صاحب سے ہوئی۔ لکھتے ہیں :-

"ایک طرف یہ کہتے ہو کہ اسلام نے بت پرستی کو مٹایا اور دوسری طرف اسی میں مبتلا ہو۔ بُت خواہ وہ خدا ہی کا کیوں نہ ہو بُت ہے اور توڑے جانے کے قابل —— اور خدا خواہ وہ کوئی بُت ہی کیوں نہ ہو۔ قابل پرستش ہے۔ اگر تم اس نازک فرق کو نہیں سمجھ سکتے تو جاؤ اٹھو وضو کر کے نماز پڑھو۔ تمہارا بُت تم سے خفا نہ ہو جائے —— میں بھی جاتا ہوں۔ آئینہ سامنے رکھ کر اپنے "خدا" کو پوجوں گا"

(صفحہ نمبر ۹۳، سالنامہ نگار جنوری سنہ ۱۹۴۰ء)

دوسری جگہ یوں :- "مذہب نام ہے صرف کورانہ و جاہلانہ انقیاد و اطاعت کا، اس لئے اس کا وجود، خواہ وہ ضروری ہو یا غیر ضروری، مفید ہو یا غیر مفید، صرف اس طرح قائم رہ سکتا ہے کہ وہ جہل و لاعلمی کی دنیا میں رہے۔ علم کے میدان میں اس کی تگ و دو حد درجہ نامعقول حبارت ہے۔ کیونکہ یہیں آ کر سب سے پہلے اس کے پائے لنگ کا حال کھلتا ہے اور وہ مضحکہ خیز چیز بن جاتا ہے" (من و یزداں حصہ دوم صفحہ ۳۹۳

مثالیں اور بھی بہت سی دی جا سکتی ہیں۔ مگر چھوڑیئے ——

کفر و اسلام کی اس جنگ کے بعد، جس میں سرد فریق نیاز اور گرم فریق علما تھے، انہوں نے ایک اور محاذ کھول دیا۔ شیعہ او سنیوں کے درمیان مسئلہ خلافت کا۔ بچلا بیٹھنا ان کے بس کی بات ہی نہیں۔ اس بحث کا آغاز "ہر نام" سے ہوتا ہے جو قرآن اور حدیث کے حوالوں سے باتیں کرتے ہیں اور حوالے دیتے ہیں ان کتابوں کے جن میں تقریب التہذیب، استیعاب، اسد الغابہ، تاریخ کبیر، تاریخ ک تاریخ ابو الفدا، لباب التاویل، مواہب لدنیہ، تاریخ خمیس، صواعق محرقہ، خصائص، ریاض النضرہ، طبقات کبریٰ، تاریخ الخلفاء، مدار النبوۃ، جامع البیان، تفسیر کبیر، موطا، سیرۃ ابن ہشام، روض الانف وغیرہ ہیں۔ یہ ساری کتابیں رجال، سیر، تاریخ اور تفسیر کی مشہ

کتابیں ہیں۔ اس سے پہلے میں نے ان میں سے چند ہی کے نام سنے تھے۔ چہ جائیکہ پڑھا ہو۔ جانچا ہو۔ مگر حیرت ہے ایک غیر مسلم پر، جو نہ صرف ان کتابوں کو پڑھتا ہے بلکہ ان میں ڈوب کر اپنے مطلب کے حوالے بھی نکال لاتا ہے۔ جہاں تک میرا ذہن کام کرتا ہے۔ وہ تو یہ ہے کہ ہر نام کے پردے میں خود نیاز صاحب ہی تھے۔

ربع صدی پہلے ہی کا یہ بھی ذکر ہے کہ انھوں نے ایک شوشہ، خط کی صورت میں چھوڑا، جس میں تمام علما سے یہ پوچھا کہ ایک مسلمان جو فاسق و فاجر ہے اور ہر لحاظ سے بُرا انسان ہے اور اس کے برعکس ایک غیر مسلم، جو ہر طرح سے بہتر انسان ہے اور دنیا کی کوئی برائی اس میں نہیں ——— ان دونوں میں سے جنت کا حق دار کون ہوگا۔

بہت سے علما نے اپنی رائے گول مول سی دی۔ کچھ نے کنی کترائی۔ بہتوں نے یہ لکھا کہ مسلمان ہی جنت کا حق دار ہوگا خواہ وہ کتنا ہی بُرا کیوں نہ ہو۔ جواب میں انہوں نے بڑے تند و تیز مضامین لکھے۔ ان کے کہنے کا جو کچھ بھی لب لباب تھا وہ کچھ یوں تھا:۔

”آپ لاکھ سمجھائیں۔ یہ بات میری سمجھ میں نہ آئے گی کہ خدا صرف مسلمانوں کا ہے اور سوا ان کے سب کو جہنم میں پھینک دے گا۔ ظہورِ اسلام سے لے کر اس وقت تک زیادہ سے زیادہ دو چار ارب مسلمان پیدا ہوئے ہوں گے اور ان کے مقابلے میں ہزار گنا زیادہ اور مذاہب کے لوگ، پھر کیا کوئی ذی عقل باور کر سکتا ہے کہ خدا ایک کو تو جنت دے اور ہزار کو دوزخ میں جلائے۔ اس کو اتنے جہنمی پیدا کرنے کی آخر ضرورت ہی کیا تھی اور اتنی مخلوق کو جن میں جانے کتنی عورتیں اور بچے ہوں گے آگ میں ڈال کر تڑپانے سے خدا کی کونسی مسرت وابستہ ہے ——— آپ کے پاس اس کا ایک ہی جواب ہے کہ اس کی مرضی، اور میرے پاس بھی اس کے خلاف ایک ہی احتجاج ہے ؎

یارب ز سیلِ حادثہ طوفاں رسیدہ باد بت خانہ کہ خانقہش نام کردہ اند“

(مکاتیب نیاز)

جہاں تک میرا خیال ہے نیاز صاحب اندر سے بڑے مذہبی آدمی ہیں۔ انہوں نے اب تک مذہب کے بارے میں جو کچھ اور جتنا کچھ لکھا ہے اس میں صرف جعلی مذہبیت کو جھنجھوڑا۔ بنے ہوئے خدائی فوجداروں کے مذہبی پندار کو آئینہ دکھایا ——— نیاز صاحب کوئی کافر وافر نہیں ہیں بلکہ معاملہ صرف اتنا نظر آتا ہے ——— کافر ہوا میں دین کے آداب دیکھ کر ——— بہرحال یہ چھیڑ چھاڑ انہیں بڑی مہنگی پڑی۔ ساری خدائی ایک طرف تھی اور یہ اکیلے ایک طرف۔ مولویوں سے بغاوت، رسول سے بغاوت کے نام سے تعبیر ہوئی اور پھر بات خدا سے بغاوت تک پہنچادی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے مولویوں کے خلاف ”نقاب اٹھ جانے کے بعد“، قسم کے تقدس توڑ افسانے لکھے۔ ضد میں آکر اعتدال کی حدود سے بھی پھاند گئے اور ہمارے علما بھی، حالانکہ ضرورت یہ تھی کہ ذرا پچکار کے اس ”مسلمان کو کافر بنالیا جاتا“ ——— اس ذہنی ورزش کا اور کوئی فائدہ ہوا یا نہیں۔ مگر حقیقی نیاز سامنے آگیا اور عقل کو بھی مذہب کے معاملات میں ساتھ رکھ لینے کی بنیاد پڑ گئی۔

میں نے جو کہا ہے کہ نیاز صاحب اندر سے مذہبی آدمی ہیں تو اس کی کچھ وجوہ بھی ہیں۔ ابھی ایک کتاب ”خلافت معاویہ و یزید“ نکلی۔ بہت سے نامور علماء نے اس کی بڑی تعریف کی۔ حالانکہ اس میں بڑی اوٹ پٹانگ باتیں درج ہیں۔ اُس میں یزید کو خلیفۂ برحق کہا گیا ہے۔ پھر یزید کو امیر المومنین، علیہ السلام اور رضی اللہ تعالیٰ عنہ لکھ کر مسلمانوں کے جذبات سے کھیلا گیا۔ مطلب یہ کہ سخت دل آزار قسم کی کتاب ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق ایسے ادیب اور مولانا عبدالماجد دریابادی ایسے عالم نے اس کتاب کی تعریف کی۔ مگر نیاز نے جو کافر ہیں، بڑا سخت ریویو لکھا اور اس کے مندرجات کو ملعون گردانا۔

اگر کوئی رسول کی عظمت کے بارے میں، خدا کے وجود کے بارے میں اور اسلام کی برتری کے بارے میں، نیاز صاحب کی تحریروں میں ڈھونڈنا چاہے تو وہ قطعاً مایوس نہ ہوگا۔ مگر کتنے ہیں جنھوں نے نیاز کے اس پہلو پر غور کیا ہوگا۔ ایک آدھ شہادت کے بعد میں اس

باب کو نہ چھیڑوں گا۔ اس لئے کہ میں کوئی "مفتیٔ وقت" ہوں کہ کسی کو مسلمان ہونے کے اور کسی کو مسلمان نہ ہونے کے پرمٹ بانٹتا پھر

نیاز صاحب اپنے عقائد کے بارے میں خود کہتے ہیں:۔

"غضب خدا کا، میں سو بار کہہ چکا ہوں کہ خدا کی عظمت و جبروت اور اس کی قوت و قدرت کا اس طرح قائل ہوں کہ شاید ہی کوئی دو ہو۔ ہزار بار لکھ چکا ہوں کہ رسولؐ کی صداقت و بلندیٔ فطرت پر جس طرح ایمان میں لایا ہوں شاید ہی کوئی دوسرا ایمان لایا ہو۔ لیکن باوجو اس اقرار کے بھی میں کافر ہوں۔ ملحد ہوں۔ مُرتد ہوں۔ پھر اگر اسی اقرار و عقیدہ کا نام کفر و الحاد ہے تو

نازم بہ کفر خویش کہ بہ ایماں برابر ست

(من و یزداں صفحہ ۸۹)

نیاز صاحب کے عقائد کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ مذہب کے معاملے میں سرسید کے ہمنوا نظر آتے ہیں۔ سرسید بھی اپنے وقت میں "کافر اور ملحد" تھے۔ یہ بھی ہیں۔ اس لئے کہ دونوں کا جرم یہ ہے کہ انہوں نے مذہب کو عقلی انداز میں سمجھنے کی کوشش کی۔ آج لاکھوں کروڑوں مسلمان ہیں۔ مگر ان میں کوئی سرسید نظر نہیں آتا۔ اسی طرح کل بھی لاکھوں کروڑوں مسلمان ہوں گ مگر ان میں کوئی نیاز نہ ہو گا۔

نیاز صاحب سے میری پہلی ملاقات ۱۹۴۴ء میں ہوئی تھی۔ اس وقت کی کوئی بات میرے ذہن میں نہیں۔ سوا اس کے کہ میں انہیں ایک بڑا ادیب سمجھ کر ان سے ملنے چلا گیا تھا۔ دوبارہ ۱۹۴۶ء میں ملا۔

دوران گفتگو کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ بھی چلا۔ نیاز صاحب نے اس وقت تک، زیادہ تر اپنی کتابیں خود ہی چھاپی تھیں میں نے یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ اپنی کوئی کتاب کسی دوسرے ادارے کو نہ دیں گے پوچھ لیا۔ اگر آپ اپنی دو چار کتابیں ادارہ فروغ اُردو کو بھی چھاپنے کے لئے دیں تو کرم ہو۔ خلافِ توقع انہوں نے "بہت اچھا" کہہ دیا اور میں نے شائع بھی کیں لیکن ان میں وہ مضامین نہ تھے جو میں چاہتا تھا بعض میں یہ مضامین من و یزداں (حصہ اول) کے نام سے خود نیاز صاحب کے چھاپے۔

یہ وہی مضامین تھے جن پر ایک زمانے میں ہنگامہ بپا تھا اور دین کا "سچا درد رکھنے والے" نیاز صاحب کو قتل کر دینے کی فکر میں تھے۔ میں نے ایسے مضامین کی اشاعت کے بارے میں کیوں سوچا تھا یہ مسئلہ آج بھی میرے لئے غور طلب ہے۔ مگر یہ مسئلہ غور طلب نہیں کہ میں اگر نیاز صاحب کی ذہانت اور ان کی تحریر کا قائل ہوا تھا تو انہیں مضامین سے، عقل اور تحریر کا اتنا بانکپن یکجا کم ہی کبھی ہوا ہو گا۔

نیاز صاحب کی تحریر کی بات آ نکلی ہے تو میری دو چار باتیں اور بھی سُن لیں ـــ یہ مضمون لکھنے کے لئے، میں نے نیاز صاحب کی کتابوں کو پھر سے پڑھنا شروع کر دیا۔ اس لئے کہ میرا خیال ہے کہ نیاز صاحب اپنی تحریروں میں بالکل واشگاف ہیں۔ دل و دماغ دونوں اعتبار سے! شروع شروع میں بعض خوبصورت فقروں اور جملوں پہ نشان بھی لگائے۔ مگر میں یہ کام کہاں تک کرتا۔ ہر سطر، ہر فقرہ اپنی طرف متوجہ کر لیتا۔ بعد میں تو ان کی تحریروں کے بہاؤ میں ایسا بہا کہ کچھ ہوش نہ رہا۔ پھر نہ تو کوئی نشان ہی لگا سکا اور نہ کہیں اٹک سکا۔ بہتا ہی چلا گیا۔ یہ بھی پتہ نہ چلا کہ صبح کے تین بج گئے ـــــ تین بجے ہوں اور سماں یہ ہو ـــــ ٹھنڈی یخ رات، اٹوٹ سناٹا، دور کتے کے بھونکنے کی آواز، کسی کسی گھر میں سرسراہٹ، کہیں اکّا دکّا دھند میں لپٹی ہوئی آواز ـــــ کبھی آپ نے نیاز کی تحریریں، ایسے ماحول میں پڑھی ہیں۔ اگر پڑھی ہوں گی تو ان پر الہام کا گمان بھی ہوا ہو گا۔ ایسے سمے میں "ایک شاعر کا انجام" پڑھ رہا تھا۔ کیا بتاؤں، میں نے کیا کچھ نہ پایا۔

نیاز صاحب نے جو کچھ بھی امتیاز حاصل کیا وہ اپنے قلم کے سحر سے حاصل کیا۔ لکھنے کے لئے کسی اہتمام کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بلکہ باتیں بھی کرتے جاتے ہیں، لکھتے بھی جاتے ہیں۔ گلوری منہ میں ہو گی۔ خُوں خُوں کر کے باتوں میں ساتھ دیں گے۔ ضرورت پڑی تو پیک نگل کر بولیں گے۔ "یہ آپ نے

کیسے سمجھ لیا کہ کام میں مشغول ہوں" ——— حافظہ بلا کا پایا ہے۔ ہر چیز، ہر کتاب ان کے ذہن میں منتقل ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے بڑے بڑے کام صرف چند دنوں میں کر ڈالے۔ "گہوارۂ تمدن" ایسی کتاب صرف پندرہ دن میں ذہن سے کاغذ پر منتقل ہو گئی تھی۔

ان کے ہاں آمد ہی آمد ہے۔ آورد نام کو نہیں۔ الفاظ واقعی ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ یہ کمال میں نے صرف انیسؔ، جوشؔ اور نیازؔ میں دیکھا۔ باقی سب کے ہاں کاریگری ہے۔ وہ چاہے محمد حسین آزاد ہوں چاہے کوئی اور ——— ہاں ابوالکلام کا نام بھی لیا جا سکتا ہے مگر انہوں نے آورد کو آمد بنایا اس لئے میں نے دانستہ انہیں اس گروہ میں شامل نہیں کیا۔ یوں تو نیاز ابوالکلام سے متاثر ہیں۔ نیاز ہی کیا پورا دور متاثر ہے ابوالکلام نے تحریر کی باگیں خطابت کے ہاتھ میں دے دیں مگر نیاز نے ایسا نہیں کیا۔ انہوں نے اپنا رنگ جمانے کے لئے، تحریر کی آبرو کی قیمت اپنی ریاضت سے ادا کی اور اسی نے ان میں انا پیدا کیا۔

ان کے "انا" کا ایک واقعہ وہ عرض داشت بھی ہے جو انہوں نے بیگم صاحبہ بھوپال کے نام لکھی تھی۔ سن پندرہ سولہ کا واقعہ ہوگا۔ یہ زمانہ وہ تھا جب ان کا "گیتا نجلی" کا ترجمہ شائع ہو چکا تھا "شاعر کا انجام" اور "جذبات بھاشا" چھپ چکی تھیں۔ بھوپال میں ان کے کچھ قدردان پیدا ہوئے جنھوں نے انہیں بھوپال آنے کی دعوت بھی دی اور بات بھی بیگم صاحبہ تک پہنچائی۔ بیگم صاحبہ نے وعدہ کر لیا کہ نیاز صاحب کا ہر طرح سے خیال رکھا جائے گا ——— نیاز صاحب بھوپال پہنچے تو فوری طور پر کچھ نہ ہوا۔ مجبوراً انہیں محکمہ اوقاف میں کام کرنا پڑا۔ جب دو برس یونہی گزر گئے تو دوستوں کے تقاضے سے انہوں نے ایک عرض داشت بیگم صاحبہ کو بھیجی۔ وہ عرض داشت یہ ہے:-

زمن سپاس تو آید ہمیں کہ نالانم — زخندہ ات چہ لوا بردہ ام کہ گریانم
نگاہِ مہر کہ بر من فگندہ بینم — سحابِ لطف کہ بر من فشردہ دانم
ولے ز آرزوِ خود ہنوز منفعلم — ز اقتضائے کمالِ خودش پشیمانم
بدستِ من سرِ دامانِ خود رسیدن دہ — وگرنہ چاک شدن خواہدش گریبانم
عجب نباشد اگر می زنی بدستارت — بجائے طرہ کہ من گوہرے زعمانم
ببر مرا بہ مشامت کہ مشکم از تاتار — بکش مرا ببرت تیغے از صفاہانم
مرا بہ افسرِ دیہیمِ خود بدہ جائے — کہ من بہ تاب و صفا لعلے از بدخشانم
مرا بپرس ز حسان و شیخ شیرازی — کہ نغمۂ عرب و طوطئ ز ایرانم
مرا بہ وعدۂ لطفے چو شاد فرمودی — نہ زیبدت کہ تماشہ کنی پریشانم
چہا کنی کہ تو امروز نیشتر سازی — بہماں امید کہ دی ساختی رگِ جانم
تلطفے کن و قدرم شناس و کارم دہ — کہ باشد از نظرِ عدل و نظم شایانم
وگرنہ دہ خبر از نامرادیم کہ زنم — بہ سنگِ سخت فنا قلب شیشہ سامانم

ملاحظہ فرمائی آپ نے عرضداشت، دیکھ لیجئے درخواست میں بھی ان کا انا کس مقام پر ہے۔ بیگم صاحبہ پر طنز اور اپنی حد درجہ بڑائی کا احسا یہ طنز، آپ کو اس قلندر کے علاوہ اور کس کے ہاں ملے گا؟ بیگم صاحبہ کا بھی ظرف دیکھئے کہ انہوں نے ایسی عرضداشت پر بھی ان کا (سنہ ۱۹۱۸ء میں) کوئی ڈیڑھ دو سو روپیہ ماہوار کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ تاکہ "بزرگوار" آزادانہ تصنیف و تالیف کا کام کر سکیں۔

عمل زندگی میں یہ ریاضی ہیں یا اقلیدس ہیں۔ جس طرح ایک عدد دوسرے عدد کو جمع تفریق ہوئے بغیر کوئی نقصان نہیں پہنچاتا اسی طرح یہ بھی اپنے ملنے والوں کو "جمع تفریق" ہوئے بغیر کوئی نقصان نہیں پہنچاتے ——— اور ——— گوتم بدھ کی طرح، ان کے ہاں ایک

خاص قسم کا ذہنی سکون بھی ملتا ہے۔ ربودگی اور بھاری بھرکم پن کے ساتھ، ایک خاص قسم کا استغنا —— تکلف نام کو نہیں۔ جھوٹے پندار سے یارانہ نہیں۔ سوچنے کا انداز نرالا، مذہبی معاملہ ہو یا علمی و ادبی، انہیں اپنے جوہر دکھائے بغیر چین نہیں پڑتا۔ چاہے کسی بھی معاملے میں موسو کیڑ ڈلوا لیجیے۔ ہما شما کا تو ذکر ہی کیا۔ انہوں نے خدا کی کتاب (قرآن) تک کو کہہ دیا کہ یہ خدا کا کلام نہیں، بلکہ اس کتاب کو اگر رسولؐ کی کتا مانیں تو اس سے رسولؐ کی عظمت اور بڑھے گی۔ مطلب یہ کہ بات دنیا سے الگ جو کرنی ہوئی۔

انہوں نے اگر کسی کے خلاف لکھا ہے تو وہ سب کے سب ایسے ہیں جن کا ادب میں اونچا مقام ہے۔ چھوٹے موٹے ادیبوں کو تو منہ ہی نہیں لگاتے۔ پہلے بھی میں نے عرض کیا ہے کہ مُبتدیوں کی تو بے جا حد تک تعریف افزائی کر جائیں گے اس خیال سے نہیں کہ وہ ایسے توصیفی کلمات کے مستحق ہوتے ہیں بلکہ اس خیال سے کہ ان کی مخفی صلاحیتوں کو اُبھرنے کا موقع تو ملے اور —— اور —— انہوں نے بڑے بڑے اساتذہ کو وہ اصطلاحیں دی ہیں کہ بے چارے نکو بن کر رہ گئے۔ کوئی خوش قسمت ہی ہوگا۔ جو ان کے قلم کی زد سے بچا ہو۔ جہاں تک شعر کے سمجھنے کا تعلق خوب سمجھتے ہیں۔ شعروں کا آپریشن بھی خوب کرتے ہیں۔ مگر اس آپریشن میں بعض اوقات شعر کو ذبح بھی کر ڈالتے ہیں۔

نیاز صاحب نے فارسی تو اپنے والد ماجد سے پڑھی اور عربی مختلف اساتذہ سے۔ انہی بزرگوں کا یہ سب کیا دھرا ہے جو نیاز کی شکل میں ہمارے سامنے آیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات ان کے فقرے سمجھ میں نہیں آتے۔ بہ ظاہر اردو کے ہوتے ہیں مگر ٹوہ لگائی جائے تو ان سے کچھ فارسی کے نکلتے ہیں اور کچھ عربی کے اور پتّا ان عزیزوں کا ہو جاتا ہے جو اپنی طرف سے اردو پڑھنا چاہتے ہیں۔

نیاز صاحب غالباً پہلے شخص ہیں جنھوں نے قلم کو آمدنی کا ذریعہ بنایا۔ جب تک یہ بھوپال میں تھے اس وقت تک ان کا اپنا کوئی اشاع ادارہ نہ تھا مگر یہ مضامین اس وقت بھی معاوضتہً دیتے تھے۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں یہ باقاعدہ قسم کے مضمون نگار تھے۔ تمدن، اسوۂ حسنہ، صوفی، خطی وغیرہ رسائل میں ان کے مضامین نکلتے بھی تھے۔ چلتے بھی تھے۔ اس کے بعد جب انہوں نے باقاعدہ کتابوں کی نشر و اشاعت کا سلسلہ چلایا اور نگار کو آسمانِ صحافت تک پہنچایا تو لاکھوں کمائے۔ خوب خوب کتابیں لکھیں جو بکیں بھی خوب خوب۔ نگار کے بھی وہ وہ نمبر نکلے کہ اُن پر اضاف تقریباً ناممکن ہے۔

یوں تو نگار کے قلمی معاونین میں، ہمیشہ بڑے لکھنے والے ہی رہے مگر ان سب کی موجودگی میں بھی، نیاز کی تحریر کی بات ہی اور ہوتی تھی اور جی چاہتا تھا کہ کاش سارا رسالہ خود نیاز صاحب کی تحریروں ہی سے مزین ہوتا۔ چنانچہ انہوں نے ایسا بھی کر دکھایا۔ سارے کا سارا نمبر خود لکھ کر پیش کر دیا۔ پڑھنے والے نہال ہو گئے۔ یہ مرتبہ بھی نیاز صاحب کے سوا، کسی اور کو نصیب نہ ہوا۔

نیاز صاحب مومن کے بڑے مداح ہیں۔ جو کوئی بھی مومن کا زیادہ مداح ہوگا وہ لازمی طور پر اُس کے ہمعصر غالب کا طرف دار نہ ہوگا یہی حال کچھ نیاز صاحب کا بھی ہے مگر یہ اپنے مضامین میں جتنے شعر غالب کے کوٹ کرتے ہیں اُتنے مومن کے نہیں کرتے۔ احتیاط صرف اتنی کرتے ہیں کہ غالب کے اردو شعروں کے بجائے، فارسی کے شعر اپنی نثر میں سجاتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ غالب کو فارسی کا شاعر اور مومن کو اردو کا شاعر مانتے ہیں۔ یہ فلسفے کو صرف تصوف اور تصوف کو غزل نہیں سمجھتے۔ یہی وجہ ہے کہ غزل کا جو تصور اُن کے ہاں ہے۔ وہ مومن ہی میں ملتا ہے۔ غالب میں استحکام کم ملتا ہے۔ بظاہر یہ بات بجا تو چل جانے والی ہے۔ مگر یہ کچھ زیادہ غلط نہیں۔

اس لحاظ سے بھی نیاز صاحب کی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو یہ عملی زندگی میں بھی مومن ہی نظر آتے ہیں۔ مومن ہی کی طرح عورت سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ مومن ہی کی طرح عورت کی پرستش کرتے ہیں اور مومن ہی کی طرح کا، ان کے ہاں بھی تصور عفت کچھ عجیب سی رندی میں عفت اور عفت میں رندی کا سا انداز رہا ہے۔

مومن اپنی مثنویات میں جس طرح نظر آتے ہیں۔ نیاز ویسے ہی اپنے خطوط میں نظر آتے ہیں۔ میں نے ان کی تحریروں میں شراب کی باتیں پڑھی ہیں مگر انہیں کبھی پیتے ہوئے نہ پایا۔ اِدھر اُدھر پوچھا بھی، مگر ان کی بادہ خواری کا حال نہ کھلا۔ پیتے ضرور ہوں گے۔ اس لئے کہ دوستوں کو بھی کہتے ہیں کہ "چار انگل شراب پیو اور خدا کو یاد کرو"۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو ان کا قلم اتنا سچا اور اتنا بے ریا نہ ہوتا۔ شراب میں ہزار عیب ہوں گے مگر بادہ خوار کا باطن میلا ہونے نہیں دیتی۔ اس باب میں ان کا مسلک کچھ اس قسم کا نظر آتا ہے۔

گہ، گہ، خورد کم خورد و تنہا مے خوار

میرا بڑا جی چاہتا ہے کہ میں بھی معقول آدمی بن جاؤں۔ مگر نہیں بن سکا۔ اچھے بُرے مشاغل کا اتنا ہجوم ہے کہ پناہ بخدا میرے پاس جتنے خط آتے ہیں ان سب کا جواب دینا میرے بس کی بات ہی نہیں رہی۔ پھر یہ بھی نہیں کہ مجھے اپنی اس زیادتی کا احساس نہ ہو۔ مگر میں کیا کروں۔ ہجومِ کار کی زیادتیوں نے مجھے عاجز سا بنا دیا ہے۔ اس کے برعکس نیاز صاحب خطوط کے جواب میں اتنے باقاعدہ ہیں جیسے سورج کا ہر روز نکلنا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اٹھارہ برس کے عرصے میں انھوں نے میرے کسی خط کا جواب نہ دیا ہو۔ میں کتنا نالائق، یہ کتنے باضابطہ، رشک چھوڑ حسد والی بات ہے یہ!

یہ صرف خطوں کے جواب ہی میں باقاعدہ نہیں بلکہ ان کی پوری زندگی ہی ایک ضابطے میں ڈھلی ہوئی ہے۔ انہیں جو کام اس وقت کرنا ہے وہی کام دوسرے دن اور اُسی وقت کرتا ہے۔ نیاز صاحب خط کا جواب ضرور دیں گے خواہ صرف اتنا ہی لکھا ہو —— "تم لکھنؤ آرہی ہو —— بالکل جھوٹ! —— نیاز" —— میرا خیال ہے کہ نیاز صاحب میری طرح دن رات کے اتنا چھوٹا ہونے پر خوش نہ ہوں گے۔ ضرور چوبیس گھنٹوں کے بجائے ایک سو چوبیس گھنٹے چاہتے ہوں گے۔ ۶۲ گھنٹے دن کے ۶۲ گھنٹے رات کے، مگر انہیں بھی سب کی طرح ۱۲ گھنٹے دن کے میسر ہیں اور ۱۲ گھنٹے رات کے، مگر ان بارہ گھنٹوں میں یہ کیا کچھ کرتے ہیں آیئے ذرا اس کا تو سراغ لگائیں۔

صبح اٹھتے ہیں۔ سیر کرتے ہیں۔ خطوں کے جواب دیتے ہیں (اس میں سبھی قسم کے خطوط ہوتے ہیں۔ علمی کاروباری بھی، احباب کے نام بھی، ادبی نوعیت کے بھی اور عاشقانہ بھی) آئے ہوئے اچھے بُرے مضامین پڑھتے ہیں (یہ کام بہ ظاہر تو بڑا شاندار معلوم ہوتا ہے۔ مگر جو کرتا ہے اسے ہی معلوم ہے کہ ایڈیٹری کس عذاب کا نام ہے) مضامین کی تصحیح کرتے ہیں، ناقابلِ اشاعت مضامین واپس کرتے ہیں۔ کھانا کھاتے ہیں۔ قیلولہ کرتے ہیں۔ تصنیف و تالیف کا کام کرتے ہیں۔ دوست احباب سے گپ لڑاتے ہیں۔ چائے نہیں پیتے۔ پان کھاتے ہیں۔ سگریٹ نہیں پیتے۔ شام کو کوئی نہ کوئی دلچسپ کام کرتے ہیں، سینما دیکھتے ہیں۔ کسی "کسی" سے ملنے چلے جاتے ہیں۔ مطالعہ کرتے ہیں۔

مجھے نیاز صاحب کے خط بڑے پیارے معلوم ہوتے ہیں۔ مکتوباتِ نیاز میں جتنے خط ہیں۔ ان میں کچھ تو فرضی ہیں جو انہوں نے کسی نہ کسی مسئلے کو خط ہی کے پیرایہ میں لکھنے کو بہتر جان کر لکھ ڈالے۔ مگر بیشتر خط ایسے ہیں جن کا واقعی کوئی مخاطب تھا بھی اور تھی بھی۔

مکاتیب نمبر کی ترتیب کے وقت، مجھے ان کے کچھ ایسے خط بھی ملے تھے جن میں نیاز صاحب نے اپنے جوان قلم سے خون کی سیاہی چھڑکی تھی مگر میں نے ان کی اشاعت مناسب نہ سمجھی۔ اس لئے کہ مجھے نیاز صاحب کی شخصیت سے ایک نیاز مندانہ ربط ہے مگر نیاز صاحب خود اس کی کچھ پروا نہیں کرتے۔ وہ علی الاعلان راجہ اندر بننے میں کسی قسم کی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ اس لئے میں بھی انہیں شیخ کیوں سمجھوں!

صنفِ لطیف کی نفسیات کا جتنا گہرا مطالعہ ان کے ہاں ملتا ہے وہ انہی کا حصّہ ہے۔ جذباتِ بھاشا" ہمیں ان کے ادبی رجحانات کا رُخ سجھاتی ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ کس طرح عورت کی نفسیات کی عکاسی اور نقاشی کرتے ہیں ـــــ قاضی عبدالغفار نے بھی "لیلےٰ کے خطوط" میں عورت کی نفسیات کی بڑی عمدہ عکاسی کی ہے۔ مگر ان دونوں میں ایک بنیادی فرق ہے قاضی صاحب کے ہاں عورت کی جو نفسیات ملتی ہے۔ وہ کوٹھے والیوں کی ہے نیاز کے ہاں شوقین عورتوں کی نفسیات ہے۔

اس نوع کا، ان کا ایک مضمون "کیوپڈ اور سائیکی" ہے۔ پڑھتے جائیے اور مرحبا کہتے جائیے۔ مگر میں یہاں ان کے مضمون "رقاصہ" کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ بڑی گہری باتیں ہیں اس میں۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے نیاز صاحب اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ رقاصہ کی تعریفیں کرتے ہیں مگر یہ بھی کہتے ہیں "کاش تو صرف بہری ہوتی اور اس پر افسوس بھی کرتے ہیں کہ تو سب کی ہے" شاید یہی وہ انداز فکر تھا جس کی وجہ سے انہوں نے کوٹھوں پر چڑھنے کے بجائے، شایستہ عورتوں ہی سے ایک قسم کی ذہنی وابستگی رکھی۔ یہ "وصل کے بعد تنہائی بھی اک دینا ہے" پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔ جو قطعی طور پر ذہنی آوارگی کی ضد ہے۔ یہ اگر اپنی زندگی کو کچھ محرومیوں سے بھی آشنا نہ رکھتے تو اس رنگ میں اتر ہی نہیں سکتے تھے۔ اتنا گہرا مشاہدہ کہ تصور کی آنکھیں ہار مان لیں۔ شاید ہی اردو میں، کہیں ملے۔ اگر یہ اس نوع کے بھی عملی انسان ہوتے اور اپنی جوانی کو نگار کے صفحات سے اٹھا کر ہاتھ پہ لیے پھرتے تو ایسا مضمون قیامت تک نہ لکھ سکتے۔ انہوں نے ہمیشہ بازار کی روٹی اور بازار کی چیز سے پرہیز کیا۔ عجیب سے رندِ پاک باطن ہیں یہ!

جہاں تک میں خود نیاز صاحب کی تحریروں سے اندازہ کر سکا وہ تو یہی ہے کہ ابتدائی زندگی انہیں بڑی پابندیوں اور بڑی گھرکیوں کے سے ماحول میں بسر کرنی پڑی۔ مگر جب عمر ایسی لگی جس میں ذہنی نشاط کی قیمت معلوم ہوتی ہے تو پھر وہ کھل کھیلے۔

بیٹھا برس لگنے کے بعد انہوں نے کیا کچھ کیا ہوگا۔ اس کا کچھ زیادہ پتہ نہیں چلتا۔ یہ ہزار رنگے سہی، مگر پھر بھی جوش اور فراق کی طرح نہیں ہیں جو بہ آواز بلند کہتے ہوں کہ میں نے دو درجن عشق کئے اور میں نے تین درجن عشق کئے ـــــ یہ درجنوں عشق والی بات آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔

نیاز صاحب کی عمر اس وقت اسی برس کے قریب ہے۔ اگر میری عمر بھی اتنی ہوتی تو مجھے یہ سب کچھ لکھنا چاہیئے تھا۔ اب تو میں نے ان کی بزرگی کا ذرا بھی لحاظ نہیں کیا۔

اقرار کرتا ہوں۔ اگر میں نیاز صاحب کی خدمت میں اتنا گستاخ نہ بنتا تو اچھا ہی تھا مگر میں نے یہ سب کچھ دانستہ کیا ہے اس لئے کہ میرا خیال ہے اور لوگ ضرور نیاز صاحب کو فرشتہ بنا کے چھوڑیں گے مگر میں اتنے بڑے آدمی کو اتنا ذلیل ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

* * *

اشاریت

"اشاریت کوئی نئی چیز نہیں ہے کنایہ۔ استعارہ اور بیان مجاز ہمیشہ ہماری شاعری میں پایا گیا ہے۔ اور اشاریت کے حدود ان سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ ابہام و اہمال کو ہمیشہ برا سمجھا گیا ہے اور سمجھا جائے گا۔ خواہ وہ نتیجہ اشاریت کا ہو یا استعارہ و کنایہ"

(نیاز)

مولانا نیاز فتحپوری سے ایک ملاقات

سمت پرکاش شوق

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں روزنامہ "تیج" میں مستقل کالم "ان سے ملئے" لکھا کرتا تھا۔ علامہ نیاز فتحپوری آکاش وانی کے ادبی فورم میں شرکت کرنے کی غرض سے دلی تشریف لائے تھے۔ اور میری درخواست پر انہوں نے یہ گراں قدر انٹرویو مرحمت فرمایا تھا۔

شوق :۔ قبلہ نیاز صاحب! آکاش وانی کے ادبی فورم کے بارے میں آپ کے تاثرات کیا ہیں؟

نیاز :۔ جس طریقہ پر یہ کام ہو رہا ہے وہ صرف سرکاری حیثیت رکھتا ہے جب تک حکومت کے اشارے یا مدد کے بغیر جماعتیں خود کسی کام کے لئے آمادہ نہ ہوں کامیابی مشکل ہے۔ بلاشبہ حکومت کی نیت اچھی ہے لیکن محض نیت اچھی ہونے سے کام نہیں چلتا۔ دوسرے یہ کام حکومت کا نہیں بلکہ خود عوام کے احساس و بیداری کا ہے۔ ان جلسوں میں اس بات کی کوشش کی گئی کہ ملک کی مختلف زبانوں کو ترقی دی جائے، بالخصوص اس حیثیت سے کہ ان میں جہاں تک ممکن ہو علمی اصطلاحات کا ترجمہ کر کے شامل کیا جائے لیکن جو طریقہ کار ان لوگوں کے سامنے ہے وہ مجھے پسند نہیں۔ جن لوگوں کا خیال ہے کہ علمی اصطلاحات کا ترجمہ علیحدہ علیحدہ ہر زبان میں ہونا چاہیئے وہ شاید اس بات پر غور نہیں کرتے کہ سائنس کی اصطلاحات کا ترجمہ کرنے سے پہلے خود سائنس کا سمجھنا ضروری ہے اور وہ صرف انگریزی زبان کی وساطت سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ سائنس کی اصطلاحات ہم انگریزی زبان کی وساطت ہی سے سیکھ سکتے ہیں۔ یہ بڑا غلط اصول ہے کہ ہم اصطلاحات کا ترجمہ سمجھے بغیر ہی اپنی زبانوں میں کر دیں اور پھر ان کو سمجھنے کے لئے انگریزی کے محتاج رہیں۔ ایک سب سے بڑی دشواری یہ بھی ہے کہ اس وقت مغربی علوم و فنون اتنی ترقی کر چکے ہیں کہ اگر ہم ان کے کسی علم یا فن کی اصطلاحات کا ترجمہ کرنے کی کوشش کریں تو کم از کم اس کے لئے ۲۵ سال درکار ہوں گے لیکن یہ عرصہ گزرنے کے بعد ہم دیکھیں گے کہ اہل مغرب اور آگے بڑھ گئے ہیں۔ پھر ہم کہاں تک ترقی کی راہ میں ان کا پیچھا کر سکتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم اصطلاحات کا ترجمہ ہی کرتے رہیں گے اور وہ خدا جانے کہاں سے کہاں پہنچ جائیں گے۔ اسی لئے میں نے فورم میں بھی یہی رائے ظاہر کی تھی کہ ہمیں انگریزی زبان کی اصطلاحوں کو بجنسہ اپنے ہاں لے لینا چاہیے اور ان کو ترجمہ کرنے کی کوشش میں وقت اور روپیہ ضائع نہ کرنا چاہیئے۔

ش :۔ بحیثیت افسانہ نگار جدید اردو افسانہ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

نیاز :۔ اردو میں افسانوں کا دور اب ختم ہو گیا ہے اب زیادہ تر توجہ ناولوں کی طرف دی جا رہی ہے۔ لیکن ہندوستان میں اس وقت تک اردو کے ناول اچھے معیار کے بہت کم شائع ہوئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ آئندہ ہمارے ادیبوں کا ذوق اس سلسلہ میں کوئی خاص مفید شکل اختیار کر سکے۔

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جس وقت تک ہمارے ادیب اس منزل پر پہنچیں گے زمانہ کا مطالبہ ناول نویسی سے زیادہ کسی اور صنف ادب کا ہو جائے گا اور ناول نویسی بھی ادھوری ہو کر رہ جائے گی۔

زمانہ بہت جلد جلد بدل رہا ہے۔ لیکن زمانے کا ساتھ صرف وہی قومیں دے سکتی ہیں جن کی ذہنی اور دماغی تربیت بھی زمانے کا ساتھ دے اور یہ چیز ہمارے ہاں بالکل نہیں پائی جاتی۔ ہمیں پڑھایا کچھ جاتا ہے اور ہم سے توقع کچھ اور رکھی جاتی ہے۔

ش:- کیا آپ کے خیال میں اردو ادب پر جمود کی کیفیت طاری ہے؟

نیاز:- اردو ادب پر جمود کی کیفیت تو طاری نہیں ہے لیکن جمود کا نہ ہونا ترقی کو مستلزم نہیں ہے۔ اس وقت اردو میں بکثرت کتابیں شائع ہو رہی ہیں لیکن زیادہ تر گھٹیا درجہ کی کیونکہ پبلشروں کا نقطۂ نظر صرف روپیہ کمانا ہے وہ سنجیدہ کتابوں کی اشاعت کی طرف توجہ نہیں کرتے اور جو ادارے سنجیدہ لٹریچر شائع کر رہے ہیں وہ کتابوں کی فروخت نہ ہونے سے زیادہ ہمت نہیں کر سکتے۔ یہ بات یقیناً تشویش ناک ہے کیونکہ جو ادب عوام کے لئے پیش کیا جا رہا ہے وہ یقیناً "GUTTER-PRODUCT" ہے اور اس سے عوام کی ذہنیت بھی گمراہ ہو رہی ہے لیکن ایسے لٹریچر کو کم کرنے کا سوال اس وقت ہمارے سامنے آسکتا ہے جب خود عوام میں اچھے برے میں تمیز پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے اور اس کا تعلق ابتدائی تعلیم سے ہے۔ بلاشبہ ابتدائی تعلیم حد درجہ ناقص بلکہ قابل ملامت ہے۔

ش:- نئے بھارت میں اردو کے مستقبل کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

نیاز:- اگر اردو سے مراد عوام کی وہ زبان ہے جس سے وہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں کام لیتے ہیں تو میں اردو کے مستقبل کے طرف سے زیادہ مایوس نہیں ہوں کیونکہ اس رجحان کے باوجود کہ اردو کو غیر مانوس اور ثقیل الفاظ سے بوجھل بنایا جا رہا ہے ہماری گھریلو اور کاروباری زندگی میں یہ نئی زبان کبھی مقبول نہیں ہو سکتی۔ البتہ جس حد تک علمی تصانیف یا اعلیٰ تعلیم کا تعلق ہے اردو کا مستقبل مجھے تاریک نظر آتا ہے اس لئے نہیں کہ حکومت اس کا ساتھ نہیں دے رہی بلکہ صرف اس لئے کہ خود اردو والوں میں کوئی اجتماعی احساس اپنی زبان کو ترقی دینے کا اب کیا کبھی پہلے بھی نہ تھا اور اردو نے جو ترقی کی اس کا سہرا یقیناً حکومت کے سر ہے۔ اگر حکومت اس کا ساتھ نہ دیتی اور اس کو عوامی زبان بننے کا موقعہ نہ دیتی جس کا تعلق سرکاری دفاتر وغیرہ سے ہے تو اردو غالباً ترقی نہ کر سکتی۔ بہرحال، موجودہ حالت میں میں یہی سمجھتا ہوں کہ اردو فنا تو نہیں ہو سکتی لیکن اس کی ترقی کے لئے ہمارے سامنے کوئی ایسی راہ نہیں ہے جس پر چل کر وہ آئندہ کوئی قابل ذکر حیثیت حاصل کر سکے۔ کچھ عرصہ سے آکاش وانی میں اردو کے پروگرام خاص طور سے نشر کئے جا رہے ہیں اور خوشی کی بات ہے کہ دلی ریڈیو کا وہ سٹاف جو اس کام پر مامور ہے پوری کوشش کر رہا ہے کہ اس پروگرام کو زیادہ مفید اور دلچسپ بنا کر پیش کیا جا سکے۔ لیکن اس کے لئے سب سے پہلی ضرورت اس بات کی ہے کہ ملک کے تمام ادبی حلقوں سے رابطہ قائم کیا جائے اور ان سے مشورہ لیا جائے میں سمجھتا ہوں یہ مسئلہ ان کے سامنے ہے اور وہ اس کی تکمیل کی کوشش بھی کر رہے ہیں تاہم اس سے اردو زبان کی حقیقی دشواریاں آسانی کے ساتھ کم نہیں ہو سکتیں۔ اس وقت اردو زبان کو عوامی حیثیت سے زیادہ مدد فلمی دنیا سے مل رہی ہے گو فلمی ذرائع سے جو اردو پیش کی جا رہی ہے وہ کوئی خاص سنجیدہ معیار نہیں رکھتی تاہم وہ ہے اردو اور خالص اردو جس میں اگر سنسکرت کے ثقیل الفاظ کو شامل کر دیا جائے جیسا کہ آج کل ہمارے سکالرز کر رہے ہیں تو کوئی فلم کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ظاہر ہے زمانہ اور عوام کی ذہنیت کے مقابلہ میں خواہ حکومت کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو زیادہ عرصہ تک کامیاب نہیں ہو سکتی اور یہی ایک "REDEEMING" فیچر ایسا ہے جس کو سامنے رکھ کر ہم اردو کے مستقبل کی طرف سے ایک حد تک مطمئن ہو سکتے ہیں۔

* * *

نیاز کی مزاح نگاری

پروفیسر یوسف سرمست

سنجیدگی جہاں بھی اور جس صورت میں بھی ہو ایک جیسی ہوتی ہے۔ لیکن تبسم گُل سے قلقل مینا تک ہنسی اور خوشی کی اتنی صورتیں اور کیفیتیں ہیں جن کی کوئی حد ہے نہ شمار، لیکن مزاح کی رنگا رنگی اس کی درجہ بندی کو آسان بنا دیتی ہے۔ مزاح پھکڑ بازی سے شروع ہو کر فحش، ضلع جگت، ہزل گوئی، ہجو، پھبتی، تمسخر، استہزا، ظرافت، طنز، چٹکلے بازی، لطیفہ گوئی، دل لگی، حاضر جوابی اور شوخی کو اپنے دائرے میں لیتا ہوا ایک انبساطی کیفیت تک پہونچ جاتا ہے۔ مزاح پیدا کرنا خواہ تحریر میں ہو یا تقریر میں بہت مشکل ہے۔ شاید اس لئے کہ یہ زندگی کی حقیقت نہیں زندگی سے فرار کا ایک راستہ ہے انسانی زندگی کی حقیقت کی ٹریجڈی موت ہے۔ یہ اتنی مستقل اور اتنی محکم حقیقت ہے جس سے کہیں بھی اور کسی طرح بھی مفر نہیں ہے۔ انسان کی زندگی آغاز سے انجام تک غم کی پرچھائیوں سے مملو ہوتی ہے وہ روتا ہوا آتا ہے اور رلاتا ہوا جاتا ہے۔ اسی لئے حد درجہ خوشی میں بھی آنسو ہی نکل آتے ہیں۔ انسانی زندگی میں غم کا یہ استقلال صرف مسرت کو اہمیت ہی نہیں دیتا، بلکہ اسے خود زندگی بنا دیتا ہے۔ لیکن زندگی میں مسرت کا ارتکاز کچھ بے جوڑ سا نظر آتا ہے۔ اسی لئے مزاح کا وہ انداز جو قہقہہ انگیز ہو بڑا ہی وقتی ہوتا ہے۔ قہقہہ دیر تک نہیں لگایا جا سکتا اور اگر کچھ دیر تک قہقہہ لگایا جائے تو اس کے بعد بڑی ہی خاص پژمردگی کا احساس ہوتا ہے۔ اور ہم یہ سوچنے یا کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ "بھئی آج تو بہت ہنسے" اس کے برخلاف ایک نشاطیہ یا انبساطی کیفیت بڑی دیر تک قائم رہتی ہے۔ اور اس کے رد عمل کے طور پر بھی کوئی دوسری کیفیت بھی پیدا نہیں ہوتی۔ اسی لئے مزاح کی وہ قسم جو بعض وقت تبسم زیر لب بھی پیدا نہیں کرتی، سب سے اعلیٰ اور بالکل فطری ہوتی ہے۔ کیونکہ ایسے مزاح میں ہونٹ کھلیں یا نہ کھلیں، دل کی کلی ضرور کھلتی ہے۔ مزاح کی یہ قسم بڑی لطیف ہوتی ہے اور بہت ہی دیرپا۔ ایسا مزاح ایک انبساطی کیفیت پیدا کر دیتا ہے اور یہ کیفیت غم کی کی اس کیفیت کے عین مطابق، لیکن اس کے برعکس ہوتی ہے جس کے لئے کہا گیا ہے۔ "دل پر گھٹا سی چھائی ہے کھلتی ہے نہ برستی ہے" جس طرح غم میں یہ کیفیت زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔ اسی طرح خوشی کی یہ حالت زیادہ مسرت زا ہوتی ہے۔ مزاح نگاری کا یہ انداز اردو میں بہت کمیاب ہے۔ شوخی تحریر کے ایسے دلآویز مرقعے غالب کے پاس یا پھر نیاز کے ہاں کثرت سے نظر آتے ہیں۔

نیاز کی شوخی تحریر کی انبساط آرائی کی آماجگاہ خاص طور پر ان کے خطوط ہیں۔ خطوط سے شخصیت کا براہ راست انداز میں اظہار ہوتا ہے، اور شخصیت کی طرحداری لطیف مزاح کی سب سے اولین شرط ہے۔ مزاح کے کیف و کم کا انحصار بالکلیہ شخصیت کے لطف و کرم پر ہوتا ہے گہری ظرافت شخصیت کے احتجاجی انداز کی غماز ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں مزاح نگار خود قہقہہ لگاتا ہے اور دوسروں کے لئے بھی قہقہہ لگانے کا سامان فراہم کر دیتا ہے۔ وہ مختلف چیزوں کی مضحکہ خیزی کو نمایاں کر کے ان کی ہنسی اڑاتا ہے۔ یہ ہنسنا ہنسانا اصل میں احتجاج ہوتا ہے۔ اور قہقہوں میں نفرت اور بیزارگی کو چھپایا جاتا ہے۔ اور یوں لطیف مزاجی کیفیت برقرار نہیں رکھی جا سکتی۔ اس لئے مزاح کی لطافت کا دار و مدار شخصیت کی فلسفیانہ بے تعلقی سے ہوتا ہے۔ بے حسی پر بہر طور نہیں۔ کارزار حیات کو ایک استغنا آمیز تبسم کے ساتھ دیکھنے اور مسکراتے ہوئے اس

ے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ رکھنے والا ہی لطیف ترین مزاح پیدا کرتا ہے۔ مزاح کی لطافت زندگی سے پیار اور اس کو برتنے کے سلیقہ کو بھی اہر کرتی ہے۔ نیاز کا لطیف مزاح ان کی شخصیت کے بانکپن کے انعکاس کا نتیجہ ہے۔

نیاز کے مزاح کی لطافت اپنی شدید صورت میں انبساطی کیفیت سے بڑھ کر کبھی کبھی تبسم زیر لبی تک بھی پہنچتی ہے۔ لیکن مزاح اس کیفیت تک پہنچنے کے لئے سنجیدگی سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس سے ان کا مزاح پُرلطف بن جاتا ہے۔ نیاز کے اس خاص رنگ مزاح کی وشن مثال ان کا یہ خط ہے۔ گو یہ طویل ہے لیکن اس کی طوالت میں اس کی خوبصورتی مضمر ہے اس لئے صرف اقتباس پر اکتفا نہیں کیا اسکتا۔ لکھتے ہیں :-

" آپ کی تحریر جس کے لفظ لفظ سے آپ کا اضطراب ٹپک رہا ہے کل شام کو مجھے ملی۔ یقیناً آپ کو حیرت ہوگی کہ میں نے اس قدر جلدی جواب دینے ں کیوں کی جب کہ آپ کے خیال کے مطابق کم از کم دو چار دن تو دریافت حال کے لئے ضروری تھے۔ سنئے مجھے تحقیق و تفتیش کی ضرورت نہیں کیونکہ میں ن کو خوب جانتا ہوں گو وہ مجھے نہ جانتی ہوں —— مگر یہ تو بتائیے کہ آپ کی شناسائی کب کی نکل آئی؟ بہر حال اگر یہ خواہش خود انہیں کی ہے کوئی مضائقہ نہیں، لیکن اگر ابھی تک آپ صرف تمنا ہی تمنا برجی رہے ہیں تو میں اس اقتران کی مخالفت کروں گا۔ آپ کے اور ان کے مزاج میں بہی ادت ہے جو میرے اور قاضی صاحب بھوپال کے مزاج میں، آپ ٹھیرے "ہنوز" کہ پہلے ہنس لینا اور پھر بات کرنا اور وہاں متانت و سنجیدگی کا یہ عالم ہے کہ شاید ہی اس وقت تک کسی نے ان کی پیشانی کو شکن سے خالی دیکھا ہو مجھے نہیں معلوم مگر سنا ہے کہ اپنے فن پر اور شاید صورت پر بھی اتنا پندار ہے کہ وہ کسی سے کھل کر بات کرنا بھی اپنی توہین سمجھتی ہیں —— اس میں شک نہیں کہ علاج وہ اچھا کرتی ہیں اور چند دن میں خاصی شہرت انہوں نے مل کرلی ہے لیکن مجھے یقین نہیں کہ وہ تمہارے درد دل کا علاج کر سکیں۔

صورت کے لحاظ سے انہیں "جمیل" تو "یقیناً" نہیں کہہ سکتے لیکن دلکش ہونے میں کلام نہیں۔ رنگ کھلتا ہوا سانولا (جو شباب کے زمانے ں واقعی قیامت ہوتا ہے)، کشیدہ قامت، دراز گردن، بڑی بڑی آنکھیں، لچکیلا بدن، کتابی چہرہ، یہ ہیں ان کی جسمانی خصوصیات —— رہے عنوی محاسن، سو یہ تمہیں معلوم ہی ہے کہ وہ لکھنؤ کی گریجویٹ اور دہلی میڈیکل کالج کی فاضل ڈاکٹر ہیں، عمر ۲۶، ۲۷ سال کی ہوگی لیکن چہرے ں نرمی سترہ اٹھارہ سال کی سی ہے۔ تہذیب جدید کی جتنی رعنائیاں ہو سکتی ہیں وہ بھی سب ان میں موجود ہیں، خصوصیت کے ساتھ رفتار تو واقعی یامت ہے —— پھر اب پوچھو کہ میں تمہارے لئے کیوں موزوں نہیں سمجھتا —— ایک سبب تو ابھی بیان کر چکا ہوں کہ ان کی تنک مزاجی تمہاری وش مزاجی کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ دوسرے یہ کہ وہ اپنے فن کو کبھی کسی حال میں ترک نہ کریں گی اور تمہاری رشک نہ کرنے والی طبیعت غالباً اسے گوارا کرے، تیسرے یہ کہ نقاب وہ اپنے چہرے پر ڈالیں گی نہیں اور تمہارے والد بے پردہ انہیں گھر میں گھسنے نہ دیں گے اور چوتھا سبب جو سب سے ڑا مانع اس ازدواج کا ہو سکتا ہے، یہ ہے کہ اس نام کی ڈاکٹرنی یہاں کوئی ہے ہی نہیں، یہ تم کو کس نے بیوقوف بنایا ہے، مجھے بھی تو معلوم ہو۔"

کسی بھی تحریر کی خوبی اس بات پر بھی منحصر ہوتی ہے کہ وہ قاری کے تخیل کو مہمیز لگائے اور تخیل دیر تک تحریر کے مختلف پہلوؤں سے ذت یاب ہوتا رہے۔ مندرجہ بالا خط کے اختتام میں جو مسرت انگیز اچانک پن ہے وہ قاری کے تخیل کی بھی آبیاری کرتا ہے اور اسی جہ سے اس میں ایک لطیف مزاح پیدا ہوتا ہے۔ قاری تحریر پڑھتے ہوئے اپنے تخیل کے ذریعہ لیڈی ڈاکٹر کے پیکر کو تراشتا ہے اور جب یہ مجسمہ خیل میں سانس لینے لگتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ تو کچھ "ہے ہی نہیں" اس کے بعد اس کا تخیل فوراً مکتوب الیہ کی حالت زار کا اندازہ کر کے خیال ہی یال میں مزے لیتا ہے۔

نیاز کا مزاح ایک ایسے تاثر کی تخلیق کرتا ہے جسے کبھی بھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ کیوں کہ اس میں "زیر نیم کش" کا انداز اپنی ساری تکمیل ے ساتھ موجود ہوتا ہے۔ اور جس کی خلش لذت زخم جگر بن جاتی ہے۔ نیاز کی شوخی تحریر ایک حسین یاد بن کر دل و دماغ میں محفوظ رہ جاتی ہے چنانچہ

ڈاکٹری والا خط جب میں نے ایک ایسے پروفیسر دوست کو سنایا جو شستہ ادب ذوق رکھتے ہیں۔ تو انہوں نے کہا "میں اسے زندگی بھر نہیں بھو سکتا۔" اور حقیقت بھی یہی ہے کہ نیاز کی تحریر کو کوئی بھی کبھی نہیں بھلا سکتا کیونکہ حسن خواہ تحریر کا ہو یا کسی اور چیز کا کبھی کسی صورت میں بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ نیاز کی شوخ تحریریں کیٹس کے اس خیال کا کہ ایک خوبصورت چیز ہمیشہ کے لئے مسرت بخشتی ہے A THING OF BEAUTY IS A JOY FOR EVER) محکم ترین ثبوت ہیں۔ مزاح کی سنجیدگی کی اس دلنشینی کو دیکھئے:-

"تمہاری سب سے پہلی تحریر مجھ تک پہونچی تو میں دیر تک سوچتا رہا کہ اگر یہی باتیں تمہاری زبان سے سنتا تو کیا ہوتا —— تمہیں خبر نہیں لیکن ہوا یہی!

میں نے تمہاری تحریر کے ایک ایک لفظ کو دیکھ کر حرفوں کی ہر ہر کشش کو سمجھ کر، کاغذ کے رنگ اور اس کی عطریت سے مدد لیکر میں نے تمہاری ایک تصویر کھینچی، کاغذ پر نہیں، قلب پر، دماغ کے اس پردہ پر جو صرف نغمہ و نکہت کے نقش کے لئے مخصوص ہے اور میں اس میں محو ہوگی —تو کیا میں بتا ہی دوں کہ میں نے تمہاری تحریر کے اندر چھپا ہوا تم کو کیسا پایا؟ —— معاف کرنا، ممکن ہے کہ کوئی بات خلاف حقیقت ہو یا تمہار ذوق کے خلاف — لیکن جب میرا یہ خط تم تک پہونچ ہی نہیں سکتا تو پھر یہ اندیشہ کیوں ——؟

اچھا تو سنو اب تم اپنا سراپا —— کوئی پسند کرے یا نہ کرے لیکن مجھے اس قدر عزیز ہے کہ اگر تم واقعی ویسی نہ نکلیں تو مجھے افسوس ہوگا!

کھلتا ہوا سا نولا رنگ، یعنی وہ رنگ جو کیفیات سے شروع ہوتا ہے اور کیفیات پر ختم —— وہ جسے دیکھ کر چھونے کو جی چاہے اور ہونٹو پر بے اختیار کپکپی سی محسوس ہونے لگے —— معاف کرنا میرے ہاتھوں نے بھی تمہیں چھوا، اور میرے لبوں نے بھی تمہارے لبوں کو مس کیا جو ریشم کی طرح نرم اور پنکھڑیوں کی طرح نازک تھے —— میں نے تم کو نحیف و ناتوان پایا، لیکن اپنی رعنائی و کشیدہ قامتی کے لحاظ سے تمہیں ایسا ہونا ہی چاہیئے —— تمہارے بال بہت سیاہ تو نہیں، لیکن ان میں ایک خاص قسم کی چمک ہے اور تھوڑا سا گھونگھر بھی کنپٹی کے بالوں میں مجھے نظر آتا ہے —— پیشانی بہت فراخ ہے اور اس میں ایک نیلگوں رگ ابھری ہوئی مانگ تک چلی گئی ہے —— بھویں کافی چوڑی ہیں اور ایک نہایت ہلکی عز لکیر ان دونوں تلواروں کو ایک دوسرے سے ملا رہی ہے —— رنگ کے بعد سب سے زیادہ قاتل چیز تمہاری آنکھیں ہیں ہر وقت کسی خیال میں مستغرق رہنے والی آنکھیں جن کو ایک بار دیکھ لینا گویا کسی سمندر میں ڈوبتے چلے جانا ہے —— چہرہ کتابی —— گردن کھنچی ہوئی متناسب اعضا کانٹے پر تلا ہوا —— اور —— چال ایسی جیسے کوئی ناگن راستہ کاٹتی ہوئی سامنے سے گزر جائے۔ عمر تم خود ہی بتا چکی ہو ۲۰ سے کم اور ۱۵ سے زیادہ —— غالباً ۱۸ سال —!

یہ تھی تمہاری وہ تصویر جو میں نے تمہارے سب سے پہلے خط کو دیکھ کر اپنے دل پر نقش کی تھی اور اگر میں یہ سب کچھ پہلے ہی لکھ دیتا تو شاید تم اسی وقت لکھ بھیجتیں کہ "آئندہ میرے نام کوئی خط نہ بھیجا جائے۔" میں چاہتا تھا کہ تم مجھ سے زیادہ بے تکلف ہو جاؤ اور میں تم کو ایسے لفظ سے خطاب کرسکوں جو تمہاری خوبصورت پیشانی پر ہلکا سا خم پیدا کر سکے۔ لیکن اچھا ہوا کہ اس منزل تک پہونچنے سے پہلے ہی یہ بساط الٹ دی گئی اور تم نے زندگی کی اس تلخ حقیقت کو جان لیا کہ اگر عورت اس کے سمجھنے پر مجبور نہ ہو تو خدائی کا دعویٰ بھی اس کے لئے کوئی بڑی چیز نہیں۔"

الفاظ کے ذریعہ تصویر کشی کرنا صرف نیاز کا حصہ ہے۔ ان لفظی مرقعوں کے شوخ و شنگ رنگ اس درجہ شگفتہ و شاداب ہوتے ہیں کہ جن کو دیکھنے سے روح اہتزاز کرتی ہے۔ اردو ادب میں ایسی لفظی مجسمہ سازی نیاز کے سوا کسی نے بھی نہیں کی ہے۔ نیاز کی تحریر میں حسن کا ذکر ہمیشہ مسرت کی کیفیت پیدا کرتا ہے جیسے اس خط میں بھی:-

"پھر ایک بات اور ہے جو صرف کان میں کہنے اور اشارہ سے بتلانے کی تھی —— مگر مجبوراً لکھنا پڑتی ہے —— کہ حزیں کو بنارس میں ہر برہمن بچہ "لچھمن و رام" نظر آیا تھا، یہاں قدم قدم پر "سیتا و رادھا" کا سامنا ہے اور اس اہتمام کے ساتھ کہ — بے پردگی دیوانہ طرح نقاب افگندش

راجپوتوں کی لڑکیاں ہیں — بلند بالا، صحیح و توانا، تیوریاں چڑھی ہوئی، گردنیں تنی ہوئی، آنکھوں میں تیر، مانگوں میں عبیر، ابروؤں میں خنجر، بالوں میں عنبر، ہاتھوں میں مہندی، ماتھے پر بیندی — اب آپ سے کیا کہوں کیا چیز ہیں۔ قامت رعنائی وہ ادا کہ چلکدار آئینہ بھی شرما جائے، کمر ہیں وہ لوچ کہ بید کو بھی عار آئے۔

آپ کو واللہ آئیے اور صرف یہ فیصلہ کرنے کے لیے آئیے کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس سے زیادہ دیکھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے یا نہیں۔"

جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں کہ نیاز کی تحریریں بعض حصے ایسے ہوتے ہیں جنھیں کوشش کے باوجود نہیں بھلایا جا سکتا۔ اس تحریر کو بھی دیکھئے۔ کوشش کے باوجود بھی آپ اسے بھلا دینے میں کامیاب ہو جائیں تو بات ہے:-

"کفارہ کے سلسلے میں آپ روزے بھی رکھیں گی اور مسکینوں کو کھانا بھی کھلائیں گی۔ خیر روزہ رکھنے میں تو کوئی حرج نہیں — "رنگ کھلتا جائے گا جتنا کہ اڑتا جائے گا۔" لیکن دوسری بات بہت خطرناک ہے۔ آپ نے ہندی کا دوہا نہیں سنا جس کا یہ مفہوم ہے کہ "غربا کو غلہ تقسیم کرنے کی خدمت بہو کے سپرد کی گئی اس خیال سے کہ اس کے ہاتھ چھوٹے چھوٹے ہیں خرچ کم ہوگا، لیکن وہاں ساری دنیا بھکاری بن کر جمع ہو گئی —"

نیاز۔ اپنی شوخی سے کام لے کر بعض وقت اہم اور سنجیدہ مسائل کو بھی اس طرح حل کرتے ہیں کہ نہ تو مزید بحث کی گنجائش رہتی ہے نہ ہی کوئی شک باقی رہتا ہے۔ سنجیدگی سے طول طویل مباحث کے ذریعہ کسی بات کو ثابت کرنا بڑی ہی عام بات ہے۔ لیکن زندگی کو قائم رکھتے ہوئے جنت کا سودا کرنا حد درجہ ذہانت، بلا کی حاضر دماغی اور بے پناہ شوخی فکر کے بغیر ممکن نہیں۔ ایک خاتون نیاز سے "ختم نبوت" کے متعلق دریافت کرتی ہیں۔ جس کا جواب نیاز دیتے ہیں:-

"ختم نبوت" کے متعلق آپ میری رائے دریافت کرتی ہیں۔ میں اس سے پہلے بھی کبھی ظاہر کر چکا ہوں اور پھر اسی کا اعادہ کرتا ہوں کہ رسول اللہ بے شک نبی آخر الزماں تھے، کیونکہ اب اگر واقعی کوئی نبی آئے بھی تو اسے مانتا کون ہے!

پچھلا زمانہ ہوتا تو گاندھی جی بھی رسول ہو سکتے تھے! علامہ مشرقی بھی دعویٰ نبوت کر سکتے تھے۔ اور وہ تو وہ — میں بھی نبی بن سکتا تھا۔ (مسیلمہ ہی قسم کا سہی)، اور آپ بھی نبیہ ہو سکتی تھیں۔ — بنت اوس کی سی سہی، گو ان دونوں کی شادی ہو گئی تھی اور ——"

کعبہ کا بت خانہ ہونا ایسی حقیقت ہے جس کا اعادہ اب اپنے اندر کوئی ندرت نہیں رکھتا۔ لیکن نیاز اسی بات کو ایسے زاویہ سے کہتے ہیں کہ "بتوں" کی خدائی یاد آجاتی ہے:-

"میں جب کبھی آپ کو خط لکھتا ہوں تو دیر تک سوچتا رہتا ہوں کہ آپ سے خطاب کس طرح کروں۔ آپ تو "محترم" لکھ کر اس فرض سے بہ آسانی سبکدوش ہو جاتی ہیں۔ تصنع و تکلف، ہی ٹھیرا نا؟ — لیکن میں اس کے جواب میں آپ کو "محترمہ" لکھنا نہیں چاہتا کیونکہ "احترام" کی حد زیادہ سے زیادہ "حریم کعبہ" تک ہے اور میں آپ کو اس وقت کی چیز سمجھتا ہوں جب کعبہ، کعبہ نہ تھا "بتکدہ" تھا۔"

نیاز نے اپنی زندگی کے متعلق لکھا تھا کہ ان کی زندگی میں عورت اور مذہب کا بڑا اہم مقام رہا ہے۔ عورت اور مذہب کے ذکر کے ساتھ ہی نیاز کی تحریر شگوفے کھلاتی ہے۔ ان موضوعات کے ساتھ ادبی نکات کی عطر بیزی بھی شامل رہتی ہے۔ بعض ادبی مباحث پر نیاز بڑے ہی پر لطف انداز سے روشنی ڈالتے ہیں۔ شعر کے مفہوم کو متعین کرنے کے بارے میں بعض حضرات جس قسم کی غیر شاعرانہ حرکتیں کرتے ہیں۔ ان کو بیان کرنے میں نیاز نے مزاح کے پھول کھلائے ہیں:-

"غالب کا یہ شعر کتنا پاکیزہ ہے:-

تا بادہ تلخ تر شود و سینہ ریش تر بگدازم آبگینہ و در ساغر افگنم

لیکن اگر تم نے یہ بحث شروع کردی کہ غالب کانچ گلانے کے فن سے کب واقف تھا یا یہ کہ بلیماروں میں شیشہ گروں کی دوکانیں کہاں تھیں جہاں انہوں نے آبگینہ پگھلوایا ہوگا یا یہ کہ ساغر میں ڈھلنے کے بعد کانچ رقیق کیونکر رہا ہوگا کہ پیا جاسکتا ہے کہ اس کے پینے کے بعد کوئی زندہ کیونکر رہ سکتا ہے تو سوا اس کا سننے والا اپنا منہ پیٹ لے اور کیا کر سکتا ہے۔

جن اشعار کا تم نے مضحکہ اڑایا ہے ان سے لطف اٹھانے کی اہلیت ہی تم میں نہیں۔

ہوتا ہے اژدحام تمنا اسی قدر ہوتی ہے جتنی دیر کشودِ نقاب میں

اس شعر کے سمجھنے میں تم نے جس بدتمیزی سے "جنسی جذبات" کا تجزیہ کیا ہے وہ نہ صرف یہ کہ تمہاری انتہائی بدذوقی کو ظاہر کرتا ہے بلکہ "فی نفسہ شباب" کی بھی توہین ہے۔

ایک شعر سے لطف اٹھانے کے لئے شاعر کی "نفسیات" سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم کو خود اپنے علوے نفس سے کام لینا چاہیئے۔ اور اسے بھی جانے دو میں یہ بھی معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تمنا کا ایک خاص مفہوم قرار دینا اور پھر لفظ "ازدحام" کی چھان بین میں اتنی بدتمیزی کا اظہار، اس کا تمہیں کیا حق حاصل تھا جبکہ "کشودِ نقاب" کی تعین خود اس کے منافی پڑتی ہے۔

ایک صاحب تم سے بھی زیادہ خوش تمیز۔ یہاں موجود ہیں۔

غالب کا مشہور شعر ہے:۔

میرے ہونے میں کیا ہے رسوائی اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

انہوں نے رسوائی اور خلوت کو ملا کر ایک عجیب مفہوم پیدا کیا ہے۔ یعنی شاعر اپنے محبوب سے کہتا ہے کہ اگر خلوت میں آپ نے مجھے بلا لیا تو رسوائی کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی، کیونکہ دنیا جانتی ہے میں بالکل ضعیف و ناکارہ ہوں اور کسی کو کچھ شبہ ہو ہی نہیں سکتا۔

بڑے قایل ہوئے کہ نہیں۔ اب آؤگے تو میں تمہیں انہیں کا شاگرد کرا دوں گا۔ ایسے سخن فہم زمانہ میں شاذ و نادر ہی پیدا ہوتے ہیں۔

نیاز ادبی انشا کی تنقید و تحلیل کے وقت بھی بڑے ہی خود آگاہ رہتے ہیں۔ نیاز کی خود آگہی ان کے مزاح کو بڑا دلکش بناتی ہے۔ اور اعلیٰ مزاح کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ اسی خط کو دیکھئے جب تک شعر و ادب کی بات ہوتی رہی مزاح کی کیفیت پیدا نہیں ہوئی لیکن جہاں بات اپنی ذات کے تعلق سے کہی گئی۔ مزاح کا رنگ ابھر آیا:۔

"اس میں کلام نہیں کہ بغیر فارسی لٹریچر کا مطالعہ کئے ہوئے اردو لکھنا پڑھنا نہیں آسکتا۔ میں دبی زبان سے اس میں عربی کا بھی اضافہ کروں گا، کیونکہ فارسی ادب کے محاسن کو سمجھنا بہت کچھ موقوف ہے عربی جاننے پر آپ کے اس ذوق سے میں بے خبر نہ تھا لیکن وہ شغف کی حیثیت اختیار کرلے گا اس سے یقیناً بے خبر تھا آپ کا وجدان صحیح خود بہتر رہنما ہے، مجھ سے یا کسی سے رائے لینے کی ضرورت نہیں۔ لیکن چونکہ آپ نے دریافت کیا ہے اس لئے عرض کروں گا کہ آپ فی الحال سوا غالب کے کسی اور طرف توجہ نہ فرمایئے۔

جس ندرت اور شوخی پر آپ جان دیتے ہیں وہ سوا غالب کے کہیں نہ ملے گی اور پھر اسی کے ساتھ "فارسیت" کا وہ عالم کہ ہر صفحہ "ایران زار" نظر آتا ہے، نزاکت خیال اس میں شک نہیں کہ بیدل کا حصہ ہے لیکن اس میں یہ لطف زبان کہاں؟ جب تک آپ جوان ہیں "خرابات غالب" نہ چھوڑیئے، انحطاط عمر میں البتہ "مصحف بیدل" سے بہتر کوئی چیز نہیں۔ میری نہ کہیئے۔ یہاں ہر بات الٹی ہے۔ جب جوان تھا تو بیدل پر جان دیتا تھا، اب زمانۂ انحطاط میں غالب کو سر دھنتا ہوں۔ اس سے یہ نتیجہ نہ نکال لیجئے گا کہ مجھ پر بڑھاپے میں دوبارہ جوانی آئی ہے بلکہ یہ کہ میں جوانی میں بھی بوڑھا تھا۔"

اسی طرح مظہر جانجاں کی شاعری کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے وہ آخر میں لکھتے ہیں:۔

"میں تو مظہر کے ذوق شاعری کا پرستار ہوں اور اس سے بحث نہیں کہ وہ امرد پرست تھے یا کیا کیونکہ ایسا ہو بھی تو کیا گناہ ہے۔ شاید تم اس راز سے

آگاہ نہیں کہ "حسنِ مجرد" کے پرستاروں کا میلان اس طرف زیادہ ہے گو خود میرا مشرب یہ نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے، کیونکہ محبت کے باب میں روحانیت و میری سمجھ میں آتی نہیں اور کسی صوفی کی خدمت میں بیٹھ کر یہ فن سیکھنے کی کوشش کبھی کی نہیں۔ میں محبت کرتا ہوں اور گناہ سمجھ کر کرتا ہوں تاکہ اس کی لذ باقی رہے۔ عورت کے ساتھ جانماز کا سا شرعی تعلق میرے بس کی بات نہیں"

نیاز بڑے ہی وسیع مشرب آدمی ہیں۔ خدا اور مذہب کے تعلق سے ان کے خیالات ہمیشہ دعوت فکر دیتے رہتے ہیں۔ وہ نہ تو مسجد میں مقید رکھنا چاہتے ہیں نہ مذہب کو داڑھی کے جال میں پھنسانا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک خدا صرف قہار و جبار نہیں نہ ہی مذہب نام زندگی کو بے رنگ و بے کیف بنا دینے کا اس لئے وہ خدا سے بھی "شرارتیں" کرتے ہیں مذہب میں بھی زندہ دلی سے کام لیتے ہیں۔ جیسا خود نے لکھا ہے:-

"ترانہ کہ نہ گنجد بہ سازی خواہم

یہی وہ چیز ہے جو سیلسیات میں "اشتراکیت" کہلاتی ہے اور مذہبیات میں "ترک رسم" والی "وحدانیت" "اگر اللہ کا وجود ہے تو لاکھ کیجئے، وہ موجود ہی رہے گا، انسان کچھ کرے لیکن خدا کی خدائی اس کی سمجھ میں کبھی نہ آئے گی۔ پھر خالق و مخلوق کا یہ تعلق کہ وہ انکار سے متاثر نہیں اور یہ اقرار پر مجبور نہیں، مثلاً دیکھئے "تو دینار رہنے کے قابل نہ رہے۔ اللہ اللہ آزادی بھی کتنی بڑی نعمت ہے لیکن اسی کے ساتھ "تصدیق بالجنان ضروری ہے کہ رندی نام بدتمیزی کا نہیں بلکہ انتہائی تمیز کا ہے۔

مذہب کی دنیا میں بد اخلاقی کی گنجائش ہو تو ہو، لیکن یہاں سب سے پہلے سوال ہوتا ہے:-

تو برونِ در چہ کردی کہ درونِ خانہ آئی

کہتے ہیں کہ تصوف بھی رندی ہی کی ایک شاخ ہے لیکن میں اسے صرف شاعری کہتا ہوں اور شاعری بھی مولانا ناسخ رحمۃ اللہ علیہ ک صوفی کہتا ہے کرتا نہیں اور خرابات میں عمل کے سوا سب حرف باطل ہے۔

غالب کا یہ شعر آپ کو یاد ہوگا، لیکن پھر سناتا ہوں، کہتا ہے:-

سنگ و خشت۔ از مسجد ویرانہ می آرم بہ شہر　　خانہ در کوئے ترسایان عمارت می کنم

یہ وہ شرارتیں ہیں جن پر خدا کو بھی پیار آجاتا ہے، لیکن "اہل تقشف" اتنی تفریح بھی جائز نہیں سمجھتے ان کے نزدیک گویا کائنات نام قدرت کی "شکن پیشانی" کا"

نیاز کو اپنی زندگی میں مولویوں کے طبقہ سے جتنی تکلیف پہنچی ہے شاید کسی اور چیز سے نہ پہونچی ہوگی۔ لیکن نیاز کی کشا اور وسیع النظری کو دیکھئے کہ اس طبقہ کے ذکر کے ساتھ ان کے لہجہ میں نہ تو تلخی آتی ہے نہ ناگواری بلکہ وہ اس طبقہ کے متعلق جب کچ کہتے ہیں تو ان کی شوخی اور مزاح کا رنگ اور زیادہ نکھر جاتا ہے اس میں "زہر خند" کی کیفیت بھی پیدا نہیں ہوتی۔ تصویر کشی کے، با میں نیاز اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"میں جانتا ہوں یہ لوگ کیا کہیں گے۔ ایک کی رائے ہوگی تصویر کھنچوانا ہر صورت ممنوع ہے (اور یہ رائے اس کی ہوگی جس کی صورت اس قابل نہیں کہ تصویر لی جائے) دوسرا کہے گا کہ نیم رخی (PROFILE) تصویر میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ اس طرح نقش میں تجسیم کا رنگ پ ہوتا (لیکن یہ قول اس کا ہوگا جو اس آرٹ سے بالکل ناواقف ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ "تجسیم" کی کیفیت نیم رخی تصویر ہی سے زیادہ ظاہر ہوتی۔ تیسرا کہے گا کہ نصف دھڑ (BUST) کی تصویر جائز ہے، کیونکہ اس طرح پورا جسم سامنے نہیں آتا (اور یہ رائے اس کی ہوگی جس کے نزدیک صرف نیچے کے دھڑ میں ہے اور دل و دماغ بیکار چیزیں ہیں) ......

جس حد تک اہل علم کا تعلق ہے بت پرستی کا دور ختم ہو چکا ہے (ہندو مسلمان دونوں کے لئے) رہے جاہل، سو ان کے لئے مجسمہ، تصویر، پیل ـسب یکساں ہیں۔ تم کو معلوم ہو گا کہ ہندوستان میں ایک جماعت صوفیہ کی ایسی بھی ہے جو اپنے پیر طریقت کی تصویر سامنے رکھ کر سجدہ کرتی ہے اور انہیں ے بحث نہیں ہوتی کہ تصویر کیسی ہے پھر ان کے لئے تصویر تو مطلقاً حرام ہونی چاہیئے، لیکن سوا اپنے پیر کے سب کی۔

ان کے برخلاف اہل فن کی جماعت کو لو، جو تصویر کیا اچھے خاصے بت بناتی ہے لیکن اس کا مقصود صرف فن کی تکمیل ہوتا ہے تو کیا ان کے لئے مجسمہ سازی رار دی جائے گی؟

یہ انتہائی کج فہمی ہے کہ کسی قانون یا شریعت کے کسی حکم کو دائمی چیز سمجھا جائے۔ قانون، وقت، ضرورت اور مصلحت کو سامنے رکھ کر بنایا جاتا ہے اور ان تینوں ے کسی ایک کے بدل جانے پر قانون میں بھی تغیر و تبدل ضروری ہو جاتا ہے۔

جس وقت اسلام نے مجسمہ سازی کی مخالفت کی یہ وہ زمانہ تھا جب عرب میں بت پرستی کا رواج فنی حیثیت سے نہیں بلکہ مذہبی حیثیت سے بکثرت تا تھا اور اس رواج نے ان کے قوائے ذہنی کو مضمحل کر رکھا تھا خیال تھا کہ بت سازی سے باز نہ رکھا گیا تو اس مذموم عادت کا استیصال ہو سکے گا۔ لیکن سوال کہ آیا اس وقت بھی کوئی مسلمان ایسا ہے جو محض مجسمہ سازی یا تصویر کشی کی وجہ سے، بت پرستی اختیار کر سکتا ہے؟

پھر جب اس کا امکان نہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ حکم اس وقت بھی قابل عمل قرار پائے اور اس کا لعدم نہ سمجھا جائے۔ میری سمجھ میں نہیں یہ خدشہ تمہارے دل میں پیدا ہی کیوں ہوا؟ کوئی اچھی شکل و صورت والا انسان اگر تصویر کھنچوائے تو اسے خیال کرنا چاہیئے کہ کہیں لوگ اسے نے لگیں تمہیں کیا ڈر ہے؟

نیاز اپنے مزاح کے ذریعہ بڑے بڑے اخلاقی سبق دے جاتے ہیں۔ وہ کبھی نصیحت اور تلقین نہیں کرتے لیکن مسکراتے کچھ اس یں بات کہتے ہیں کہ — دلنشین، ہو جاتی ہے۔

"ہر چند شادی کوئی اچھی چیز نہیں مگر آپ ضرور کیجئے، کیونکہ اگر یہ حرکت آپ نے نہ کی تو کوئی اور اس سے زیادہ خراب حرکت کر بیٹھیں گے مگر خیال رہے شادی کر رہے ہیں، عیاشی نہیں۔ "بیوی" کا تعلق "جذبۂ شہوانی" سے اتنا نہیں ہے جتنا "مصلحت عمرانی" سے ہے اس کا صاحب حسن و جمال ہونا اتنا ضروری جتنا خوش خصال ہونا — لیکن مجھے معلوم ہے آپ میری اس نصیحت کی مطلق پروا نہ کریں گے اور "ضرورت شادی" کا جو اشتہار دیں گے تو اس میں سب سے رط "جمیل و طرحدار" ہونے کی درج ہو گی حالانکہ آپ خود اس لحاظ سے ماشاء اللہ صفر ہی صفر ہیں۔ میری سمجھ میں یہ بات کبھی نہیں آئی کہ ایک معمولی ت کا مرد کیوں یہ خواہش کرتا ہے کہ عورت اسے نہایت طرحدار ملے —— اور پھر یہ کہ وہ اس سے محبت بھی کرے۔ آؤ میں تمہیں ایک راز کی بات مگر کسی مولوی سے کہہ دینا یہ جو مذہب اسلام میں کفو کے درمیان شادی کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اس کا مفہوم سب غلط سمجھتے ہیں۔ کفو سے خاندان یا برادری مراد لیتے ہیں درآنحالیکہ کفو کے معنی مماثل کے ہیں۔ مماثل کیا؟ یعنی جو لوگ تہذیب شرافت، تعلیم و تربیت، سیرت و صورت مدگر مماثل ہیں۔ ان میں ایک دوسرے کے ساتھ رشتۂ ازدواج قائم ہونا چاہیئے پھر اس کے لئے خاندان یا برادری کی قید بیکار ہے، فرض کیجئے خاندان ک لڑکی ہے لیکن اپنے صفات کے لحاظ سے ادنی درجہ کی ہے تو یقیناً کفو میں داخل نہ ہو گی، لیکن اگر کسی دوسرے خاندان کی ہے اور صورتاً و سیرتاً مماثل واقع ے تو کفو کہلائے گی۔ جنت میں حوریں بدصورت مردوں کو گوارا کر لیں تو کر لیں۔ لیکن اس دنیا میں یہ ظلم زیادہ نبھنے والا نہیں، اس لئے بھی آپ ن و جمال کی جستجو کا حق حاصل نہیں، یقیناً آپ بدصورت نہیں لیکن اتنے طرحدار بھی نہیں کہ جیو پیٹر کی بیٹی سے کم درجے کی عورت آپ کو پسند ے۔"

پنے اسی مخصوص انداز میں ازدواج کے مسئلہ پر ایک دوسری جگہ یوں روشنی ڈالتے ہیں:-

"آپ نے جو شرائط شادی پیش کئے ہیں وہ اس سے زیادہ عجیب و غریب ہیں یعنی آپ کو ایک ایسی عورت چاہیئے، جو حسن میں کوہ قاف کی پری ہو

اور دولت میں راکفلر یا فورڈ کی بیٹی —— خیال اچھا ہے کیونکہ تم بھی اپنی بدصورتی یا مفلسی میں جواب نہیں رکھتے، ہوش میں آؤ، کیوں دماغ خراب ہوا ہے، اول تو ایسی عورت ملنا محال ہے اور اگر مل بھی گئی تو وہ مجھے چھوڑ کر تمہارے پاس کیوں جانے لگی، یاد رکھو بدصورت مرد کے لیے حسین بیوی سے زیادہ کوئی عذاب نہیں، اگر اس کو تم سے محبت نہ ہوئی (اور محبت ہونے کی کوئی وجہ نہیں) تو اس عذاب میں مبتلا رہو گے کہ خدا جانے کب چھوڑ بیٹھے، اور اگر محبت ہو گئی تو ہمیشہ غلام بنے رہو گے۔

اگر آزادی ایسی ہی ناگوار ہے تو کوئی عورت معمولی شکل وصورت کی ڈھونڈو جو تمہاری قدر کرے اور تمہارے آئینہ میں اپنا منہ دیکھ سکے —— جھونپڑے میں رہنا اور محلوں کے خواب دیکھنا سراسر حماقت ہے۔"

نیاز مزاح کی ساری نزاکتوں کو جانتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ایک خط میں مزاح کے لیے "فطری آمد" کو، سب سے مقدم قرار دیا ہ "ہنسنے ہنسانے کے خاص اہتمام" پر انہیں غصہ آجاتا ہے۔ نیاز کے کامیاب ترین مزاح نگار ہونے کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ انہوں نے مزاح کو کبھی "پیشہ" کے طور پر اختیار نہیں کیا۔ اس لیے اس میں "فطری آمد" ہمیشہ رہی۔ جب کسی پر "مزاح نگار" ہونے کا لیبل لگا دیا جاتا ہے اور اسی نام سے یاد کیا جاتا ہے تو اس منصب کو سنبھالنے کے لیے اکثر اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ اور اس کوشش میں آمد کا کیا سوال باقی رہ سکتا ہے۔ مزاح نیاز کی طبیعت کے "دریائے بے تابی" کی ہمیشہ "ایک موج خوں" بنا رہا۔ اس لیے آپ کی سرخروئی ہمیشہ قائم رہتی ہے اور فطری آمد ہر جگہ دیکھی جا سکتی ہے۔ اسی خط کو دیکھیے:-

"میں نے سنا ہے (یہ نہ بتاؤں گا کس سے) کہ آپ ماہ آئندہ سفر حج کا عزم رکھتے ہیں اور برسبیل تذکرہ آپ نے یہ خیال بھی ظاہر کیا تھا کہ کیا نیاز کا چلنا ممکن نہیں۔ ممکن ہے بعض نے صاف صاف کہہ دیا ہو کہ "آپ بھی کس کافر و مشرک کا ذکر کرتے ہیں۔"

سو میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ نفس حج کا خیال اور وہ بھی کسی کی معیت میں، کسی کے طفیل میں کبھی میرے دل میں پیدا نہیں ہو سکتا، ر سوال سیر وسیاحت کا سو ایک عازم حج کے ساتھ اس کا بھی کوئی لطف نہیں، آپ چلیں گے آنکھوں پر پٹی باندھ کر اور یہاں عالم ہوگا "نظارہ زجنبیدن مژگاں گلہ دارد" کا، آپ کے ہاتھ میں ہر وقت تسبیح وحمایل ہوگی اور یہاں جام ومینا، پھر آپ ہی بتائیے کہ اگر کسی صورت کو دیکھ کر بے اختیار میری زبا سے سبحان اللہ نکل گیا اور ٹھیک اسی وقت آپ تسبیح پڑھنے لگے تو میں کیا کروں گا سوا اس کے کہ سمندر میں کود پڑوں، غرض یہ کہ آپ کے ساتھ چلنے کی کو صورت ممکن نہیں، ہاں، اگر آپ یہ وعدہ کریں کہ بمبئی میں جہاز کے عرشہ پر مجھے گم کر کے پھر اس وقت تک میری جستجو نہ کریں گے جب تک آپ پھ بمبئی واپس نہ آجائیں، تو بے شک میں طیار ہوں —— مگر پوچھیے کہ یہ معیت ہی کب ہوئی؟"

مزاح زندہ رہنے کی قوت کو ابھارتا ہے۔ مزاح حقیقی معنوں میں وہی ہے جو زندگی بسر کرنے کا حوصلہ اور ولولہ پیدا کرے زندگی اپنی ساری خوبصورتیوں کے ساتھ ابھر ابھر کے سامنے آ کہ اس پر جان دیتے ہی بنے۔ مزاح میں ایسی کیفیت مشکل سے پیدا ہوتی ہے مگر نیاز کا مزاح اسی خصوصیت سے مالا مال ہے۔ ملاحظہ کیجیے:-

"سنیے صاحب یہ جی موت کی باتیں مجھے پسند نہیں، مرنا برحق سہی لیکن جب تک آپ جی رہے ہیں اس "واویلا" سے فائدہ بھی کیا ہے، آخرت کے خیال کو آپ "مابعد الموت" سے کیوں متعلق کرتے ہیں آخرت سے مراد انجام ہے اس کا — جو ہم آپ اس دنیا میں کرتے ہیں ورنہ

مرد آخر ہیں مبارک بندہ ایست! —— کے معنی کیا؟

خدا کے لیے اس خیال کو ترک کیجیے آپ کی صحت پر خراب اثر پڑے گا اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی مایوس کر کے بے کار بنا دیں گے۔ لاحول قوۃ —— آپ سے کس نے کہا کہ اسلام کی تعلیم ہر وقت موت کو یاد کرنا ہے۔ مسلمانوں نے تو موت کا مقابلہ کیا ہے۔ اس سے جنگ کی ہے ا ایسی جنگ کہ ان میں بہت سے مرنے کے بعد زندہ ہیں اور آپ ہیں کہ زندگی ہی میں مرے جا رہے ہیں!

اگر برا نہ مانیے تو عرض کروں کہ نماز روزہ کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی کوئی گناہ بھی کر لیا کیجیے۔ کیونکہ زندگی کا احساس گناہ کے بعد بڑھ جاتا ہے۔ پہلے چھوٹے چھوٹے اور جب کچھ جان بدن میں آجائے تو بڑے بڑے! اگر آپ اس کیلئے تیار ہوں تو مطلع کیجیے۔ تاکہ ہم آپ دونوں ایک ساتھ اس کا تجربہ کریں ——— ذرا دیکھیں تو سہی ہوتا کیا ہے۔"

مزاح کے متعلق خود نیاز نے لکھا ہے کہ "یہ رنگ وہی شخص کامیابی کے ساتھ نباہ سکتا ہے جس کا مطالعہ بہت وسیع اور ذوق ہمہ گیر ہو۔" اس لئے نیاز کے ایک بلند پایہ مزاح نگار ہونے میں کوئی بھی شک نہیں کر سکتا۔ بعض وقت نیاز صرف ایک ہی لفظ سے فنکاری کے تخیل میں ایک خاص مزاحی کیفیت اور فضا پیدا کر دیتے ہیں۔ جیسے اس خط میں:۔

"نماز شروع کر دی، اچھا کیا، خدا مبارک کرے، لیکن یہ تو بتاؤ کہ اس مرتبہ کون سا نیا شکار پیش نظر ہے۔ اُس مرتبہ تم نے نماز کی پابندی کی تو غریب منیر کو تباہ کر دیا اور وضو کراتے کراتے اس کے چہرے کو اچھا خاصہ کمبخت بنا دیا۔ اس مرتبہ نظر عنایت کس پر ہے۔"

نیاز کا طنز بھی مزاح کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہوتا ہے۔ طنز کے متعلق یہ بات کہی جاتی ہے کہ وہ بغیر مزاح کے گالی بن جاتا ہے۔ طنز بغیر مزاح کے گالی بنے یا نہ بنے۔ لیکن مزاح کے ذریعہ طنز میں جو نشتریت آجاتی ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ نیاز کے ایک دوست جو خیر سے شاعر ہیں اور نظم گوئی کو تو "جنون و دیوانگی" سمجھتے ہیں لیکن غزل گوئی کو بڑی "فرزانگی"۔ ان معتقدات کے ساتھ ان کی غزل گوئی جیسی بھی ہو سکتی ہے اس کا اندازہ لگا لینا دشوار نہیں۔ یہاں نیاز کا مزاحیہ طنز دیکھیے۔

"میں نے سنا تھا کہ بھائی مراد باوجود ان کی تباہ حالیوں کے حج کو جانے والے ہیں۔ خدانخواستہ یہ خبر صحیح تو نہیں؟ ہائے یہ بھی دنیا کا کتنا بڑا سانحہ ہے کہ ایک بھائی کو شاعری نے تباہ کیا اور دوسرے کو مذہب نے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ یہ عذاب تمہاری شاعری کی وجہ سے نازل ہوا ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اس غریب کے پاس اتنی دولت کہاں کہ وہ یہ جسارت کر سکے۔"

وہ واقعات جو غصہ اور جھنجلاہٹ پیدا کرتے ہیں۔ ان کو نیاز کچھ اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ مزاح کا پہلو نکل آتا ہے۔ اور اس واقعہ کی ستم ظریفی بھرپور انداز سے ہم پر ظاہر ہو جاتی ہے۔ اس خط میں بھی وہ شعر سنانے کا ذکر کرتے ہیں لیکن خالص مزاحیہ انداز میں:۔

"کل آپ کا خط لے کر وہ تشریف لائے اور اس تصنع و تکلف کے ساتھ کہ اب کیا کہوں آنکھوں میں سرمۂ دنبالہ دار۔ ہونٹوں پہ لاکھے کی بہار، گالوں پر غازہ، ابروؤں پر وسمہ، پنڈلیوں میں چبھا ہوا تنگ پاجامہ، پاؤں میں وصلی کا زرکار جوتا، تنزیب کی تنگ اچکن، نیچے جامدانی کے کرتے کی پھبن بس یوں سمجھ لو۔

بر تنش پیراہن گل تنگ بود

بیٹھتے ہی کلام کی فرمائش کی، مدعا یہ تھا کہ میں فرمائش کروں، بس پھر کیا تھا یوں سمجھ لو کہ، ۷ بجے شام سے آدھی رات تک جسمانی و روحانی کوئی اذیت ایسی نہ تھی جو اٹھا رکھی گئی ہو۔ اخلاقاً پہلے تو دو چار غزلوں کی داد میں نے دی لیکن اس کے بعد جب زبان نے یارا نہ دیا تو خاموش ہو گیا لیکن وہاں تو یہ عالم تھا گویا سیلاب کا بند ٹوٹ گیا اور دنیا کی کوئی قوت اس کو روک نہیں سکتی —— خدا خدا کر کے جب بارہ بجے یہ دورہ ختم ہوا تو فرماتے کیا ہیں اجازت ہو تو صبح پھر حاضر ہوں۔ میں نے کہا یوں آپ کا گھر ہے۔ جب مزاج میں آئے تشریف لائیے۔ لیکن صبح میں ایک نہایت ضروری کام سے آگرہ جا رہا ہوں فرمانے لگے خیر کوئی حرج نہیں میں صبح حاضری ضرور دوں گا کیونکہ ممکن ہے کسی وجہ سے یہ سفر ملتوی ہو جائے —— کاٹو تو لہو نہیں بدن میں —— میں ان کے جانے کے بعد ہی فوراً اسٹیشن چلا آیا اور یہیں سے یہ خط لکھ رہا ہوں۔"

نیاز مذہبی معاملات کے بیان میں جس شوخی سے کام لیتے ہیں وہ ان کی اپنی خاص چیز ہے۔ اکثر جگہ نیاز کی شاعرانہ طبیعت، ادبی وسیع نگاہی اور احساس مذہبی کا کسی ایک نقطہ پر اجتماع بڑے ہی لطیف مزاح کا باعث ہوتا ہے:۔

"آپ بھی سن لیجیے اور ان سے بھی کہہ دیجیے کہ اعتراف محبت کوئی گناہ نہیں کہ تعزیر میں آزمائش و امتحان کے مبادیات طے کرنا ضروری ہوں۔

غالب کہتا ہے :۔

خجلت نگر کہ در حسناتم نیافتند
جز روزۂ درست زصہبا کشودہ

"مگر یہاں تو انشاء اللہ نامہ اعمال بالکل کورا ہی ملے گا۔ وہاں کم از کم ایک روزہ تو تھا خواہ وہ شراب ہی سے کیوں نہ کھولا گیا ہو مگر یہاں تو ساری عمر اس حسرت میں بسر ہوئی کہ شراب ہوتی تو روزہ رکھا جاتا ــــ"

بات یہ ہے کہ نیاز خرناصیت سے بیزار ہیں۔ ایسی مذہبیت جو انسان کو انسانیت کے جامے سے باہر کھینچ لیتی ہے ہمیشہ نیاز کے مزاح اور طنز کا نشانہ بنتی ہے۔ خشک مذہبیت کو نشانہ بناتے ہوئے نیاز کی شوخی بڑا البیلا پن اختیار کر لیتی ہے۔ اور ان کے مزاح کی لطافت اور رکھ رکھاؤ کا بانکپن ایسے ہی موقعوں پر کھلتا ہے :۔

"رہبری کا شکریہ لیکن کیا کروں میری گمراہی تو سکندر کی سی گمراہی ہے کہ خضر بھی "آب حیواں" تک پہنچانے میں کامیاب نہ ہوئے۔ میں آپ کی ہدایت پر ایک سے زائد باران کی صحبت "مراقبہ و سلوک" میں شریک ہو چکا ہوں ــــ گھنٹوں سر جھکائے رہنے کے بعد گردن میں درد تو ضرور پیدا ہو گیا لیکن دل پر اتنا بھی اثر نہ ہوا کہ "حضرت" کی صورت ہی مجھے اچھی معلوم ہونے لگتی ــــ فرمایا "کیا چاہتے ہو؟" ــــ میں نے جواب دیا۔ "روحانیت"۔ بولے "روحانیت سے کیا مراد ہے؟" میں نے کہا۔ "بادہ خوری کی توفیق اور گناہ کرنے کی صلاحیت"۔ قریب تھا کہ گردن میں ہاتھ دیکر مجھے نکال دیتے لیکن میں نے کہا۔ "جناب غصے کی کوئی بات نہیں جب روحانیت کا "مفہوم خود آپ مجھ سے دریافت کر رہے ہیں تو سوائے اس کے کیا عرض کروں۔ میں تو آپ کے پاس خود یہی سوال لیکر آیا ہوں اور آپ الٹا مجھ ہی سے دریافت کرتے ہیں"۔ یہ سن کر خیر غصہ تو کیا کم ہوتا لیکن ایک حد تک ضبط پر قادر ہو گئے اور فرمایا ــــ "پھر بھی تمہارے نزدیک کوئی نہ کوئی مفہوم روحانیت کا ہو گا، وہی معلوم کرنا چاہتا ہوں ــــ میں نے کہا ــــ "میرے نزدیک روحانیت نام ہے صرف پاکیزہ اخلاق کا" ــــ دریافت فرمایا۔ "کوئی مثال دو" میں نے جواب دیا۔ "مثلاً گاندھی جی" اب کیا پوچھتے ہیں کہ یہ سن کر ان کا کیا حال ہوا ــــ؟"

مذہبیت ہندوستان میں بعض وقت صرف توہم پرستی کا مہذب نام بن جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب کی خدمت کا جذبہ بھی بعض وقت یکسر توہماتی بنکر رہ جاتا ہے۔ یہاں ملک کو مسجدوں سے "آباد" کرنا ہی سب سے بڑی مذہبی خدمت سمجھ لی جاتی ہے لیکن اس "آبادی" کی "ویرانی" دور کرنے کی کوشش کا بھی خیال ذہن میں نہیں آتا۔ نیاز کے طنز کا نشتر ایسے فاسد مواد پر ہمیشہ چلتا ہے۔ مسلمانوں کی تعمیر سے زیادہ مسجدوں کی تعمیر کو عزیز رکھنا اور توہماتی روحانیت کے زعم میں اپنی بیوقوفی کا اظہار کرنا نیاز کی مزاحی حس کو ہمیشہ بیدار کر دیتا ہے۔ وہ بڑے لطیف انداز میں ایسے واقعات پر طنز کرتے ہیں :۔

"ان کے جدّ بزرگوار تو خیر صرف ہمارے فتح پوری کے صاحب خدمت تھے لیکن ان کے والد محترم کے سپرد تو پوری کمشنری الہ آباد کا نظم و نسق تھا ــــ یہ خود کیا ہیں مجھے تو ان کے بیان سے صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ یورپ کے جس قطب نے جنگ عظیم کرا دی تھی اس کو شکست دے کر انہوں ہی نے آپس میں صلح کرائی ہے یہ اتنا بڑا مرتبہ ہے کہ آپ ہی اس حقیقت کو سمجھ سکیں تو سمجھ سکیں۔ میرے بس کی بات تو ہے نہیں۔ یہ فی الحال اپنے گاؤں میں ایک مسجد بنوا رہے ہیں اور امداد کے طالب ہیں ــــ میں نے پوچھا کہ کیا آپ کے گاؤں میں کوئی مسجد نہیں تو فرمایا کہ "مسجدیں تو کئی ہیں لیکن بے مینار کی مسجد کوئی نہیں۔" میں ڈر کے مارے یہ نہ کہہ سکا کہ "کیوں نہ آپ موجودہ مسجدوں کے مینار توڑوا دیں اس میں زیادہ آسانی ہے۔"

نیاز کا مذہبی موضوعات اور اعتقادات پر گفتگو کرتے وقت استدلالی انداز ان کے مزاح کو بڑا نکھارتا ہے۔ نیاز کی بے باکی اور جرات ان کی شخصیت کے تیکھے پن کو دلچسپ بناتی ہے۔ وہ مزاح کا نقاب اس لئے نہیں اوڑھتے کہ جو جی چاہے کہہ سکیں بلکہ نقاب ہٹانے کے بعد

بھی وہی کہتے ہیں جوان کے دل کی بات ہے۔ اسی لئے مزاح نقاب کے اندر سے جھلکتی ہوئی حقیقت دلچسپ ہی نہیں فکر انگیز بھی بن جاتی ہے۔

"مانا کہ تم زاہد الانسان ہو، خدا کے بڑے صبر و شکر والے بندے ہو، کلام الٰہی میں بڑی قدرت ہے لیکن خدا کے لئے بتاؤ کہ جو بات بات میں تم خدا کو تکلیف دیا کرتے ہو اس سے کیا فائدہ ——— کیا اللہ میاں کو سوائے اس کے کوئی کام نہیں کہ وہ صرف تمہاری ریاضت، اور تمہارے ایمان و اسلام کو بیٹھے ہوئے سراہا کریں اور تم کو مرنے سے پہلے ہی دنیا میں جنت کی تمام راحتیں مہیا کر دیں،

ہوش میں آؤ، زہد و تقویٰ بھی وقت وقت سے اچھا معلوم ہوتا ہے یہ نہیں کہ میاں کو چھینک آئی اور تسبیح پر ہاتھ پہنچ گیا، سر میں درد ہوا اور مصلیٰ بچھ گیا۔ اللہ میاں کو توبہ توبہ کیا تم نے اپنا خانہ زاد غلام سمجھ لیا ہے جو بات بات میں تمہارے پیچھے دوڑتا پھرے گا۔ کیا دنیا میں ہم سے گناہگاروں کی کمی ہے جو تم ایسے زاہدان عبوس کی طرف توجہ کرتے ہیں یہ نہیں کہتا کہ تم عبادت و ریاضت چھوڑ دو یا میری طرح بے دین ہو جاؤ لیکن یہ حرکت کیا کہ "زہر مرض کہ بنالد کسے شراب دہید"

نیاز کی زبان و بیان پر بے پناہ قدرت ان کے مزاح کا منبع اصلی ہے۔ وہ ایک عظیم آرٹسٹ کی طرح اپنے برش و قلم سے سایہ و نور کے ایسے امتزاج پیدا کرتے ہیں کہ وہ جس طرح کی چاہتے ہیں کیفیت اور تاثیر پیدا کر دیتے ہیں۔ اس خط کو دیکھئے:۔

"کل شام کا لطیفہ سنو، تمہارے خال مکرم تشریف لائے اور اس شان سے کہ تسبیح ہاتھ میں تھی اور کفنی گلے میں حیران کہ خدایا میں نے کب دعویٰ نبوت کیا تھا جو جبریل کا نزول اجلال ہوا، میں نے اپنے گم کردہ راہ ہونے پر کب اظہار مسرت کیا تھا کہ جناب خضر تشریف لے آئے! ——— باور کرو میں نے ان کو پہچانا ہی نہیں، سرو قد تعظیم دی، دست بوسی کے لئے آگے بڑھا جسم کا ریشہ ریشہ کانپ رہا تھا کہ کہیں یہ "سامری" افسوں پڑھ کر خاکستر نہ کر دے۔ دفعتاً وہ مسکرا پڑے اور میں نے ان کے طلائی دانت دیکھ کر فوراً پہچان لیا،

حیران تھا کہ خدایا کیا انقلاب ہے، وہ شخص جو وضع مغربی کا اتنا دلدادہ ہو اس حد تک بھیانک بن جائے، وہ شخص جس نے بھول کر کبھی خدا کا نام نہ لیا ہو وہ بالکل زمزمی بنا ہوا سامنے آئے۔

میں نے پوچھا "حضرت! یہ کس نگاہ کا کرشمہ ہے؟ کس جلوۂ بے محابا کی کارفرمائیاں ہیں؟" امے یہ سننا تھا کہ ان پر تو حال طاری ہو گیا۔ لاحول ولاقوۃ۔ میں کس قدر پچھتایا کہ میں نے کیوں ان سے یہ پوچھا۔ وہ نیم بسمل . . . کی طرح لوٹ رہے تھے اور میں پریشان کہ کہیں ان کا دم نہ نکل جائے آخر کار زبردستی ان کے ہاتھ پاؤں باندھ کر پانی کے چھینٹے دے، لخلخہ سونگھایا تو انہیں ہوش آیا۔"

نیاز کے معتقدات اپنی انفرادیت رکھتے ہیں۔ وہ اپنی ہی . . . . راہ چلتے ہیں۔ یہ راہ پر پیچ ہی نہیں دشوار و خطرناک بھی ہے۔ ان راستوں کو سمجھنا اور سمجھانا بھی بڑا کٹھن ہوتا ہے۔ لیکن نیاز کا ہلکا ہلکا مزاح ان راہوں کو سہل ہی نہیں بنا دیتا بلکہ ان پر روشنی بھی بکھیرتا ہے۔ ٹھنڈی روشنی اتنی دلکش اور پرکشش ہوتی ہے کہ خواہ مخواہ کیسے سے کیسا زاہد خشک ہو اس راستہ پر نیاز کے ساتھ کچھ دیر کے لئے ہی سہی، ہو لیتا ہے۔ اور پھر جب لوٹ آتا ہے تو اس کی فکر تو کچھ نہ کچھ تر دامن ہو ہی جاتی ہے۔ نیاز کی شوخیٔ تحریر بڑی فکر انگیز ہوتی ہے۔ ملاحظہ کیجئے:۔

"قبلۂ عالم! آپ لاکھ سمجھائیے، یہ بات کبھی میری سمجھ میں نہ آئے گی کہ خدا صرف مسلمانوں کا ہے اور سوا ان کے وہ سب کو جہنم میں پھینک دے گا ظہور اسلام سے لے کر اس وقت تک زیادہ سے زیادہ دو چار ارب مسلمان پیدا ہوئے ہوں گے، اور ان کے مقابلے میں ہزار گنا، زیادہ اور مذاہب کے لوگ پھر کیا کوئی عقل اسے باور کر سکتا ہے کہ خدا ایک کو تو جنت دے اور ہزار کو دوزخ میں ڈالدے ——— اس کو اتنے جہنمی پیدا کرنے کی آخر ضرورت ہی کیا تھی، اور اتنی مخلوق کو جس میں خدا جانے کتنی حسین عورتیں ہوں گی آگ میں ڈال کر تڑپانے سے خدا کی کون سی مسرت وابستہ ہے"

اسی رنگ میں ایک اور تحریر دیکھئے:۔

"ہوش کی باتیں کرو، خدا اگر چنگیز و ہلاکو کو نہیں تو حاتم طائی اور جعفر برمکی بھی نہیں! نہ اس کو تمہاری عبادت کی پروا نہ میری سرکشی کی، یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ وہ تمہارے سجدہ کرنے سے خوش ہوتا ہے اور میری شراب خوری سے پیشانی پر شکنیں ڈال لیتا ہے، عجیب عقلمند ہو۔

بیا کہ رونقِ ایں کارخانہ کم نہ شود —————— ز زہدِ ہمچو توئی یا ز فسق ہم چو منی

نہ تم نمازیں پڑھ پڑھ کر کوئی بتکدہ مسمار کر سکتے ہو اور نہ میں اپنی بت پرستیوں سے کعبہ ڈھا سکتا ہوں، اس دربار میں نہ جنید و شبلی کے لئے خاص رعایت ہے نہ بہرام و جمشید سے کوئی عداوت ـ چند دن کی زندگی کو اس کوفت میں بسر کر دینا کہ معلوم نہیں حشر میں کیا معاملہ ہو سخت نادانی ہے، کسی کا دل نہ دکھاؤ اور جی میں آئے کرو۔

مباش درپئے آزار و ہرچہ خواہی کن

آپ نے دنیا ترک کردی برا کیا، دوسروں کو بھی یہی تعلیم دیتے ہو اور زیادہ برا کرتے ہو —— تم نااہل و بزدل ہو تو ساری دنیا کو ایسا سمجھتے ہو، تم چاہتے تھے کہ رندی و بادہ آشامی کی حقیقتیں اس قدر آسانی سے تم پر کھل جائیں۔ معقول۔

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں

میں اس نئے رنگ میں تمہیں دیکھنے کا آرزومند ہوں، اپنے مولی سے پوچھ کر ایک دن یہاں بھی نعرۂ "یا ہو" لگا جاؤ —— ممکن ہے میں بھی ڈر کر، سہم کر تمہارے قدموں پر گر پڑوں، یوں زبانی وعظ و پند سے تو کام چلے گا نہیں"

نیاز کی رندی کا ذکر خود ان کی زبانی تمام تر گل افشانی بن جاتا ہے۔ نیاز ایسے رند ہیں جو "بے خودی" میں بھی "انداز گفتار" کا خیال رکھتے ہیں۔ وہ خود بھی احساس رکھتے ہیں کہ اس صدی کے "رند" ہیں۔ وہ خود اس کا ذکر بڑے ہی پر لطف اعتماد کے ساتھ کرتے ہیں:۔

"حضرت یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں کس خیال میں ہیں۔ یہ سوئے ظن اور میرے متعلق آہ

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ شاید کہ تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

آپ کو معلوم نہیں جس طرح ہر صدی میں ایک مجدد پیدا ہوا کرتا ہے اسی طرح ہر سو سال کے بعد ایک رند پیدا ہوا کرتا ہے، سو اس کا حال تو آپ کو معلوم ہوگا اور ممکن ہے کہ وہ آپ ہی ہوں، لیکن اس صدی کے رند کی بابت مجھ سے پوچھئے کہ کون ہے؟ ہر چند خودستائی ہوگی لیکن آپ اصرار کریں گے تو صاف صاف کہنا ہی پڑے گا——

پھر آپ ہی غور فرمائیے کہ آپ کا یہ تمام "دفترِ تدبیر و مصلحت" کیا کام دے سکتا ہے اور آپ کی مجددانہ ترشیاں اس نشہ کو کیا اتار سکتی ہیں جہاں اگر کبھی ترک معصیت کا خیال بھی ذہن میں آگیا تو اس کا کفارہ ادا کرنا پڑتا ہے۔

نالہ از بہرِ رہائی نہ کند مرغِ اسیر خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نہ بود

نمازیں پڑھتے رہیے اور فرشتے بنے رہیے، ہم لوگوں کو چھیڑنے سے فائدہ کہ اگر آزادی سے ایک سانس بھی آپ کے سامنے لی تو بادۂ شبانہ کی بو سے آپ کو بھاگنے کی راہ نہ ملے گی، ہم لوگ رند ہیں رند! سنا آپ نے"

نیاز بڑے ہوش و گوش رکھنے والے رند ہیں۔ ان کی تحریر کی لطافتیں زندگی کی رنگا رنگی سے رنگین بنتی ہیں۔ وہ دل و دماغ دو کے دریچے کھلے رکھتے ہیں۔ وہ زندگی کے ہر رخ کو دیکھتے ہیں۔ اسے محسوس کرتے ہیں اور پھر اس کا تجزیہ کرتے ہیں۔ اسے اپنے جذبات کی ترا پر تولتے ہیں اور پھر فیصلہ صادر کرتے ہیں۔ چونکہ ان سارے مراحل میں وہ نفسیاتی ژرف نگاہی سے کام لیتے ہیں اس لئے دوسروں کی کمزوری پر وہ جھلاتے نہیں بلکہ اس پر مسکرا دیتے ہیں چونکہ اس مسکراہٹ میں ہمدردی اور خلوص ہوتا ہے اس لئے ان کی اس خوش دلی میں سب ہی شریک ہو جاتے ہیں۔ ذرا اس تحریر پر غور کیجئے:۔

"معاف فرمایئے۔ میں آپ سے متفق نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان کا انتخاب میں آنا باعث حیرت ہو۔ لیکن خود ان کا انتخاب تو ایسا ہے کہ جلِّ وصلِّ۔ میں اپنے جذبات کا اندازہ کرتے ہوئے کہتا ہوں کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ تمام برہمی صرف اس لئے ہو کہ عناصر میں وہ اعتدال باقی نہیں۔ یہ درسِ اخلاق دینے والے بھی کس قدر ظالم ہوتے ہیں۔ جب تک خود جوان رہتے ہیں کسی کی سنتے نہیں اور بوڑھے ہونے پر چاہتے ہیں کہ دنیا سے جوانی ناپید ہو جائے۔ آپ کیوں خواہ مخواہ کوفت مول لیتے ہیں۔ وہ آپ کے بھتیجے ہیں اور میرے دوست۔ آپ کی طرح میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ ان کا اخلاق خراب نہ ہو۔ لیکن اس کا بھی یقین ہے کہ اگر ہمیں آپ کو دوبارہ جوانی نصیب ہو جائے تو اسی عورت کے پیچھے آپ ہم دونوں ایک دوسرے کے نہایت سخت رقیب ہو جائیں۔ اور نہ آپ اس بات کو دیکھیں کہ صورتاً آپ کو مجھ سے کیا نسبت ہے اور نہ میں یہ دیکھوں کہ دولت کے لحاظ سے میں آپ کے مقابلے میں کتنا حقیر ہوں۔"

نیاز کے ہاں نازک اور حد درجہ شگفتہ مزاح لطیف ترین مزاح کے ان گنت جواہر پارے بکھرے ہوئے ہیں۔ ان کے مزاح کی نزاکتوں کی پہلواری کا جائزہ لینا اور ان کے اس خزانہ کی قدر و قیمت کو متعین کرنا وہ بھی ایک مختصر مضمون میں مشکل ہی نہیں بلکہ شاید ناممکن ہے۔ جلدی میں میرے ہاتھ جو کچھ لگا اسے میں نے یہاں پیش کر دیا ہے لیکن یہ "مشتے از خروارے" سے بھی بہت کم ہے۔ غالب کے بعد نیاز نے ہی اردو مزاح کی لطافتوں کو نئی وسعتوں سے روشناس کیا۔ نیاز نے جہاں اردو ادب کو اور بہت گراں قدر چیزیں دی ہیں وہیں شگفتگی اور زندہ دلی کا ایک منفرد انداز بھی دیا ہے۔ نیاز کی شوخی صرف انبساطی فضا پیدا نہیں کر دیتی بلکہ یہ ذہن و فکر کا تغذیہ بھی کرتی ہے۔ زندگی کی بے پناہ وسعتوں کا لطیف احساس نیاز کی تحریروں میں سمٹ آتا ہے اور یہی سمٹی سمٹائی احساسیت فکر و فن کے تار کو چھیڑتی ہے۔ اور اسی تار کو لے پر نیاز کے مزاح کے نازک اور لطیف نغمات ابھرتے ہیں۔ اور ان نغمات سے اردو ادب کا ایوان ہمیشہ گونجتا رہے گا —— اس لئے نیاز کی تخلیقی ذہانت کا صرف یہی ایک پہلو انھیں اردو ادب میں زندہ جاوید بنانے کے لئے کافی ہے۔

* * *

غزل نام ہے، بیان محبت کا اور مثنوی، داستان محبت کا، وہ سرودِ غم ہے اور یہ بزمِ ماتم۔

"نظم نام ہے تعبیراتِ مشاہدہ کا، قیاس و برہان سے کام لے کر اعمالِ حیات سے نتیجہ پیدا کرنے کا، اور شعر نام ہے صرف انفعالاتِ نفسیہ کے شعور کا، جس کے اظہار میں شواہد و دلائل سے کام لینے کی ضرورت نہیں۔ الغرض یوں سمجھئے کہ نظم عقل کی زبان ہے اور شعر نفس و قلب کی۔"

"شعر کا تعلق صرف دو باتوں سے ہے، تاثر و اظہار، لیکن اصل چیز تاثر و اظہار کی نوعیت ہے اور ان دونوں کے توازن یا عدم توازن کا تعلق الفاظ سے نہیں بلکہ شاعر کی نفسیات سے ہے، اس کے صنّاعانہ سلیقہ سے ہے۔"

"رقص و غنا دونوں نہایت قدیم فن ہیں۔ رقص نام ہے محض جسم و اعضاء کی جنبش کا اور غنا کا تعلق صرف صوتی لحن سے ہے جس کے لئے الفاظ کی ضرورت نہیں۔"

(نیازؔ)

نیاز فتحپوری اور انکا اسلوب بیان

صلاح الدین پرکار

نیاز فتحپوری کی اسلوب نگارش اور رومانیت میں ڈوبے ہوئے شائستہ اور لطیف پیرایۂ بیان سے شاید ہی کسی کو انکار ہو۔ جدید اردو نثر کی ترویج و ترقی سرسید کی کوششوں کی مرہونِ منت ہے۔ انہوں نے نہ صرف اردو نثر کو ایک بہترین اسلوب دیا بلکہ اس نثر کو جو مقفی اور مسجع تھی نئی زندگی بخشی۔ سلاست، روانی بلکہ شگفتہ طرزِ تحریر عطا کی۔ سرسید کی تحریک دراصل ایک ایسا چشمہ تھی جس سے اردو ادب کے مختلف سوتے پھوٹے۔ نذیر احمد ناول لکھ رہے تھے تو حالی سوانح عمریاں اور مسدس کے ذریعہ اردو میں ایک روح پھونک رہے تھے۔ شبلی دلچسپ پیرائے میں فلسفیانہ نقطہ نظر سے تاریخیں مرتب کر رہے تھے۔ مگر ایک ایسی ہستی اور بھی جو اپنے "آبحیات" سے مُردہ دلوں میں روح پھونک رہی تھی اور وہ تھے آزاد۔ آزاد نے انشاپردازی کی وہ بنیاد قائم کی جو آج بھی ان کے توسط سے باقی ہے ورنہ وہ دور مقصدیت ہر فن کو نظرانداز کئے ہوئے تھا۔ حالی ہوں یا سرسید ان کے یہاں ایک طرح کی خشکی ضرور محسوس ہوتی ہے اور یہ اردو ادب کی ایک کمی رہ جاتی اگر آزاد نے اپنے رنگین طرزِ بیان سے ایک رومانیت کی لہر نہ پیدا کی ہوتی۔ آزاد کے بعد شبلی اور پھر ابوالکلام آزاد اس کے علمبردار بنے جنہوں نے ایک خاص اسٹائل اختیار کیا۔ ان میں جاذبیت تھی، کشش تھی جو اردو داں طبقہ کو متاثر کئے بغیر نہ رہ سکی۔ یہ دراصل شاعر تھے جو نثر میں شاعری کر رہے تھے۔ ابوالکلام آزاد جلد ہی سیاست میں ڈھل گئے۔ ابوالکلام نے اپنے زورِ بیان اور رنگین اسلوب سے نئی پود کو بہت متاثر کیا۔ و صرف رومان انگیز تحریر کے ہی مالک نہ تھے بلکہ ان کے یہاں تحریر کے ساتھ ساتھ فکر اور مواد کی بھی کثرت تھی۔ چنانچہ ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی بہت سے ادیبوں نے کوشش کیں لیکن ان میں نیاز پیش پیش رہے۔ نیاز نے جتنا اثر ابوالکلام آزاد سے قبول کیا شاید ہی اتنا اس دور کے ادیبوں میں سے کسی اور نے کیا ہو۔ وہ جب تک شاعر رہے مولانا کا ہی اثر ان پر حاوی تھا اور جب انشاپردازی کی طرف متوجہ ہوئے تب بھی ان ہی کا اثر رہا مگر انہوں نے جلد ہی، اپنا رنگ اختیار کیا اور نئے طرزِ اسلوب کے موجد بنے۔

یہ لوگ مغرب سے زیادہ متاثر تھے جسے ہم رومانی تحریک کہہ سکتے ہیں۔ اس رنگ میں کچھ اور ہستیاں بھی آئیں اور انہوں نے اپنے لافانی نقوش چھوڑے۔ ان میں خاص کر سید حیدر یلدرم اور مہدی حسن افادی قابلِ ذکر ہیں۔ یہ تینوں دراصل اس تحریک کے علمبردار تھے جن میں نیاز کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ اردو ادب کی خوش نصیبی تھی جو نیاز نے شاعری ترک کر دی۔ وہ شاعر رہ کر ایسی خدمات انجام نہ دے سکتے تھے جو انہوں نے ایک انشاپرداز [illegible] کر دیں۔

ان کے رگ و پے میں رومان رچا ہوا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ خشک باتوں میں بھی رومانیت پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک دنیا کی ہر چیز میں "نسائیت" ہے۔ مہدی حسن بھی اس نظریہ کے قائل معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنی لائبریری کی کتابوں کو بھی "نازنینانِ حرم" کہا۔ یلدرم کا ایمان ہے "...... اگر عورت میں حسن نہ ہوتا تو مرد میں عالی حوصلگی پیدا نہ ہوتی اور اگر مرد میں عالی حوصلگی نہ ہوتی تو عورت کا حسن رائگاں جاتا ......" نیاز کا مضمون "عورت" اس دعوے کی تشریح کرتا ہے اور اس کا مکمل ثبوت ہے کہ ہر دور کے ادب میں عورت ایک اہم موضوع بنی رہی ہے ہماری غزل میں ذخیر یہی موضوع ہے۔ اس کے علاوہ افسانے ہوں یا ناول، ڈرامے ہوں یا نظمیں غرض تمام تر ادبی کاوشوں کا موضوع "عورت" ہے۔ اس میں نسائیت ہے،

رومان ہے، ایک دلکشی ہے، ایک جاذب نظر حُسن ہے جس نے ساری کائنات کو دلکشی بخشی، جس نے زندگی کو رنگین بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ نیاز کو ہر قطرے میں، ہر ذرے میں، ہر تازگی میں اور ہر جگہ عورت ہی نظر آتی ہے۔ وہ ہر نفاست کو، ہر لطافت کو، ہر نزاکت کو عورت کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ عورت ان کے یہاں صرف گوشت پوست والی شے نہیں بلکہ فطرت کی ہر دلکشی میں انہیں نسائیت کی جھلک ملتی ہے چنانچہ اپنے مضمون "عورت" میں لکھتے ہیں:

"راتوں کی خلوت میں بارہا میں نے اس امر کی کوشش کی کہ میں حسن کو عورت سے جدا کر سکوں کوئی صورت ایسی فرض کر سکوں جس کا علیحدہ نظارہ ہو سکے لیکن سوائے اس کے کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ نسائیت ہی نام ہے حُسن کا اور جو چیز دنیا میں حُسن کا مکمل نمونہ پیش کر سکتی ہے وہ نسائیت سے خارج نہیں ہے، یہاں تک کہ میں فرطِ استغراق میں ہر ذرہ کو اس کے پرتو سے رنگین پاتا ہوں۔"

یہی وہ رنگین نگاہی ہے جو نیاز کو دراصل رنگین پیرایۂ بیان اور رنگین بیانی کے لئے مجبور کرتی ہے۔ ان کے یہاں ورڈس ورتھ کی طرح بولتی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ فطرت سے بہت زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔ قدرتی مناظر ان کے دل کے ایک ایک تار کو چھیڑتے ہیں اور ان تاروں سے جو ہلکی، لطیف، مترنم آواز نکلتی ہے وہی نیاز کا اسلوب ہے۔

اسلوب دراصل شاعر کے فطری رجحان پر منحصر ہے۔ حالیؔ رنگین اس لئے نہ ہو سکے کہ یہ ان کا فطری رجحان نہ تھا اور محمد حسین آزاد سیدھا سادہ پیرایۂ بیان اختیار نہ کر سکے اس لئے کہ ان کے اندر ایک خاص قسم کی شعریت تھی اور وہ اپنے الفاظ کو اس سے خالی نہ رکھ سکتے تھے۔ یہی حال نیاز کا بھی ہے۔ ان کے یہاں خلوص کے ساتھ حقیقت بیانی، سلاست اور روانی ہوتی ہے اور دوسروں کے یہاں لفاظی اور سیدھی سادی ترکیبیں۔ نیاز کے یہاں خیال سے زیادہ الفاظ پر زور ہے۔ ان میں ایک طرح کا ترنم ہوتا ہے جو روح کے تاروں کو چھیڑتا ہے، ایک نغمگی کی کیفیت ہوتی ہے، ایک مدہوش کرنیوالا جادو ہوتا ہے۔ فطرت کی عکاسی میں انہیں کمال حاصل ہے۔ وہ معمولی سے معمولی شے میں بھی حُسن پیدا کر دیتے ہیں، اتنی جاذبیت اور اتنا حُسن کہ نگاہیں الفاظ پر جم جاتی ہیں۔ شاعری میں چونکہ قیود میں رہنا پڑتا ہے اس لئے کھل کر بات نہیں ہو سکتی۔ نثر میں کھل کر اظہار کرنے کا موقع ملتا ہے اور نیاز نے اس سے فائدہ اٹھایا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ منظوم عکاسی کرنے والے بہت ہیں کیوں نہ نثر میں شاعری کی جائے اور حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے نثر کو معراج کمال پر پہنچایا ہے۔

ان کے مضامین انشا پردازی کے بہترین نمونے ہیں۔ خاص کر "برسات" "ایک رقاصہ سے" "عورت" "ایک قافلہ صحرا کو دیکھ کر" اردو ادب میں انشا پردازی کے سنگ میل ہیں۔ الفاظ اپنے دل کے جذبات دوسروں تک پہنچانے کے ذریعے ہیں مگر بہترین ادیب وہ ہے جو اپنے خیالات دوسروں کے دلوں میں بھی اسی طرح پیدا کر سکے۔ نیاز کے پاس الفاظ کا بیش بہا خزانہ ہے اور وہ ان کو استعمال بھی بڑی موزونیت کے ساتھ کرتے ہیں اور ایک ہی منظر اور کیفیت کے لئے الگ پیرایۂ بیان اختیار کرتے ہیں جس سے طبیعت اکتاتی نہیں بلکہ بار بار پڑھنے پر بھی سیری نہیں ہوتی اور ہر بار ایک نئے پن کا احساس ہوتا ہے۔ ذیل کے مرقع سے پتہ چلتا ہے کہ نیاز نے کس طرح اس خشک اور چٹیل فضا کو رنگین بنا دیا ہے۔

"۲۳ جون کی صبح کو جو آنکھ کھلی تو سواد بمبئی شروع ہو گیا تھا اور سب سے پہلا منظر کھجوروں کے درختوں کا تھا جو سبز و شاداب ٹیکروں اور پھیلے ہوئے قطعات آب سے مل کر آنکھوں میں سمائے جا رہے تھے۔ راستہ کے خشک و گرم میدانوں کو دیکھنے کے بعد اچانک یہ سکون نظر خدا جانے کیسی نعمت تھا۔ میں اس منظر کی عربیت سے متاثر ہوا اور ایسا محسوس کرنے لگا گویا دشت نجد میں قیس اتفاقاً کہیں لیلیٰ کو پا گیا ہے اور صحرا کی وحشت و خشکی جو شاید اسی ملاقات کی منتظر تھی، یکبارگی رونق و سرسبزی، خشکی و تری میں تبدیل ہو گئی ہے۔"

ان کے یہاں اکثر مترنم الفاظ ملتے ہیں۔ ایسے الفاظ مشکل سے ملیں گے جن میں کوئی ثقل ہو۔ ایک روانی ہوتی ہے، ایک جاذبیت اور ایک کشش ہوتی ہے۔ اکثر مخرج حروف بھی ملتے ہیں جن کے استعمال سے جملے کی خوبی دوبالا ہو جاتی ہے۔ اپولو بندر کا ایک سین وہ اس طرح پیش کرتے ہیں:

"میں سمجھتا تھا کہ اونچی اونچی لہروں کے ہیبتناک غیر منقطع سلسلہ اور ایک سامع شکن شور کا نام سمندر ہے لیکن یہ دیکھ کر کتنا تعجب ہوا وہ تو صرف ایک سکون ہے متحرک، اور خموشی ہے متلاطم۔"

نیاز کے یہاں خطابیہ اسلوب بھی کثرت سے پایا جاتا ہے، مگر باوجود حُسن و جاذبیت کے وہ بہت زیادہ کامیاب نظر آتے ہیں کیوں کہ یہاں زیادہ تر حُسن

کی تعریف بیان کرتے ہیں اور باوجود جدت اور رنگینی کے طبیعت اوب جاتی ہے۔ یہ بات تقریباً تمام رومانیت پسند ادیبوں کے یہاں پائی جاتی ہے اور یہ خامی ان کے یہاں بھی ملتی ہے۔ شرر کا "لالۂ خودرو" میں ہائے اور آہ اور وہی خیالات کچھ ایسے طریقے سے بار بار دہرائے گئے ہیں کہ تھوڑی ہی دیر میں پھیکا پن محسوس ہوتا ہے۔ اسی طرح نیاز کا مضمون "ایک رقاصہ سے" اگرچہ بہترین ہے، خیالات کی نزاکت اور قوت تخئیل انتہائی عروج پر ہے پھر بھی مشکل سے آدھے مضمون تک دلچسپی قائم رہتی ہے۔

نیاز بہترین افسانہ نگار نہ سہی، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ افسانوی ادب میں ایک نئے طرز بیان کے وہ موجد ضرور ہیں۔ ان کے اسلوب کی جاذبیت تھوڑی دیر کے لئے گرد و پیش سے بے خبر کر دیتی ہے۔ یہاں بھی جگہ جگہ شوخی اور شاعرانہ انداز بیان کی چاشنی ہے۔ حسن و عشق ہی ہمارے زیادہ تر افسانوں کے مواد ہیں اور اس وادی کو نیاز سے زیادہ شاید ہی کسی اور نے طے کیا ہو۔ ان کے بعض فقرے ایسے ہوتے ہیں جو بھولے نہیں جاسکتے۔ "جان عالم اور ملکۂ مہر نگار" کا ایک سین ملاحظہ فرمائیے:

> "اپنی دوکان کے سامنے بیٹھا ہوں کہ ناگہاں ایک تلاطم نور، ایک سیلاب رنگین، ایک طوفان حسن و شباب یعنی ایک عورت، مکمل عورت، تمام ترین خصوصیات نسائی لئے ہوئے دکان کی طرف بڑھتی نظر آتی ہے۔ ایک ایسے غرور و پندار کے ساتھ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ دنیا کی ہر چیز کو وہ اپنی مملوکہ سمجھتی ہے۔ دیوار پر لٹکی ہوئی ساریوں کو آکر دیکھنے لگتی ہے جب تک آگے بڑھوں وہ تیتری کی طرح ادھر ادھر پھر کر ایک آسمانی رنگ کی بنارسی ساری پر اپنا ہاتھ رکھ کر میری طرف دیکھتی ہے یعنی قیمت دریافت کرتی ہے۔ میں بڑھ کر گویا یہ دیکھنے کے لئے کہ کس قیمت کی ساری ہے اس کا کونہ اپنے ہاتھ میں لینا چاہتا ہوں اور عالم سرشاری میں اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیتا ہوں، وہ چونک پڑتی ہے میں معذرت کرتا ہوں۔ "معاف فرمائیے میں نے تو آپ کے ہاتھ کو بھی ساری ہی کا کوئی زرکار بوٹہ سمجھا تھا، وہ سن کر شرما جاتی ہے اور بجائے ساری کے میرے دل کا سودا ہو جاتا ہے"

نیاز کے خطوط میں غالب کا اثر زیادہ نظر آتا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ غالب کے جتنے مقلد ہوئے ہیں ان میں نیاز نے سب سے زیادہ اس انداز کو اپنایا اور پروان چڑھایا ہے۔ وہی بے تکلفی، وہی سادگی اور وہی لطیف مسکراہٹ، نیاز نے اس انداز کو ظاہراً نہیں بلکہ فطری طور پر بھی اور بقول مجنوں ان کی طبیعت میں ایک چلبلا پن ہے اور رومانیت ہے اور یہی چلبلاہٹ اور رومانیت ان کے خطوط کی زینت ہے۔ غالب کے بعد بے تکلفی اور ظرافت کا یہ انداز شاید نیاز کے ہی حصہ کی چیز تھی۔ ملاحظہ ہو ان کا ایک خط جو انہوں نے ایک دوست کو لکھا:

> "یہاں تشریف لائیے اور جب تک میں بیزار نہ ہو جاؤں میرے پاس رہیئے۔ اس کے بعد اگر مجھے عذر ہو تو جو سزا میں تجویز کروں مجھے دیجئے۔ سرسری نظر کیسی، میں تو ایک ایک فقرہ، ایک ایک لفظ پر دشمن کی سی نگاہ ڈالوں گا اور بے دردی سے قطع و برید سے کام لوں گا"

ایک دوسرے صاحب کو یوں خطاب کرتے ہیں:

> "بحمد اللہ میں صحیح و تندرست ہوں اور اسی لئے آپ کی صحت و عافیت کا طالب ہوں ورنہ یوں بیمار پڑ جانے پر تو میں چاہتا ہوں ساری دنیا میری طرح کراہنے لگے"

نیاز سب کچھ بھول سکتے ہیں مگر قدرتی نظارے انہیں اپنی طرف متوجہ کئے بغیر نہیں رہتے۔ وہ تو جیسے شیدائی ہیں حسین نظاروں کے۔ ایک رومانی خط کا انداز ملاحظہ فرمائیے:

"ع۔ رات کس درجہ یاد آئے تم — ہائے ایک پوری رات سکر و بیخودی میں گزر جاتی اور تم مجھ سے دور رہو واقعہ کربلا تو نہیں مگر دہلی کی تباہی کے بعد غالباً یہ دوسرا ظلم اپنی قسم کا تھا جسے قدرت نے روا رکھا۔ اچھا سنو ٹھیک ۱۰ بجے "شمع کافوری" روشن ہوئی۔ "ہاں ہاں وہی ہاتھ بچائیں اگر ہاتھ لگائے نہ

اُف وہ گلابی رنگ کا آنچل یہ معلوم ہوتا تھا کہ چہرے کی روشنی ایک جگہ قائم ہو کر رہ گئی ہے۔ باور کرو کہ معصوم آنکھوں کی معصیاں کاریاں" بالکل بے نقاب تھیں اور میری رُوح لرزاں تھی اس موج بادہ کے ساتھ ساتھ جو آنکھوں کے جام نرگس سے تبسم بن چھلکی پڑ رہی تھی۔ بے حجابی بڑھی، تکلف گھٹا اور ایمن کے پر جلال سروں میں رادھا و کرشن کی وہ کہانی شروع ہو گئی جس نے آج کل "عالم کافری" کو یکسر نغمہ و رنگ بنا رکھا ہے۔ وہ کرشن کا بازو تھام لینا اور پھر کسی کا لجائی ہوئی ادا سے ہٹو چلو، شیام موری بہیاں نا مروڑ کہنا۔ اُف دہائی ہے مُرلی والے کی"

انہوں نے افسانے لکھے، تنقیدی مقالے لکھے، مگر دراصل وہ انشا پرداز ہیں اور یہی وجہ ہے کہ افسانوں اور خطوط میں فن کی پختگی نہیں پائی جاتی تاہم وہ ایک بہترین انشا پرداز کی حیثیت سے ہمیشہ یاد کئے جائیں گے۔

اردو میں افسانے لکھے جاتے ہیں، ناول، تنقید اور ڈرامے بھی لکھے جاتے ہیں، مگر خالص انشا پردازوں کی بہت کمی ہے کیونکہ اس کے لئے تبحر علمی کے ساتھ ساتھ بلند تخیّل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اردو میں بھی نیاز کے رنگ میں لکھنے والوں کی ہمیشہ ضرورت محسوس ہوتی رہے گی۔

* * *

غوازیِ مصر غوازی جمع ہے غازیہ کی۔ مصر میں رقاصہ عورتوں کا ایک مخصوص طبقہ غوازی کہلاتا ہے، جو خانہ بدوشوں کی سی زندگی بسر کرتی تھیں اور اطراف مصر میں اپنا رقص عریاں پیش کر کے کسب معاش کی عادی تھیں۔ ان کی معاشرت نہایت سادہ ہے اور تعلق ازدواج وہ اپنے ہی گروہ میں قائم کرتی ہیں ان کے مرد عام طور سے نوکری اور تجارت وغیرہ میں مصروف رہتے ہیں، اپنی عورتوں کے ساتھ آوارہ نہیں پھرتے۔ غوازیِ مصر میں ہنوز وہی وحشت باقی ہے جو اس سے قبل تھی، یا اب بھی جپسی GIPSY اقوام میں پائی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی اصل نینشا کی قدیم اقوام سے ملتی ہے، رہا یہ امر کہ انہیں غوازی یا غازیہ کیوں کہتے ہیں۔ اس کے متعلق یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا، ممکن ہے کہ خود انھوں نے یا اُن کے شیدائیوں نے حسن تاویل کی بنا پر اُن کا یہ نام رکھ لیا ہو جس طرح ہندوستان میں پیشہ ور عورتوں کو بعض بازاری لوگ گروہ متوکلان سے تعبیر کرتے ہیں۔

اب سے تقریباً ایک صدی قبل غوازیِ مصر عام طور سے سڑکوں پر اپنا رقص دکھایا کرتی تھیں لیکن ۱۸۳۴ء سے قانوناً اُن کا رقص، شدتِ عریانی کی وجہ سے ممنوع ہو گیا ہے کیونکہ اُن کے اُس رقص کی وجہ سے فحش بہت بڑھ چلا تھا۔"

(نیاز)

صنفِ نازک

اور

نیاز فتح پوری

عائشہ خان

نیاز کی تمام تحریریں جو افسانوی یا رومانی ادب سے تعلق رکھتی ہیں صرف ایک ہی مرکزِ خیال سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور وہ مرکز عورت ہے، عورت کے ساتھ مرد کی محبت ایک فطری و انبساطی ضرورت ہے اور کوئی نئی چیز نہیں۔ دُنیا کا کون سا شاعر ایسا ہے جس نے عورت کا ذکر نہ کیا ہو، کون سا افسانہ ایسا ہے جو عورت کے بیان سے خالی ہو۔ دنیا نے اس سے محبت کی، لیکن نیاز نے عورت کو چاہا نہیں بلکہ اس کی پرستش کی اوروں نے اس سے عشق کیا صرف عورت سمجھ کر نیاز نے اس کی پوجا کی اسے دیوی سمجھ کر اور اس باب میں انھوں نے اس قدر غلو سے کام لیا کہ لوگوں کو نفسیاتی نقطۂ نظر سے یہ سمجھنے کا موقع ملگیا کہ یہ سب کچھ جنسی ناآسودگی کا کرشمہ ہے۔ لیکن میں اس معاملہ میں دبی زبان سے بھی کچھ نہیں کہہ سکتی کیونکہ میں ان کی زندگی کے بعض ایسے واقعات سے بھی واقف ہوں جنھیں انتہائی "جراُت رندانہ" کہا جا سکتا ہے، اور جن کا تعلق "جنسی آسودگی" سے تو نہیں مگر ناکردہ گناہوں کی حسرت سے ضرور ہو سکتا ہے۔ نیاز اپنی اس عمر میں بھی جوان ہیں اور غالباً ہمیشہ رہیں گے۔

ان کے سامنے عورت کا وہ تخیل نہیں جو عام طور پر کیا جاتا ہے، بلکہ وہ تصور ہے ایک ایسی Ideal عورت کا جس کا وجود اس دُنیا میں نہیں۔ خود انھوں نے اس کی تعمیر کی، اس کی پرستش کی اور پھر اس کو اپنے ہی لئے مخصوص بھی کر لیا عورت کی تعمیر میں انھوں نے جس اہتمام سے کام لیا ہے اس کا علم ذیل کے فقروں سے ہو سکتا ہے:۔

"اب سے بہت پہلے، کروڑوں برس پہلے، جب تکوینِ عالم کی بالکل ابتدا تھی، مذاقِ آفرینش یا تو پانی کی لہروں سے کھیلتا نظر آتا تھا، یا وادیٔ قاف کی نسرین و نسترن زار میں آسودہ بـــــ خشکی کا حصہ سارے عالم میں صرف اسی قدر تھا، لیکن حالت

یہ تھی کہ سبزہ نہ تھا مگر یاسمین اور چھوٹی سی چھوٹی موجِ آب نہ تھی مگر برگ نیلوفر، سفید اور صرف سفید رنگ میں تمام کائنات ملفوف تھی، گویا نیچر ہنس رہا تھا ــــ ایک شب کا واقعہ ہے، وادیٔ قاف میں سفید پھولوں کی کثرت سے ایک طوفان عریانی بپا تھا، چاند چادرِ سیمیں پھیلا کر اس میں اُتر آنے کی کوشش کر رہا تھا اور چھوٹی چھوٹی موجیں چاندنی میں بس کر رہ گئی تھیں ــ چاند نصف فلک طے کر چکا تھا کہ سطحِ آب کی حرکت یکایک بند ہو گئی۔ نیلوفر کی کلیاں ساحل کی جانب ایک قطار میں آکر قائم ہو گئیں، ہوا بند ہو گئی، اور ایک ایسا سکون پیدا ہو گیا، جیسے یہ مختصر سی دنیا چلتے چلتے اکبارگی کسی چیز کو دیکھ کر حیرت سے ٹھٹک کر رہ گئی ہو ــ دفعتاً ساحل پر پھیلی ہوئی چاندنی پھٹی اور نیلوفر کی ساری کلیاں دفعتاً کھل پڑیں بیشمار چھوٹی چھوٹی مچھلیاں منھ میں ایک ایک صدف دبائے باہر نکل آئیں اور ہنس ایک ایک دانۂ مرجان اپنی چونچ میں لئے ہوئے باہر آ گئے ــــ ساحل پر ایک فرشتہ خاموش کھڑا ہے، وہ چاند کو دیکھتا ہے اور زمردیں قلم ایک ہاتھ میں اور ورقِ زر دوسرے ہاتھ میں لے کر ساحل پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ جاتا ہے وہ کچھ متفکر تھا، کچھ سوچ رہا تھا اور اس ورقِ زر پر کچھ لکھنا چاہتا تھا، کہ دفعتاً وہ چونک پڑا اور اس نے وادی کی طرف منھ کر کے ہاتھ بڑھایا، خوشبو کی موجیں جو اُٹھ رہی تھیں انھوں نے سمٹنا شروع کیا یہاں تک کہ وہ سمٹتے سمٹتے یکجا ہو گئیں اور انھوں نے ایک سپید نورانی شفاف جسم اختیار کر لیا۔ فرشتے نے اُس کو اپنی مٹھی میں لے کر ایسا فشار دیا کہ وہ بے شمار منور ذرّوں میں تبدیل ہو گیا ــــ اس نے اب اُن مچھلیوں کی طرف نگاہ ڈالی، اور بہ یک اشارۂ انگشت جتنی سیپیاں تھیں سب کھل کر رہ گئیں، موتیوں کے شفاف و پاکیزہ دانے نظر آنے لگے اور اس نے ورقِ زر پر لکھ لیا پھر اِک نگاہِ گرم سے ان موتیوں کی طرف دیکھا۔ اب وہ ایک سیال شے بن گئے، فرشتے نے یہ رقیق مادہ اُن ذرّوں پر چھڑک دیا، لیکن اسی کے ساتھ وہ نیلوفر کی نرم و نازک پتیوں کو بھی دیکھتا جاتا تھا اور اُن دانہائے مرجاں کو بھی جو ہنس لئے کھڑے تھے، رفتہ رفتہ پنکھڑیاں سخت و سنگین ہو گئیں اور مرجاں سپید یعنی اس نے پتیوں کا لوچ لے لیا اور مرجاں کا رنگ اور اسی خاک میں انھیں بھی ملا دیا، ہنس چلے گئے مچھلیاں غائب ہو گئیں اور نیلوفر کی کلیاں سطحِ آب میں غرق۔ اب ادھر وادیٔ قاف خالی پڑی تھی اور ادھر ورقِ آب سادہ کامل ۱۴-۱۵ گھنٹوں کی لگا تار محنت کے بعد اس خاک میں خمیر پیدا ہوا تو فرشتہ نے اپنی انگلی کے اشارہ سے اپنے اس خمیر کے گرد ایک حصار کھینچ لیا اور نظروں سے غائب ہو گیا۔ ایک دن، دو دن۔ ایک مہینہ دو مہینے، سال، دو سال، یہاں تک کہ برسوں ہو گئے اور وہ فرشتہ اسی پردۂ حصار میں غائب رہا ایک شب وہی ساعت تھی، جب نگاہوں سے وہ غائب ہوا تھا پورے پندرہ سال ہو چکے تھے، چاند کی وہی درخشانی اور پانی کی وہی روانی تھی کہ یکایک وہ سنگین حصار پگھل کر بہ گیا، فرشتہ خوشی سے اچھل پڑا، اس نے عدن میں سنا تھا کہ جب پتھر پانی ہو جائے گا، اس وقت اُس کام کی تکمیل کا وقت آئے گا ــ ایک حسین و جمیل کالبد بےحس و حرکت پڑا ہوا تھا، فرش خاک کا ہر ذرہ، سطحِ آب کا ہر ہر قطرہ، چاند کے دریائے نور کی ہر ہر موج اس جسدِ بیجان کی طرف کھنچی چلی آتی تھی اور فرشتہ اپنے بازوؤں کی ہوا اور ہاتھ کی حرکت سے ہٹاتا جاتا تھا۔ اگرچہ اس کا کام ایک حد تک پورا ہو چکا تھا، تاہم اس تعطرِ نور، رنگ اور لوچ سے بنائی ہوئی صورت میں ہنوز ایک ایسی یکسانی تھی، جس کو وہ دور کرنا چاہتا تھا۔ وہ خاموش تھا، اور غور سے چاند کو دیکھ رہا تھا کہ دفعتاً اس نے فوراً چاندنی کی طرف ہاتھ کے ایک جھٹکے سے ایسا اشارہ کیا کہ وہ ہر جگہ سے مسک کر تار تار ہو گئی تمام فضا میں باریک باریک، شعاعیں الگ الگ ہو کر رہ گئیں فرشتہ اس منظر سے بہت دیر تک متاثر رہا۔ اس کے بعد اس نے اپنی انگلیاں ان شعاعوں کی طرف بڑھا کر آہستہ آہستہ مٹھی بند کرنا شروع کی، یہاں تک کہ جب وقت اس کی ہتھیلی سے اس کی انگلیاں مل گئیں تو تمام عالم میں اندھیرا سا چھا گیا (روشنی اس نے مٹھی میں کھینچ کر بند کر لی تھی) اور شعاعیں سیاہ چمکدار ریشم کے لچھوں میں تبدیل ہو گئیں

فرشتہ نے فوراً وہ ساری چمک جو اس کی مٹھی میں بند تھی، اس کالبد کی آنکھوں میں منتقل کردی اور ان ریشمی کرنوں کو خم دے کر شانہ و دوش پر چھوڑ دیا۔ ابھی اس سے فارغ بھی نہ ہوا تھا کہ دفعتہً ایک آواز پیدا ہوئی آسمان پھٹ گیا، پانی خشک ہوگیا اور زمین بخار بن کر غائب۔ فرشتہ بیہوش تھا اور اس کالبد کے آگے ملائکہ سر جھکائے کھڑے تھے، حوریں ایک مودب حلقہ میں اسے لئے تھیں اور عدن کا ہر طائر ترانہ ہائے مسرت سنانے میں مصروف تھا ____ پھر اے عورت تجھے اپنی آفرینش کا حال نہیں معلوم، مگر میں جانتا ہوں تیرے خمیر میں کتنی خوشبوئیں کتنی رنگینیاں، کتنی نزاکتیں شامل ہیں۔ تجھے خبر نہیں، مگر مجھے معلوم ہے کہ تیرے تبسم میں کیوں ایک پُر گہر صدف کے کھلنے کا انداز پایا جاتا ہے، تجھے اُس وقت ہوش نہ تھا، مگر ہم دیکھ رہے تھے جب تیری انکھڑیوں میں سارے جہاں کی چمک منتقل کی جا رہی تھی، تو غافل تھی مگر ہم تیری ہی طرف کھنچے جا رہے تھے، جب تیری اس بلوریں گردن پر گیسو چھوڑے جا رہے تھے، تیری عصمت میں ایک صامئیت ہے، کیوں یہ اُس فرشتہ سے پوچھ جس نے کامل پندرہ سال تک بے آب و دانہ رہ کر تیری تعمیر کی تجھ میں حیا ہے، تو اپنے جسم کو سمیٹ کر ہم سے الگ ہو جانے پر مجبور ہو جاتی ہے، کیوں یہ اُس خلوت کا نتیجہ ہے جو برسوں ایک حصار رنگین کے لئے تجھے لئے رہی ____ ہم کیوں تیری ایک اک شب کے لئے سارا مایۂ حیات دیدینے پر راضی ہو جاتے ہیں، اس لئے کہ تو رات ہی کو پیدا ہوئی اور حقیقت یہ ہے کہ وہ رات بے کیف و بے روح ہے جس میں تو نہ جگمگا رہی ہو!"

آپ نے دیکھا نیاز کا تخیل عورت کے متعلق! میں سمجھتی ہوں کہ اس سے زیادہ "ETHERIAL" (سماوی) اس سے زیادہ "ARTISTICA" (نقاشانہ) اس سے زیادہ "ETHETICAL" (جمالیاتی) اور POETICAL (شاعرانہ) اور کیا ہو سکتا ہے۔ اگر نیاز ادیب نہ ہوتے تو بہت بڑے نقاش ہوتے، حالانکہ ان کا ادب بجائے خود بڑی حسین نقاشی ہے۔

سنہ ۱۹۱۵ء سے لے کر سنہ ۱۹۲۵ء تک کا زمانہ نیاز کے شباب کا تھا اور اس دوران میں انھوں نے جو کچھ لکھا وہ زیادہ تر "عورت" ہی کی دُنیا سے متعلق ہے اور اس موضوع پر انھوں نے اتنا کچھ لکھا کہ اگر جذبات کے لحاظ سے اس کی تقسیم کی جائے تو Subjective اور objective دونوں حیثیتوں سے اس کی بہت سی تقسیمیں ہو سکتی ہیں

اس زمانہ کا سب سے زیادہ طویل فسانہ "کیوپڈ و سائکی" ہے جو انھوں نے دہلی کے دورانِ قیام میں لکھا اور جس کی اشاعت نے دُنیائے ادب میں ہل چل ڈالدی تھی، اس میں انھوں نے عورت اور اس کے جذبات کا تجزیہ جس شاعرانہ تکمیل کے ساتھ کیا ہے وہ آپ اپنی مثال ہے۔

بعض اقتباسات ملاحظہ ہوں:-

(۱) لیکن جب رات کو شاہی باغ کے کنجوں میں گھڑی گھڑی بجلی کی سی چمک نمودار ہو ہو کر غائب ہو جاتی تو سارے شہر کو معلوم ہو جاتا کہ آج سائکی باغ میں نقاب اُلٹ اُلٹ کر پھول توڑ رہی ہے۔"

منظر نگاری ہو تجزیۂ جذبات بڑی نازک چیز ہے، ایک خاص تدریجی آہنگ چاہتا ہے اور اس سلسلہ میں ایک انشا پرداز کا کمال یہ ہے کہ جب وہ climax تک پہونچے تو صرف ایک فقرہ پر ختم کر کے دماغ میں سناٹا پیدا کردے۔

چند مثالیں ملاحظہ ہوں

(۲) اس نے چاندنی میں ایک جمائی لی اور پھر انگڑائی لیتی ہوئی وہیں لیٹ گئی، وہ اب سونا چاہتی تھی، یعنی اس کی شرابی آنکھیں جو یوں بھی ہمیشہ نیم خواب ہی رہتی ہیں اب بالکل سو جانا چاہتی تھیں، ساری فضا سو رہی تھی، آسمان و زمین سو رہے

تھے، وہ شاہراہ زریں جس پر چاند کی شعاعیں چڑھ اتر رہی تھیں، سو رہی تھی، مگر سکوت خواب تو اس خوش نصیب کنج کا تھا جو بیہوش سائکی کو اپنے آغوش میں لئے سو رہا تھا ـــــ آہ! اس حالت کو نیچر گھنٹوں تک دیکھتا رہا!"

۳۔ پھول اگر اپنی نکہت سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، اگر کلی اپنی رعنائی پر خود فریفتہ ہو سکتی ہے تو ہزار دفعہ وہی ہوگا، جو ابھی گائی، ورنہ اپنے بربط کے تار توڑ ڈال، طربیں اتار دے، نغموں کو بھول جا، اور اپنا ساز کسی کو نہ جھنبک کر آ، اور میرے ساتھ کراہ۔"

وینس، کیوپڈ کو سائکی کے پاس بھیجتی ہے تاکہ اس کے دل کو تیر سے زخمی کر کے اپنی محبّت میں مبتلا کر دے۔ اور وہ اپنا تیر و کمان لے کر چل دیتا ہے، لیکن جس وقت وہ سائکی کے باغ میں پہونچا تو:۔

۴۔ سیاہ ریشمی چادر جو اس کی کمر سے لپٹی ہوئی سر تک پہونچ گئی تھی، ڈھلک گئی، شانے کھل گئے، سینہ و گردن عریاں ہو گئے، سیاہ ریشمی بال پیٹھ پر منتشر ہو گئے، ابرو میں تن گئیں، آنکھیں چڑھ گئیں، ٹھیک یہی وقت تھا اور یہی عالم کہ کیوپڈ اپنا تیر و کمان سنبھالے کنجوں سے نکلا اور اس ارادہ سے نکلا کہ آج اپنا ترکش سائکی پر خالی کر دے گا، لیکن نشانہ کو پیش نظر رکھنے کے لئے کیوپڈ نے سائکی کو نگاہ بھر کے دیکھا ہی تھا کہ تیر چٹکی سے چھوٹ گیا، کمان ہاتھ سے گر پڑی، چلہ اتر گیا اور کیوپڈ غش کھا کر زمین پر گر پڑا۔

آہ، کاش کوئی سائکی سے اس وقت جا کر کہہ دیتا کہ جس محبت کی اس کو جستجو تھی وہ خود اس کی آرزومند ہے، جس عشق کی اسے تمنا تھی وہ اب خود اس کا تمنائی ہے۔ صیاد خود اس کا مجروح ہے، عشق خود اس کا دیوانہ ہے اور تیر آپ اس کی نگاہ کا زخمی"

اس پر نیاز کا خطاب کیوپڈ سے ملاحظہ ہو:۔

۵۔ جا تیرا تیر، اب صرف شہپر ہے بازو سے جدا، تیری کمان صرف ایک خمیازہ ہے بے مزہ جو کچھ ہونا تھا ہو گیا، فرشتوں نے صحائف میں لکھ لیا، حوروں نے اپنے کانوں میں سن لیا کہ وینس کا بیٹا آج سائکی کے باغ میں بے ہوش پڑا ہے۔"

کیوپڈ جب ناکام جاتا ہے تو اپنی ماں وینس سے ان الفاظ میں معذرت کرتا ہے:۔

۶۔ اے وینس مجھے ملامت نہ کر کیونکہ سائکی تیر اندازی میں مجھ سے زیادہ مشاق نکلی اور مجھ پر افسوس بھی نہ کر کیونکہ ساری عمر میں آج ہی تو معلوم ہوا ہے کہ تیر چلانے سے تیر کھانے میں زیادہ مزہ ہے۔"

نمبر ۴۔ ۵۔ ۶ کے آخری فقروں کو پڑھئے اور ان کے زوردار Climax کو ملاحظہ کیجئے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی چیز دماغ میں گونج کر رہ گئی ہے اور سر پکڑ کر بیٹھ جانے کو جی چاہتا ہے

عورت کے متعلق نیاز کے جذبات کی بلندی ... اس وقت انتہائی عروج پر پہونچ جاتی ہے جب وہ اخلاقی تصورات کو بھی اس میں شامل کر دیتے ہیں، لیکن عجیب تر بات یہ ہے کہ جب وہ حسن و اخلاق دونوں کو ایک ساتھ ملا دیتے ہیں تو پھر ان کی نقاشی ایک فلسفہ ہو کر رہ جاتی ہے، اور عورت کی عظمت کا تصور بالکل نئے زاوئے سے ہمارے سامنے آتا ہے۔

نیاز کو بلند شاعرانہ تعبیرات اور جذبات کے visualize کرنے میں غیر معمولی قدرت حاصل ہے۔ اس کی ایک بڑی پاکیزہ مثال ہم کو اس مضمون میں ملتی ہے جو ایک رقاصہ کو دیکھ کر انھوں نے لکھا ہے:۔

جب تو اپنے سانچے میں ڈھلی ہوئی کشیدہ قامتی اور اپنی قد آدم رعنائی کو لے کر محفل میں کھڑی ہو جاتی ہے تو میں چاہتا ہوں کہ اس فتنۂ سرکش، اس سحر خوش قامت، اس قامتِ بلند بالا کو نہ دیکھوں، مگر دیکھتا ہوں اور کانپتا ہوں، جب تو اپنی

آواز میں نرمی و بیچارگی، پیدا کر کے اپنے نغمہ کو میرے دل کی سب سے پنہاں رگ میں ڈبوتی جاتی ہے تو میں چاہتا ہوں کہ اس صدائے بے پناہ کی طرف سے اپنے کان بند کر لوں، لیکن ایسا نہیں کر سکتا، سنتا ہوں اور مٹتا ہوں —— جب تو گردن میں ذرا خم دے کر ایک خاص ادائے حجاب سے اپنے چہرے پر صرف آدھا گھونگھٹ کر لیتی ہے، اس حال میں کہ گھونگھٹ کے کنارے کو تیرے نازک ہاتھ کی صرف دو حنائی انگلیاں تانے رکھتی ہیں تو میں چاہتا ہوں کہ اس پردۂ عریاں سے اپنی جان بچا کر کہیں نکل جاؤں لیکن نہیں نکل سکتا دیکھتا ہوں اور تباہ ہوتا ہوں، جب تو اپنی نازک کمر میں ہلکی ہلکی لہریں پیدا کر کے فرش پر تیرتی ہوئی سی چلتی معلوم ہوتی ہے تو میں کوشش کرتا ہوں کہ تجھے نہ دیکھوں، مگر دیکھتا ہوں اور تیرے جسم کی ہر جنبش پر مٹتا جاتا ہوں —— جس وقت تو اپنا زیر نقاب چہرہ ایک طرف موڑ کر، اپنے ایک ہاتھ کو پورا خم دیتی ہوئی چھوٹی انگلی کے ارتعاش سے اپنی کمر کی لرزش کو چھوتی ہے اور دوسرے ہاتھ کو پلٹ کر سر پر رکھ لیتی ہے تو میں تیری طرف سے اپنی نگاہیں پھیر لینا چاہتا ہوں لیکن نہیں پھیر سکتا —— جس وقت تو سروقد کھڑی ہو کر اپنی نازک لانبی، پتلی انگلیوں کو باہر کی طرف خم دے کر صرف ہتھیلیوں کے تصادم سے تالیاں بجاتی ہے، اور متواتر لرزش کے ساتھ ساز کی طرف ایک اُچٹتی ہوئی نگاہ ڈال کر اپنا رقصِ نغمہ ریز شروع کرتی ہے، تو میں اپنی نگاہیں نیچی کر لینا چاہتا ہوں مگر نہیں کر سکتا، دیکھتا ہوں اور تڑپتا ہوں —— جس وقت تو اپنے . . . . ایک حنائی پاؤں کو زمین پر قائم رکھ کر اور دوسرے پاؤں کی ایڑی اٹھا کر، صرف پنجہ کی ہلکی ہلکی ٹھوکر سے گھونگروں کی آواز کو ساز کے تال وسم کے ساتھ ملا کر ہوا میں منتشر کر دیتی ہے، تو میں اس منظر سے جان بچا کر کسی طرف نکل جانا چاہتا ہوں مگر نہیں نکل سکتا —— پھر —— اگر میں تیرے رقص سے جس کو میں خرامِ نغمہ یا نغمۂ خراماں کہہ سکتا ہوں، کانپتا ہوں، ڈرتا ہوں، تو مجھے معذور جان کہ واقعی میں اس کی تاب نہیں لاسکتا —— تو تو صرف گا، مگر رقص نہ کر، ہر چند تیرا نغمہ بھی ہلاک کرنے کے لئے کافی ہے، لیکن جب تو آمادۂ رقص ہوتی ہے اور ساز کے تال وسم کے ساتھ تیری بوٹی بوٹی پھڑکنے لگتی ہے تو بے اختیار یہ جی چاہنے لگتا ہے کہ میں بھی تیرے ساتھ رقص کرنے لگوں —— جب تو اپنے چُرائے ہوئے بدن، کھنچی ہوئی گردن، بل کھاتی ہوئی کمر کے ساتھ رقص کرتی ہے، اس وقت وہ ساری شرارتیں اور جسارتیں مجھ میں عود کر آتی ہیں جن سے میرے شباب کی ترکیب ہوئی ہے اور تیری نزاکت کی طرف سے اپنے اندر ایک سخت خیالِ دشمنی پاتا ہوں اور یہ چاہتا ہوں کہ تیرے بازو کے ہر بل، تیری کلائی کی ہر جنبش، تیری کلائی کی ہر لچک اور تیرے جسم کا تمام توڑ مروڑ صرف اپنے لئے مخصوص کر لوں مگر ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ تو ہر ایک کو ایسا کرنے کی اجازت دے سکتی ہے اور یہی مجھے پسند نہیں —— اپنی آنکھوں کی وہ شراب جو ابھی تیری لانبی پلکوں سے ٹپک رہی ہے —— یہ تیرے دن صبح کی پھوٹ نکلنے والی سُرخی، وہ تیرے گورے گالوں میں بھرا ہوا رنگ شباب جس کو میں بلور شعلہ رنگ یا شعلۂ بلوریں کہہ سکتا ہوں اور وہ پھر وہ تیرے سینہ پر دہرائے ہوئے آنچل کے پلّو کا چہرہ تک پہونچ جانا اور وہاں اس کی زریں باریک جھالر کا دمکتے ہوئے چہرہ پر برقی روشنی میں جھل مل ہونا اس میں ایک روشن تھرتھری پیدا ہونا . . . . ، آہ کیا قیامت ہے کہ تو ان چیزوں کے سامنے مجھ سے میرے ایمان، میرے صبر و تقویٰ، میری متانت و سنجیدگی کی قیمت پوچھتی ہے، تجھے کیا خبر کہ اس وقت میں انھیں کس قدر ارزاں دیدینے کے لئے بے تاب ہو جاتا ہوں —— دیکھ تیری دو حیثیتیں ہیں ایک صرف عورت ہونے کی اور دوسری رقاصہ و مغنیہ ہونے کی اور ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا رکھ، تو صرف اس لئے نغمہ و رقص کو اختیار نہ کر کہ تو عورت ہے، تو صرف اس لحاظ سے اس فن کی نمائش نہ کر کہ تیری نسائیت میں اس سے زیادہ دلکشی و دلربائی پیدا ہو جاتی ہے، بلکہ تو گا، محض گانے کے لئے، رقص کر صرف رقص کی غرض سے جس وقت تو حالتِ رقص میں ہوتی ہے تو میں یہ آرزو اپنے دل میں پاتا ہوں، کہ کاش تو اس وقت اسی حیثیت سے میری آغوش میں آسکتی اور شاید تو آجائے، اگر میں

چاہوں مگر مجھے یہ پسند نہیں آتا کہ تو اس حیثیت سے اس قدر آسانی سے مل جائے —— تو خواہ کتنی ہی عصمت فروش ہو لیکن اپنے فن کی معصومیت کو مجروح نہ کر تو اس کے ذریعہ سے اپنے بازارِ حسن کو رونق نہ دے تو خوبصورت ہے، تیرے اعضا میں تناسب ہے جسم میں کشیدگی ہے۔ آنکھوں میں سحر ہے، چتون میں افسوں ہے اور پھر سب سے بڑھ کر یہ ابھی تیری نئی جوانی ہے انھیں سے کسی کو پناہ نہیں مل سکتی —— وہ تیرا لحنِ گلوسوز، وہ ساز میں ڈوبی ہوئی آواز، ایسی ڈوبی ہوئی کہ یہ معلوم ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ تیری آواز صدائے ساز ہے یا صدائے ساز تیری آواز، ہنگامِ رقص وہ تیری شوخ و متحرک چتونیں جن کے نظامِ حرکت سے اصولِ ریاضی منضبط ہو سکتے ہیں، وہ پھڑکنے والی ابروئیں جن کی نازک لرزش پر ایک مصور کا قلم رشک کر سکتا ہے، وہ آنکھیں جن کی گہرائی میں سمندر کا عمق ڈوب سکتا ہے، وہ نگاہیں جن کے بسط میں فضا کی وسعت گم ہو سکتی ہے، وہ کمر کا لوچ جو دُنیا کو رعشہ براندام کر سکتا ہے، وہ گردن کی جنبش جو دُنیا کی نیندوں میں تھرتھری پیدا کر سکتی ہے وہ نصف سر پر ترچھا آنچل رکھ کر ایک خاص انداز سے اپنے ہاتھ کی چھوٹی انگلی کی نوک ٹھوڑی پر رکھ کر کھڑا ہو جانا جو ساری دُنیا میں تیری حکومت کرا سکتا ہے —— اگر کہیں تو یہ سمجھ جائے کہ دُنیا میں تو صرف اس لئے آئی ہے کہ دلوں میں جذبات پیدا کرے اور الگ ہو جائے۔ دلوں میں حوصلے، سینوں میں اُمنگیں پیدا کرے اور ہٹ جائے، دماغوں میں جستجوئیں ہستیوں میں بے تابیاں پھیلائے اور علٰحدہ ہو جائے تو خدا جانے تو کیا ہو جائے —— تیرے لئے تسکین خواہشات فرض نہیں، میں تیری قدر صرف اس وقت تک کر سکتا ہوں جب تک تو میرے لئے صرف ایک خلش ہے، لیکن یہ جاننے کے بعد کہ تجھ سے خلش دور بھی ہو سکتی ہے، میں اپنے اندر اضمحلال پیدا ہوتے ہوئے محسوس کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ اب میں دنیا میں کچھ نہیں کر سکتا —— الغرض تو جو چاہے کر، جو چاہے بن، مگر وہ آزاد و رمیدہ آغوش سے دور، معانقہ سے الگ، اور پھر مجھ سے پوچھ کہ تو کیا ہے؟

نیاز کے عہدِ رنگین کے بعض واقعات جو میرے علم میں ہیں، ان کی تفصیل غالباً مناسب نہ ہو۔ لیکن ایک خاص واقعہ جس کا ذکر خود انھوں نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے، اس کا حوالہ شاید نامناسب نہ ہو۔

ان کے شباب کے دو مہینے جو انھوں نے نمائش الہ آباد ۱۹۰۹ء میں صرف کئے ایک مستقل رومان تھے۔ انھیں میں سے ایک خاص واقعہ کا ذکر ان کی زبان سے سنئے:۔

> میں دوکان کے سامنے بیٹھا ہوں کہ ناگہاں ایک تلاطم نور، ایک سیلاب رنگینی، ایک طوفان حسن و شباب یعنی ایک "پارسی دوشیزہ دوکان کی طرف بڑھتی نظر آتی ہے اور ایک ایسے غرور و پندار کے ساتھ گویا وہ دُنیا کی ہر چیز کو اپنی ملکیت سمجھتی ہے، دیوار پر لٹکی ہوئی ساریوں کو آکر دیکھنے لگتی ہے، جب تک میں آگے بڑھوں وہ تیتری کی طرح اِدھر اُدھر کا چکر لگا کر، ایک آسمانی رنگ کی بنارسی ساری پر اپنا ہاتھ رکھ کر میری طرف دیکھتی ہے، یعنی قیمت دریافت کرتی ہے میں آگے بڑھ کر گویا یہ دیکھنے کے لئے کہ قیمت کیا ہے، ساری کا کونہ ہاتھ میں لینا چاہتا ہوں لیکن بالکل بے اختیارانہ اس کے ہاتھ پر ہاتھ پڑ جاتا ہے، وہ چونک پڑتی ہے میں معذرت کرتا ہوں کہ "معاف فرمائیے میں نے تو آپ کے ہاتھ کو بھی ساری ہی کا زر کار بوٹہ سمجھا تھا۔"

نیاز ایک خانہ بدوش قافلہ کی لڑکی کو دیکھتے ہیں۔۔۔ اور اس کے وحشیانہ لیکن فطری حسن کو دیکھ کر جذبات کا ایک ناقابلِ ضبط ہیجان ان کے اندر پیدا ہوتا ہے اور وہ اس قافلہ کے ساتھ رہ پڑنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اس کا ذکر انھوں نے اپنے ایک مضمون میں بڑے والہانہ انداز سے کیا ہے۔ آخر کے چند جملے ملاحظہ ہوں:

> "تو اے فرزندانِ صحرا، کیا تم مجھے اپنے ساتھ رہنے کی اجازت دو گے، کیا مجھے اس شبام رنگ لڑکی سے جو اپنی خوبصورت

آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی ہے، دو باتیں کرنے کی اجازت دو گے —— لیکن اگر تم اس پر راضی نہیں تو اس سے کہہ دو کہ مجھے نہ دیکھے اپنی جادو کرنے والی نگاہیں میری طرف سے ہٹا لے۔ میرے پاؤں تھرتھرا رہے ہیں۔ میرا بدن کانپ رہا ہے میں اس کی طرف کھنچا جا رہا ہوں، اور وہ مجھے کھینچ لے گی۔"

نیازؔ کا قیام اجے گڑھ میں ہے سنہ ء کی بات ہے۔ یہاں بھی دُنیائے رنگ و بو اور فضائے حُسن و محبّت میں جس طرح انھوں نے زندگی بسر کی اس کا اندازہ ان کے ایک خط سے ہو سکتا ہے جو اس زمانہ میں اپنے ایک دوست کو لکھا تھا:۔

" ایک بات اور ہے —— کان میں کہنے کی تھی مگر خیر سُن لو۔ حسرتؔ کو بنارس میں ہر ہر برہمن بچہ " لچھمن و رام " نظر آتا تھا لیکن یہاں ہر ہر قدم پر " سیتا و رادھا " کا سامنا ہے اور اس اہتمام کے ساتھ کہ

بے پردگی دیوانۂ طرحِ نقاب افگندنش

راجپوتوں کی لڑکیاں ہیں۔ بلند بالا۔ صحیح و توانا۔ تیوریاں چڑھی ہوئی۔ گردنیں تنی ہوئی۔ آنکھوں میں تیر۔ مانگوں میں عبیر۔ ابروؤں میں خنجر۔ بالوں میں عنبر۔ ہاتھوں میں مہندی۔ ماتھے پر بندی۔ کیا پوچھتے ہو کیا عالم ہے۔

یہاں کی رومان آفریں فضا پر نیازؔ کے ایک اور خط سے خاص روشنی پڑتی ہے جو اجے گڈھ چھوڑنے کے بعد انھوں نے کسی کو لکھا تھا۔

جانِ نیازؔ! —— قاصد پہنچا اور دفعتاً آپ کا باندہ چلا آنا معلوم ہوا —— اتنی بڑی قربانی اور میرے لئے اللہ، اللہ۔

دلے دارم خراب از التفاتِ چشم بیمارت
ہمہ از جور می ترسند و من از لطف بسیارت

میری مجبوریاں آپ سے مخفی نہیں۔ اس لئے اب آپ ہی بتایئے کہ کیا کر سکتا ہوں، یہ تو ہو سکتا ہے کہ میں وہاں آ کر آپ پر سے قربان ہو جاؤں لیکن اجے گڈھ واپس جانا مناسب نہیں۔ اگر آپ کا وہاں سے چلا آنا بغیر اجازت کے ہوا ہے تو بھی واپسی میں حرج نہیں، زیادہ سے زیادہ دو چار اشکِ ندامت کافی ہوں گے اور اجازت حاصل کر لی گئی ہے تو پھر کوئی جھگڑا ہی نہیں، اول تو مجھے یقین نہیں کہ وہ آپ سے اس قدر خفا ہیں اور اگر ہوں بھی تو راضی کر لینا آپ کے لئے چنداں مشکل نہیں۔ بپھر کر، بگڑ کر نہ سہی، آنسو بہا کر سہی۔

یہیں کے ایک اور واقعہ کا ذکر ایک دوسرے خط میں اس طرح کرتے ہیں:۔

ظالم!۔ اب کیا پوچھتے ہو کہ یہ سب کیونکر ہوا —— شام کا وقت ہے ہلکی ہلکی خنک ہوا چل رہی ہے محل کے پائیں باغ میں، میں روشوں پر ٹہل رہا ہوں، طلبی کا انتظار ہے —— دفعتاً سامنے مجسمۂ حسن و رعنائی نظر آتا ہے —— ٹھیک اسی وقت چوبدار آتا ہے اور میں اندر چلا جاتا ہوں، لیکن یہ دو چیزیں اپنے ساتھ لے جاتا ہوں، ہلکے سانولے رنگ میں شفق کا انعکاس اور طاؤس کی سی مستی رفتار۔

اے جمالِ تو بتاراجِ نظرہا گستاخ
اے خرامِ تو بہ پامالی سرہا گستاخ

بسنت کی صبح ہے، دربار میں رسم گلبازی کی طیاریاں ہو رہی ہیں گلاب اور گیندے کے سرخ و زرد پھولوں سے انگنی معمور ہیں، مہاراج برآمد ہوتے ہیں اور بہار کی راگنی کے ساتھ ہی یہ رسم شروع ہو جاتی ہے۔ تم کبھی آؤ گے تو دکھاؤں گا کہ اس پھول کی پنکھڑی اب تک میرے پاس محفوظ ہے جو میرے سینہ پر پڑا اور ہمیشہ کے لئے ایک زخم چھوڑ گیا۔

بالکل اسی طرح کا ایک واقعہ مسوری کا بھی ہے۔ لکھتے ہیں:-

سنئے، ٹھیک دوپہر کو راج پورہ سے ٹیلیفون آتا ہے۔ میں یہاں پہونچ گئی ہوں۔ لنچ کے بعد چلوں گی۔ یہ وہ خبر تھی جس کے سننے کا دل ازل سے منتظر تھا۔ ۴ بجے کا وقت ہے گہرا ابر محیط ہے۔ پہاڑی کی خنک ہوائیں جسم میں سردی لیکن دل و دماغ میں شراب کی سی گرمی پیدا کر رہی ہیں کہ دفعتاً بنگلہ سے باہر (ونڈاسٹریم میں میرا قیام تھا) چہل پہل سی معلوم ہوتی ہے اور میں باہر نکلتا ہوں ـــــ معلوم نہیں غالبؔ کا "نگار آتشیں رخ سر کھلا" کیا تھا یہاں تو ایک سمٹی ہوئی روشنی تھی پیکر انسانی میں، ایک قید کی ہوئی بجلی تھی عالمِ آب و گل میں۔ آنکھیں یکسر سحر بابل، لب "ہمہ خونِ صد میخانہ" اور اب یہ نہ پوچھئے کہ سِن کیا تھا بس یوں سمجھئے کہ جوانی کانٹے پر تل رہی تھی، پھر غور کیجئے کہ جس شخص کو ایک دن نہیں مسلسل چار مہینے اس شعلۂ جوالہ، اس برق بے پناہ کی معیت حاصل ہو رہی ہو وہ زندہ کیوں کر رہ سکا۔

نیازؔ نے عورت کو خدا جانے کس کس حال میں دیکھا، کن کن زاویوں سے اس کا مطالعہ کیا اور کیا کیا جذبات ان کے دل میں پیدا ہوئے اس کا صحیح اندازہ ان کے ادبی مضامین پڑھنے کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ جن کے ایک ایک لفظ میں عورت سانس لے رہی ہے۔

حسن و عشق کے موضوع پر ان کے چند Aphorisms ملاحظہ ہوں:-

عورت ایک لذت ہے مجسم۔ ایک سحر ہے مرئی۔ ایک نور ہے مادی۔

عورت ایک روشنی ہے جسے ہم چھو سکتے ہیں، ایک نکہت ہے جس سے ہم گفتگو کر سکتے ہیں۔ وہ ایک شیرینی ہے جو ہاتھوں سے چکھی جاتی ہے، ایک موسیقی ہے جو آنکھوں سے سنی جاتی ہے۔

اگر عورت کو خود مرد سنگدل بنا دے تو پھر اس کی تلافی جان دینے سے بھی نہیں ہو سکتی۔

جب عورت کسی مرد کے اندر جذبات عشق کی شدت محسوس کرتی ہے تو اس کا پندار خدا کا سا پندار ہو جاتا ہے۔

محبت ایک قسم کی نکہت ہے جو روح کی شگفتگی سے پیدا ہوتی ہے۔

عورت کی تنہائی ایک راز ہے جس کو مرد نے ہمیشہ سمجھنا چاہا اور کبھی نہیں سمجھ سکا۔

نیاز کی ادبی زندگی جیسا کہ میں پہلے ظاہر کر چکی ہوں۔ بڑی حد تک ان کی رومانی زندگی کا منطقی نتیجہ تھی جس کو انھوں نے کبھی نہیں چھپایا، اور میں نیاز کو سب سے بڑا ادیب اس لئے سمجھتی ہوں کہ انھوں نے کبھی "نمائش تقدس" سے کام نہیں لیا، انھوں نے محبت کھلم کھلا کی، اور کبھی اس پر تصوف و افلاطونیت کا پردہ نہیں ڈالا۔

پھر ہو سکتا ہے کہ کسی وقت کوئی مولوی منش سوانح نگار اس چیز کو سامنے رکھ کر ان کو بد اطوار انسان قرار دے، لیکن میں سمجھتی ہوں کہ نیاز کی عظمت کا راز محض ان کی صداقت ہے۔ یعنی ان کی زبان پر وہی آتا ہے جو ان کے دل میں ہوتا ہے یہاں تک کہ ان کی بے باکی صرف "حسن و عشق" ہی کی دنیا تک محدود نہیں ہے بلکہ مذہب تک بھی پہونچی ہوئی ہے اور اتنی شدت کے ساتھ کہ ایک مولوی کی زبان میں اس کا نام صرف "ارتداد و الحاد" ہے۔ اور نیاز کی یہ فطری خصوصیت سعدی کے اس شعر کی مصداق ہے کہ

3 JUL 1963

ہیچ کس بے دامنِ تر نیست اما پیشِ خلق بعض می پوشند و ما در آفتاب افگندہ ایم

ان کے مکاتیب دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی خط و کتابت متعدد عورتوں سے رہی ہے جن میں سے بعض کا علم مجھے بھی ہے ان میں ایک خاتون رام پور کی تھیں، جن کو نیاز صاحب نے کبھی نہیں دیکھا، لیکن وہ خود ان کے حالات سے بہت واقف تھیں ان محترمہ نے مذہب، سیاست، شعر و سخن وغیرہ مختلف مسائل پر خط و کتابت کی لیکن بعض خطوط ایسے بھی تھے جو صرف جذبات سے تعلق رکھتے تھے اور ان کا جواب بھی نیاز نے اسی رنگ میں دیا (افسوس ہے کہ یہ خاتون اب اس دنیا میں موجود نہیں)

> محترمہ، ہر چند، آشنا گاہے، گہے نا آشنا، والی ادا مجھے پسند نہیں، لیکن یہ واقعہ ہے کہ آپ کا کبھی کبھی یاد کر لینا بھی "جلوۂ برق شراب گاہ گاہی" سے کم نہیں، مہینوں اُس طرف کی بات ہے جب آپ کی آخری تحریر رامپور سے وصول ہوئی تھی اور ہر چند اس میں کافی برہمی کا اظہار کیا گیا تھا، لیکن چونکہ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی، میں بھی حسب عادت ایک آہ سرد بھر کر خاموش ہو رہا اس وقت اس نزاع کو تازہ کرنا مناسب نہیں کہ آپ نے ہمیشہ میری اس معذرت خاموش کو "خودسری" پر محمول کیا اور میں نے بے کسی و بیچارگی پر، اب آپ نے پھر "ساحل اپالو" سے مجھے توخیال آیا کہ اس داستان کا گزشتہ باب شاید اس سین پر ختم ہوا تھا!
>
> زلفِ برہم نشارِ مستیِ چشم
>
> اچھا یہ تو بتائیے کہ اب کیا ارادہ ہے، وہی ابتلا و آزمائش، وہی امتحانِ صبر و وفا اور وہی مطالبۂ "کج دار و مریز" مناسب ہے۔ اسلام کی شرط "ورزش ایمان بالغیب" ہو یا نہ ہو لیکن محبت و خلوص کے معاملہ میں میرا اصول ہمیشہ یہی رہا ہے، اس لئے صبر کروں گا تو کیا کروں گا۔
>
> سیاسیات کے باب میں بڑی حد تک میں آپ کا ہم خیال ہوں۔ لیکن اسلوب کار میرا اور ہے، آپ کا اور، تقریروں کے متعلق آپ نے خوب رائے دی۔ انتقاد آپ کا حصہ ہے۔ اور ہاں یہ تو بتائیے اب آپ ہیں کیسی؟ پروانۂ راہداری عطا ہو تو حاضر ہوں۔

اسی طرح بھوپال کی ایک خاتون سے عرصہ تک خط و کتابت جاری رہی، لیکن جب ان کی شادی ہونے لگی تو انھوں نے لکھا کہ اب سلسلہ مراسلت جاری رکھنا مناسب نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کا جواب نیاز صاحب براہِ راست انھیں نہ دے سکتے تھے اس لئے اسے "نگار" میں شائع کر دیا۔

میں سمجھتا ہوں کہ نیازؔ صاحب کے تمام اُن مکاتیب میں جو انھوں نے خواتین کے نام لکھے ہیں یہ خط خاص اہمیت رکھتا ہے نہ صرف انشاپردازی کے لحاظ سے بلکہ اس لئے بھی کہ اس میں وہ ہم کو بہت زیادہ بے نقاب نظر آتے ہیں۔

یہ خط جولائی سنہ ۳۲ء کے "نگار" میں شائع ہوا اور اس کا عنوان تھا " وہ خط جو مکتوب الیہ تک نہ پہونچ سکا"۔ ملاحظہ ہو:۔

اتنا قاتل خط اور اس قدر طویل!۔ تم تو صرف یہی کہنا چاہتی تھیں نا، کہ آئندہ میں تمھیں کوئی خط نہ لکھوں پھر یہ پورے چھ صفحے کیوں؟ شاید اس لئے کہ صاف صاف ایسا کہتے ہوئے تم کو حجاب آتا تھا۔

نہیں یہ بات نہیں ——— میں سمجھتا ہوں

تم نے مجھے آہستہ آہستہ ذبح کرنا چاہا۔ اس طرح کہ حلق پہ چھری بھی چل رہی ہے، تم مسکرا مسکرا کر مجھ کو تسلیاں بھی دیتی جاتی ہو، اور میں بے خبر ہوں، یہاں تک کہ دفعتاً تمھارا ہاتھ شہ رگ تک پہونچ جاتا ہے یعنی تمھارا خط ختم ہو جاتا ہے اس حکم کے ساتھ کہ آئندہ تمھیں کوئی خط نہ بھیجوں —— اور —— مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی نہایت بیش قیمت چینی کی قاب دفعتاً ہاتھ سے چھوٹ جائے اور فرش پر گر کر چور چور ہو جائے۔ لیکن خیر اس سے ایک فائدہ ضرور ہوا اور وہ یہ کہ تم نے خط لکھنے سے باز رکھ کر مجھے اس کا موقع تو دے دیا کہ جو کچھ کہنا ہے آزادی سے کہدوں اور دل کی ہر بات جو تم پہ ظاہر کر سکتا تھا، کہہ ڈالوں۔ کیونکہ اب مجھے کیا ڈر ہے۔ تم سُن نہ سکو گی اور دُنیا سنتی ہے تو سُنے۔ اچھا تو شروع کرتا ہوں۔

ایک تھا بادشاہ، ہمارا تمھارا خدا بادشاہ........!

تمھاری سب سے پہلی تحریر مجھ تک پہونچی تو میں دیر تک سوچتا رہا کہ اگر یہی باتیں میں تمھاری زبان سے سُنتا تو کیا ہوتا —— تمھیں خبر نہیں لیکن ہوا یہی!

میں نے تمھاری تحریر کے ایک ایک لفظ کو دیکھ کر، حرفوں کی ہر ہر کشش کو سمجھ کر، کاغذ کے رنگ اور اس کی عطریت سے مدد لے کر، میں نے تمھاری ایک تصویر کھینچی، کاغذ پر نہیں، قلب پر، دماغ کے اس پردہ پر جو صرف نغمہ و نکہت کے نقش کے لئے مخصوص ہے اور میں اس میں محو ہو گیا —— تو کیا میں بتا ہی دوں کہ میں نے تمھاری تحریر کے اندر چھپا ہوا تم کو کیسا پایا؟۔ معاف کرنا، ممکن ہے کوئی بات خلاف حقیقت ہو یا تمھارے ذوق کے خلاف —— لیکن جب میرا یہ خط تم تک پہونچ ہی نہیں سکتا تو پھر اندیشہ کیوں ——؟

اچھا تو سُنو اب تم اپنا سراپا —— کوئی پسند کرے یا نہ کرے لیکن مجھے تو وہ اس قدر عزیز ہے کہ اگر تم واقعی ویسی نہ نکلیں تو مجھے افسوس ہو گا۔

کھلتا ہوا سانولا رنگ، یعنی وہ رنگ جو کیفیات سے شروع ہوتا ہے اور کیفیات ہی پر ختم۔ وہ جسے دیکھ کر چھونے کو جی چاہے اور ہونٹوں میں بے اختیار کپکپی سی محسوس ہونے لگے۔ معاف کرنا میرے ہاتھوں نے بھی تمھیں چھُوا، اور میرے ہونٹوں نے بھی تمھارے لبوں کو مس کیا جو ریشم کی طرح نرم اور پنکھڑی کی طرح نازک تھے —— میں نے تم کو نحیف و ناتواں پایا، لیکن اپنی رعنائی و کشیدہ قامتی کے لحاظ سے تمھیں ایسا ہونا چاہیئے —— تمھارے بال بہت سیاہ تو نہیں، لیکن ان میں ایک خاص قسم کی چمک ضرور ہے اور تھوڑا سا گھونگھر بھی کنپٹی کے بالوں میں مجھے نظر آتا ہے —— پیشانی بہت فراخ اور اس میں ایک نیلگوں رگ اُبھری ہوئی، مانگ

تک چلی گئی ہے ـــ بھویں کافی چوڑی ہیں اور ایک نہایت ہلکی عنبری لکیر ان دو تلواروں کو ایک دوسرے سے ملا رہی ہے ـــ رنگ کے بعد سب سے زیادہ قاتل چیز تمھاری آنکھیں ہیں، ہر وقت کسی خیال میں مستغرق رہنے والی آنکھیں جن کو ایک بار دیکھ لینا گویا کسی سمندر میں ڈوبتے چلے جانا ہے ـــ چہرہ کتابی ـــ گردن کھنچی ہوئی تناسب اعضا کانٹے پر تلا ہوا ـــ اور ـــ چال ایسی جیسے کوئی ناگن راستہ کاٹتی ہوئی سامنے سے گزر جائے عُمر تو تم خود ہی بتا چکی ہو کہ ۲۰ سے کم اور پندرہ سے زیادہ ہے غالباً ۱۸ سال ـــ!

یہ تھی تمھاری وہ تصویر جو میں نے تمھارے سب سے پہلے خط کو دیکھ کر اپنے دل پر نقش کی تھی اور اگر میں یہ سب کچھ پہلے ہی لکھ دیتا تو شاید تم اسی وقت مجھے لکھ بھیجتیں کہ "آئندہ میرے نام کوئی خط نہ بھیجا جائے"!

میں چاہتا تھا کہ تم مجھ سے زیادہ بے تکلّف ہو جاؤ۔ اور میں تم کو ایسے لفظ سے خطاب کر سکوں جو تمھاری خوبصورت پیشانی پر ہلکا سا خم پیدا کر سکے۔ لیکن اچھا ہوا کہ اس منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی یہ بساط الٹ دی گئی اور تم نے زندگی کی اُس تلخ حقیقت کو جان لیا کہ اگر عورت اس کے سمجھنے پر مجبور نہ ہو تو خدائی کا دعویٰ بھی اس کے لئے کوئی بڑی چیز نہیں۔

ہر چند میں تم کو دُنیا میں آزاد، انسانی دسترس سے دور، کسی آسمانی دیوی کی طرح بلند دیکھنا چاہتا تھا لیکن میری یہ تمنا پوری نہ ہوئی اور تمھاری زندگی کا وہ دور جب تمھارا جسم تمھاری روح کے اندر محوِ خواب تھا، جلد ختم ہو گیا۔

پھر بتاؤ کہ اب تم کیا کرو گی۔ مگر میں یہ کیوں پوچھ رہا ہوں، مجھے کیا حق حاصل ہے اور اگر تم کچھ کہنا بھی چاہو گی تو کیسے کہو گی اور اگر کہو گی بھی تو کلیجہ پر ہاتھ کون رکھے گا۔

تمھارے اس چھ صفحہ کی داستان میں سب سے زیادہ تڑپا دینے والی بات یہ تھی کہ تمھارے جسم کے ساتھ تمھاری روح کا سودا نہیں ہو سکا۔ باور کرو یہ سن کر مجھے بہت قلق ہوا اور دیر تک سوچتا رہا کہ تم کس قدر گھبرا رہی ہو گی۔ لیکن میں اب تو تسکین کے الفاظ بھی تم تک نہیں پہونچا سکتا، کیا کروں مجبور ہوں۔ اچھا تو لو اب میں بھی اپنی تسکین کی چیزیں اپنے سے جدا کئے دیتا ہوں اور تمھاری تمام تحریریں جن کو میں نے اس وقت تک حرزِ جاں بنا کر رکھا تھا، نذرِ آتش کئے دیتا ہوں

اے عزّت و شرافت کی دیوی ـــ میری یہ قربانی قبول کر لے

نیاز صاحب کا صرف یہی ایک خط ان کے جنسی و جذباتی تاثرات کے سمجھنے اور ان کی انشا پردازی پر مہرِ دوام ثبت کرنے کے لئے کافی ہے۔

غالب کی فارسی شاعری

"غالب اپنے اخلاق کے لحاظ سے جیسا کچھ بھی رہا ہو لیکن شاعر ہونے کی حیثیت سے وہ ـــ اپنی جگہ تنہا نظر آ رہا ہے۔ شعراء کے کلام میں شوخی بھی پائی جاتی ہے اور رنگینی بھی۔ ندرت بیان بھی نظر آتی ہے اور لطف زبان بھی۔ لیکن ان سب کے مل جانے کے بعد جو ایک نئی چیز بنتی ہے وہ غالب ہی کے یہاں ملے گی۔" (نیاز)

نیاز فتحپوری ۔ قدیم وجدید

سید حامد حسین، ایم ۔ اے

نیاز ادبِ لطیف کی تحریک سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ تحریک ایک جمالیاتی تحریک تھی جس پر ٹیگور کی تخیلیت، انگریزی ادب کے جمالیاتی رجحان، یونانی صنمیات اور کچھ حد تک خیام کی عیش کوشی کی چھاپ دکھائی دیتی ہے۔ اس تحریک کے دو پہلو تھے۔ ایک فکری، دوسرا جمالیاتی اور ان دونوں کے حسین و نازک امتزاج سے اس ادب کی تخلیق ہوتی ہے۔ ادبِ لطیف سے تعلق رکھنے والے ادیبوں کی جمالیاتی حس بہت تیز ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کا ذہن منطقی فکر سے بھی آشنا ہے چنانچہ ان کے یہاں حسن و عشق باضابطہ اور اصولی قسم کے اقدار ہیں جن کے ذریعہ وہ زندگی کے رنگ اور اس کیف کی تعبیر کرنا چاہتے ہیں۔ یہ تحریک اردو ادب کی رومانی تحریک کا احیا کہی جاسکتی ہے۔ لیکن اس تحریک نے اردو ادب پر اتنے دور رس نتائج نہیں چھوڑے جتنے انگریزی ادب میں دکھائی دیتے ہیں۔ تاہم اس نے اردو نثر میں تخیلاتی رنگ پیدا کرنے میں بڑا اہم حصہ لیا ہے۔

نیاز اس تحریک کے بڑے مناسب نمائندہ کہے جاسکتے ہیں۔ ان کا تخیل بھی اس تحریک کے جمالیاتی رنگ سے رنگا ہوا ہے اور ان کے تصورات حسن و عشق میں عام زندگی کی نفسیات، اس کے پیچ وخم اور نشیب و فراز نہیں ہیں۔ ان کے یہاں ان دونوں اقدار کا غلبہ ہے۔ حسن اپنی پوری تجلی ریزیوں کے ساتھ نمایاں ہوتا ہے اور عشق پوری شدت کے ساتھ اپنا وار کرتا ہے اور ان کا تصادم بھی نتیجہ میں اتنا ہی شدید ہوتا ہے۔

عورت ان کے نزدیک حسن کا نام ہے اور حسن سوائے نسائیت کے کچھ نہیں۔ حسن کو عورت سے جدا نہیں کیا جاسکتا اور جب اس عالم کی کسی مادی یا غیر مادی حسین شے کو دیکھ کر کلیجہ جلنے لگتا ہے تو اس میں ایک خاص قسم کی نسائیت محسوس ہوتی ہے، انہوں نے مرد کو عشق کی دلبندگی دی ہے۔ عشق کی وارفتگیاں، شورشیں اور ہنگامہ خیزیاں اس کے حصہ میں آئی ہیں لیکن انہوں نے اکثر عشق کو حسن کی طرح بے پایاں محسوس نہیں کیا اور مرد کو ناموس حسن کی پاسداری کے لئے مستحکم نہیں پایا ہے وہ چاہے "کہکشاں کا ایک ساغر" ہو، جہاں نیاز یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ "دنیا میں عورت محبت کرتی ہے صرف اس لئے کہ وہ محبت پر مجبور ہے اور مرد محبت کرتا ہے صرف اس لئے کہ وہ اس کی مسرت ہے پھر یہ کبھی نہیں ہوتا کہ وہ مجبوری جاتی رہے اور ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ یہ مسرت ناپائیدار ثابت ہو" "دنیا" "ایک مصلح بت تراش" اور "دنیا کا اولین بت ساز" جس میں عورت مرد کی سنگ دلی سے مجبور ہو کر پتھر میں تبدیل ہو جاتی ہے وہ اس نتیجہ پر پہونچاتے ہیں کہ مرد اس وفا کا مالک نہیں ہوتا جو عورت کی زندگی ہوتی ہے۔

نیاز کے یہ تصورات بڑے مستقل ہیں اور ان میں اس نفسیاتی پہلو کی گنجائش نہیں جو حالات کی پیچیدگی سے پیدا ہوتا

ہے کیونکہ یہ تصورات جس فضا میں اُبھرتے ہیں وہ عموماً بالکل سلجھی ہوئی ہوتی ہے اور اس میں حالات کی رفتار خطِ مستقیم میں رہتی ہے۔ ان کے کامیاب ترین مضامین زیادہ تر ایسے ہیں جو یا تو قبل از آفرینش عالم کے قرونِ ابعد یا یونانی دیوتاؤں کے درمیان یا اس دنیا کے آب و گل سے دور کسی جگمگاتے ستارے کی فضا میں جنم لیتے ہیں اور معبدوں کی دنیا نیازؔ کی محبوب دنیا ہے جسے وہ اپنے تخیل کے اعتبار سے سجاتے، اس کے قوانین تیار کرتے اور اپنے ماجرے کے لئے فضا سنوارتے ہیں، وہ وقت اور زمانہ کی گرفت کو اپنے اوپر محسوس نہیں کرتے جو افسانے عصر حاضر کے سماجی پس منظر کے ساتھ ابھرتے ہیں ان میں بھی مرکزی جذبات کا دھارا اتنا قوی ہوتا ہے کہ وہ کسی حدود کے پابند نہیں رہ جاتے (مثلاً صدائے بازگشت)

نیاز کے یہاں حسن و عشق کے تصورات زمان و مکان کے محدود تصور سے کتنے ہی آزاد کیوں نہ ہوں انہوں نے کم از کم ہندستانی عورت کی محبّت کو ضرور ایک غیر معمولی درجہ دیا ہے۔ ہندوستانی عورت کی وفا شعاری اور شوہر کے ہاتھوں تکلیف پا کے باوجود اس کے فراق میں اس کی گنگناہٹ "تجھ بن پیا کچھو نہ سہائے" عشق کی وہ پُرسوز مثال ہے جو اس شاعر کو بھی جھنجھوڑ دی ہے جس کو بیدار کرنے میں دولت، شہرت، موسیقی اور حسن و شباب کی دیویاں بھی ناکام رہی ہیں (ایک شاعر کا انجام) ہندوستانی عورت کا یہی کردار "ایک مصلح بت تراش" کے اختتام پر اُبھرتا ہے اور یہی نیاز کے مضمون "عورت" کا بڑا ہی موثر نقطہ بنتا ہے مگر اس تصور میں تھوڑی سی خصوصیت یا مقامیت پیدا ہو جانے سے اس کی آدرش نوعیت نہیں ختم ہو جاتی یہ عشق کا ایک اور آئیڈیل ہے جو عورت کے پیکر میں اُبھرتا ہے۔

نیاز کے کردار کسی نہ کسی آئیڈیل کی علامت ہیں، ان کی زندگی میں عام سماجی زندگی دھوپ چھاؤں نہیں ہے بلکہ ان کی سیرت حسن کی نورانیت عشق کی شعلہ فشانی یا کسی تصور کی شدت سے معنی پیدا ہوتی ہے ان کی زندگی کا حاصل اپنے آئیڈیل کی تکمیل ہوتا ہے۔ "ایک شاعر کی محبت" اور "زہرہ کا پجاری" میں ایسے مرکزی کردار ہیں جن کے تصور نے ایک مخصوص رُخ اختیار کر لیا اور ان کے اس تصو سے جُدا کرنا ان کے وجود کو ختم کرنا ہے۔ اس طرح عموماً ان کے کرداروں میں ایک Al-Narmality کا احساس ہوتا ہے۔ و کسی نہ کسی Mania کا شکار ہوتے ہیں۔ اور ان کے لئے زندگی ویسا ہی روپ اختیار کر لیتی ہے۔ نیازؔ نے زیادہ تر اپنے کردار کے لئے ماحول بنایا ہے۔ ماحول سے کرداروں کو نہیں ابھارا ہے۔ یہ کردار زندگی کی عام کشمکشوں کو لے کر ان افسانوں میں نہیں آتے اور نہ ان کی نفسیاتی پیچیدگیاں ان افسانوں میں پیچ و خم پیدا کرتی ہیں بلکہ ان کی سیرت کا کوئی غالب عنصر پوری شدت کے ساتھ نمایاں ہوتا ہے جو افسانہ کی ساری فضا پر حاوی ہو جاتا ہے اس کے نتیجہ میں ان کے کرداروں میں یک رخی پیدا ہونا لازمی ان کے یہاں کردار زیادہ تر مکمل جذبات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ بیک وقت دو متضاد جذبات کا تصادم ان کے یہاں نہیں ہوتا وہ "فریب خیال" جیسا حقیقی زندگی سے قریب افسانہ ہی کیوں نہ ہو۔

نیازؔ کے تخیلاتی افسانوں میں حزنیہ افسانے طربیہ افسانوں سے زیادہ کامیاب اور موثر ہیں۔ ان کے نقوش میں زیادہ دلآویز اور جاذبیت ہے، وہ فضا جو شوخ اور چمکدار رنگوں سے تعمیر کی جاتی ہے وہ کردار جو گہرے اور شدید جذبات کے ساتھ تخلیق جاتے ہیں، جب کسی شخص سے ہمکنار ہوتے ہیں تو یہ شکست بھی اتنی ہی گہری اور شدید ہوتی ہے۔ تخیلی افسانوں میں حزن بھی زیاد تر اپنے پس منظر سے تاثر حاصل کرتا ہے کیونکہ پس منظر کی رعنائی حزن کی فضا کو اور زیادہ نمایاں کر دیتی ہے۔ اسی لئے "جال عالم اور ملکۂ چہرنگار" اور "صدائے شکست" کا انجام اتنا گہرا نہیں ہے جتنا "ایک شاعر کی محبت" یا "زہرہ کا پجاری" کا نیازؔ کا تخیل ایک چابک دست سنگ تراش کا تخیل ہے۔ لیکن ان کی صورتگری میں زندگی کی حرکت حرارت اور جوش بھی

نیاز اپنے فن کے تینوں ابعاد (Dimensions) کے خود خالق ہیں۔ اپنے تخیل کی تجسیم کے ساتھ ساتھ اس کے گرد ایک رنگین اور جمیل فضا بھی پیدا کی ہے۔ ان کی خلاقانہ صلاحیتوں نے نازک سے نازک تصورات اور لطیف سے لطیف تخیلات کو پیراہن دیا ہے۔ اتنا ہی سبک اور اتنا ہی باریک جس میں سے ان کا اصل تصور اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ منعکس ہے۔ "ایک مصور فرشتہ"، "مطربۂ فلک" اور "کیوپڈ و سائیکی" حسین تخیلات ہیں جو سمٹ کر ایک تصویر بن گئے ہیں۔ قوس قزحی دھاریاں جو کسی پیکر میں سما گئی ہیں نیاز نے ایک خالق کی طرح ان کو زندگی دی ہے، ان کو حسین پیکر دیا ہے، جاذب نظر نقوش دیئے ہیں۔ حسن کی برنائیاں اور عشق کی وارفتگیاں رہی ہیں۔ نیاز اپنی تخلیق کی ہوئی اقلیم پر خود حکمراں ہیں۔

"کیوپڈ و سائیکی" کی تمہید میں نیاز نے کہا ہے کہ انہوں نے لکھتے وقت اپنے حسیات کی پابندی کی ہے اور اپنی تحریر کا عام اخلاقیات سے کوئی سروکار نہیں رکھا ہے۔ ان کی تخلیقات سے بھی یہی نمایاں ہے کہ انھوں نے اپنی "لغزشِ مستانہ" کو الفاظ کا پیراہن دیا ہے اور ان کے تخیل کے جمالیاتی کیف اور ان کی فکر کی لطیف سرشاری نے ان کے مضامین کی صورت اختیار کی ہے۔ ان کے مضامین نمایاں جذبات کے وفور میں ان کے احساسات کا وفور شامل ہے اور انہیں کے ذہن کے نکھار نے ان نقوش کو تابانی اور جلا بخشی ہے۔ ادبیات نے انسانی زندگی کو جو تعلق حاصل ہے وہ اس کی اخلاقی اہمیت کو کبھی نظر انداز نہیں کر سکتا اور اس لئے یہ کہنا کہ حسن اور آرٹ کو محض حسن اور آرٹ کی حیثیت سے دیکھنا چاہئے اور اس کے اخلاقی ہونے کو نظر انداز کر دینا چاہیئے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ مگر خود نیاز کی تخلیقات اس اصول پر پوری نہیں اترتیں۔ ان کا سوائے ایک جمالیاتی پہلو کے کوئی افادی پہلو متعین نہیں کیا جا سکتا۔ نیاز نے ان کو زمان و مکان کے حدود سے الگ رکھ کر اور حسن و عشق اور ازدواج کے مسائل پر مطلق طریقے سے بحث کر کے کسی طرح بدلتے ہوئے مذاق زندگی سے ہم آہنگ نہیں کیا ہے باوجودیکہ ادبیات اور اصول نقد میں انھوں نے اخلاقی تعبیرات کی تغیر پذیری کو مانا ہے۔

نیاز کی طبیعت میں ایک جوش ہے جو خواہ تنقید ہو یا تخلیق ہر صورت میں ساری اصول بندیوں کو توڑتا چلا جاتا ہے۔ نیاز ایک اچھے نظریہ ساز بن سکتے ہیں۔ کم از کم "انتقادیات" کے دو آخر کے مضامین "ادبیات اور اصول نقد" اور "فنون ادبیہ و حقیقت نگاری" سے یہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے مگر ایک عملی نقاد کی حیثیت سے ان کا پہلو کمزور ہے —— نقاد کی ایک خصوصیت نیاز نے غیر جانبداری بتلائی ہے مگر ان کی اپنی تنقیدیں غیر جانبدارانہ نہیں ہیں بلکہ بعض تنقیدوں میں نیاز کا اپنا تصور اتنا حاوی ہو گیا ہے کہ اس ادیب یا شاعر کے جس کی تخلیقات کو وہ زیر بحث لاتے ہیں، بہتر پہلو یکسر پنہاں ہو جاتے ہیں کم از کم اصغر اور جوش پر جو مضامین "انتقادیات" میں شامل ہیں وہ ایسے ہی ہیں۔

نیاز کے یہاں ایک چونکا دینے والا انداز ہے جو آپ کو "من و یزداں" میں بھی ملے گا اور "انتقادیات" میں بھی وہ دنیائے فکر میں کسی ایسے انکشاف کو زیادہ پسند کرتے ہیں جو تقریباً نیا ہو۔ مومن کو میر کے علاوہ سارے اردو شعراء پر فوقیت دینا، ایک ایسے دور میں جبکہ غالب کو بلند کیا جا رہا تھا یقیناً ایک چونکا دینے والی بات تھی۔ اسی طرح اردو ادب میں نظام شاہ رامپوری جادید مرحوم اور آصف الدولہ کا تعارف اپنے موضوع کے لحاظ سے تقریباً نیا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ یہاں نیاز ایک ناقد کی حیثیت سے ان شعراء کی قدر و قیمت جانچنے یا ان کے کلام پر ایک سیر حاصل تنقید کرنے کے بجائے تعارف اور کلام کے انتخابات سے آگے نہیں بڑھتے۔

نیاز کی تنقید کا انداز جزوی ہے۔ وہ ایک ایک شعر ایک ایک مصرع اور ایک ایک بندش کو پرکھ کر دیکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک ادب پر

تنقید کرتے ہوئے اسلوب و طرز ادا پر خصوصیت کے ساتھ توجہ دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے ناقد کو چاہیئے کہ پہلے وہ یہ دیکھے کہ شاعر اپنے خیال کو کہاں تک حسین طریقہ سے ادا کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ نیاز اس طرح شاعر کے خیال پر تنقید کرنے سے زیاد اس کے اظہار کو تنقید کا محتاج سمجھتے ہیں۔ چنانچہ نیاز کی عملی تنقید کا ایک بہت بڑا حصہ مختلف شعراء کے یہاں الفاظ کی صحیح بند اور مناسب استعمال کی چھان بین پر مشتمل ہے۔

نیاز کی تنقید میں گہری انانیت کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی اپنی شخصیت پوری تنقید پر چھائی رہتی ہے۔ چنانچہ ابتدا سے ہی جو تصور قایم کر لیتے ہیں وہ اس کے زیر اثر اپنی ساری بحث کو جاری رکھتے ہیں۔ لہٰذا کہیں کہیں ایسا بھی ہوا ہے کہ بعض اشعار کو محض اپنے ک جوش تصور کے تحت رد کر دیا ہے اور اس کے نتیجہ میں کہیں کہیں ان کا لہجہ متین نہیں رہا ہے بلکہ ان کے لبوں پر ایک طنز آمیز مس دوڑ گئی ہے خصوصیت کے ساتھ اصغر کی شاعری پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے اپنے تصوف سے ناپسندیدگی کی بنار پر کہیں کہیں بڑا غیر ہمدردانہ رویہ اختیار کر لیا ہے۔ "لکھنؤ اور لکھنویت پر لکھتے ہوئے انہوں نے ایک بار تحریر کیا تھا۔ "میرے نزدیک شاعری کے تمام اصناف میں "غزل گوئی" جس قدر بلند چیز ہے کوئی نہیں۔ روح کی گہرائیوں اور قلب کے اعماق سے خبردار کرنے والی چ اگر کوئی ہو سکتی ہے تو صرف غزل ہے اور اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ غزل کا ارتقا تصوف ہے۔ تصوف سے مراد عہد حاضر کی قبر پرست مرید ساز، خرقہ مکر و سالوس والی درویشی نہیں بلکہ میری مراد وہ علوئے فطرت، وہ عروج روح اور وہ استغراق تصور ہے جہاں اذہان مادیت سے گزر کر اپنے حیز اصلی، نور ربانی اور جلوہ حقیقی سے ہم آغوش ہو جاتا ہے اور تمام امتیازات دنیاوی کو جن میں امت مذہبی بھی شامل ہے محو کر دیتا ہے۔" یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اصغر کی غزل میں تصوف کے یہ منازل نہیں ہیں جو نیاز نے بتلائے ہیں بلکہ نیاز کے جوش طبیعت نے اصغر کی شاعری کے تابناک پہلو کو ماننے سے انکار کر دیا اس لئے انھوں نے روایتی تصو کا نمائندہ تصور کر کے مورد الزام ٹھہرا دیا۔ اس طرح آسانی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ نیاز کا جوش طبیعت عملی تنقید میں کس طرح خود اپنے اصول توڑ سکتا ہے۔

صحیح نقطۂ نظر سے نیاز کا ظفر پر مضمون سب سے زیادہ جنچا تلا اور متوازن ہے اور اس مضمون میں انھوں نے اپ لئے جو طریق عمل تیار کیا ہے اس کو برتا بھی ہے۔ نظیر اور مومن پر مضامین میں بھی یہ عناصر نظر آتے ہیں مگر نیاز نے اپنے منط استدلال سے تنقید میں اتنا فایدہ نہ اٹھایا جتنا اٹھانا چاہیئے تھا۔ ان کی یہ صلاحیت، جہاں انہوں نے لکھنؤ اسکول پر بحث کی ہے وہاں اور "ادبیات اور اصول نقد" اور "فنون ادبیہ اور حقیقت نگاری" میں نمایاں ہوئی ہے (باوجودیکہ اس سے انکا نہیں کیا جاسکتا کہ اشعار کی بندش پر بحث کرتے ہوئے انھوں نے استدلال سے کام لیا ہے۔ لیکن اس کا استعمال اتنا پھیلا ہوا نہیں جتنا تنقید چاہتی ہے۔ یعنی فن کا مجموعی تجربہ فنکار کے رجحانات پر بحث، فنکار کے مقام کا تعین وغیرہ)

نیاز کی تنقید کا اسلوب تحریر بڑا باوزن اور پر وقار ہے۔ نیاز نے نئی نئی تراکیب کی اختراع کی ہے اور نئی اصطلا وضع کی ہیں ان کی تحریر میں بحیثیت مجموعی ایک عالمانہ سنجیدگی اور منطقیانہ سلجھاؤ کا اندازہ ہوتا ہے نیاز نے اپنی عملی تنقید میں اد فن وغیرہ پر گہری فلسفہ طرازی سے کام نہیں لیا ہے بلکہ اکثر براہ راست اپنے موضوع سے تعلق رکھا ہے۔ نیاز کے انداز میں ایک توانائی اور گہرائی اور چند الفاظ میں بسیط تصورات کو گھیر لینے کی صلاحیت ہے۔ ان کی تنقید میں بھی کہیں کہیں تراکیب ان کی انشائے لطیف کا اثر جھلک آیا ہے۔

نیاز نے انشائے لطیف کے لئے جو پیرایہ اختیار کیا ہے وہ بیک وقت آبشار کی سی روانی رکھتا ہے۔ اس

جمال بھی اس کا زور اور ہمواری بھی۔ نیاز نے فکر کی کرختگی میں اپنے جمالیاتی رجحان سے ایک نفاست پیدا کی ہے۔ فولاد کو صیقل کر کے آئینہ بنایا ہے اور اقلیدس کی شکلوں سے گل بوٹے بنائے ہیں۔ اسی طرح تخیل کے نازک تانے بانے کو ان کی فکر نے پختگی بھی بخشی ہے اور توانائی بھی، جلا بھی اور رعنائی بھی۔ عنکبوت کے تاروں کو ریشم کی طرح مضبوط بھی بنایا ہے اور چمک اور لچک بھی دی ہے۔

نیاز کی شخصیت ایک ہمہ گیر شخصیت ہے جس میں اپنے اندر جذب کر لینے کی زبردست صلاحیتیں ہیں۔ انہوں نے قدیم اور جدید علوم سے کسب نور کیا ہے اور اس کی تجلیاں ان کے ادب پاروں میں نمایاں ہیں۔ لیکن نیاز کی اپنی حیثیت، نیاز کی اپنی آواز ان سب میں موجود ہے۔ انہوں نے یونانی دیومالا از سر نو خود ہی تخلیق کی ہے۔ نیاز کی شخصیت ایک پہلو دار شیشہ (Prism) کی سی ہے جس نے بکھری ہوئی شعاؤں کو ایک جا کر کے قوس قزحی رنگوں میں منتشر کر دیا ہے۔

اردو ادب میں نیاز ایک قد آور شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کی گراں بہا تصانیف اور ان کی فکری صلاحیتیں موجودہ دور کا عظیم ترین سرمایہ ہیں۔

"مذاہب عالم میں اسلام سب سے کم عمر ہے اور دیگر مذاہب کے خلاف اُس کا آغاز ماضی کی تاریکیوں میں گم نہیں ہے بلکہ اس کا ظہور و انتشار ایک واضح تاریخی واقعہ ہے۔ رسول اللہ کے زمانہ تک اسلام صرف عرب تک محدود تھا۔ لیکن انکی رحلت کے بیس سال کے اندر وہ پورے شرق اوسط پر چھا گیا۔ شام ۶۳۴ء میں، عراق ۶۳۶ء میں، فلسطین ۶۳۸ء میں فتح ہو گیا اور ۶۴۲ء میں ایرانی سلطنت پر اسلامی پرچم لہرانے لگا۔ اس کے بعد پورے شمالی افریقہ اور اسپین میں اسلامی حکومت قائم ہو گئی۔ مشرق میں اسلام ہندوستان، چین اور انڈونیشیا تک پھیل گیا۔ اور آج اس مذہب کے ماننے والوں کی تعداد ۴۵ کروڑ ہے جو انسانی آبادی کے ساتویں حصہ سے بھی زیادہ ہے۔

اسلام کی غیر معمولی کامیابی کا سبب صرف رسول کی شخصیت اور نئے مسلمانوں کا جوش و خروش تھا بلکہ مذہب کی سادگی اور فطرت انسان سے اسکی مطابقت بھی کامیابی کی ضامن تھی۔ لفظ اسلام کا تعلق سلام سے ہے جس کے معنے "امن" سلامتی کے ہیں۔ قرآن میں یہ لفظ "سپردگی" کے معنے میں بھی آیا ہے۔

اسلام کسی خاص قوم کا مذہب نہیں بلکہ ساری دنیا کا مذہب ہے اور وہ رنگ و نسل کا کوئی امتیاز نہیں کرتا۔ اخوت اور مساوات اسلام کی خصوصیات ہیں۔ لیکن اسلام کے ظہور سے قبل عرب ذہنیت اس سے بالکل مختلف تھی"

(نیاز)

نیاز کے انتقادی خیالات

ڈاکٹر سید عبداللہ

شاعر پیدا ہوتا ہے بنتا نہیں مشہور بات ہے لیکن اگر شاعر اس نظریے پر بھروسہ کر کے شعر کہے تو وہ بگڑ بھی جاتا ہے۔ یہ مالہ و ماعلیہ کے پیش نظر کے ابتدائی الفاظ ہیں اور انہیں چھبیس الفاظ کے اندر نیاز کا پورا نظریہ تنقید سمایا ہوا ہے۔ "شاعر پیدا ہوتا ہے بنتا نہیں" مشہور بات تو ہے ہی لیکن کیا یہ درست بات بھی ہے۔ نیاز نے اس کی تردید کی ہے۔ گویا نیاز کے نزدیک شاعر کا پیدا ہونا تسلیم، مگر کیا پیدا ہونے کے بعد خود بخود بن بھی جاتا ہے اس خیال سے نیاز کو اتفاق نہیں۔ ان کی رائے یہ ہے "شاعری یا ادب ایک فطری ملکہ سہی مگر اس کو صحیح طور سے بروئے کار لانے کے لئے ایک خاص قسم کی تربیت کی بھی ضرورت ہے۔"

مالہ و ماعلیہ کے سب مندرجات سے اتفاق کرنا مشکل بھی ہے اور غیر ضروری بھی مگر اتنا واضح ہے کہ ان مندرجات میں جو تنقیدی عمل یا طریقہ اختیار کیا گیا ہے وہ انتقاد کے ایک ایسے تصور پر مبنی ہے جس کی خاص اہمیت ہے مگر اسے عام طور سے نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ وہ تصور ہے زبان کی صحت اور بیان کی بلاغت کا مسئلہ۔

بعض لوگ زبان کی صحت کے مسئلے کو لفظی حرف گیری کے نام سے یاد کرتے ہیں لیکن سچ یہ ہے کہ یہ خیال صحیح نہیں۔ ادب اور تحریر کی ہر قسم میں زبان کی صحت بڑی اہمیت ہے بلکہ ناگزیر حیثیت رکھتی ہے۔ غور کیجیے، تو یہ صاف ظاہر ہوگا کہ کوئی ادبی تحریر اپنے اظہار و ابلاغ میں اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک اس کے وسائل اظہار بلیغ اور کامیاب نہیں ہو جاتے اور ادب کا واحد وسیلہ اظہار زبان و بیان ہے۔ کیا کسی نے ایسا کوئی مصور دیکھا ہے جو اپنے رنگوں کی صحیح ترتیب و ترکیب کے بغیر کامیاب تصویر بنانے کا مدعی ہو اور اگر ایسا کوئی ہے تو وہ یقیناً ژولیدگی تصور کا مریض ہے۔ یہی حال شاعری اور ادب کا ہے کہ اس میں زبان و بیان کی بلاغت کے بغیر کامیاب نظم یا نثر لکھنے کا دعویٰ صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو پتنگ اڑانے کا عادی ہے مگر ڈور کے بغیر۔

اردو تنقید میں نیاز کی حیثیت منفرد ہے اور اس انفرادیت کی بنیاد خاص یہی لفظیاتی تنقید ہے۔ لیکن لفظیاتی تنقید ایک مغالطہ انگیز ترکیب ہے۔ اس سے یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ نیاز شاعری اور ادب میں لفظوں کو معنی کے رابطے سے آزاد سمجھتے ہیں اور تجربہ و اظہار کی جداگانہ ہستی کے قائل ہیں۔ یہ خیال صحیح نہیں اور صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ نیاز کا مسلک یہ ہے کہ ہر تجربے کی یہ تقدیر ہے کہ وہ اپنے لئے صحیح قالب اظہار اختیار کرے اور اگر کسی تجربے کو صحیح قالب اظہار نہیں ملتا تو اس کا سبب یہ ہے کہ شاعر کو وسائل اظہار یعنی زبان و بیان پر قدرت نہیں۔ پس نیاز الفاظ اور زبان و بیان کو کوئی منقطع اور مستقل چیز نہیں سمجھتے۔ صحت زبان و بیان پر ان کا اصرار اس وجہ سے ہے کہ اس کے بغیر تجربے کا صحیح اظہار ممکن ہی نہیں۔

معلوم نہیں یہ غلط خیال کس نے پھیلا دیا ہے کہ شاعری زبان و بیان پر قدرت کے بغیر بھی ممکن ہے۔ یہ رویہ شاید جنگ عظیم اول کے بعد پیدا ہوا جب کہ ایک طرف ذہنی افراتفری اور فکری انارکی کو رواج ہوا اور دوسری طرف اہل ادب ریاضت اور محنت سے جی چرانے لگے اور ان کے نزدیک وہ تربیت ضروری نہ رہی جو قدما کے نزدیک بنیادی بات تھی۔ انتقادی افراتفری کے موجودہ دور میں شاید یہ خیال کسی کی سمجھ میں نہ آ سکے گا مگر یہ امر واقعہ ہے

نظامی عروضی، سمرقندی، نے (چہار مقالہ میں) یہ رائے ظاہر کی ہے کہ شاعری کی تکمیل کے لئے اساتذہ کے دواوین کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔ یہ ساری ریاضت اس لئے لازمی سمجھی گئی کہ شاعری کے آرزو مند کو زبان و بیان کے کامیاب اور موثر سانچوں اور وسیلوں کا علم ہوجائے اور تجربے کے اظہار کی راہ میں زبان و بیان فراہم نہ ہوجائے۔ کیونکہ زبان و بیان کے معاملے میں عجز، یا بے احتیاطی یا سہل انگاری کی وجہ سے فطری شاعر بھی تجربے کے صحیح اظہار سے قاصر رہتا ہے۔ چنانچہ مالہ و ماعلیہ کے ہر مضمون میں اس قسم کی ناکامیوں کی مثالیں پیش کی گئی ہیں اور ان میں اکثر فی الواقع ایسی ہیں جن کی وجہ سے بعض بڑے بڑے شاعروں کی شاعری بھی کمزور نظر آنے لگتی ہے۔ اس کا سبب ان شاعروں کی سہل انگاری ہے۔ یا یہ وہم کہ شاعر چونکہ تلمیذ ربانی ہے اس لئے جو کچھ اس کے قلم سے نکلا سب الہام ہے۔ اس کی نوک پلک درست کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ سارا ادبی الحاد دراصل بعض مشاعرہ باز اور کم فرصت شاعروں یا ان کے بے فن شاگردوں کا پھیلایا ہوا ہے۔ اگر یہ کوئی اصول ہوتا تو فن پرستوں کو ایک مصرع تر کے لئے سیروں لہو خشک کرنے کی ضرورت کیوں پیش آتی!۔

ایک عجیب و غریب مغالطہ یہ بھی ہے کہ شعر محض اشاروں سے مرتب ہوتا ہے اور ان اشاروں کی مدد سے قاری کا تخیّل خود بخود تجربے کی تہ تک پہنچ جاتا ہے۔ چلئے یہ بھی سہی۔ مگر اشاروں کے لئے "نارسا" ہونا کیوں ضروری سمجھ لیا جائے۔ اگر شاعری اشاروں ہی کا نام ہے تو اس صورت میں بھی یہ لازمی ہے کہ اشارے بلیغ اور "رسا" ہوں۔ ورنہ شاعر کا تجربہ یا خیال اشاروں کے ابہام میں الجھ کر ابلاغ کی خدمت سے قاصر رہے گا۔ زبان کی غلطی اور بیان کی پیچیدگیاں نہ اشاروں کی مددگار ہو سکتی نہ شاعری کی غم گسار — یہ تو دونوں کے لئے بیم جان اور خطرہ ایمان کا درجہ رکھتی ہے۔

اور اگر سوچا جائے تو لفظی یا لسانی سہل انگاری کا یہ عذر کچھ زیادہ قابل سماعت بھی نہیں کیونکہ اشاراتی انداز بیان اپنے اختصار و ایما کے باوجود زبان و بیان کی کمزوری سے پاک ہوتا ہے۔ اس میں اور ایک عام انداز بیان میں اگر فرق ہے تو یہ ہے کہ جہاں عام انداز بیان تجربے کی ساری اہم جزئیات فطری ترتیب کے ساتھ پیش کرتا ہے وہاں اشاراتی بیان۔ تجربے کی بعض جزئیات کو ترک کر دیتا ہے۔ مگر فطری ترتیب اور فطری اسلوب اظہار کو وہ بھی مدنظر رکھتا ہے۔

مثال کے طور پر جگر کے درج ذیل شعر کو لیجئے (جس پر مالہ و ماعلیہ میں نیاز نے بھی تنقید کی ہے)۔ اس میں بیان کی اشاریت کا تو خیر جو حال ہے شعر فطری اسلوب اظہار ہی سے انحراف کرتا نظر آتا ہے۔

وہ چمن میں جس روش سے ہو کے گزرے بے نقاب
دیر تک ہر ایک گل کا رنگ گہرا ہو گیا!

نیاز نے شعر کے مصرعہ ثانی کو ناکام قرار دیا ہے اور اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ مصرعہ ثانی مافی الضمیر کے اظہار میں بالکل ناکام ہے کیونکہ اس کا اسلوب اظہار غیر فطری ہے۔ ایسے تسامحات کو شاعر کی الہامی بے ساختگی کہنا۔ الہام کا منہ چڑانا ہے اور اگر نیاز نے اپنی معاصر شاعری کو اس بگڑی ہوئی الہامیت سے بچانے کی کوشش کی ہے تو یہ ان کے ذوق صحیح اور سلامت مزاج کی علامت ہے۔

فرض کیجئے کہ شاعری میں آزاد اور بے ساختہ اظہار (Automatism) کو ایک آئینی مسلک قرار دے دیا جائے تو بھی بات نہیں بنتی کیونکہ اس صورت میں شاعر کے ارادہ و مقصد کا سوال سامنے آجاتا ہے۔ شاعری میں اس قسم کی بے ساختگی کو روا رکھنے والے لوگ زندگی میں ربط، تنظیم اور ترتیب کے عنصر کو ضروری نہیں سمجھتے۔ لہٰذا وہ جو کچھ فرمائیں فرماتے جائیں۔ ان کو نہ صلے کی تمنا نہ ستائش کی پرواہ — وہ تو اپنے لئے لکھتے ہیں کسی قاری کے نہ منتظر ہیں نہ آرزو مند —— مگر کیا مشاعروں میں پڑھائے جانے والی غزلوں اور نظموں میں بھی غیر فطری اسلوب اظہار چل سکتا ہے یا جائز سمجھا جا سکتا ہے۔ اس سے اتفاق کرنا مشکل ہے۔ اچھی نظم کے لئے کامیاب وسیلہ اظہار ناگزیر ہے اور اچھی غزل کے لئے تو فطری اسلوب اور بھی لازمی ہے کیونکہ اس میں ایما اظہار کی وسعتوں کو پہلے ہی سے سمیٹ کر مختصر کر چکا ہوتا ہے۔ اس پر ناقص

اور غیر فطری پیرایہ ہائے بیان کا بھی اگر اضافہ ہو جائے تو غزل ژولیدہ بیانی کا مظاہرہ بن جاتی ہے۔

غرض نیاز نے بگڑے شعروں پر یا اچھے شعروں کے بگڑے ہوئے اشعار کا تجزیہ کر کے ادبی ذوق کی صحیح رہنمائی کی ہے۔ البتہ کچھ باتیں ایسی بھی ہیں جن میں نیاز کے تصورات کچھ الجھے الجھے معلوم ہوتے ہیں۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ نیازؔ — اپنے بنیادی طریق انتقاد سے ہٹ کر جب اصول و نظریات وضع کرنے لگتے ہیں تو اس سے اکثر موقعوں پر پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً نیاز نے مالہ وماعلیہ کے مختصر سے پیش لفظ میں علم اور شاعری کے روابط کا اشارۃً ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے "کہا جاتا ہے کہ فطری شاعر کا لکھا پڑھا ہونا ضروری نہیں لیکن اگر ایسا شخص فطری شاعر بھی ہے اور لکھا پڑھا بھی تو اُسے جاہل فطری شاعر سے یقیناً بہتر ہونا چاہیئے" عام طور سے تو نیازؔ کے اس بیان پر کسی اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں لیکن اس کو بطور قاعدہ کلیہ تسلیم کرنا مشکل ہے کیونکہ اچھی شاعری کے علم سے بطور خاص کوئی تعلق نہیں۔

اس سے یہ مقصد نہیں کہ شاعری کے لئے جہالت ضروری ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ شاعری کی استعداد اصطلاحی اور اکتسابی علم کی قید سے بے نیاز ہے۔ ایک لحاظ سے شاعری خود ایک علم ہے مگر یہ علم وہ ہے جس کا تعلق مشاہدہ کائنات اور تمدنی تجربوں سے ہے نہ کہ کتابوں سے۔

اردو فارسی میں شاعری کے لئے علم کو اس وجہ سے ضروری سمجھا جاتا ہے کہ ان زبانوں میں شاعری کرنے والے کچھ ایسے لوگ بھی رہے ہیں اور اب بھی ہیں جن کے لئے یہ دونوں اکتسابی زبانیں ہیں۔ اس بنا پر زبان کے ذخیرے تک پہنچنے کے لئے ایسے شاعروں کو تحصیل و اکتساب کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

اگر غرض شاعری کے علم سے ہے تو اس علم کا ماخذ علم کے ماخذ سے بالکل مختلف ہے یعنی مشاہدہ کائنات اور تمدنی تجربہ۔ شاعر کا عمل عالم کے عمل سے مختلف ہے اور اس کی استعداد کا دائرہ بھی اس کے دائرہ استعداد سے مختلف! پڑھا لکھا ہونا کوئی بُری بات نہیں اور مہذب سوسائٹی میں پڑھا لکھا ہونا ایک عام سی بات ہے، اس لئے کسی شاعر کا پڑھا لکھا ہونا اچنبھے کی بات بھی نہیں —— مگر شاعری سے اس اکتساب کا کوئی تعلق نہیں کیونکہ شاعری کوئی عملی چیز نہیں یہ تو محض تخلیقی شے ہے۔

مالہ وماعلیہ میں جو لفظیاتی تنقید کی گئی ہے اس سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعروں کی نارسائی علم کی کمی بیشی کی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے ہے کہ وہ سہل انگاری سے کام لیتے ہیں ورنہ جگر کی زبان دانی میں کسے شک ہو سکتا ہے اور اگر محض رسمی علم کچھ معنی رکھتا ہے تو پھر جوش (جن کا رسمی علم جگر سے بہتر ہے) کیوں غلطیاں کرتے ہیں۔

میں نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ نیازؔ کی تنقیدیں لفظیاتی ہیں مگر ان کے انتقادی کام کی یہ تعریف یا تحدید قدرے ناقص ہے۔ بعض احباب نے نیازؔ کی تنقید کو جذباتی رومانی تنقید کہا ہے اور یہ غلط بھی نہیں مگر اس امر سے انکار نہیں ہو سکتا کہ نیازؔ نے اپنی سب انتقادی تحریروں میں عقلی اصول بندی بھی کی ہے۔ نیاز کو اردو ادب میں رومانیت کی تحریک کا ایک ممتاز رکن خیال کیا جاتا ہے۔ ان کے تخلیقی ادب اور انتقادی ادب دونوں میں یہ رومانیت در آئی ہے مگر اس کے باوصف وہ اپنے زمانے کے ایک بڑے عقل پسند ادیب بھی ہیں۔

بات کچھ یوں ہے کہ رومانیت یا غیر رومانیت —— کوئی شے بھی ہو۔ یہ ممکن نہیں کہ کسی ایک کے مزاج اور اظہار میں ان میں سے صرف ایک ہی رنگ (خالصتاً ایک ہی رنگ بلا شرکت غیر) موجود ہو۔ عام طور سے یہ دیکھا گیا ہے کہ بعض ادیب حیرت انگیز طور پر متضاد رویوں کے امتزاج کے نمائندہ بن جاتے ہیں۔ فرانس کے ادب میں روسو کی طبیعت کا تجزیہ کیجئے۔ اصلاً وہ حد درجہ رومانی مزاج کا آدمی تھا مگر یہی آشفتہ مزاج شخص جب "معاہدہ عمرانی" لکھنے بیٹھتا ہے تو اصول بندوں کا گرو معلوم ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے نیاز کو بھی عقل پسند رومانی کہہ دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

نیازؔ کی تنقیدوں میں مومنؔ کا جائزہ خیال انگیز بھی ہے اور اختلاف انگیز بھی۔ جذباتی اور تاثراتی تنقیدوں کی مصیبت یہ ہے کہ ان میں بحث کرنے کی گنجائش بہت کم ہوتی ہے۔ یہ اس لئے کہ ایسی تنقیدوں میں نقاد یا ناقد اصول بندی بھی کرتا ہے تو اپنے تاثر کی حاکمیت کے زیر اثر۔ یعنی وہ اپنے ہی تاثر کو حکم بلکہ حاکم بنا لیتا ہے اور اس کے احکام کو قابلِ قبول زبان میں پیش کر کے دوسروں کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اگر کوئی نہیں

ماننا تو وہ صاف صاف کہہ دیتا ہے۔ "نہ میں اپنی پسندیدگی پر آپ کو مجبور کرسکتا ہوں اور نہ آپ مجھ سے اپنی عدم پسندیدگی کو بہ جبر تسلیم کراسکتے ہیں۔" "من ویزدان" کے مصنف کی یہ چیرہ دستی، تنقید آخر تنقید ہے اس میں جبر ہے بھی اور نہیں بھی، مگر اس کا کل فیصلہ ذاتی پسند و ناپسند کے ہاتھ میں نہیں ہوتا۔ اور اس فیصلے کو مستحکم عقلی اصولوں کی ضرورت ہے۔

مومن کی شاعری پر ذاتی پسند کی بنا پر ایمان لے آنا ممکن ہے مگر مسلّم اصول تنقید کی روشنی میں مومن کو اردو کا سب سے بڑا شاعر کہہ دینا بالکل جدا چیز ہے۔ لیکن نیاز کا اصولیاتی استدلال اتنا زور دار ہوتا ہے کہ ان کی تنقید کو پڑھ کر کچھ دیر کے لئے ان کا ہم نوا ہو جانا پڑتا ہے۔ مجھے کلیات مومن دے دو۔ باقی سب اٹھالے جاؤ۔" واقعی مومن بڑا شاعر ہے بہت بڑا شاعر ہے۔ کلیات مومن کے علاوہ باقی سب اٹھالے جاؤ۔ باقی سب اٹھالے جاؤ۔

ہم نیاز کے اس دعوے کو تسلیم کر کے آگے بڑھتے تو معترض نے کہا۔ اس دعوے کی دلیلیں بھی تو دیکھو اور فکر معقول سے ان کا تجزیہ بھی تو کرتے جاؤ۔ دلیلیں یہ ہیں:۔

"کسی خیال پر نقد کرنے کے لئے سب سے پہلے اصول فطرت پر نظر ڈالنا چاہیئے اور یہ دیکھنا چاہیئے کہ وہ خیال کس حد تک درمیانی منازل طے کرتا ہوا فطرت کے ساتھ ساتھ چلا ہے اور اگر کوئی شخص اس طرح فیصلہ کرنے پر قادر ہو تو پھر دوسرا اصول یہ ہے کہ اس کو صرف اپنی ہی رائے پر اعتماد کرنا چاہیئے اور سمجھ لینا چاہیئے کہ ـــ! "جو کچھ میں کہتا ہوں وہی صحیح ہے۔" اور اس اصول کے مطابق میں مومن کے کلام پر ایک سرسری نظر ڈالوں گا۔"

اپنے تاثر پر یہ ناقابل شکست اعتماد تاثر کی مطلق العنان سلطانی کے آئین سے ملتا جلتا اعتماد ہے۔ لیکن نیاز نے اس کے ہمراہ یہ اصول بھی پیش کیا ہے کہ "سب سے پہلے اصول فطرت پر نظر ڈالنا چاہیئے اور یہ دیکھنا چاہیئے کہ وہ خیال کس حد تک . . . . فطرت کے ساتھ چلا ہے۔" پس اگر فطرت کو ثالث اور حکم بنانا ہے تو اس صورت میں ہر شے کو سائنس عقلی اور نفسیاتی نتائج کی روشنی میں پیش کرنا لازمی ہوگا کیونکہ فطرت اپنے تجزیے کے لئے ان ہی وسائل کی محتاج ہے اور اس میں تاثر کا حکم اس طرح نہیں چل سکتا جس طرح مندرجہ بالا اقتباس میں ہمیں محسوس ہو رہا ہے۔ "کہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہی صحیح ہے۔"

مقصود کلام یہ ہے کہ نیاز کی تنقید جذباتی اور تاثراتی ہے مگر نیاز ذہناً عقل پسند آدمی ہیں اس لئے اپنی "تاثراتی" تنقید کو عقلی اصولوں کے پردے میں چھپا دینا چاہتے ہیں۔ ان کی تنقیدوں میں تاریخی شعور اور ماحول کے اثرات کا بھی اعتراف پایا جاتا ہے اور بہت سے موقعوں پر وہ شاعر کی شخصیت اور نفسیات سے بھی بحث کرتے ہیں مگر یہ سب کچھ اس طرح ملا جلا ہے کہ واضح طور پر انہیں کسی ایک دبستان سے متعلق کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ ماسوا اس کے کہ ان کو زبان کے دبستان کا رکن اعظم کہہ دیا جائے۔ بہرصورت ان ملی جلی چیزوں کے اندر سے وہ اس مخصوص طرز انتقاد ظہور میں آتا ہے جسے نیاز کا رنگ خاص کہا جاسکتا ہے۔

شاعری میں صداقت و حقیقت اور اس کے طرز اظہار اور اسلوب کے رابطے کی بحث کے بارے میں بھی نیاز کے خیالات قابل توجہ ہیں۔ مثلاً انہوں نے فرمایا کہ "شاعری حقیقت نہیں ہے بلکہ حقیقتوں کا اظہار ہے۔ صداقت نہیں بلکہ صداقتوں کی تعبیر ہے۔ خود کوئی کیفیت نہیں ہے بلکہ کیفیت کا ایک بیان ہے اور تعبیر بیان کا اختلاف فطرتِ انسانی ہے۔"

ان چند جملوں میں نیاز نے اپنے سب انتقادی مضامین کا خلاصہ پیش کر دیا ہے۔ لکھنؤ کی شاعری کو جو تحسین نیاز کے مضامین میں ملتی ہے وہ بھی اسی نظریے کے زیر اثر ہے۔ یعنی ان کے نزدیک حسن خارجی حقیقت سے عبارت ہے اور ادب اور شاعری اور جملہ فنون کی آبرو ان کے طرز اظہار سے قائم ہے معانی جو کچھ بھی ہوں ہوا کریں اصل شے ان معانی کا طریق اظہار ہے۔ معانی کے مقابلے میں حسن ظاہری پر اصرار لکھنؤ کے ادبی تصورات کے عین مطابق ہے۔ نیاز کے یہاں لکھنویت کی حمایت اور طرز لکھنؤ کی تحسین کی جو صورتیں ملتی ہیں وہ اسی نظریے کی وجہ سے ہیں یا طرز لکھنؤ کی تحسین کی خاطر یہ نظریہ اختیار کیا گیا ہے یہ اور بات ہے کہ نیاز اپنی آزاد تنقیدوں میں غیر شعوری طور پر معنی اور حسن الفاظ کے فاصلوں کو مٹانے پر بھی اصرار کرتے دکھائی دیتے ہیں ــــ
. . . . اگر یہ نہیں تو ان کی ساری لفظیاتی تنقید

بے کار ہو جاتی ہے۔ دلیل یہ کہ زبان کی نارسائی کا شکوہ پیدا ہی اس لئے ہوتا ہے کہ شاعر کا اصل مقصد بعض تجربات یا معانی کا اظہار تھا جس میں ادیب و شاعر کو اس لئے ناکامی ہوئی کہ وہ معانی سے کامل مطابقت رکھنے والے معنی خیز الفاظ نہ لا سکا۔ اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ شاعری بذات خود ایک ایسی حقیقت ہے جس میں معانی اور ان کے اظہار کا اسلوب باہم ملا ہوا ہوتا ہے۔ شاعر کے پیش نظر بعض جذباتی سچائیاں ہوتی ہیں جن کا تقا عقلی کے مطابق ہونا ضروری نہیں۔ یہی جذباتی سچائیاں شاعری کے قماش کا جزو لاینفک ہیں۔ اظہار اور تعمیر کو ان سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔

میں مضمون کے آغاز میں عرض کر چکا ہوں کہ نیاز اردو انتقاد کی تاریخ میں امتیازی مقام رکھتے ہیں اور ان کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے ناتمام اور نارسا شاعری میں سخت گرفت کی ہے۔ انہوں نے اس سہل انگاری کے خلاف شدید احتجاج کیا ہے جو شاعر کو اس کے فن کے بارے میں کام چور بنا دیتی ہے۔ شاعری کے چمن میں "سبزہ بیگانہ" کی نمود نیاز کو ایک آنکھ نہیں بھاتی —— اور "سبزہ بیگانہ" سے مراد وہ کھردری بے ساختگی ہے جو شاعر کو اپنے کلام پر نظر ثانی سے روکتی ہے۔ میرے خیال میں نیاز نے بھونڈی شاعری کے خلاف آواز بلند کرکے اردو ادب پر بڑا احسان کیا ہے۔ اسی طرح نیاز کا یہ بھی احسان ہے کہ انہوں نے دبستان دہلی لکھنؤ کے تقابلی مطالعہ میں توازن پیدا کیا اور یہ بتایا کہ لکھنؤ اپنی سب کمزوریوں کے باوجود ادبی حسن و جما کے بعض خاص تصورات رکھتا تھا جن میں سے بعض کو کسی حال میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً ادب میں وضع داری کا سوال۔ یا ادب میں خوش پوشی کی اہمیت جس سے مراد فقط یہ ہے کہ ادب کے لباس یعنی زبان و بیان کو بہر حال حسین ہونا چاہیئے۔ نیاز نے زبان و بیان کے حسن پر بھی زور دیا ہے اور زبان و بیان کی بلاغت اور "رسائی" پر بھی —— انہوں نے اپنی تنقیدوں میں بعض اور مسائل بھی چھیڑے ہیں مگر میں شعر فہمی کو نیاز کے نقادانہ مرتبے کی اصل بنیاد مانتا ہوں۔

"اس میں شک نہیں کہ قوت فیصلہ ذاتی و انفرادی جذبات سے بہت متاثر ہوتی ہے، لیکن اگر فیصلہ کرنے والا اس کیفیت سے مغلوب ہو جائے تو پھر قانون و انصاف کا خاتمہ ہے۔ ایک نقاد کو بھی اپنا فیصلہ حاکم عدالت کی طرح کرنا چاہیئے، جس کے سامنے نہ فریقین کی ہستی ہوتی ہے اور نہ خود اس کی ذاتی خواہش و تمنا۔ وہ صرف واقعات و حالات کو دیکھتا ہے اور انھیں سے استدلال کرتا ہے۔ خود پہلے سے کوئی رائے قائم کر کے اسی کی تائید میں حجت و دلیل کی جستجو کرنا حاکم و نقاد کا بدترین عیب ہے اور اگر ہم صالح ادب کی تخلیق چاہتے ہیں تو ہمیں اس غیر صالح انتقاد کو ترک کرنا پڑے گا۔

میں سمجھتا ہوں کہ نقاد کے فرائض حاکم عدالت کے مقابلہ میں زیادہ اہم ہیں۔ کیونکہ حاکم کے سامنے صرف حال ہوتا ہے، لیکن نقاد کو ماضی، حال اور مستقبل تینوں پر غور کرنا پڑتا ہے۔ جو کچھ ہو چکا ہے اس کے لحاظ سے وہ مؤرخ ہے، جو ہو رہا ہے اس کے لحاظ سے وہ مفکر ہے اور جو کچھ ہونے والا ہے اس کے اعتبار سے وہ پیغمبر ہے۔ اور ان تینوں فرائض کو پوری دیانت و امانت کامل حزم و احتیاط کے ساتھ ادا کرنا آسان نہیں۔

اس میں شک نہیں انسان فطرتاً بہت کمزور ہے اور اس کا جذبات سے مغلوب نہ ہونا آسان بات نہیں۔ اسی لئے اچھا نقاد وہی ہو سکتا ہے جو تھوڑا سا "فوق الانسان" ہو اور محبت و عناد دونوں سے بلند تر۔" (نیاز)

تاثراتی وجمالیاتی تنقید میں نیاز کا حصّہ

(ڈاکٹر عبادت بریلوی)

اردو میں تاثراتی اور جمالیاتی تنقید کا ذکر کرنے سے قبل یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ تاثراتی اور جمالیاتی تنقید کس کو کہتے ہیں؟ وہ کن خصوصیات کی حامل ہوتی ہے، اس کا کیا مقصد ہوتا ہے؟ ادب کو وہ کس راستے پر لے جاتی ہے۔؟ اور خود ادب میں اس کی جگہ کیا ہے؟

ادب کو تاثرات کا فنی اظہار سمجھا جاتا ہے۔ ادب یا فن کار پر خارجی حالات و واقعات کے جو نقوش ثبت ہوتے ہیں ان کا اظہار ادب ہے اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ تاثر ادب کے لئے ضروری ہے بعضوں کا یہ خیال ہے کہ کسی قسم کا تاثر ہو اگر فنی خصوصیات کے ساتھ پیش کر دیا جاتا ہے تو ادب ہے اس سے پڑھنے والوں یا لکھنے والوں کو حظ بھی حاصل ہوتا ہے۔ اس نظریئے کے علم بردار ان حالات کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتے جن کی وجہ سے وہ تاثرات پیدا ہوئے اور نہ ان نتائج سے کوئی سروکار رکھتے ہیں جو ان تاثرات کے اظہار کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ صرف حظ حاصل کرنا ان کا مقصد ہو جاتا ہے چنانچہ ادب و فن میں افادیت کی خصوصیت پس منظر میں جا پڑی ہے وہ جمالیات اور صرف جمالیات تک محدود ہو کر رہ جاتے ہیں لائی جائی نس (LONGINUS) اور والٹر پیٹر (WALTER PATER) سے لے کر کروچے (CROGE) اور اس کی اظہاریت (EXPRESSIONISM) کی تحریک میں یہی بنیادی خیال کارفرما نظر آتا ہے۔

اس نظریئے کے اثرات تنقید میں اس تحریک یا دبستان کی صورت میں نمایاں ہوئے ہیں جس کو تنقید کا تاثراتی IMPRESSIONIST کہا جاتا ہے اس دبستان کی خصوصیات یہ ہیں کہ تنقید نگار صرف ان تاثرات کا اظہار کرتا ہے جو کوئی تخلیق اس کے دل و دماغ پر چھوڑتی ہے۔ وہ نہ صرف ان نقوش ہی کے پیش کر دینے کو معراج سمجھتا ہے جو کسی فن پارے نے اس کے ذہن ثبت کئے ہیں۔ سرور و مسرت کی ان لہروں کی تصویر کشی جو فنی تخلیق اس کے دل و دماغ پر پیدا کرتی ہے اس کے نزدیک مقصد بن جاتی ہے اور وہ ادب کو تفریح طبع اور لذّت اندوزی کا مترادف سمجھ لیتا ہے۔ ادب اور سماج کے تعلق سے اس کو غرض نہیں ہوتی اور نہ فنی تخلیق کو سماجی حالات کے پس منظر میں دیکھنا اس کے نزدیک ضروری ہوتا ہے اس کی تنقید صرف تاثرات کا اظہار ہوتی ہے۔ چاہے اس کی نوعیت کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ اس کا انداز تنقید کچھ اس قسم کا ہوتا ہے کہ فلاں نظم مجھے پسند ہے۔ کس قدر حسین اور دلکش ہے وہ اس کی کیا تعریف کی جائے وہ میرے دل میں عجیب قسم کی لہروں کو بیدار کرتی ہے۔ یہ لہریں میری خوشی کا باعث بنتی ہیں۔ ایسی خوشی اور مسرت کے اظہار ہی کو میں اس پر بہترین تنقید سمجھتا ہوں۔ اور اس سے بہتر تنقید ہو بھی کیا سکتی ہے کہ میں صرف ان تاثرات کا اظہار کر دوں۔ اس کے علاوہ میں کہہ بھی کیا سکتا ہوں۔ میرے بس میں تو

صرف اتنا ہی ہے۔ دوسروں پر یہ فنی تخلیق دوسرے اثرات چھوڑے گی۔ اور ان کو اختیار ہے کہ وہ تاثرات کا اظہار دوسرے طریقے پر کریں۔ اگر ایسا ہو تو ہم میں سے ہر ایک کے تاثرات ایک دوسری فنی تخلیق کو ظہور میں لائیں گے جو اس فنی تخلیق کی جگہ لے لے گی جس نے ہمیں متاثر کیا۔ یہی تنقید کا فن ہے۔ ان حدود سے وہ کسی طرح باہر نہیں جاسکتا۔[1]

تنقید کے اس رجحان نے اگرچہ آج ایک مستقل اسکول کی صورت اختیار کرلی ہے لیکن ذرا غور سے دیکھنے کے بعد یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اس میں ابتدائے آفرینش کے وحشی انسان کی نفسیات کی خصوصیات پوری طرح موجود ہیں۔ وحشی انسان بھی مختلف چیزوں کو دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔ اس خوشی کے اظہار کے لئے اس کے پاس الفاظ نہیں تھے۔ اس لئے وہ اشاروں سے کام لیتا تھا۔ دور وحشت کے آرٹ اور ادب میں یہی خصوصیات ملتی ہیں۔ ان میں تاثرات کا اظہار سادگی کے ساتھ کیا گیا ہے۔

انسان کو دور وحشت کی چند خصوصیات بھی عزیز ہیں۔ چناں چہ تنقیدی نظریات کی تاریخ میں کئی ایسے نام ملتے ہیں جن کا رجحان تاثراتی تنقید کی طرف تھا۔ لان جائی نس، پیٹر، آسکر وائلڈ، کروچے ان سب کی تنقید میں یہی رجحان موجود ہے اور پھر ادھر آکر ہمیں اسپنگرن (SPINGARN) کے ایسے ارتقا ملتے ہیں جن کے انہماک نے تاثراتی تنقید کا ایک اچھا خاصا اسکول ہی قائم کردیا ہے اور جس نے ایک مستقل حیثیت اختیار کرلی ہے۔

اردو تنقید کی تاریخ میں بھی تاثراتی تنقید کی جھلکیاں کہیں کہیں نظر آجاتی ہیں۔ سب سے پہلے تو اردو میں داد دینے کی وہ روایت ہی موجود ہے جس کا سلسلہ مشاعروں سے شروع ہوا تھا۔ اس روایت کے اثرات تذکروں میں بھی ملتے ہیں اور دوسرے نقادوں پر بھی اس کا اثر ہے، حالی، شبلی تک کے یہاں کہیں کہیں اس کے اثرات موجود ہیں۔ ان کی تنقید میں بھی داد دینے کا پہلو ملتا ہے، لیکن ان کے بعد سب سے زیادہ جن نقادوں کے یہاں یہ خصوصیت نمایاں ہے وہ امداد امام اثر اور مہدی افادی ہیں۔ مہدی افادی کی تنقید کو مجنوں گورکھپوری نے پیٹر کی طرح ارتسامی (تاثراتی) بتایا ہے[2] امداد امام اثر کا بھی یہی انداز ہے۔ انہوں نے صفحے کے صفحے اس کے لئے وقف کردیئے ہیں۔ ان کے بعد ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی تنقید میں بھی اس رنگ کی جھلکیاں مل جاتی ہیں لیکن اس کو ایک مستقل فن بنا کر پیش کرنے کا سہرا اس دور کے سر ہے جس میں جذباتیت اور رومانیت اپنے پورے شباب پر تھی۔

یہ جذباتیت اور رومانیت جو کم و بیش سنہ ۱۹۳۰ء تک اردو ادب پر چھائی رہی بڑی حد تک مغرب کے اثرات کا براہ راست نتیجہ ہے اس زمانے میں شاعری اور افسانہ نگاری، خاص طور پر اس رنگ میں رنگی ہوئی نظر آتی ہے۔ اگرچہ اس زمانے میں اصلاحی و انقلاب کے پیغام بھی دیئے جارہے تھے۔ حب وطن کی تانیں بھی الاپی جارہی تھیں۔ سیاست کو موضوع بھی بنایا جارہا تھا لیکن بعض افسانہ نگار، اور شاعر مغرب کے زیر اثر حقیقتوں سے منہ موڑ کر جذباتیت اور رومانیت کے دھارے پر بھی بہے جارہے تھے۔ ان پر آسکر وائلڈ اور اسی طرح کے دوسرے لکھنے والوں کا اثر گہرا تھا۔ اسی وجہ سے ان کی تحریروں

---

[1] THE NEW CRITCISM: AMERICAN CRITICAL ESSAYS XIX + XX CENTURY PP. 427-429

[2] مجنوں گورکھپوری:۔ مہدی حسن افادی الاقتصادی کا طرز نگارش:۔ سالنامہ اضطراب ۱۹۳۱ء ص ۱۸۲

یہ اثر نظر آتا ہے۔

افسانہ نگاری اور شاعری کے ساتھ ساتھ اس زمانے میں اردو، تنقید بھی اس رجحان سے متاثر ہوئی جس کے نتیجے میں جذباتیت اور رومانیت کا رنگ اس میں بھی پیدا ہو گیا۔ یہ بھی مغرب کے براہ راست اثرات کا نتیجہ تھا۔ آسکر وائلڈ اور پیٹر وغیرہ کے خیالات اس زمانے میں بہت عام ہوئے اور انہیں کے زیر اثر تنقید کے اس رجحان نے ترقی کی نیاز فتح پوری جو اپنی افسانہ نگاری اور دوسری تحریروں میں بھی یہی رنگ پیدا کر کے اچھی خاصی شہرت حاصل کر چکے تھے اور جنھوں نے دو چار ادیبوں کو ساتھ لے کر اس کا ایک اسکول ہی قائم کر دیا تھا اس قسم کی تنقید کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کا علمبردار بن گئے، کیونکہ انہوں نے اس طرف پوری توجہ کی۔ ان کی تنقید میں جذباتیت اور رومانیت کا رنگ غالب ہے۔ اسی وجہ سے اس میں تاثراتی تنقید کی تمام خصوصیات نظر آتی ہیں۔

نیاز فتح پوری کی کوئی مستقل تصنیف تنقید پر نہیں ہے صرف مضامین ہیں جو ان کے رسالہ "نگار" میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے۔ یہ مضامین اب "انتقادیات" کے نام سے دو جلدوں میں شائع کر دیے گئے ہیں۔ ان کے انہیں مضامین سے ان کے تنقیدی خیالات و نظریات اور انداز تنقید کا پتا چلتا ہے۔

شاعری کے متعلق انہوں نے اپنی مضامین میں مختلف مقامات پر اظہار خیال کیا ہے ایک جگہ غزل گوئی عشق و محبت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ محبت یا عشق فی الحقیقت ایک شدید قسم کا احساس پسندیدگی ہے اور اسی احساس و تاثر کے اظہار کا نام شعر ہے، ہم کسی پھول کو دیکھتے ہیں یہ بھی شعر ہے۔ ہم شفق کی رنگینی سے متاثر ہوتے ہیں اور اس کا اظہار کرتے ہیں یہ بھی شعر ہے۔ ہم قوس قزح کو دیکھتے ہیں اور بے اختیار کلمات تحسین زبان سے نکل جاتے ہیں۔ یہ بھی شعر ہے۔ اسی طرح کائنات میں قدرت کے جتنے مظاہر و آثار ہیں وہ سب انسان کے احساس پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ اور جو کیفیت ان سے پیدا ہوتی ہے ان کو ظاہر کر دینا شعر ہو سکتا ہے بشرط آنکہ اس اظہار میں ترنم کو قائم رکھا جائے اور اسی ترنم کو پیدا کرنے کے لئے مخصوص لب و لہجہ اور مخصوص اوزان وضع کئے گئے ہیں[۵۱] اس سے پتا چلا کہ ان کے نزدیک دنیا کے مظاہر اور حالات و واقعات کے جو اثرات انسانی ذہن اور دل و دماغ قبول کرتا ہے، ان کو مخصوص انداز میں مخصوص اوزان و بحور کے سانچے میں ڈھال کر پیش کر دینے کا نام شعر ہے۔ لیکن وہ ان مظاہر میں حسین چیزوں کی طرف خاص طور پر توجہ کرتے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک مظاہر حسن شاعری کے لئے ضروری ہیں کیوں کہ ان مظاہر سے ہر شخص کا متاثر ہونا لازمی ہے۔ ایک دوسری جگہ اسی خیال کا اظہار کیا ہے کہ "شاعری صرف تاثرات کی زبان ہے"[۵۲] یہ تاثرات مختلف قسم کے ہو سکتے ہیں ان کے کوئی خاص حدود مقرر کر دینا مناسب نہیں وہ اس کا تعین کرنا نہیں چاہتے چناں چہ لکھتے ہیں "یہ گفتگو کوئی معنی نہیں رکھتی کہ ان تاثرات کی نوعیت کیا ہے۔ چہ جائیکہ اخلاقیات اور مذہبیات وغیرہ کی بحث چھیڑنا کہ اسے تو شاید کوئی پیغمبر بھی گوارا نہ کرے۔ اگر وہ شعر کہنے پر آ جائے[۵۳]۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اخلاقیات

---

[۵۱] نیاز فتح پوری، انتقادیات جلد دوم صفحہ ۱۹۱-۱۹۲

[۵۲] ایضاً۔ صفحہ ۳۳۸ ،، اول صفحہ ۳۴۰

[۵۳] ،، ،، انتقادیات جلد اول صفحہ ۳۳۸

مذہبیات یا اقتصادیات و معاشیات کی قدروں اور ان کے مسائل کو شاعری کے لیے ضروری قرار نہیں دیتے۔ شاعری ان کے نزدیک دل کا معاملہ ہے اور چوں کہ ہر دل کے مختلف جذبات ہو سکتے ہیں اسی وجہ سے وہ شاعری کو مخصوص جذبات کی ترجمانی کے لیے محدود کر دینا نہیں چاہتے ان کے خیال میں اس کے اندر تنوع کا پایا جانا ضروری ہے۔ مجموعی اعتبار سے اگر ان کی تنقیدی تحریریں دیکھی جائیں تو یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ شاعری کو کسی بڑے مقصد کے لیے استعمال کرنے کے قائل نہیں۔ حسن کاری، حسن آفرینی اور لذّت اندوزی ان کے نزدیک شاعری کے لیے کافی ہے اور یہی ان کے نزدیک شاعری کا بڑا مقصد ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے آسکر وائلڈ کا قول نقل کیا ہے جو شاعری کو اخلاق سے علاحدہ رکھنا چاہتا ہے۔ نیاز کا خیال ہے کہ اس کی یہ رائے "شاعری کے باب میں یقیناً قابلِ عمل ہے"[۱] وہ اس کو آزاد چھوڑنا چاہتے ہیں اور ان کے پاس دلیل صرف یہ ہے کہ وہ چوں کہ صرف تاثرات کا اظہار ہے۔ اس لیے اس پر پابندی نہیں لگائی جا سکتی۔ یہ بالکل ایک تاثراتی IMPRESSIONISTIC نقطہ نظر ہے۔

نیاز کے خیال میں شاعری کا تعلق وجدان سے ہے۔ وہ براہ راست وجدان پر اثر کرتی ہے اسی وجہ سے وہ انسانوں کے لُطف کا باعث بنتی ہے ان کا خیال ہے کہ شاعری ہماری حیات دنیوی کو کام یاب بنانے کے لیے ضروری نہیں۔ کم از کم اسے ایک نوع کی وجدانی تسکین کا ذریعہ یقیناً ہونا چاہیئے، اور اگر یہ بات بھی اسے حاصل نہ ہو تو پھر ایں دفتر بے معنی غرق مے ناب اولیٰ۔"[۲] اس سے صاف ظاہر ہے کہ شاعری وجدان تسکین کا باعث بنتی ہے اس لیے اس کا مقصد سوائے لطف دینے کے اور کچھ نہیں۔ یہ بھی تاثراتی (IMPRESSIONISTIC) نقطۂ نظر ہے۔

وہ شاعری کو کسی نہ کسی پیغام کا حامل ضرور دیکھنا چاہتے ہیں، لیکن اس پیغام کی نوعیت ملکی اور ملّی ہونا۔ ان کے نزدیک ضروری نہیں۔ وہ صرف ایک بات کو دوسرے تک پہنچانے کو پیغام سمجھتے ہیں۔ شاعر کے دل کی باتیں اس کا پیغام ہوتی ہیں۔ چاہے وہ مقید ہوں یا غیر مقید! لکھتے ہیں: "ہر فطری شاعر کسی نہ کسی پیغام کا حامل ہوا کرتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ پیغام دُنیا کے لیے مفید اور ضروری بھی ہو۔"[۳] اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان کا مطلب اس پیغام سے کیا ہے۔

یہ تمام خیالات اس خیال پر صداقت کی مہر لگاتے ہیں کہ شاعری کے متعلق ان کا نظریہ عینی اور جمالیاتی ہے وہ اس کی سماجی اہمیت کے قائل نہیں ہیں اور اس وجہ سے اس پہلو پر زور نہیں دیتے۔ اس کا مقصد ان کے نزدیک صرف وجدان کی لطف اندوزی ہے۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے دُنیا کے ہنگاموں سے نجات دلا دیتی ہے۔ وہ اس کو صرف تاثرات کا اظہار سمجھتے ہیں اور بس! خواہ وہ تاثرات کسی قسم کے ہوں۔ یہ خیالات بھی اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ وہ تنقید کے تاثراتی نظریہ کے قائل ہیں۔

لیکن ان کے یہ خیالات ہمیشہ نہیں رہے۔ ان کا ردعمل ہونا ضروری تھا۔ چناں چہ آخر میں آ کر وہ ادب اور شعر

---

[۱] نیاز فتح پوری انتقادیات: جلد اول: ص۴۳
[۲] " " " ص۱۳۵
[۳] " " جلد دوم ص۳۲۹

کی سماجی اہمیت کے بھی قائل ہو گئے لیکن تاثراتی انداز بیان بھی ان سے نہیں چھوٹا۔

اپنی عملی تنقید میں انہوں نے انہیں تمام نظریات کو سامنے رکھا ہے اور جو اصول بنائے ہیں انہیں کی روشنی میں مختلف شاعروں پر تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ ان کا نظریہ چوں کہ جمالیاتی اور تاثراتی ہے۔ اس لیے ان کی عملی تنقید میں بھی یہی خصوصیات جھلکتی ہیں۔ وہ تنقید کے تاثراتی رجحان سے ــــ اور مغربی تنقید کے تاثراتی رجحان سے واقفیت ضرور رکھتے ہیں۔ چناں چہ ایک جگہ اسپنگروں کا (SPINGARN) جو تاثراتی تنقید کا سب سے بڑا علم بردار ہے تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ مسٹر اسپنگرون لکھتا ہے کہ نظم نہ اخلاقی ہوتی ہے نہ غیر اخلاقی، بلکہ وہ صرف آرٹ کا ایک نمونہ ہوتی ہے[1] یہاں وہ اس سے اختلاف کرتے ہیں لیکن یہ اختلاف اس دور کی پیداوار ہے جب ان پر ردّ عمل شروع ہو گیا تھا اور وہ ادب و شعر کی سماجی اور اخلاقی اہمیت کے ایک حد تک قائل ہو گئے تھے۔ لیکن ان کی عملی تنقید میں اس کا پتہ نہیں چلتا۔

نیاز نے اپنے انداز تنقید کی وضاحت خود کئی جگہ کی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں "جب میں کسی شاعر کے کلام پر انتقادی نگاہ ڈالتا ہوں تو اس سے بحث نہیں کرتا کہ اس کے جذبات کیسے ہیں۔ بلکہ صرف یہ کہ اس نے ان کے ظاہر کرنے میں کیا اسلوب اختیار کیا۔ وہ ذہن سامع تک اس کو پہنچانے میں کامیاب ہوا ہے یا نہیں۔ بیان خواہ حسن و عشق کا ہو یا نہر کی پن چکی کا۔ اس سے غرض نہیں۔ دیکھنے کی چیز صرف یہ ہے کہ شاعر جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ واقعی الفاظ سے ادا ہوتا بھی ہے یا نہیں"[2] اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ معانی کی طرف زیادہ توجہ نہیں کرتے۔ اسلوب کے مقابلے میں ان کے نزدیک اس کی اہمیت ثانوی ہے۔ انہوں نے کئی جگہ اپنے اس خیال پر زور دیا ہے۔

وہ اپنی عملی تنقید کی بنیاد عام طور پر اپنی ذاتی پسندیدگی اور ناپسندیدگی پر رکھتے ہیں۔ اگر کسی کی تخلیق ان کو پسند آتی ہے تو وہ اس کی تعریف کرتے ہیں اور اگر پسند نہیں آتی تو اس کو لغو اور مہمل کہہ دیتے ہیں۔ انہیں دو باتوں پر ان کی تنقید کی ساری عمارت کھڑی ہے۔ جب داد دینا چاہتے ہیں تو اس قسم کی تنقید کرتے ہیں: جزئیات کا مطالعہ اتنا وسیع ہے کہ کوہ سے لے کر پر کاہ تک کوئی چیز اس کی نگاہ سے نہیں چھوٹتی، اور آہنگِ شعر اتنا زبردست رکھتا ہے کہ ایک غیر متوازن چیز میں بھی وہ بلا کا توازن پیدا کر دیتا ہے۔ رہا الفاظ کا ذخیرہ سو اس باب میں اردو، کا کوئی شاعر اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا[3] اور کہیں کہتے ہیں "کیا خوب کہا ہے۔ اس کا جواب نہیں ہو سکتا"۔ "اس کا کون مقابلہ کر سکتا ہے" اور جب ان کو کوئی تخلیق پسند نہیں آتی تو کہتے ہیں۔ "اس سے کھلی ہوئی مثال لایعنی رعایت لفظی کی اور کیا ہو سکتی ہے"[4] اسی کے ساتھ دوسری لغویت یہ ہے" "لیکن مفہوم کیا ہے

---

[1] نیاز فتح پوری۔ انتقادیات جلد دوم ص۳۶۹

[2] " " جلد اول ص۳۳۹

[3] " " " ص۲۹۰

[4] " " " ص۸۱

اس کو خدا ہی بہتر جانتا ہے "[1] ــــــ غرض یہ کہ ان کی تنقید کا خاص انداز ہے۔ اس میں تاثراتی تنقید کی خصوصیات موجود ہیں۔ لیکن ان کی تعریف یا تنقیص کا انداز اس کو بہت بھونڈا بنا دیتا ہے۔ تاثراتی تنقید میں خود جمالیاتی اور فنی رنگ ہونا چاہیئے وہ ان کی تنقید میں نہیں ہوتا۔

ان کے نزدیک تنقید کا سب سے بڑا اصول ذاتی پسندیدگی ہے۔ لکھتے ہیں "کسی خیال پر تنقید کرنے سے پہلے اصول فطرت پر نظر ڈالنا چاہیئے اور یہ دیکھنا چاہیئے کہ وہ خیال کس حد تک درمیانی منازل طے کرتا ہوا فطرت کے ساتھ ساتھ چلا ہے اگر کوئی شخص اسی طرح فیصلہ کرنے پر قادر ہو تو دوسرا اصول یہ ہے کہ اس کو صرف اپنی رائے پر اعتماد کرنا چاہیئے اور سمجھ لینا چاہیئے کہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہی صحیح ہے"[2] اور اپنی عملی تنقید میں وہ پوری طرح انہیں اصولوں کی پابندی کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تشریح کرتے ہیں۔ تجزیہ نہیں کر پاتے اور ان کا انداز بیان اس کو تعریف و تنقیص کا مجموعہ بنا دیتا ہے۔

کلام کے انتخاب سے بھی وہ اپنی تنقید میں کام لیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ "انتخاب کلام بجائے خود نہایت واضح انتقاد ہے"[3] چناں چہ وہ شاعر کے کلام پر نظر ڈالتے ہوئے اس کے کلام کا اچھا خاصا حصہ نقل کر دیتے ہیں اور جگہ جگہ اس کی تشریح بھی کرتے جاتے ہیں۔ اس سے کلام کی خصوصیات کا اندازہ ضرور ہو جاتا ہے اور کچھ دلچسپی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

نیاز پر مشرقی رنگ تنقید کا اچھا خاصا اثر ہے۔ وہ اپنی تنقید میں معانی و بیان کی اصطلاحات کے علاوہ... جدت ادا شوخی بیان، ندرت خیال، اسلوب بیان، طرز ادا، ترکیبوں کی جدت، بندش اور قوافی و ردیف وغیرہ کا ذکر ضرور کرتے ہیں اور الفاظ کی طرف ان کی توجہ اس قدر رہتی ہے کہ وہ شاعر کے کلام میں لفظی اصلاح بھی کر دیتے ہیں۔ اصغر کے اس شعر کے متعلق ؎

نہیں ہوں درخور القان یہ جانتا ہوں میں
فریب خوردۂ عقلِ گریز پا ہوں میں[4]

اور اس طرح کی بہت سی مثالیں ان کی تنقید میں ملتی ہیں اور یہ سب ان کے تاثراتی رجحان کا نتیجہ ہے کیوں کہ وہ کسی ایسی چیز کو برداشت نہیں کر سکتے جس کو ان کا ذوق سلیم ماننے کے لئے تیار نہ ہو۔

بہرحال نیاز فتح پوری کے تنقیدی نظریات اور انداز تنقید دونوں اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ ان کا رجحان جمالیات کی طرف ہے اور اس کی نوعیت تاثراتی ہے، جو نتیجہ ہے ان کے ذہنی رجحان اور افتاد طبع کا! لیکن اس میں آسکر وائلڈ اور پیٹر وغیرہ کے خیالات کو بھی دخل ہے۔ نیاز ان سے متاثر ضرور ہوئے ہیں لیکن انہوں نے اپنی انفرادیت کو بھی برقرار رکھا ہے۔ وہ پہلے نقاد ہیں جس نے تاثراتی تنقید کی طرف پوری توجہ کی۔

---

[1] نیاز : انتقادیات : جلد اول ص ۲۰۴
[2] " " " ص ۲۲-۲۳
[3] " " جلد دوم ص ۱۹۰
[4] " " جلد اوّل ص ۲۰۶

نیاز فتحپوری بحیثیت نقاد

ڈاکٹر عبدالقیوم

انیسویں صدی کے آخر میں سرسید اور ان کے ساتھیوں نے جو اصلاحی و اخلاقی نظام بنایا تھا اس کی بے لطفی اور خشکی کا احساس بیسویں صدی کے شروع ہی سے ہونے لگا تھا لیکن جنگ عظیم کے بعد اس احساس میں شدت پیدا ہو گئی۔ ہندوستان کی اندرونی بے چینی۔ تحریک ترک موالات اور جنگ کی وجہ سے پیدا ہونے والے روحانی کرب اور اقتصادی بحران نے اس کشمکش کو اور زیادہ بڑھا دیا۔ مغرب کے بڑھتے ہوئے اثرات نے زندگی کے بہت سے گوشوں کو متاثر کیا۔ اسکر وائلڈ کے فلسفہ اصنام پرستی اور ٹیگور کی ماورائیت نے جمالیاتی تصورات کے فروغ کے لئے راستے زیادہ ہموار کر دیا اور نوجوانوں کا ایک گروہ حسن کو مقصود بالذات سمجھ کر مسرت اور حسن پر بہت زیادہ زور دینے لگا۔ انکے نزدیک زندگی کا مقصد حصولِ مسرت کے سوا اور کچھ نہ رہا۔ یہ تحریک اگرچہ مغرب سے آئی تھی لیکن اس میں مغربی افکار کی سنجیدگی نہ تھی بلکہ زیادہ تر توجہ جمالیات کی طرف رہی اس غلبہ نے سماجی احساس سے دوری پیدا کر دی اور زندگی کی دوسری ضرورتیں پس پشت جا پڑیں۔ ادب لطیف کی اس تحریک کے علم برداروں میں سجاد حیدر یلدرم، مہدی افادی، سجاد انصاری اور نیاز فتحپوری کے نام بہت نمایاں ہیں

رومانیت کے یہ پجاری دراصل انفرادیت، انانیت و جذباتیت اور بغاوت کے طلسم میں اسیر ہو گئے انکی بدولت جہاں عقلیت اور روایت پرستی کا غلبہ کم ہوا وہیں غیر حقیقی تصورات نے بھی فروغ پایا۔ نقادوں کا خیال ہے کہ "ان غیر حقیقی تصورات کی واضح مثال نیاز فتحپوری کی تخلیقات میں ملتی ہے"۔ مگر اس سے انکار ممکن نہیں کہ ان میں سب سے اہم شخصیت نیاز ہی کی ہے جن کی بدولت ادب میں لطافت کی چاشنی پیدا ہوئی اور بہت سی فرسودہ روایات کو صدمہ پہنچا تقلید کی بندشیں اور زیادہ ڈھیلی ہوئیں لیکن جہاں تک فن کا تعلق ہے اس کے متعلق یہ غلط فہمی نہیں پیدا ہونی چاہیئے۔ مغربی افکار سے واقفیت کے باوجود وہ اس سلسلہ میں خاصے قدامت پسند ہیں عربی اردو فارسی پر عبور رکھنے کی وجہ سے یہ رجحان اور زیادہ مستحکم ہوا۔ بلاشبہ نیاز کو شعر و ادب سے بہت دلچسپی ہے لیکن رومانیت سے شغف کی وجہ سے انکی نگاہ شعر کے جمالیاتی پہلو سے آگے نہیں بڑھتی اسی روشنی میں انہوں نے فکر و فن کے سانچے بنائے اور ایک مخصوص انداز تنقید سے لوگوں کو طویل عرصہ تک روشناس کراتے رہے۔ بہتوں کو ادبی شہرت بخشی لیکن بہتوں کو محروم کرنے کی بھی کوشش کی زبان و بیان کی بہت سی لغزشوں کی اصلاح کی۔ اردو میں حالی کے اثر سے فن کی جو اہمیت کم ہوتی جا رہی تھی اور اسے نظر انداز کرنے کا جو رجحان بڑھ رہا تھا نیاز کی بدولت یہ سیلاب م ہوا لیکن تنقید جو پھیلاؤ چاہتی ہے وہ ان کے یہاں پیدا نہ ہو سکا غیر معمولی ذہانت اور علمیت کے باوجود قدامت پسندی انھیں قدیم انداز تنقید کے تنگنائے سے نکلنے نہیں دیتی اور احساس جمال کی شدت انھیں سماجی مسائل تک نہیں پہنچنے دیتی۔ درحقیقت نیاز کی تنقیدیں تاثرات اور جمالیات ے مرکب ہیں۔ اگرچہ وہ سماجی مسائل کا ذکر ادبیات میں لازمی نہیں سمجھتے لیکن وہ جدید خیالات سے واقف ہیں اور اپنے عہد کو خوب سمجھتے ہیں البتہ ظام کے اثرات اور تہذیبی تبدیلیوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

نیاز تنقید میں شاعر کی سوانح حیات۔ زندگی کے نشیب و فراز و ماحول۔ خاندانی حالت۔ تعلیم و تربیت۔ بچپن۔ جوانی اور زندگی کی دوسری نزلیں جن سے وہ گزرا ہے پیش نظر رکھنا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ نقاد کی اصلی غرض فنکار کی تخلیق اور ان اسباب و محرکات سے زیادہ ہوتی ہے

جو کسی تخلیق کے وجود میں آنے کا سبب بنتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ ایک نقاد کو ان باتوں پر نظر رکھنی چاہیئے لیکن اس تفصیلات کی کچھ حدود ہیں نقاد ان سے اگر آگے بڑھا تو پھر وہ بہت سی اہم باتوں کو فراموش کر جائے گا اس کا کام صرف زندگی کی عکاسی کرنا نہیں بلکہ اس پر ناقدانہ نگاہ بھی ڈالنا ہے۔ جسطرح ایک فنکار کے ذاتی تجربات جب تک سماجی ماحول سے ہم آہنگ ہو کر ظاہر نہیں ہوتے ان میں توانائی نہیں آتی چونکہ اس کے مخاطب دوسرے بھی ہوتے ہیں اس لئے فنکار کے لئے بھی ذاتی ذوق کے لئے گنجائش بہت کم باقی رہ جاتی ہے اور اسی نسبت سے نقاد کے لئے ذاتی پسند یا ناپسند کا طریقہ بھی مستحسن نہیں قرار دیا جا سکتا اور نہ تخلیق کو محض فن اور فارم تک محدود کرنا مناسب ہوگا جہاں تک نیاز کی تنقیدوں کا تعلق ہے انہوں نے بہت سی اہم اشخاص پر اہم تنقیدیں کی ہیں اور اپنے خیال میں انھیں زمانہ اور ماحول سے ہم آہنگ کرنے کی بھی کوشش کی ہے لیکن ان کا رجحان انداز بیان کی طرف زیادہ ہے وہ شاعری میں یہ دیکھتے ہیں" کہ شاعر جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ واقعی الفاظ سے ادا بھی ہوتا ہے یا نہیں اور وہ سامع کے ذہن میں تک پہنچنے میں کامیاب ہوا ہے یا نہیں۔ یعنی انہیں جذبات سے سروکار نہیں اسی لئے وہ شعر کی ماہیت پر بہت کم توجہ دیتے ہیں" ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ اس میں شک نہیں کہ لٹریچر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ جذبات انسانی کو حرکت میں لائے اور اس لئے ادبیات میں اہم ترین اسکی "جذباتی قیمت" ہے جو تصنیف ہمارے جذبات کو ابھار سکتی ہے وہ یقیناً ادبیات میں داخل ہے خواہ اسکی کوئی اخلاقی قیمت ہو یا نہ ہو (ادبیات اور اصول نقد انتقادیات حصہ دوم) یا "کسی تصنیف یا کتاب کے متعلق یہ بحث کرنا کہ وہ اخلاق کا درس دیتی ہے یا بداخلاقی کا بالکل لایعنی سی بات ہے اس کے متعلق صرف یہ بحث ہو سکتی ہے کہ" وہ تصنیف ایک تصنیف کی حیثیت سے اچھی ہے یا بری" اسکر وائلڈ کی یہ رائے جملہ اصناف تصنیف و تالیف پر حاوی ہو یا نہ ہو لیکن شاعری کے بارے میں، یقیناً قابل عمل ہے اور میں کبھی شاعری کے اخلاقی یا غیر اخلاقی ہونے سے بحث نہیں کرتا بلکہ یہ دیکھتا ہوں کہ بری یا بھلی جو ودیعت فطری ایک شاعر کو عطا ہوئی ہے اس کا استعمال اس نے درست کیا یا نہیں، (ظفر کی شاعری)

جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ نیاز کے ذہنی ارتقا میں جمالیاتی حس کو بہت بڑا دخل رہا ہے اگرچہ شاعری کی کتابوں میں ان کے نزدیک بالاستیعاب پڑھنے کی چیز نہیں یہ تو کبھی فرصت کے لمحات میں دلبستگی پیدا کرنے اور اضمحلال دور کرنے کا ذریعہ ہے پھر بھی انکی نظر شعری سرمایہ پر گہری ہے اور شعری لطافت انھیں کاروبار دنیوی الجھنوں کے باوجود تھوڑی دیر کے لئے سکون بخش ہے شاعری کا یہ تفریحی پہلو اس بڑھتے ہوئے سماجی شعور کے لئے حد درجہ مہلک ہے۔ غرض نیاز کے یہاں "محبت یا عشق فی الحقیقت ایک شدید قسم کا احساس پسندیدگی ہے اور اسی احساس و تاثر کے اظہار کا نام شعر ہے...... کائنات میں قدرت کے جتنے مظاہر و آثار ہیں وہ سب انسان کے احساس پر اثر انداز ہو سکتے ہیں اور جو کیفیت ان سے پیدا ہوتی ہے اسکو ظاہر کر دینا شعر ہو سکتا ہے بشرطیکہ اس اظہار میں ترنم کو قائم رکھا جائے اور اسی ترنم کے پیدا کرنے کے لئے مخصوص لب و لہجہ اور مخصوص اوزان وضع کئے گئے ہیں۔ پھر اگر یہی جذبہ پسندیدگی افراد نوع انسانی سے کسی کے ساتھ ہو تو وہ بھی محبت کہلاتا ہے لیکن جس محبت کا تعلق غزل گوئی سے ہے وہ مخصوص ہے اس جذبہ سے جو جنسی کشش خواہش سے پیدا ہوتا ہے، (انتقادیات ص ۸۶) ظاہر ہے کہ نیاز کے نزدیک شاعری مقصد کے لئے نہیں ہے اور نہ سماجی و معاشی مسائل کا بیان شاعری میں کوئی خاص اہمیت رکھتا ہے بلکہ اس کا سب سے بڑا مقصد لذت اندوزی ہے؛ ہاں شاعر کے دل کی باتیں دوسرے کے لئے پیغام کے طور پر کام آ سکتی ہیں کہیں کہیں یہ آواز قدرے اونچی ہو جاتی ہے۔ سیماب کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "سیماب کی شاعری کا تعلق کار امروز، سے اتنا نہیں جتنا فسانہ دیروز، سے ہے یعنی جتنی خوبی کے ساتھ وہ کل کی داستان بیان کر جاتے ہیں اتنی خوبی سے وہ آج کے حقائق سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے" یا یوں سمجھئے کہ وہ ماضی کے نقوش کو تکمیل کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں لیکن حال کی تعمیر کا خاکہ انکی قدرت سے باہر ہے وہ ارض تاج کی کھوئی ہوئی عظمت کا مرثیہ تو اچھا لکھ سکتے ہیں لیکن دوسری ارض تاج پیدا نہیں کر سکتے" تغیرات زمانہ اور زندگی کی بڑھتی ہوئی الجھنوں نے انہیں سماجی و معاشی مسائل کی طرف متوجہ کیا لیکن انکی عملی تنقید کا نمایاں پہلو فن اور فارم سے زیادہ متعلق ہے وہ اسلوب بیان کے پرستار ہیں اور دیکھتے ہیں کہ الفاظ سے مطلب ادا ہوا یا نہیں

کیونکہ وہ اس بات پر مطمئن ہیں کہ جذبات و تاثرات کا اظہار الفاظ کے ذریعہ ممکن ہے اور انداز بیان ہی ایک وہ چیز ہے جس سے مخاطب کو متاثر کیا جاتا ہے اور گفتگو کا لب و لہجہ پیدا کرنا مخصوص الفاظ کی مخصوص ترکیب ہی سے ممکن ہے علاوہ اس کے جذبات کی بلندی و سخافت سب الفاظ و انداز بیان پر منحصر ہے۔

نیاز کی تنقیدوں کو پڑھئے تو بعض باتیں صاف نظر آتی ہیں وہ مغربی افکار و خیالات سے اس فن میں بہت کم فائدہ اٹھاتے ہیں یہ ضروری نہیں ہے کہ مغرب کے ہر خیال سے اتفاق کیا جائے یا ہر اصول کو اردو ادب پر منطبق کر دیا جائے لیکن فن تنقید میں مغرب نے جو غیر معمولی کارنامہ انجام دیا ہے اس سے کام نہ لینا گویا فن کے ساتھ ناانصافی کرنا ہے۔ نیاز اپنے آپ کو عموماً مشرقی اصطلاحات تک محدود رکھتے ہیں اور ساتھ ہی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کا اظہار بھی کرتے ہیں کہیں انداز تحسینی ہے اور کسی جگہ تنقیص ہے۔ تحسین و تعریف کی نمایاں مثال ان کا وہ مضمون ہے جو انہوں نے نگار کے مومن نمبر میں لکھا ہے "اگر میرے سامنے اردو کے تمام شعراء متقدمین و متاخرین کا کلام رکھ کر (باستثنائے میرؔ) مجھ کو صرف ایک دیوان حاصل کرنے کی اجازت دی جائے تو میں بلا تامل کہہ دونگا کہ "مجھے کلیات مومن دیدو اور باقی سب اٹھالے جاؤ"...... میں اپنی پسندیدگی پر آپ کو مجبور کر سکتا ہوں اور نہ آپ مجھ سے اپنی عدم پسندیدگی کو بہ جبر تسلیم کرا سکتے ہیں...... لیکن جن لوگوں نے ان دشواریوں کو محسوس کر کے اصولِ نقد منضبط کئے ہیں وہ بہت محفوظ ہیں اگر ان پر عمل کیا جائے اور حقیقت یہ ہے کہ ان پر عمل کئے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ کسی خیال پر نقد کرنے کے لئے سب سے پہلے اصول فطرت پر نظر ڈالنا چاہیئے۔ اور یہ دیکھنا چاہیئے کہ وہ خیال کس حد تک درمیانی منازل طے کرتا ہوا فطرت کے ساتھ چلا ہے اور اگر کوئی شخص اسی طرح فیصلہ کرنے پر قادر ہو تو پھر دوسرا اصول یہ ہے کہ اسکو اپنی ہی رائے پر اعتماد کرنا چاہیئے اور سمجھ لینا چاہیئے کہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہی صحیح ہے چنانچہ اسی اصول کے مطابق میں مومن کے کلام پر ایک سرسری نظر ڈالوں گا۔

(کلام مومن پر ایک طائرانہ نگاہ) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نیاز پسند اور ناپسند کے کسقدر قائل ہیں اور کس حد تک قطعیت کا راستہ اختیار کرتے ہیں بیسویں صدی میں فن نقد کی تمام بلند کتابیں پڑھیئے تو کسی جگہ بھی اسکی حمایت نہیں ملے گی بلکہ ایسے اٹل فیصلوں کو فن کا سب سے بڑا نقص بتایا گیا ہے۔ اس اصول کا سب سے خطرناک پہلو وہ ہے جب نقاد کی یہ ذاتی پسند غلط راستہ پر ڈال سکتی ہے اور اس پابندی کی وجہ سے خود نقاد سیدھے راستہ سے ہٹ جاتا ہے اور اس کا فن ادب کی خدمت کرنے کے بجائے اپنی آرزوؤں اور امنگوں میں اسیر ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس مضمون میں نیاز نے یہ بھی لکھا ہے "اگر ایک نقاد غزل کو غزل ہی کے نقطہ نظر سے دیکھے گا تو یوں بھی تصوف کے کلام کو خارج کر دے گا" عام خیال یہی تھا کہ تصوف برائے شعر گفتن خوب است، غالباً یہ کوئی نقصان دہ پہلو غزل میں ثابت نہیں ہوا، ممکن ہے کہ غزل کے متعلق نیاز کا یہ نقطہ نظر صدیوں پہلے درست ہو لیکن سر دست اسکی مقبولیت کے امکانات نظر نہیں آتے۔ غالب اور مومن دونوں نازک خیال شاعر ہیں، نیاز نے اس پہلو پر توجہ نہیں دی کہ غالب کی نزاکت خیال کسقدر وقیع اور عموماً با معنی ہوتی ہے۔ کیا مومن کے کلام میں بھی یہ صفت ہے یا انکی نزاکت خیال محض ایک پرواز تخیل ہے جس میں گرہیں پر گرہیں پڑتی چلی جاتی ہیں اور جب بقول ایک نقاد انہیں کھول لیجئے تو کوئی خاص بات پیدا نہیں ہوتی۔ کلام مومن کا یہ امتیازی وصف گتھیاں ڈالنے کا وصف ہے۔ اسکی اگلی منزل معمہ بازی ہے جسے لطافت شعری سے کوئی واسطہ نہیں مومن کا قیامت خیز انداز بیان اور مزاج کی وارفتگی نیاز کو پسند خاطر ہے۔ غالباً مومن کا انتخاب اسی بنا پر کیا گیا۔ اس ذاتی پسندیدگی و ناپسندیدگی کا سب سے خطرناک پہلو وہ ہوتا ہے جب نقاد اپنے جذبات میں آکر کسی فنکار کو گرانے یا رسوا کرنے کے لئے اپنی رائے پر اڑ جاتا ہے۔ جوش اور جگر کے کلام پر عمل جراحی بھی اسی رجحان کی آئینہ دار ہے۔ بلاشبہ نیاز صاحب کی بعض اصلاحیں بہت مفید ہیں۔ سیماب کے ایک شعر پر رائے زنی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

سکوں برسا ہوا اس کے تبسم سے محبت کا
ہے اسکے تیوریوں میں موجزن دریا صداقت کا

نیاز صاحب کا اس پر اعتراض یہ ہے کہ پہلے مصرع میں سکوں برسا ہوا بجائے (برستا ہوا) کے استعمال کیا گیا ہے جو درست نہیں دوسرے مصرع میں تیوریوں جمع استعمال کیا گیا ہے جو درست نہیں تیور میں خود جمع کا مفہوم ہے اور اساتذہ نے ہمیشہ اسکو جمع کے مفہوم میں استعمال کیا ہے علاوہ اس کے تیور ہمیشہ خشونت و برہمی وغیرہ کے محل پر استعمال ہوتا ہے اور شگفتگی سے اسے کوئی واسطہ نہیں یہ شعر یوں ہونا چاہیئے۔

جبیں صاف پر تھا موجزن دریا صداقت کا
برستا تھا سکوں اس کے تبسم سے محبت کا

یوں تو نیاز صاحب جوش کے قائل نہیں رہے لیکن موجودہ دور میں حضرت جوش کی قادر الکلامی اور شاعرانہ فضیلت کے پیش نظر انکے کلام کو بطور سند پیش کیا ہی جائے گا۔ ان کا مصرع ہے۔ ع چال جیسے تند چشمے تیوریاں جیسے غزال

غالباً اس کے پیش نظر نیاز صاحب کے دو اعتراض ختم ہو جاتے ہیں۔

بیسویں صدی میں تنقید کا فن نہ مدح ہے نہ ذم بلکہ اس کا کام قدروں کی اشاعت کرنا ہے اور تجربات تجربات میں فرق کرنا۔ ادب کے تہذیبی مطالعہ میں ان سے جو مدد ملتی ہے وہ ظاہر ہے اور شعر و ادب سے زندگی کے سنوارنے کی جو توقعات وابستہ کی جاتی ہیں وہ بھی کچھ ایسی بے جا نہیں۔ خود نیاز صاحب شعر کو ایک کھلی ہوئی حقیقت تسلیم کرتے ہیں اور فطرت سے اسکو جدا بھی نہیں کرنا چاہتے پھر بھی وہ اسے ذاتی رائے کا پابند بتاتے ہیں۔ وہ شاعری میں موزونیٔ طبع کے قائل ہیں ان کے خیال میں یہ موزونیٔ طبع جذبات کو نہایت عمدہ اور واضح الفاظ میں ظاہر کر دیتی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس کی تکمیل بغیر نقد حیات کے ہو سکتی ہے۔ یہ اصول ایسا بنیادی اور واضح ہے کہ خود نیاز صاحب جب کبھی شاعری کو الفاظ سے علیحدہ اور انتقاد کو ذاتی رائے سے الگ ہو کر سوچتے ہیں تو وہ خود بھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ انتقاد کی ایک عام غلطی جس میں ہر شخص مبتلا نظر آتا ہے یہ ہے کہ نقاد سب سے پہلے یہ دیکھتا ہے کہ لکھنے والے نے اپنے ذوق کی رعایت کس حد تک کی ہے اور اس کے نقطۂ خیال سے کون کون سا حصہ ایک تصنیف کا مکمل باب کہا جا سکتا ہے۔

نیاز شاعری کا تعلق ذوق انسانی سے وابستہ سمجھتے ہیں وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ شاعری طبیعت کے تمام پوشیدہ اسرار کی حامل ہے انہیں اس بات کے تسلیم کرنے میں بھی کوئی تامل نہیں ہے کہ ہر قوم کی شاعری اس کے اخلاق و عادات اور زندگی کے مختلف مراحل کی آئینہ دار ہوتی ہے اور شاعری جکی بنیاد تصورات، استعارات، کنایات اور تشبیہات پر قائم ہے مگر ان لطیف پردوں کے پیچھے ایک حقیقت موجود ہوتی ہے۔ اگرچہ وہ نقد شعر کو انتقاد عالیہ کے نام سے یاد کرتے ہیں اور لٹریچر کو زندگی کی تنقید کہتے ہیں لیکن تنقید سے مراد تشریح لیتے ہیں کیونکہ تمام باتوں سے باخبر ہو کر کسی تصنیف کے متعلق جو رائے دیتا ہے وہ تشریح ہے، تنقید کے لئے وہ حد درجہ پاکیزگیٔ ذوق کی ضرورت کو محسوس کرتے ہیں۔ وہ کسی موضوع یا فن سے گہری دلچسپی نہ رکھتا ہو بلکہ علم علمی مذاق رکھتا ہو لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہر ایک عمومی آگاہی رکھنے والا شخص علم و فن کی کتاب پر نقد کرنے کا اہل ہے اس لئے جو شخص شعر کا پاکیزہ ذوق رکھتا ہے وہی دراصل نقاد کے فرائض انجام دے سکتا ہے۔ پاکیزگی ذوق پر حد سے زیادہ زور دینا اور دیگر خوبیوں پر زیادہ توجہ نہ دینا دراصل نیاز کی تنقید کو یک طرفہ بنا دیتا ہے اس طرح ان کی تنقید میں کہیں توصیفی اور کسی جگہ تنقیص کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے اور یہیں سے جانبداری اور مخالفت کے رجحان ان کے یہاں غالب آ جاتے ہیں۔ فراق کو آگے بڑھانے اور انکی شاعری کے محاسن اجاگر کرنے میں نیاز صاحب کا بڑا ہاتھ ہے۔ یہ تعریف و توصیف اس وقت تک کوئی بری شے نہیں جب تک کسی شاعر کے کلام کا مطالعہ اصول کی روشنی میں کیا جائے لیکن جب نقاد اصول کی سرحدوں سے گزر کر محض توصیف یا تنقیص کی سرحد میں داخل ہو جاتا ہے تو تنقید محض حرف گیری رہ جاتی ہے اور اپنی افادیت مشتبہ کر دیتی ہے۔

غرض نیاز کو خواہ ہم بڑا نقاد نہ مانیں لیکن ان کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ پروفیسر کلیم الدین نے اردو تنقید پر ایک نظر میں، انہیں نظر انداز کر کے اردو تنقید کے ارتقاء کی ایک کڑی کو چھوڑ دیا ہے۔

> ”یوں تو فن نقد نہ صرف علوم و فنون بلکہ سچ پوچھئے تو ہر ہر بات پر حاوی ہے لیکن اس کی اہمیت کا صحیح اندازہ اسی وقت ہو سکتا ہے، جب آپ ادب لطیف کو سامنے رکھیں، کیونکہ وجدان و جمالیات یا نفسیات جن کو اب فن نقد کا ضروری عنصر خیال کیا جاتا ہے، ان سے زیادہ تر ادب لطیف ہی کے نقد میں کام لیا جاتا ہے۔“ (نیاز)

عملی تنقید اور نیاز فتحپوری

رشید حسن خاں

شاعری میں الفاظ وطرز اظہار کی اہمیت، اس لحاظ سے زیادہ ہے کہ خیال کو صرف انھیں کے واسطے سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ خیال کی جدت ہو یا فکر کی گہرائی یہ دونوں عناصر معرض اظہار میں آنے کے لئے، الفاظ و اسلوب کے مرہونِ منت ہیں۔ الفاظ، مناسب طرز ادا کا سہارا لے کر، ان اجنبی عناصر کو ایسے لوگوں کی فکر و خیال کا جزو بنا دیتے ہیں، جو اس سے پہلے اُن سے آشنا نہیں تھے۔ صحیح الفاظ اور مناسب طرز ادا کا انتخاب، ایک شخص کے خیالات کو، خواہ اُن میں کتنی ہی اجنبیت ہو، دوسرے مختلف الخیال لوگوں تک پہنچانے کا واحد ذریعہ ہیں۔ اگر ان دونوں اجزا میں سے، ایک جزو بھی ناقص ہے اس صورت میں نہ بات بنے گی نہ دوسرے تک پہنچے گی۔ بالفرض خیال کسی نہ کسی صورت میں دوسرے تک پہنچ بھی گیا، تب بھی مقصد اعلیٰ یعنی تاثیر کا حصول ناممکن ہوگا۔

نئی بات بہت کم کہی جاتی ہے، عام طور سے متعارف اجزا ہی میں نئے نئے عناصر کی تلاش کی جاتی ہے جو درحقیقت طرز فکر کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ یہ کام اکثر اسلوب بیان سے لیا جاتا ہے۔ مناسب انداز بیان، عامۃ الورود تصورات اور عام حقیقتوں کو جدت و ندرت کے سانچے میں ڈھال دیتا ہے

کسی زبان کے دور آغاز میں یہ مشکل تو ہوتی ہے کہ الفاظ، محاورات اور تعبیرات کا ذخیرہ کم سے کم ہوتا ہے۔ مزید دقت کی بات یہ ہوتی ہے کہ اس خزانے میں اضافہ بہت آہستگی کے ساتھ ہوتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ فکر کی دنیا بھی مختصر ہوتی ہے۔ اس جہان مختصر میں، سادہ خیالی کی حکومت ہوتی ہے اور حسن ذاتی تکلف سے بری ہوتا ہے۔ اس لئے نہ زبان کی کم وسعتی کا احساس ہوتا ہے، نہ بیان میں بے راہروی کا زیادہ امکان ہوتا ہے پھر یہ بھی ہے کہ اس زمانے میں زبان و بیان اور اس کے ضابطوں کی حیثیت نقش اول کی ہوتی ہے۔ ترقی کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ ان میں خود بخود سدھار ہوتا رہتا ہے، ہر آنے والا دور پچھلے دور کی بہت سی آسان پسندیوں کو گلدستۂ طاق نسیاں بنا دیتا ہے۔ یہاں تک کہ ادب ترقی کی ایک خاص منزل پر آجاتا ہے۔ اس سطح تک پہنچتے پہنچتے، صحت کا ایک خاص معیار بھی قائم ہو جاتا ہے، اور فصاحت و بلاغت کے آئین بھی درجۂ تکمیل حاصل کر لیتے ہیں۔ اصولاً اس مرحلے پر، جب کہ بیشتر قاعدے تعین کے سانچے میں ڈھل چکتے ہیں اور الفاظ و محاورات قبول عام کی سند حاصل کر چکے ہوتے ہیں، اسقام و معائب کا امکان کم سے کم ہو جانا چاہیئے۔ لیکن درحقیقت یہی وہ منزل ہے، جہاں بے راہروی کا امکان سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ مظاہر زندگی میں قانون ارتقا، کے اثر سے برابر تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، اسی نسبت سے ذہن کی تہیں کھلتی ہیں۔ زندگی جس قدر آگے بڑھتی ہے، ذوق آرائش بھی بڑھتا ہے اور اسی نسبت سے غازۂ رنگ تکلف میں اضافہ ہوتا ہے۔ دیدۂ بینا کو ہر قطرے میں دریا اور ہر جزو میں کل نظر آتا ہے۔ پہلے ایک پھول کے مضمون سو رنگ سے باندھتے تھے اور کمال رسائی تھا، اب ہر پھول میں ہزار رنگ اور ہر رنگ میں بے شمار نیرنگیاں نظر آتی ہیں — زندگی کی رنگا رنگی، مظاہر کی کثرت اور کاروبار زندگی کے پیچ و تاب، شاعر کے ذہن کو محشر خیال بنا دیتے ہیں۔ ایسے عالم میں اگر شاعر کے ہاتھ سے کبھی کبھی احتیاط کا دامن چھوٹ جائے، تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہوگی۔

ارتقائے زبان کی اس منزل پر عملی تنقید کی ذمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے۔ ایک طرف زبان کی صحت، فصاحت کا معیار، ادب کی روایت اور اسکے معیار بلند

کا تصور ہوتا ہے، دوسری طرف شاعر کے خیال و جذبات کی وسعت طلبی، اس کی بعض مجبوریاں اور پابندیوں کو توڑنے کا ایک دبا دبا سا فطری جذبہ ہوتا ہے۔ اس پر شور عالم میں عملی تنقید اس توازن کو قائم رکھتی ہے، جس کے نہ ہونے سے خیالات زخموں کے پیراہن میں ملبوس نظر آتے ہیں۔

اس سلسلے میں تصویر کا ایک اور رُخ بھی ہمارے سامنے رہنا چاہیئے۔ ہندوستان طویل مدت تک مختلف سیاسی و انقلابی تحریکوں کا گہوارہ رہا ہے خاص طور سے بیسویں صدی کے دوسرے عشرے سے۔ صورت حال یہ رہی ہے کہ اس عرصے میں مختصر سے وقفوں کے بعد برابر نئی تحریکیں پیدا ہوتی رہی ہیں۔ سیاسی و انقلابی تحریکوں کے اس طوفانِ مسلسل نے قومی سطح پر، ذہنوں کو زود حس، اشتعال پسند اور جذبات پرست بنا دیا تھا۔ کسی ملک میں اگر یہ صورت حال خاصی مدت تک رہے تو قدرتی طور پر، ضبط و نظم کی پابندیوں کو پوری طرح نبھانے کا جذبہ کمزور تر ہو جاتا ہے۔ پر شور حالات نے ذہنوں میں تاب و تب کی عجیب کیفیت پیدا کر دی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہونا ہی چاہیئے تھا کہ ہمارے بہت سے اچھے شاعر بھی، غیر شعوری طور پر ہی سہی، کہیں کہیں آوارۂ حدودِ نیاز ہو جائیں۔ ان ملک آشوب بلکہ ادب آشوب حالات میں عملی تنقید کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ زبان و بیان کی حد تک بار بار پابندیوں کی یاد دلائے۔ اور بار بار غلطیوں کی نشان دہی کرے ـــــ کسی مغلوب الغضب شخص کو عالم طیش میں آداب گفتگو کی یاد دلانا، دہاڑتے ہوئے شیر کو ٹوکنا ہے۔ کیسا مشکل کام ہے اور کس قدر صبر آزما!! کم لوگ ہوتے ہیں، جو ایسے عالم میں قبول عام اور مصلحت خاص سے بے نیاز ہو کر، صحیح بات کہنے کی جرأت کریں۔ اس ادبی فرض کو ادا کرنے کی توفیق کم سے کم لوگوں کو ہوتی ہے۔ نیاز صاحب کا شمار ان لوگوں میں ہے، جنہوں نے حالات کی برق خرامی یا طوفان آفرینی پر نظریں نہیں جمائیں۔ وہ نہ حالات سے متاثر ہوئے، نہ شخصیتوں سے مرعوب جس زمانے میں زبان و بیان کے نکات و رموز پر گفتگو کرنا، کار عبث سمجھا جاتا تھا، انہوں نے اُس زمانے میں اس کی تبلیغ کی اور جن شخصیتوں کا جادو سر چڑھ کر بولتا تھا، انہوں نے اُن کے معائب و اسقام شاعرانہ کو اس وضاحت و صاف گوئی کے ساتھ پیش کیا، کہ شیوہ اہل نظر کی آبرو رہ گئی۔ وہ خود کسی سے مرعوب نہیں ہوئے، یہ کچھ زیادہ تعجب کی بات نہیں، قابل ذکر بات یہ ہے کہ انہوں نے نئی نسل کے بے شمار افراد کو احساس مرعوبیت سے محفوظ رکھا۔ اور ان کے اندر زبان و بیان کے محاسن و معائب کے احساس کو پیدا کیا۔

عملی تنقید کا وجود اردو میں کسی نہ کسی صورت میں، ہر زمانے میں ملتا ہے۔ پرانے تذکروں میں مختلف مقامات پر اس کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ الفاظ کے انتخاب اور انداز بیان کے متعلق ایک ایک دو دو جملے مل جاتے ہیں۔ امیر و داغ کے زمانے میں، اور ان کے کچھ بعد تک، اس کی خاصی گرم بازاری رہی۔ گلزار نسیم کا مباحثہ، اس کا ایک نمونہ ہے۔ اس زمانے میں بیشتر توجہ روزمرہ و محاورے کے صحیح استعمال پر رہتی تھی۔ یا دہلی و لکھنؤ کے دبستانی اختلافات پر۔ یہی باتیں عموماً معرضِ بحث میں آتی تھیں۔ ان لفظی بحثوں میں سخن فہمی سے زیادہ طرفداری کا مظاہرہ ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ اُس زمانے میں خاصے لمبے عرصے تک بے شمار بحثیں ہوئیں، لیکن نہ کسی رجحان کی تشکیل ہوئی نہ عملی تنقید نے ایک اندازِ مستقل کی شکل اختیار کی۔ اور آج ہم کو بیشتر مباحثے محض تبادلۂ الفاظ کا مجموعہ نظر آتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس زمانے تک صرف اساتذہ کے مختارات، دبستانی مفروضات اور ٹھپا لگے ہوئے الفاظ، حاصل کل تھے۔ نہ مغربی ادبیات کے اثر سے خیالات کا یہ طوفان آیا تھا، نہ اسالیب کا یہ تنوّع تھا، نہ جدت پسندی کا عام رجحان پیدا ہوا تھا۔ ہمارے زمانے میں ایک طرف خیالات و اسالیب میں تنوع کی نیرنگیاں شامل ہوئیں، اور مغربی ادب نے اردو کو براہ راست متاثر کرنا شروع کیا۔ دوسری طرف مختلف تحریکوں کا سیلاب امنڈ پڑا جس نے ساری سکون سامانی چھین لی دہلی و لکھنؤ کی دبستانی پابندیاں ٹوٹنے لگیں اور شاعری میں الفاظ سے زیادہ اسلوب کا پیچ و خم، توجہ طلب ہو کر سامنے آیا۔

اسی زمانے میں مرحوم سیماب اکبر آبادی نے، دبستان اکبر آباد کا نیا راگ چھیڑا۔ اور اس کی خصوصیات کو واضح کرنے کے لئے ایک خاص طرز بیان اختیار کیا جس میں متاثر کرنے سے کہیں زیادہ مرعوب کرنے کا انداز تھا۔ ایک طرف جوش صاحب ـــ الفاظ کے انبار میں روحِ شاعری کو پنہاں کرنے کی کامیاب کوشش میں مصروف تھے اور مناسب و غیر مناسب الفاظ کے ہجوم بے پایاں کو حسن کلام کا مترادف سمجھنے سمجھانے پر مصر تھے۔ اصغر گونڈوی مرحوم کی متصوفانہ غزلیں رنگینیٔ بیان کے پردے میں سب کچھ چھپائے ہوئے تھیں۔ اور جگر صاحب کی غنائیہ شاعری نے قوت تجزیہ کو خستہ و درماندہ بنا دیا تھا۔ ان میں سے ہر ایک اپنے فن کا کامل تھا اور ہر ایک کی شخصیت طلسم کدہ تھی جس کے اثر سے عام طور سے تنقید و تجزیہ کی نگاہیں بے نور ہو کر رہ گئی تھیں۔ بلند آہنگی، شدید بیانی،

الفاظ کا طمطراق، مرادفات کا ہجوم، اور انداز بیان کی رنگینی و شادابی، پردۂ حائل بن گئی تھی۔ نگاہیں اسی میں الجھ کر رہ جاتی تھیں۔

ان حالات میں اس بات کی بہت ضرورت تھی کہ ادبی احتساب کے دائرے کو وسیع کیا جائے۔ خیال و الفاظ میں ربطِ باہم کی تلاش، اور طرزِ اظہار میں مناسبات کی جستجو کے انداز و احساس کو عام کیا جائے، اور منزلِ الفاظ سے آگے بڑھ کر، اسالیب بیان کا مکمل جائزہ لیا جائے۔ نیاز صاحب نے اس فرض کو ادا کیا اور اس طرح کہ عملی تنقید کو ایک صنفِ مستقل کی حیثیت بخش دی۔ زبان و بیان کے اعتبار سے جوش، سیماب، اصغر، وغیرہ کی شاعری کا جائزہ اس تفصیل کے ساتھ لیا کہ اندازِ بیاں کی وہ خامیاں سب کو نظر آنے لگیں، جو اس سے پہلے رنگینیٔ الفاظ و بیان کے پردوں میں چھپی ہوئی تھیں۔

عملی تنقید کے اس جہاد میں، بعض اور حضرات مثلاً مولانا حامد حسن قادری اور حضرت اثر لکھنوی نے بھی بہت اہم حصہ لیا۔ خصوصاً اثر صاحب نے لیکن نیاز صاحب کی حیثیت شریکِ غالب کی ہے۔ جس کی وجہ یہ بھی ہے کہ اُن کے علاوہ اور کسی نے، عملی تنقید کو، اندازِ مستقل کی حیثیت سے نہیں اپنایا اور نہ اس تفصیل نگاری سے کام لیا۔

الفاظ کی صحت و عدم صحت پر گفتگو کرنا، کوئی زیادہ قابلِ ذکر بات نہیں۔ اس سے کسی شخص کے علم کا اندازہ تو کیا جا سکتا ہے، ذہنِ رسا کا نہیں۔ اصل مرحلہ یہ ہے کہ بات جس رُخ سے کہی گئی ہے، اس کا گہری نظر سے جائزہ لیا جائے۔ اور اس میں جو نزاکتیں ہوں۔ ان کو پوری طرح سمجھ کر، معرضِ اظہار میں لایا جائے۔ اس کے لئے قدیم ادب سے بہت اچھی واقفیت، فارسی ادب سے کماحقہٗ آگاہی، اور الفاظ و اسالیب کا مزاج شناس ہونا ضروری ہے، لیکن اس سے بھی زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ ذہن رسا ہو اور جودت و ذکاوت ہو، جس کے فیض سے خیال کی تیز نگاہ عکس ریز شعاعوں کی طرح گہرائیوں تک اُتر جائے۔ نیاز صاحب میں یہ خصوصیات یکجا ہیں۔ وہ اگر کسی سے ناراض نہ ہوں، یا کسی وجہ سے اصرار کرنے پر نہ تل جائیں (یہ ان کے کمزور پہلو ہیں، جن کی جلوہ گری ان کے بعض مضامین میں کئی جگہ صاف صاف نظر آتی ہے۔ خاص طور سے نگار کے جگر نمبر میں) تو یہ بہت مشکل ہے کہ زیر بحث ادب پارے کے سارے محاسن و معائب ان کے سامنے آئینہ نہ ہو جائیں اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ وہ ان کو اس طرح پیش نہ کر سکیں کہ ہر شخص ان کی بات پر ایمان لانے پر مجبور ہو جائے۔

جس زمانے میں ہندوستان واقعی محشرستانِ خیال تھا جوش کی شاعری کا غلغلہ بلند ہوا اور اس بلند آہنگی کے ساتھ کہ الفاظ کی گرج کے سامنے توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہو کر رہ گئے۔ جوش کے یہاں کثرتِ الفاظ، کثرتِ تشبیہات، تکرارِ خیال اور بے حد پُرزور لیکن نسبتہً مرصع اندازِ بیان کی حکومت تھی۔ حسین تشبیہات، خیال فریب استعارے، اور شور انگیز اندازِ بیان نے، ذہنوں میں پسندیدگی کے سوا اور کسی چیز کے لئے گنجائش نہیں چھوڑی تھی۔ الفاظ جوش کا سرمایہ بھی ہیں اور ان کی سب سے بڑی کمزوری بھی۔ ان کی نظموں میں الفاظ کا انبار ہوتا ہے جن میں سے کچھ لفظ مناسب ہوتے ہیں، کچھ بے جوڑ اور کچھ اصل مفہوم کے منافی۔ بات کو بڑھا کر کہنا ان کی بہت سی نظموں کا واحد خوبی ہے۔ یہ بے حد پُرخطر راستہ ہے جس میں ہر قدم پر بہکنے کا شدید احتمال رہتا ہے۔ جوش کی نظموں میں جگہ جگہ اس کے کامیاب مظاہرے نظر آتے ہیں۔ اُن کی ایسی نظموں کو پڑھ پڑھ کر نئے شاعروں کا ایک قابلِ ذکر گروہ، محض تقلید میں، لفاظی کو حسن و معیار سمجھ بیٹھا تھا۔ نیاز صاحب نے جوش کی کئی ایسی نظموں کا عملی تنقید کے نقطۂ نظر سے مفصل جائزہ لیا، جو بظاہر بہت کامیاب معلوم ہوتی تھیں۔ انہوں نے لفظی تضاد، طرزِ ادا کی نارسائی، تشبیہات کے عدم تناسب کا وضاحت کے ساتھ جائزہ لیا اور واضح کیا کہ ان معائب نے مل کر مفہوم کو جراحت ہائے پنہاں سے گراں بار کر دیا ہے۔

یہ بظاہر جوش کی نظموں کا جائزہ تھا، لیکن درحقیقت عملی تنقید کی اہمیت، ضرورت، اور اس کے دائرہ کار کا باضابطہ عملی مظاہرہ تھا۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اصولی، تاثراتی اور تشریحی تنقید کے دوش بدوش، عملی تنقید کی حقیقی قدر و قیمت اور اس کی اہمیت کا احساس عام ہوا۔ دوسری طرف غلط نگاری کے اُس انداز کی ہمت شکنی ہوئی جس میں ایک مستقل رجحان بن جانے کی ضرورت سے زیادہ صلاحیت تھی۔

سیماب صاحب اور اصغر گونڈوی مرحوم کے یہاں بالکل دوسری صورت حال تھی۔ سیماب صاحب کی یہ کوشش رہتی تھی کہ نظم ہو یا غزل، اس میں اندازِ بیان کے لحاظ سے ایک ایسا بانکپن ضرور پیدا ہو جائے، جس کو ان کے مخصوص رنگ سے تعبیر کیا جا سکے۔ اس کے لئے وہ اکثر بھاری بھرکم الفاظ استعمال کرتے تھے۔ کبھی کبھی ان الفاظ کے جماؤ سے طرزِ ادا میں کاواک انداز پیدا ہو جاتا تھا جس کا بظاہر احساس نہیں ہوتا تھا۔ اصغر مرحوم کی غزلیں شگفتہ بیانی کے پھولوں کا گلدستہ معلوم ہوتی تھیں

لیکن جگہ جگہ عالم بالا کی باتیں زمینی انداز بیان کی کثافت کی تاب نہ لاکر، ایک معمہ بن کر رہ جاتی تھیں جس کے لیے حُسن عقیدت تعبیر تراشی کا کام انجام دیتی تھی۔ نیاز صاحب نے ان اسالیب کا اس صراحت کے ساتھ جائزہ لیا کہ انداز بیان کے ایسے ہوشربا طلسموں کی ساری دلکشی و نظر فریبی بڑی حد تک ختم ہوگئی۔ اس موقع پر یہ مناسب ہوگا کہ چند مثالوں سے نیاز صاحب کے انداز انتقاد کی مزید وضاحت کی جائے۔ نیاز صاحب کی کتاب انتقادیات جلد اول سے میں ایسی چند مثالیں درج کرتا ہوں۔ ان مثالوں میں ہر بات اس وضاحت و صراحت کے ساتھ کہی گئی ہے کہ کسی مزید حاشیہ آرائی کی ضرورت نہیں ہے۔ جوش صاحب کی ایک نظم کا ایک شعر ہے ؎

پھر اُٹھوں گا ابر کے مانند اٹھلاتا ہوا   گھومتا گھرتا، گرجتا، گونجتا، گاتا ہوا

دوسرے مصرعے پر زور الفاظ سے رجز کا ایک ٹکڑا بن گیا ہے۔ اس کے متعلق نیاز صاحب لکھتے ہیں۔

"پہلی چار صفتیں تو ابر کے لیے ٹھیک ہیں، لیکن گونجنا اور گانا، اس سے متعلق نہیں ہو سکتا۔ مکان گونجتا ہے، وادی گونجتی ہے، لیکن ابر نہیں گونج سکتا اسی طرح ابر کو جب گرجتا ہوا کہہ دیا تو پھر اس کا گانا کیا معنی؟"

جوش صاحب کی ایک اور نظم کا شعر ہے جس میں انہوں نے اپنی شریک زندگی کو مخاطب کر کے کہا ہے کہ

کیوں نہیں روتی کہ دنیا دام میں آئی ہوئی   زر کے پیچھے دوڑتی پھرتی ہے گھبرائی ہوئی

اس پر تبصرہ ملاحظہ ہو۔

"لفظ دام کے معنی جال کے ہیں۔ اور مجازاً اس کا استعمال مکر و فریب کے محل پر بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن اصول معانی و بیان کے لحاظ سے مجازی معنی میں ایک لفظ ہمیشہ اسی وقت استعمال کیا جائے گا، جب اس کے بعد کوئی لفظ یا فقرہ الیانہ ہو، جو لفظ کے اصل مفہوم کے متناقض ہو، درانحالیکہ یہاں دوسرے مصرع میں، "دوڑتی پھرتی" کا فقرہ استعمال کیا گیا ہے جو دام کے اصل معنی کے متناقض ہے دام (جال) میں آنے کے بعد "دوڑتی پھرتی" کیونکر صحیح ہو سکتا ہے"

اصغر گونڈوی مرحوم کا ایک مشہور شعر ہے۔

نظر اس حُسن پر ٹھہرے تو آخر کس طرح ٹھہرے   کبھی جو پھول بن جائے کبھی رخسار ہو جائے

اِس پر گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں،

"پہلے مصرع میں نظر نہ ٹھہر سکنے کا ذکر ہے اور اسی لئے مصرع ثانی میں کسی نہ کسی ایسی چیز کا بیان ضروری تھا، جس پر واقعی نظر نہیں ٹھہر سکتی درانحالیکہ پھول اور رخسار، دونوں چیزیں ایسی نہیں، جن پر نگاہ نہ ٹھہر سکے۔"

سیماب صاحب کی ایک رباعی پر تبصرہ قابل توجہ ہے۔

اے ربِّ قدیم و کردگارِ امروز   وے نزہتِ ماضی و بہارِ امروز
دیروز رہینِ منتِ رحمتِ تو   لطف و کرمت ضامن کارِ امروز

اس رباعی میں ہر جگہ ترکیب اضافی اختیار کی گئی ہے۔ مثلاً کردگار امروز، نزہت ماضی، رہین منت، ضامن کار وغیرہ۔ لیکن پہلا ٹکڑا "رب قدیم" صفت و موصوف واقع ہوا ہے، جو علم معانی و بیان کی رو سے خلاف فصاحت ہے۔ علاوہ اس کے رب کی صفت میں جب لفظ قدیم استعمال کیا جائیگا، تو اس کے مفہوم میں ازل و ابد، دونوں شامل ہوں گے، حالانکہ محل کا اقتضا یہ ہے کہ صرف ماضی یا عہد گزشتہ سے اسکو متعلق کیا جائے۔"

اسی سلسلے کی دوسری رُباعی ہے۔

اے سطوتِ دیروز و وقارِ امروز   نورِ فردا جلوہ دارِ امروز
یک سطر رتب عالم از دفتر تو (کذا)   مجموعۂ کار تست کارِ امروز

"تیسرے مصرع کا مفہوم یہ ہے کہ" تیرے دفتر کی صرف ایک ترتیب دی ہوئی سطر اک دنیا ہے " لیکن چوتھے مصرع میں بیان کا یہ ارتقا گھٹ کر، اس حد تک اتر آیا ہے کہ کار امروز کو اس کا مجموعۂ کار بتایا جاتا ہے، حالانکہ ہمارا تمام مجموعۂ کار اس کے صرف ایک لفظ یا ایک اشارے کا نتیجہ ہونا چاہیے"

سیماب صاحب کی ایک نظم کا شعر ہے۔

عالمِ ایجاد اک مجموعۂ اضداد ہے　　اختلاف رنگ و بو سے انجمن آباد ہے

اس پر یہ مختصر مگر جامع تبصرہ دیکھیے۔ " اختلاف رنگ و بو میں، تضاد نہیں، تنوع ہے"

اسی نظم کا ایک اور شعر ہے۔

رکھ لئے ہیں نام پھولوں کے ہمیں نے مختلف　　فطرت گلشن مگر اس قید سے آزاد ہے

اس پر لکھتے ہیں۔

(اس شعر نے اس دعوے کو بالکل رد کر دیا۔ جو شاعر نے پہلے شعر میں کیا تھا۔ کہ عالم ایجاد اک مجموعۂ اضداد ہے" نظم کہنے میں شعراء کی ناکامی کا اکثر سبب یہی ہوا کرتا ہے کہ وہ خود اپنے قول کے تضاد کو محسوس نہیں کرتے)۔

سیماب صاحب کی ایک نظم ہے جس کا عنوان ہے "منافق"۔ اس کے بعض اشعار پر مفصل بحث کی ہے عبارت طویل ہے میں صرف ایک حصہ نقل کرتا ہوں اثبات مدعا کے لئے یہ کافی ہے۔

(نقص تعبیر و معنی کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو۔ لکھتے ہیں۔

دل اس کا مزبلہ ہے اور گندی ہے زباں اسکی　　کثافت سے ہیں آلودہ خیال آرائیاں اسکی

زباں پر کچھ ہے، دل میں کچھ، نمونہ ہے دو رنگی کا　　خود اس کا ہر عمل شاہد ہے اس کی ظرف تنگی کا

نہ صرف ان دو شعروں میں۔ بلکہ پوری نظم میں، منافق کی تصویر کھینچ کر یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اس کا ظاہر و باطن یکساں نہیں ہے اور جو دل میں ہے وہ زبان پر نہیں ہے۔ لیکن اس مصرع میں ع دل اس کا مزبلہ ہے اور گندی ہے زباں اسکی، بیان کا یہ التزام قائم نہ رہ سکا کیونکہ یہاں دل و زبان دونوں کو گندہ دکھایا ہے اگر اس مفہوم کو یوں ادا کیا جاتا کہ گو زبان بظاہر صاف ہے لیکن دل اس کا مزبلہ ہے، تو بے شک درست ہو سکتا تھا)۔ ....

ان مثالوں سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نیاز صاحب کی عملی تنقید کا کیا انداز ہے اور یہ بھی کہ ان کے اس انداز انتقاد سے، مطالعہ کرنے والوں میں، تجزیۂ شعر کا شعور، کس حد تک پیدا ہوا ہوگا۔

ترقی پسند ادبی تحریک کے زمانہ عروج میں، شوریدہ بیانی، مہمل نگاری، اور ہر قید سے آزادی حاصل کرنا، باشعور ہونے کی پہچان تھا۔ زبان و بیان کو مسخ کرنا جدت کا مرادف تھا۔ یہ وہ دور تھا کہ واقعی "کرتب و کرتوت کی نمائش" کو اظہار دیدہ وری سمجھا جاتا تھا۔ اس دور ہنگامہ آفریں میں، جن لوگوں نے زبان و بیان کے بھرم کو قائم رکھا، ان میں نیاز صاحب کا نام سرِ فہرست ہے۔ انہوں نے اس زمانے میں، جب کہ ان عنوانات پر گفتگو کرنا، رجعت پرستی کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنا تھا، نگار کے صفحات پر برابر اس انداز نقد کو پیش کیا جس سے شعر فہمی و تجزیۂ شعر کی روایت زندہ رہی اور ایک نسبتہً "معقول طبقے" میں ان دو مختلف رجحانوں کے تقابل سے، توازن و تناسب کا احساس پیدا ہوا۔

ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ ہمارے یہاں کچھ تو ازراہ ادب اور کچھ "زود یقینی" کی بنا پر، متعارف حضرات سے بے طرح متاثر یا مرعوب ہو جانے کی ذہنیت پیدا ہو گئی تھی۔ یقین کر لیا جاتا تھا کہ فلاں فلاں حضرات کی تخلیقات یقیناً بے عیب ہونگی۔ نیاز صاحب نے اس طلسم مرعوبیت کو توڑا اور ذہنوں میں اس خیال کو بٹھا دیا، کہ نام و شہرت، یا بزرگی و استادی، تنقید کے راستے کا پتھر نہیں بن سکتیں۔ مرحومین کے عیب نکالنا، آسان بھی ہے اور دلچسپ بھی

ہمارے یہاں یہ کاروبار خاصا چلتا رہا ہے خصوصاً فنِ اصلاح کی کتابوں میں اس کے خوب خوب مظاہرے کئے گئے ہیں۔ نیازؔ صاحب کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مُردوں کے بجائے، زندوں کی شاعری کو عملی تنقید کی کسوٹی پر کسا۔ اور وضعِ احتیاط کے بجائے، جرأت رندانہ سے کام لیا۔ ان کا یہ عمل مرحوم ثاقبؔ قزلباش کے اس شعر کی تفسیر بن گیا۔

دعائیں دیں مرے بعد آنے والے میری وحشت کو
بہت کانٹے نکل آئے مرے ہمراہ منزل سے

نیازؔ صاحب کی تنقیدات سے بہت سے مقامات پر اختلاف کیا جا سکتا ہے، کیا بھی گیا ہے۔ لیکن اختلاف سے اُن کے کام کی اہمیت پر اثر نہیں پڑتا ہے۔ شعر العجم اور موازنۂ انیس و دبیر کی بہت سی باتوں سے اختلاف کیا گیا ہے۔ بہت سے اختلافات بالکل صحیح ہیں لیکن ان کتابوں کے مصنف کی عظمت پر حرف نہیں آتا۔ نہ شرفِ اولیت میں کمی ہوتی ہے۔

نیازؔ صاحب نے اردو میں عملی تنقید کو، تنقید کا جزوِ مستقل بنا دیا جس سے غلط نگاری، خوش فہمی اور ناتواں بینی کے بہت سے پردے چاک ہو گئے اور احتیاط کا رجحان خاص پیدا ہوا۔ احتساب سے کوئی خرابی کبھی مکمل ختم نہیں ہوتی، کم ہو سکتی ہے، اور اس کی برائی کا احساس عام ہو سکتا ہے۔ یہ کافی ہے اور یہی احتساب کا حاصل ہے۔

نیازؔ صاحب کی بعض کمزوریاں بھی ہیں، وہ کسی کا جب خیال کرتے ہیں، تو پھر کچھ اور نہیں دیکھتے ہیں۔ مثلاً انہوں نے ایک ایسے صاحب کے مجموعۂ رباعیات پر دیباچہ لکھا، جنہوں نے رباعی پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔ میری مراد ڈاکٹر سلام سندیلوی سے ہے اس دیباچے میں اُن کی اتنی تعریف کی، جتنی وہ غریب خود نہیں کر سکتے تھے، جب کہ اس مجموعے کی ۱۵۰ رباعیوں میں سے کم از کم ۴۰ رباعیاں ساقط الوزن ہیں اور کئی تبصرے اسی قبیل کے ہیں، بعض دفعہ محسوس ہوتا ہے، کہ انہوں نے کتاب پڑھے بغیر محض مشق و مزاولت کے بل بوتے پر تبصرہ لکھ دیا ہے۔ یا جب وہ کسی سے خفا ہوتے ہیں، تو باریک بینی معائب میں، معنی آفرینی کا کمال دکھا دیتے ہیں۔ یہ وہ کمزوریاں ہیں، جن سے بہ حیثیت انسان دامن آلودہ ہو جانا ناممکن نہیں، اگرچہ ہم بحیثیت نقاد، یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ ایسا ہونا نہیں چاہیئے۔ جس طرح ہم یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ محاسن کا فراخدلی کے ساتھ اعتراف کیا جائے، اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ ہم کمزوریوں کا بھی اسی فراخدلی سے جائزہ لیں اور اعتراف بھی کریں۔ اس سے وہ توازن لے گا، جس کی ہماری تنقید میں بہت کمی ہے اور جس کی نیازؔ صاحب نے ہمیشہ تبلیغ کی ہے۔

اس بات کی بہت ضرورت ہے کہ نیازؔ صاحب کے ایسے مضامین جو عملی تنقید کے ذیل میں آتے ہیں۔ اور جو انتقادیات، مجموعۂ استفسار و جواب، اور مالہٗ و ما علیہ، میں منتشر ہیں، نظرثانی کے بعد، علاحدہ کتابی صورت میں صحت و حُسن کے ساتھ شائع کئے جائیں کہ یہ مجموعہ عملی تنقید کا پہلا باضابطہ صحیفہ ہوگا۔ انتقادیات کی ایک جلد، دونوں حصوں کے بعض مضامین پر مشتمل کراچی سے ۵۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ جس میں صحت متن کا اہتمام نہیں کیا گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جگہ جگہ فاحش غلطیاں داخل ہو گئی ہیں۔ جس سے عام لوگ سخت غلط فہمی کا شکار ہو سکتے ہیں۔ کیا اچھا ہو اگر جناب فرمان فتحپوری اس کام کو اپنی نگرانی میں مکمل کرائیں کہ یہ نیازؔ صاحب کی یادگار مستقل ہوگی اور نئی نسل کے لوگوں کے لئے لوحِ طلسم اغلاط کا کام دیگی۔

"تاریخ، فلسفہ، مذہب، ریاضی وغیرہ تمام علوم خواہ حکمت نظری سے تعلق رکھتے ہوں یا حکمت عملی سے، منقولات میں شامل ہوں یا معقولات میں مقررہ اصول میں جکڑے ہوئے ہیں اور ان اصول سے ہٹ کر انکی صحت و عدم صحت، یا حُسن و قبح پر حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ لیکن ادبیات اور خصوصیت کے ساتھ شاعری کے پرکھنے کے لئے مقررہ اصول کے علاوہ اس قوتِ فیصلہ سے بھی کام لینا پڑتا ہے جس کا تعلق صرف ذوق و وجدان سے ہے جو بڑی نازک چیز ہے اور اسی لئے "نقد شعر" کو میں "انتقادِ عالیہ" کہتا ہوں۔"

(نیازؔ)

نیاز کی ناقدانہ صلاحیتوں پر ایک نظر

پروفیسر حسرت نعمانی

مولانا نیاز فتحپوری

تنقید نگاری کی صلاحیت قدرت کی طرف سے لے کر آئے ہیں اور شاید ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم سے زیادہ خطرناک قسم کے ذہین آدمی ہیں۔ فنی نکات و نقد سے واقف ہیں اور شعر اور آرٹ کی مختلف قدروں کو پہچاننے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ تحقیق و مطالعہ کے لئے وقت محفوظ رکھتے ہیں، چنانچہ سوسائٹی سے اپنا واسطہ ختم کر چکے ہیں ساری ذہنی جدوجہد اور دوسری سرگرمیاں سمٹ سمٹا کر علمی و ادبی تحقیق و تدقیق میں مرتکز ہو گئی ہیں۔ چنانچہ محقق کی حیثیت سے ان کی اُردو ادب میں ایک خاص پوزیشن ہے۔ ان کا رسالہ نگار گزشتہ چالیس سالوں سے اردو ادب کی خدمت اور تنقیدی خیالات کی ترجمانی کر رہا ہے۔ جس میں "باب الاستفسار والجواب" اور "مکتوبات نیاز" کے صفحات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ "باب الاستفسار و جواب" کے تحت مختلف علمی، ادبی، تاریخی، لسانی اور تنقیدی مسائل پر سوال و جواب کی صورت میں روشنی ڈالی جاتی ہے اور "مکتوبات نیاز" میں بعض ایسے تنقیدی اشارے پائے جاتے ہیں جن پر اگر غور کیا جائے تو اُن سے مفید و مستقل تنقیدی مباحث پیدا ہو سکتے ہیں، عام اشاعتوں کے علاوہ جس میں بیشتر مضامین مولانا نیاز ہی کے قلم کے اور اکثر تنقیدی ہوتے ہیں۔ اس کے سالنامے انتقادیات کے لئے مخصوص ہوتے ہیں جن میں ملک کے اچھے اہل قلم اور مشہور ادبا و نقاد کے مضامین شامل ہوتے ہیں۔

ان کی انتقادیات کی دو جلدیں شائع ہوئی ہیں جس کی دوسری جلد خاص توجہ کی مستحق ہے۔ اس میں "ایران و ہندوستان کا اثر جرمن شاعری" پر اچھا مضمون ہے مگر چونکہ یہ مضمون کئی سال پہلے کا لکھا ہوا ہے اس لئے اس کا دائرہ عمل انیسویں صدی تک محدود ہے اور ممالک مغربی اور خصوصاً جرمنی کی سیاحت سے واپس آئے ہوئے ہندوستانی ادیبوں کے خیالات سے آشنا ہونے کے بعد اس مقالہ میں مزید اضافہ کی گنجائش نظر آتی ہے۔ "فارسی زبان کی پیدائش پر مورخانہ نظر" میں شاہنامہ سے جو تاریخی اہمیت سے زیادہ اپنی افسانوی حیثیت نمایاں رکھتا ہے، استفادہ کیا گیا ہے۔ "اردو شاعری پر تاریخی تبصرہ" اور "اردو غزل گوئی اور ترقی زبان پر عہد بعہد تبصرہ" یہ دو مقالے جدید تحقیقات کی روشنی میں مرتب کئے گئے ہیں اور بہت مفید ہیں لیکن "نقش ہائے رنگ رنگ" جناب نیاز کا ایک غیر فانی ادبی تنقیدی کارنامہ ہے جو غالب کے ساتھ مولانا نیاز کو بھی رہتی دنیا تک زندہ رکھے گا۔

آخری دو مضامین "ادبیات اور اصول نقد" اور "فنون ادبیہ و حقیقت نگاری" میں مغربی معیار ادب کی ترجمانی کے ساتھ مغربی معیار نقد اور اصول تنقید سے آشنا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان دو مقالات میں مولانا نیاز نے بعض ان تصانیف و مقالات کی کورانہ تقلید نہیں کی ہے جو شروع سے لے کر آخیر تک ہڈسن اور ورسفولڈ سے استفاضہ یا ان کا ترجمہ ہیں۔ اور نہ اپنا مطالعہ صرف انہیں کتابوں تک محدود رکھا ہے جن کا شمار مبادیات نقد میں ہوتا ہے تاہم دوسری تصانیف بھی جن سے انھوں نے استفادہ کیا ہے جو اپنی کافی اہمیت رکھتی ہیں مگر اب وہ انگلستان کے لئے بھولی ہوئی یاد ہو چکی ہیں۔ کیونکہ گزشتہ دس پندرہ سال کے اندر مغرب کی دنیائے نقد بہت آگے بڑھ گئی ہے جس کے ساتھ ساتھ چلنے کی کوشش ہندوستان میں شاید صرف پنجاب کے نوجوان طلباء و یونیورسٹی کے نئے معلمین ہی کر رہے ہیں چنانچہ انتقادیات کے دو مضامین جو نقد و ادب سے متعلق ہیں اگرچہ بہت اچھے ہیں مگر وہ جنگ عظیم سے

قبول کے نقد و ادب سے روشناس کراتے ہیں، ان سے جدید نظریات کی ترجمانی نہیں ہوتی ہے لیکن اس میں ایک خوبی یہ ہے کہ ماخوذ خیالات کو اس طرح اپنانے کی کوشش نہیں کی گئی ہے جیسے وہ ان کے اپنے ذہن کی پیداوار اور ذاتی فکر کا نتیجہ ہوں اور نہ پروفیس میرٹھی یا پروفیسر نعیم الرحمٰن کی طرح انھوں نے تنقید کی ابتدائی کتابوں کا لفظی ترجمہ ہی اُٹھا کر رکھ دیا ہو۔ بلکہ پہلے مغربی خیالات کا سمجھ کر مطالعہ کیا ہے پھر اسے سمیٹ سلجھا کر حسن و سلیقہ سے ترتیب دینے کی کوشش کی ہے۔ اور چونکہ خود ان کے احساس نقد کو دنیا کے ادبی ماحو کا شعور رہتا ہے اس لئے انھوں نے جا بجا اپنی ذاتی رائیں جو پیش کی ہیں وہ رفتار زمانہ کی نمائندگی کرتی ہیں اور ان میں خود ان کی انفرادی بھی نمایاں ہے۔

مولانا نیازؔ میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ روایتی اصول تجزیہ و تشریح اور قدیم استقرائی طریقہ انتقاد کے علاوہ عمل نقد میں امپرشنسٹک (Impressionistic) طرز پر بھی قدرت رکھتے ہیں اور ان میں اظہار تاثرات و تحریک ہیجان کی غیر معمولی صلاحیت ہے وہ ایک کامیاب تاثراتی کی طرح اپنے طرز بیان، حسن اسلوب اور زور خامہ سے سرور کی لہر دوڑا دیتے ہیں، دل میں ہیجان انبساط پیدا کرتے ہیں وہ کسی نئے شاہکار کے متعلق ابلاغ تجربات communication of Expression کی کوش کرتے ہیں تو تحریر کی جادو اثری سے دوسروں پر عجیب کیفیت سی طاری کر دیتے ہیں مگر وہ ہوشیار جمالیاتی ہیں۔ باریک بین نگاہیں اس حقیقت کو تاڑ جاتی ہیں کہ کبھی کبھی وہ خود تو تاثرات میں زیادہ گہرے نہیں ہوتے ہیں مگر اپنے اثر قلم سے لوگوں کو جذبات کے بڑے تیز دھارے میں بہا دیتے ہیں۔ اس لحاظ سے انھیں اُردو کا والٹر پیٹرؔ نہیں بلکہ تاثراتیوں کا خدا آسکر وائلڈ کہا جاسکتا ہے۔

مختصر یہ ہے کہ تنقید میں مولانا نیازؔ آئی۔ اے رچرڈس کی طرح حسب موقع روایتی استقرائی سائنٹفک اور جمالیاتی سبھی طریقہ نقد اختیار کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں چنانچہ وہ خود بھی فرماتے ہیں کہ "ایک آزاد نقاد کے لئے بہترین طریقہ یہی ہوگا کہ وہ اپنے آپ کسی اسکول کا پیرو نہ سمجھے بلکہ وہ خود اپنی قوت تمیز سے کام لے کر حسن و قبح کا فیصلہ کرے" اور ان کے اس خیال سے پورا پورا اتفا کرتے ہوئے جیسا کہ اپنے مقالہ معیار نقد میں بھی عرض کر چکا ہوں میں اس بات کا لحاظ بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ عمل نقد میں تنقید کی صحیح ا قائم رہے اور فن پارہ کی فنی قدروں کے علاوہ اخلاقی، تعقلی، جذباتی اور تخیلی قدریں بھی ظاہر ہو جائیں۔

گزشتہ چند سال سے نگار میں "مالہ و ماعلیہ" کا سلسلہ جو قائم ہے وہ ان دنوں ایک نئی ہنگامہ آرائی کا سبب بن گیا بلاشبہ اس میں وہی قدیم طریقۂ اعتراض و استناد اختیار کیا گیا ہے اور غزلوں کی تنقید میں اس کے بغیر چارہ بھی نہیں لیکن عصبیت و تحقی بر طرف معاون دیکھا جائے تو اس میں فنی غلطیوں پر مولانا نیازؔ کے اعتراضات اٹل نظر آئیں گے تاہم انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اس باب میں اعتراضات کے ساتھ تحسین کا بھی فرض ادا ہوتے رہے۔

ایک نقاد کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ اس کی نظر ہمیشہ معائب پر رہے چنانچہ لوگ پوچھتے ہیں کہ آخر ملک کے رسالوں میں نظمیں بھی تو شائع ہوتی رہتی ہیں، نگار کی توجہ ان کی طرف کیوں مبذول نہیں ہوتی ہے، میں کہتا ہوں کہ خود نگار میں بہت سے نظم نگاروں کے فنی شاہکار شائع ہوتے رہتے ہیں جن کی خصوصیات پر وہ تبصرہ نہیں کرتے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ملک بہت سے اچھے لکھنے والوں کے محاسن کا قرض مولانا نیازؔ کے قلم پر باقی رہ جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ "مالہ و ماعلیہ" کے لئے مبتدی و معمولی شعرا کی طرف توجہ نہیں کی جاتی ہے اور یقیناً وہ شعرا جن کی نظمیں منتخب جاتی ہیں کہنہ مشق اور اچھے لکھنے والے ہوتے ہیں اگر نقائص کی تشریح کے ساتھ انھیں کی دوسری اچھی اور بے عیب نظموں محاسن پر بحث کی جاتی تو عوام کو سوء فہمی کا زیادہ موقع نہ ملتا۔

جہانتک مولانا نیاز کی صلاحیت نقد کا تعلق ہے میں بلاشائبہ تصنع کہہ سکتا ہوں کہ ان میں تنقید کی ساری وہبی خصوصیات موجود ہیں اور وہ نقاد کی اکثر و بیشتر کسبی شرائط بھی پوری کرتے ہیں۔ وہ ایک زمانہ میں شعرائے اردو کی صف میں نمایاں جگہ رکھتے تھے مگر جب انھوں نے شعراء کے کلام پر تنقید کی طرف توجہ کی تو انھیں اس بات کا احساس ہوا کہ ایک شاعر کے لئے تنقید میں اپنے ہمعصروں کے ساتھ انصاف کرنا مشکل ہو جاتا ہے چنانچہ سب سے پہلے انھوں نے خود شعر گوئی ترک کر دی اور یہ بڑی قابل تحسین اسپرٹ تھی اگرچہ ان کے عمل نقد میں اس احساس کی کمی نظر آتی ہے تاہم اردو کے دوسرے نقادوں میں جن میں متقدمین کا بھی شمار ہو سکتا ہے چونکہ ان سے زیادہ خامیاں نمایاں ہیں اس لئے اگر ہم انھیں شبلی کے بعد اردو کا دوسرا سب سے بڑا نقاد کہیں تو شاید داخل مبالغہ نہ ہوگا۔ لیکن مولانا نیاز اگر نقاد کی صحیح اسپرٹ پیدا کر لیں تو انھیں اپنے عہد کا سب سے بلند نقاد کہیں گے بلکہ ان میں بعض ایسی صلاحتیں موجود ہیں کہ اگر وہ اپنی علمی سرگرمیاں صرف ادبی تحقیق اور تنقیدی جد و جہد تک محدود رکھتے تو دنیا کے کامیاب اور اعلیٰ نقد نگاران شعر ادب میں شمار ہوتا۔

ایک آزاد نقاد کو مولانا نیاز کا یہ مشورہ کہ وہ اپنے آپ کو کسی اسکول نقد کا پیرو اور کسی خاص روایتی اصول کا مقلد نہ بنائے بالکل مناسب ہے اور خود اپنی قوت تمیز سے کام لینے کی ترغیب نہایت معقول۔ مگر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ان کی تاثریت اور جذباتیت انھیں کبھی کبھی صحیح فیصلہ کی راہ سے الگ کر دیتی ہے۔ مجھے جہاں تک ان کی سائیکالاجی کے مطالعہ کا موقع ملا ہے اور ممکن ہے مجھے سمجھنے میں خطا ہوئی ہو، ان کے متعلق میرا خیال ہے کہ وہ چونکہ خود ذہین انسان اور غیر معمولی ذکاوت جس کے مالک ہیں اس لئے بلا امتیاز کمیت و کیفیت ہر ذہین و حساس انسان کی قدر کرنے لگتے ہیں اور اگر ان میں سے کسی کی کوئی خاص ادا پسند آگئی تو وہ ان کا استحقاق سے زیادہ محبوب بن جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کبھی کبھی ادبی دنیا میں غیر مستحق لوگوں کا غلط تعارف ہو جاتا ہے اور ادب کی دنیا میں وہ ایسی پوزیشن حاصل کر لیتے ہیں جہاں ان کے لئے جگہ نہیں بن سکتی، چنانچہ اس غیر معمولی توجہ کے پیداوار بعض ایسے لوگ ہیں جو اگرچہ کسی قدر شاعرانہ شعور رکھتے تھے مگر ابتدا میں غلط حوصلہ افزائی نے محدود علمی واقفیت کے باوجود شاعر، ادیب، مورخ اور نقاد سب کچھ بنا دیا۔ اور صرف مولانا نیاز ہی تک محدود نہیں ہے ہمارے ملک میں ایسے کئی اور بھی ذمہ دار پوزیشن والے با اثر ادبی نقاد موجود ہیں جن کی اس قسم کی بیجا سرپرستی کے سبب معمولی ذہین و شعور کے ادیب اپنے کو نقاد سمجھنے لگے اور بہت سے تک بندی کرنے والوں نے سطحیت احساس کے سبب پہلے ابہام گوئی کو اپنا شعار بنایا اور پھر مہمل نویسی پر اتر آئے مگر مولانا نیاز کو ان لوگوں سے زیادہ اپنی ذمہ داری کے احساس کی ضرورت ہے۔

مولانا نیاز کی طبیعت میں بڑی جدت پسندی ہے وہ اچھے اختراعی ذہن کے مالک ہیں چنانچہ ان کے ہر خیال و ہر تحقیق میں ایک جدت و ندرت ہوتی ہے چنانچہ وہ اکثر ادب، شعر مذہب فلسفہ اور دوسری چیزوں میں جمہور کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے ایک نئی رائے پیش کرتے ہیں اور اس میں ہمیشہ اس قدر وزن رہتا ہے کہ باوجود شور و ہنگامے کے وہ اپنی وقعت حاصل کر لیتی ہے، انھوں نے جہاں اپنا مضمون "نقشہائے رنگ رنگ" لکھ کر فارسی شاعری میں غالب کا صحیح مرتبہ بتایا ہے، وہاں نگار کے مخصوص سالانہ نمبر کے ذریعہ مومن کو بہتر طریقہ سے روشناس کر کے، ان کے ساتھ سالہائے پیشیں میں واقعی جو ناانصافیاں کی گئی تھیں اس کی تلافی کی کوشش میں مومن کے ساتھ اس جوش عقیدت سے کام لیا گیا ہے کہ مولانا نیاز کے ہاتھ سے انصاف کا دامن چھوٹ گیا ہے۔ اور مومن سے ان کا غلو اتنا بڑھ گیا ہے کہ انھوں نے اسے غالب سے برتر ثابت کرنے کی انتہائی کوشش کی تھی اور یہ مومن نمبر کی آمد کا پیش خیمہ تھا مگر غالب غالب ہے اور مومن مومن۔ مومن، غالب کبھی نہیں ہو سکتا مولانا نیاز میں ایک اور کمزوری یہ پائی جاتی ہے کہ مولوی عبدالحق کی طرح وہ مغرب کی یونیورسٹیوں کے سند یافتہ پروفیسروں کی تنقید سے مرعوب نظر آتے ہیں۔

نیاز کے افسانے کا اسلوب

پروفیسر عبدالقادر سروری

مولانا نیاز نے ابتدائی دور میں جو قصے لکھے یا انگریزی قصوں سے اردو میں ترجمہ کئے ان سب میں سب سے پہلی چیز اسلوب اور بیان کی دلکشی ہے جو پڑھنے وا کو گھنٹوں سرور و انبساط کی دنیا میں پہنچا دیتی ہے۔ جو اسلوب نیاز اور سجاد حیدر نے اپنے قصوں کے لئے انتخاب کیا وہ اس قسم کے قصوں کے لئے نہایت موزوں ہے اگر کبھ کبھی صداقت افسانے سے زیادہ تعجب خیز ہوتی ہے تو افسانے صداقت سے زیادہ دلچسپ بھی اور یہی آخری قول نیاز اور سجاد حیدر کے قصوں پر صادق آتا ہے۔ انکی پیدا کرد رومانوی فضا میں ہم صداقت کی کمی محسوس کرنا بالکل بھول جاتے ہیں اور یہی سب سے زیادہ تعریف کسی ادبی کارنامے کی ہو سکتی ہے کہ جب وہ سامنے ہو تو کوئی دوس شے سامنے نہ ہو۔ غرض نیاز کے قصوں میں سب سے پہلی شے اسلوب بیان کی عمدگی ہے۔ جو سارے قصے کو روشن بنا دیتی ہے۔ چست بندشیں، انوکھی ترکیبیں، الفا کا توازن اور موسیقیت ایسے اسلوب کی امتیازی خصوصیت ہے۔ ان کے بہترین قصے "کیوپڈ اور سائکی" کی عبارت کے یہ سرسری نمونے قابل دید ہیں۔

(۱) "یوں تو یونان کے عہد زریں کا ذرہ ذرہ بجائے خود ایک حسن آباد تھا لیکن سائکی کے شباب نے جس رعنائی جمال کا نمونہ پیش کیا۔ وہ حقیقتہً عورت کی دنیا میں ایک سحر تھا۔ ع۱ کیوپڈ نے اس سے قبل سائکی کو باغ میں دیکھا تھا تو وہ بے نقاب ضرور تھی مگر محو خواب تھی۔ لیکن اسے کیا خبر تھی کہ جب حسن سو جاتا ہے تو کیا ہو جاتا ہے۔ اور جب لباس بے ترتیب اور بال برہم ہو جاتے ہیں۔ تو ایک عورت کیا قیامت ہو جاتی ہے"۔

(۲) وہ ساری التجائیں وہ ساری لجاجتیں جو دیگر اعضاء سے کی جا سکتی تھیں اب صرف اسکی آنکھوں میں کھنچ کر آ گئی تھیں اور اسی لئے عالم یاس میں اسکی آنکھوں کا ماں سے طلب رحم کرنا حقیقتاً"...... دل ہلا دینے والا منظر تھا۔" ع۲

نیاز اور سجاد حیدر یلدرم کے قصوں سے نہایت بلند تخیل کا ثبوت ملتا ہے۔ نیاز نے کیوپڈ اور سائکی ہی میں جہاں سائکی کی اس حالت کا نقشہ دکھایا ہے جب وہ کسی چاہنے والے کے نہ ہونے کے غم میں خود فراموش ہو جاتی ہے۔ ایک فنی شہ پارہ ہے۔ اسی ایک واقعہ سے نیاز کے تصویری بیانات کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ سجاد حید یلدرم نے بھی "خیالستان" میں ایک بہترین تخیلی تصویر ایسی لڑکی کی کھینچی ہے جسکو محبت کرنے والے کی تلاش ہے۔ اس خاص نقطۂ نظر سے سجاد حیدر کے بیا آگے نکل جاتے ہیں اور سجاد حیدر و نیاز کے قصے "جذبات نگاری" میں بھی ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ سجاد حیدر یلدرم کے اکثر قصے" اس امر کے ثبوت میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ کہ مستعمل مضامین اور قصے جب ایک کامل فن کے ہاتھ لگتے ہیں تو ادب کے لئے کیونکر مایہ ناز بن جاتے ہیں ؎

" مُردہ بھی بولتا ہے مسیحا کے ہاتھ میں"

مگر اس خصوصیت میں نیاز بھی انکے ساتھ شریک ہو جاتے ہیں کہ انکے غیر زبانوں کے ترجمے بعض وقت اصل سے بھی آگے نکل جاتے ہیں۔ نیاز کے قصوں کی عبارتوں کا بانکپ بندشوں کی جدت اور شگفتگی کے ساتھ سنجیدہ پن بہت کم افسانوں میں پایا جاتا ہے۔ نیاز کا مطمح نظر محض قصہ نہیں بلکہ ادب اور اس کی ترقی بھی ہے۔ اس لئے جہا وہ اپنے اشخاص قصص کی نفسیاتی یا کرداری خصوصیات کو واضح کرنا چاہتے ہیں بعض ایسے شہ پارے بھی نکل پڑتے ہیں جن سے ہر ادب آشنا متکیف ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ سد اور پریم چند، قارئین کو مسرور ضرور کرتے ہیں۔ لیکن پڑھنے والوں کو ادبی نزاکتوں سے محظوظ بنا دینا۔ نیاز اور سجاد حیدر کا کام ہے۔ سدرشن، پریم چند اور خواجہ حسن نظامی مصور فطرت ہی لیکن سجاد حیدر اور نیاز نقاش فطرت یہی دو بزرگوار اردو زبان میں ادب لطیف کے موجد ہیں۔

ع۱ - نگارستان صہ ۸۲ ۱۹۲۲ء ع۲ نگارستان صہ ۱۱۹ ، ۱۱۲ ، ۱۱۳ ع۳ نگارستان صہ ۹۷ ، ۹۸

رومانی افسانہ اور نیاز

پروفیسر سید وقار عظیم

اردو میں جب سے مختصر افسانوں کی بنیاد پڑی زیادہ تر افسانے ایسے ہی لکھے گئے ہیں جن میں کسی نہ کسی پہلو سے فطرت انسانی کا قوی ترین جذبہ محبت حکمراں رہا۔ لیکن فرق صرف یہ ہے کہ مختصر افسانوں کی ابتدا کے ساتھ ہی اس میں ایسی روشیں عام ہو گئیں جنہوں نے محبت کو، فطرت اور نفسیات کا پابند کرنا شروع کر دیا اور رفتہ رفتہ اب ہمارے افسانے ایک ایسی منزل پر پہنچ چکے ہیں۔ جہاں مبتدیوں کے افسانوں کو چھوڑ کر اچھے لکھنے والوں کے افسانوں میں فطری محبت اور نفسیات کی بلندی کی کمی نہیں محسوس ہوتی۔

محبت کے جن مرقعوں میں مبالغہ اور غیر فطری عناصر کے شامل ہونے کی زیادہ گنجائش ہے وہ ہمیں عموماً رومانی اور مثلی افسانوں میں مل سکتے ہیں۔ افسانوں کی دونوں قسموں کے لوازم فطری طور پر کچھ اس طرح کے ہیں کہ ان میں شاعرانہ مبالغہ ایک حسن پیدا کر دیتا ہے۔ بلکہ کبھی کبھی تو شاعرانہ مبالغہ کے بغیر اس کی حقیقتیں نہایت تلخ اور بے مزہ معلوم ہونے لگتی ہیں۔ ہمارے افسانہ نگاروں میں سے جن جن نے رومانی محبت کے افسانے لکھے ہیں ان کے یہاں نفسیات اور نفسیاتی تحلیل کے بہترین نمونے موجود ہیں۔ رومانی افسانہ نگاروں میں نیاز فتحپوری اور سجاد حیدر کے افسانے اردو ... کے افسانوی ادب میں سرمایہ ناز چیزیں ہیں۔ اور ان دونوں رومان پرست افسانہ نگاروں کے افسانے پڑھنے کے بعد ہمیں جہاں ایک طرف رومانی محبت کے بہترین شاعرانہ مرقعے ملتے ہیں۔ وہاں دوسری طرف نفسیات اور فطرت کا ان کے اوپر اتنا گہرا اثر ہے کہ ہم ذرا سی دیر کو بھی ان شاعرانہ مبالغوں سے مکدر نہیں ہوتے۔ انکی شاعری نفسیات کی پابند ہے اور انکی نفسیات فن اور اسکی لطیف بلندیوں کی حامل، اس لئے قدیم رومانی جذبہ اور اس فطرت اور نفسیات کے رنگ میں ڈوبے ہوئے رومان میں ہمیں زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے ہماری نظریں انہیں بڑھ کر بلندی کی طرف جاتی ہیں۔

رومانی محبت کے علاوہ مختصر افسانوں میں مثالی محبت کی ترجمانی کرنے والے ایک دو نہیں بیسوں اچھے افسانے موجود ہیں۔ ان کے عاشق اور معشوق اپنی ظاہری اور باطنی خوبیوں اور محاسن کے اعتبار سے بلند ترین نمونے ہیں۔ اور ان کی تقلید کرنیوالا، ان کے راستہ پر چلنے والا، آسانی سے اپنے آپ کو بلندی کی طرف مائل یا محسوس کرتا ہے۔ لیکن ان باتوں کے باوجود ان کے خیالات، جذبات، احساسات، جذباتی کشمکش، عمل اور کردار، ہر چیز فطرت اور نفسیات کی پابند ہے۔ ان میں انقلابات بھی رونما ہوتے ہیں، مختلف تبدیلیاں بھی ان پر اثر کرتی ہیں، ان کی فطرتوں کو بھی مختلف ہیجانات اور کشمکشوں کے درمیان ہو کر گذرنا پڑتا ہے اور ان سب موقعوں پر یہ جو کچھ کرتے ہیں، جو کچھ کہتے ہیں جس طرح ان چیزوں کا مقابلہ کرتے ہیں اور جس طریقہ سے کسی اچھے سے اچھے نتیجہ پر پہنچتے ہیں یہ سب چیزیں جہاں ایک طرف مثالی محبت کی نظیر ہوتی ہیں وہاں فطرت انسانی اور نفسیات کے منافی بھی نہیں ہوتیں۔ اس لئے ہمیں اپنے افسانوں کی مثالی محبت میں ایک خاص کیف اور بلندی محسوس ہوتی ہے۔ ایسے افسانوں کی کافی مثالیں ہمیں نیاز، سجاد حیدر، مجنوں، حسینی اور قیسی کے افسانوں میں آسانی سے مل سکتی ہیں۔

نیاز کے افسانے پریم چند یا سدرشن کی طرح کسی مخصوص سوسائٹی کے مرقع نہیں ہیں۔ غالباً وہ مقامی رنگ یا کسی مقصد کا شامل کرنا افسانہ کے لئے غیر شاعرانہ سا خیال کرتے ہیں جس سے افسانہ کی نزاکت اور حسن کو ٹھیس لگتی ہے۔ ان کے افسانے حسن اور عشق کی داستانوں کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہیں۔ ان کے نزدیک محبت اور عورت افسانہ کا سب سے زیادہ دلکش اور دلفریب موضوع ہو سکتا ہے۔ صرف اسی ذکر کے بعد کائنات کے جسم مردہ میں روح اور کیف کی سرمستی پیدا کی جا سکتی ہے۔

یہی چیز مردہ دلوں کے لئے پیامِ بیداری بن سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں پر رومانیت چھائی ہوئی ہے۔ رومان سے انھیں محبت نہیں، بلکہ والہانہ عشق سا ہے۔ سجاد حیدر کے افسانے بھی رومانی ہیں، ان میں بھی رومانی کیف اور انکی رنگینیاں موجود ہیں، لیکن نیاز کی رومانیت ان سے الگ ہے۔ وہ رومان کی آغوش میں سکون تلاش کرتے ہیں۔ ان کا رومان ہمیشہ اضطراب و ہیجان کا دمساز ہے۔ یہ اضطراب و ہیجان ہماری روح کو ہمارے احساسات کو، ہمارے جذبات کو عام سطحِ انسانی سے بلند لے جانیکی کوشش کرتا ہے۔ ہم تھوڑی دیر کے لئے ایک ایسے عالم کی سیر کرنے لگتے ہیں جہاں کا ہر ذرہ رومان کے جذبہ میں ڈوبا ہوا ہے۔ جہاں کی ہر نظر فریب رنگینی اور سادگی رومان کا پیام دیکر ہمیں اپنی طرف کھینچتی ہے۔ ہمیں سرشار بناکر اپنے گرد و پیش سے اسقدر بے خبر کردیتی ہے کہ ہم صرف رومان کی پرستش کو اپنے لئے پیامِ زندگی سمجھنے لگتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نیاز کو اردو کا سب سے بڑا رومانی افسانہ نگار کہہ سکتے ہیں۔

نیاز کے افسانوں میں رومانیت مختلف طریقوں سے جلوہ گر نظر آتی ہے۔ اول تو وہ اپنے افسانے کا موضوع ایسے واقعات کو بناتے ہیں جو کلاسی حیثیت سے ایک رومانی درجہ حاصل کرچکے ہیں۔ ان کلاسی واقعات میں، کہیں معصومیت اور کہیں سحر، رومانی لطافت کا مظہر ہے اور کہیں خود ان کی فطری شعریت اور بلند شاعرانہ اور افسانوی تخیل ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نئی نئی باتیں نکالتی اور ہر جگہ نئے لطف پیدا کرتی ہے۔ اور ان کلاسی افسانوں میں رومان اور محبت کے کیف آور ہیجان پرور مرقعے کھینچے جاتے ہیں۔ مثال کے لئے "ذاکرِ محبت" "حرا کا گلاب" اور "کیوپڈ اور سائیکی" کو دیکھئے۔ ان میں سے ہر ایک کی بنیاد ایک کلاسی اور تاریخی واقعہ پر ہے۔

ان کلاسی واقعات کے علاوہ کبھی کبھی وہ افسانے کا پلاٹ محض تخیل سے پیدا کرتے ہیں اور ان میں رومانی عناصر شامل کرکے اُسے اپنے رنگ میں رنگ لیتے ہیں۔ اس تخیل میں ہمیشہ افسانوی دلکشی اور رومانی فریب کا خیال رکھا جاتا ہے۔

نیاز کے رومانی افسانوں کی جان، انھیں پُر تاثیر بنانے والی قوت، ان میں شعریت اور رنگینی کی کیف آگینیاں شامل کرنیوالی لطیف شئے صرف عورت ہے۔ عورت کے نغمے نے ان کے ہر لفظ کو، ہر جملہ کو، ہر قصہ کو رومانی اور رومانی سے زیادہ کیف آور بنانے میں مدد دی ہے۔ عورت کو انہوں نے جن جن طریقوں سے یاد کیا ہے اور ان کا ذکر کرتے وقت زبان نے جو کچھ کہا ہے اس سے رومانیت کا صحیح اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

"ایک حسین عورت کی جو حرکت ہے وہ ایک نطقِ موسیقی ہے۔ حسن کا ساز نسائیت اور صرف نسائیت ہے وہ ہاتھ ہلاتی ہے گویا ہوا میں نقشِ ترنم بنا دیتی ہے۔ وہ چلتی ہے اور اپنے پیروں سے زمین پر نشانِ موسیقی چھوڑ جاتی ہے۔"

(چند دن بمبئی میں)

عورت کائنات کی ساری حسین چیزوں کا نچوڑ ہے اور اس کے بغیر زندگی بے کیف اور بے روح ہے۔"

(ایک معصوم فرشتہ)

عورت کا حسن ان کے نزدیک صرف دیکھنے کے لئے ہے۔

آزاد۔ رمیدہ۔ آغوش سے دور" (ایک رقاصہ سے)

یہ "ایک لذت ہے مجسم۔ ایک تسکین ہے متشکل۔ ایک سحر ہے مرئی۔ ایک نور ہے مادّی

(عورت)

لوگ کہتے ہیں کہ تو عریانی ہے اور تیرا رقص اور زیادہ عریانی مگر وہ نہیں جانتے کہ ہر صنعت کی تکمیل عریانی پر ہوتی ہے۔"

(رقاصہ)

یہی وجہ ہے کہ ایک جگہ یہ کہتے ہیں:-

"سب سے بڑا اعتراض جو اس نوع کے لٹریچر پر کیا جاتا ہے یہ ہے کہ اس میں عورت اور اس کے متعلقات کا ذکر عنصر غالب ہے لیکن مجھے حیرت ہوتی ہے کہ عورت اور اس کے ذکر نکال دینے کے بعد آپ کے پاس کیا رہ جائے گا۔ کائنات میں کونسی دوسری چیز ایسی ہے جس سے آپ اس کی رونق کو قائم رکھ سکیں۔"

جس سے آپ اس کی رونق کو قائم رکھ سکیں۔

”کیا وجہ ہے کہ جو لوگ نثر میں شاعری کرنا چاہتے اس حسن کے ذکر سے غائب ہو جائیں۔“ (مقدمہ کیوپڈ سائکی)

عورت کے ساتھ ساتھ ان کا نظریہ محبت بھی رومانی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ عورت محبت کے لئے پیدا ہوئی ہے مرد اور اس کی محبت فطری ہے اور یہ انسان میں پرستش کی حد تک موجود ہونی چاہیئے۔ محبت کا جذبہ اُن کے نزدیک فطری ہے۔ اسے جتنا دبایا جائیگا اتنا ہی ابھرے گا۔ جتنا اسے چھپانے کی کوشش کی جلئے گی اتنا ہی نمایاں ہوگا۔ کوئی دل ایسا نہیں جو فطرت کی طرف سے محبت کے جذبات لے کر نہ آیا ہو۔ یہ جذبات غیر محسوس طریقہ پر ہمارے دلوں میں ترقی کرتے ہیں۔ فطرت اور اس کے مظاہر، کائنات اور اس کے تمام لوازمات کے کسی نہ کسی جزو میں محبت شامل ہے اس لئے دل ان چیزوں میں رومانی لذت اور محبت کی کشش محسوس کرتے ہیں اور خود بخود محبت کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

نیازؔ کے افسانوں میں اسی وجہ سے اتحاد و اثر بہت زیادہ ہے کہ وہ جو کچھ لکھتے ہیں ایک ہی رنگ میں ڈوب کر لکھتے ہیں۔ بلکہ کہیں کہیں اپنے جذبات اور احساسات کو نمایاں کرنے کے لئے خیالات کی رو میں جو جو جی میں آتا ہے کہتے چلے جاتے ہیں اور اس کا نتیجہ کبھی کبھی یہ ہوتا ہے، وہ چیزیں جنھیں ہم ادب لطیف کہتے ہیں بے حد غیر دلچسپ ہو گئی ہیں اور ایک مجموعی تاثیر پیدا کرنے کے بجائے طبیعت پر ایک بار معلوم ہوتی ہیں۔ اور افسانہ کی ساری فضا غیر دل کش ہو جاتی ہے۔

نیازؔ کے افسانوں کی ابتدائیں ہمیشہ بہت تصور زا ہوتی ہیں۔ اور ہمیں فوراً اسی دُنیا میں کھینچ کر لے جاتی ہیں جہاں افسانہ نگار خود ہے

نیازؔ کے دوسرے دَور کے افسانوں میں حقیقت اور نفسیات کا مظاہرہ رومانیت اور کلاسیت سے کہیں زیادہ ہوا ہے جن میں ہمیں نفسیات کے گہرے نقوش اور تصورات کے علاوہ کرداری ارتقا۔ جذبات و تحریکات کی جنگ۔ خیالات و احساسات کے فطری نمونے زیادہ نظر آتے ہیں۔ ان میں نیازؔ رومانیت پسند تو ضرور ہیں لیکن رومان پرست نہیں۔ اس کی کمی بڑی حد تک حقیقت شعاری نے پوری کی ہے۔

لیکن اس کے باوجود ان کے رومانی۔ تخیلی۔ کلاسی۔ عاشقانہ نفسیاتی یا حقیقی ہر افسانہ میں پلاٹ کے لحاظ سے ہمیشہ دلچسپی ہے۔ افسانوی دلکشی میں کہیں کمی نہیں آتی۔

* * *

”دُنیا کی تمام ان صداقتوں میں سے جن کا تعلق انسانی تاثرات سے ہے، ایک کھلی ہوئی صداقت شعر بھی ہے اور اس لئے ہم شعر کو فطرت سے جدا نہیں کرسکتے۔ اگر مختلف مناظر کا ظہور، فطرت کے متنوع الالوان مظاہر و آثار کا مشاہدہ ہمارے حواس کو متاثر کرسکتا ہے، تو یہ حقیقت بھی تسلیم کرنا پڑیگی کہ قدرت ہمارے لئے ہر وقت اسباب شعر فراہم کیا کرتی ہے خواہ ہم اس سے فائدہ اٹھانے کے اہل ہوں یا نہ ہوں۔

دریا کی روانی، آسمان کی لاجوری فضا، صبح و شام کا طلوع و غروب، رات کی تاریکی، دن کی ضیا پاشی، بہار و خزاں، سردی و گرمی، لذت و الم اور علاوہ اس کے تمام وہ مناظر و کیفیات جن سے نفس انسانی متاثر ہوتا ہے، وہ برکات ہیں، جن کو فطرت ہر وقت اور ہر حال میں نہایت فیاضی سے ہمارے لئے فراہم کرتی ہے، لیکن ہم میں کم ایسے ہیں جو احساس کے اُس نقطۂ اضطراب تک پہونچ جائیں، جہاں تاثر کی حد ختم ہو کر شاعری شروع ہو جاتی ہے۔“

(نیازؔ)

* * *

نیاز کا ایک طویل افسانہ

"شہاب کی سرگزشت"

پروفیسر عبد السلام

نیاز صاحب اردو ادب میں عجیب و غریب حیثیت کے مالک ہیں۔ انہوں نے نصف صدی سے زیادہ اردو ادب کی خدمت کی ہے اور شاید ہی کسی اہم صنف ادب کو چھوڑا ہو مگر انہیں افسانہ نگار، نقاد یا فلسفی کہنے کے بجائے عالم کہنا زیادہ موزوں ہے۔

نیاز صاحب نے افسانہ نویسی اس وقت شروع کی جب اردو افسانہ پر رومانیت چھائی ہوئی تھی ان کے یہاں سجاد یلدرم اور ٹیگور کا کافی اثر نظر آتا ہے۔ یلدرم .... کے نزدیک عورت فطرت کا شاہکار ہے۔ نیاز صاحب کے یہاں بھی عورت سے وابستگی پائی جاتی ہے مگر ان کا طرز فکر ان سے مختلف ہے۔

نیاز کے تصورات اور فن کو سمجھنے کے لئے "شہاب کی سرگزشت" غالباً سب سے زیادہ موزوں ہے۔ بعض صاحبان برنارڈ شا کے ڈراموں کو مباحثے کہہ کر پکارتے ہیں یہی کیفیت "شہاب کی سرگزشت" میں نظر آتی ہے۔ شہاب دراصل نیاز کا تصوراتی پیکر ہے۔ ۱۷۶ صفحات کے اس طویل افسانے کی کہانی بہت مختصر ہے۔ یہ کہانی محض ایک بہانہ نظر آتی ہے۔ مصنف کا اصل مقصد نکاح اور محبت کے بارے میں اپنے تصورات پیش کرنا ہے۔ غالب کی طرح نیاز بھی اپنی الگ راہ تراشنا چاہتے ہیں۔ اس رجحان کی جھلک ہر جگہ ملتی ہے۔ نیاز کے فن کی بنیادی خصوصیت انکی آزادی فکر ہے۔ ان کے ادبی اور مذہبی ہنگامے اسی آزادیٔ فکر کا مظہر ہیں۔ یہ کتاب بھی انکی آزادی فکر کا اچھا نمونہ پیش کرتی ہے۔ ویسے تو ہر مصنف کی تحریر میں اس کے نظریۂ زندگی کی جھلک ملتی ہے مگر دوسرے رومانوی ادیبوں کی طرح اس کتاب میں بھی مصنف کا نظریہ اور تصور بہت نمایاں ہو گیا ہے۔

نیاز اپنے نظریات کو منوانے کے لئے فلسفے کے حربے استعمال کرتے ہیں اسی لئے ان کے مکالمے طویل بحثیں یا تقریریں بن گئی ہیں۔

ان کی کہانی نہ زندگی کی ترجمانی ہے نہ تنقید۔ بلکہ اس میں ایک حسین تصوراتی زندگی پیش کی گئی ہے۔ ممکن ہے حقیقت کے علم بردار اسے حد درجہ غیر حقیقی اور غیر صحت مند کہہ کر پکاریں مگر رومانوی ادیب تو تلخ حقیقتوں سے اکتائے ہوئے انسانوں کا غم غلط کرنے کے لئے ہی اپنی حسین دنیا سجاتے ہیں رومانوی ادب زندگی سے فرار سہی مگر اس کی دلآویزی اور سحر سازی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

نیاز کی رومانوی دنیا کا ہیرو بڑا نستعلیق قسم کا انسان ہے۔ اردو میں غالباً نیاز سے پہلے اس قسم کا ہیرو کسی نے پیش نہیں کیا۔ شہاب کا تعارف اس طرح کرایا جاتا ہے:۔

" اس کی ہر دل میں گھر کرنے والی ادائیں۔ وہ اس کی خودداریاں جنہوں نے اس کے اندر خدا جانے کتنی رعنائیاں پیدا کر دی تھیں ایسی مستقل چیز تھی کہ لفظ شہاب کا مفہوم ہی متانت و سنجیدگی۔ خودداری و رعنائی۔ ذہانت و تہذیب قرار پا گیا تھا ——— وہ فطرتاً فلسفی تھا لیکن اسی کے ساتھ حد درجہ پاکیزہ ذوق ادب اپنے اندر رکھتا تھا اور حیرت ہوتی تھی کہ وہ شخص جو محض خشک علمی آدمی بن سکتا تھا اس میں اتنی نزاکت خیال لطافت

ذوق کہاں سے آئی ــــ جس طرح وہ بڑی سے بڑی مسرت سے غیر متاثر نظر آتا تھا اسی طرح سخت سے سخت رنج بھی اسکو مضمحل نہ کر سکتا تھا۔"

شہاب کی محبت، ہمدردی اور دوستی کے اصول ساری دنیا سے نرالے ہیں اسی لئے بادی النظر میں وہ سنکی سا نظر آتا ہے مگر اس کردار کو خلاف فطرت نہیں کہہ سکتے۔ آج بھی اس قسم کے انسان آپ کو فلسفی قسم کے شاعروں میں مل جائیں گے۔ وہ تقریباً ہر معاملے میں اپنے دوستوں اور گردوپیش کے لوگوں سے اختلاف رکھتا ہے مگر اپنے نظریات کو منوانے کے لئے وہ ایسی دلیلیں پیش کرتا ہے کہ محمود جیسا ذہین انسان اور اختر جیسی جہاں دیدہ اور طرار عورت کو بھی سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے۔ تمام افراد قصہ اسکی منطق سے مرعوب ہو جاتے ہیں۔ نیاز کی طرح وہ بھی بہت سے مسلمات کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ نکاح کو محبت کی موت سمجھتا ہے وہ اپنے عزیز دوست محمود کو نکاح سے باز رکھنے کے لئے جو منطق استعمال کرتا ہے اسے اسی کی زبان سے سنئے:۔

" چونکہ تم اس سے زیادہ کسی سے محبت نہیں کر سکتے" اسی لئے اس سے زیادہ ناموزوں تمہاری بیوی بننے کے لئے اور کوئی نہیں ــــــ اگر محبت کا نتیجہ صرف نکاح ہونا چاہیئے تو میں کہونگا کہ آگ کا کام بہا لیجانا اور پانی کا کام جلا دینا ہونا چاہیئے۔" اس سے اتفاق کیا جاسکتا ہے کہ محبت کی بعض شادیاں ناکام رہتی ہیں لیکن اسے کلیہ نہیں بنایا جاسکتا محبت کی بہت سی شادیاں کامیاب بھی رہتی ہیں۔ کامیابی یا ناکامی کا تعلق دراصل افراد متعلقہ کے مزاج رویہ اور حالات سے ہے۔ ازدواجی تعلقات میں خوشگواری طرفین کے سلیقے سے پیدا ہوتی ہے عام اس سے کہ وہ محبت کی شادی ہو یا اس کے برخلاف، اس لئے ہم شہاب کی منطق سے اتفاق نہیں کر سکتے۔ یہاں بھی وہ ہمیں محض تصوراتی اور سنکی نظر آتا ہے مگر نکاح کے بارے میں اس کے نظریات کی تعبیر اس وقت نکلتی ہے جب وہ ایک بچوں والی بیوہ سے نکاح کر لیتا ہے۔ وہ محبت کے خلاف نہیں لیکن جذباتی محبت کا وہ قائل نہیں ہے اسی لئے اس کے نزدیک " اس جذباتی محبت سے متاثر ہو کر جو نکاح کیا جاتا ہے وہ ناپائدار ہوتا ہے" وہ نکاح کو ایک بلند معاشرتی فریضہ سمجھتا ہے۔ اس لئے جذباتی محبت سے اسکی بساط وقتی اُبال سے زیادہ نہ ہو اسے داغدار نہیں کرنا چاہتا وہ یہ منطق بھی پیش کرتا ہے کہ جذباتی محبت کی بنیاد شہوانی جذبہ پر ہوتی ہے وصال محبوب کے بعد یہ جذبہ تسکین پا جاتا ہے اس لئے شباب ڈھل جانے کے بعد دونوں ایک دوسرے سے بے رخی برتنے لگتے ہیں ہم اس نتیجے کو کلیہ نہیں بنا سکتے مگر اس کی صحت سے انکار نہیں کر سکتے۔

شاعر عموماً جذباتی ہوتے ہیں اسی طرح محمود بھی جذباتی محبت میں مبتلا ہے شہاب یہ محسوس کرتا ہے کہ فطرت نے محمود میں جو صلاحیتیں پیدا کی ہیں یہ جذباتی محبت انہیں ختم کر سکتی ہے۔ اسے فطرت نے شاعر، ادیب، نقاش اور مصور پیدا کیا ہے۔ شہاب چاہتا ہے کہ وہ ان صلاحیتوں کو بروئے کار لائے اسی لئے وہ اس سے کہتا ہے " میں چاہتا ہوں کہ تم طلوع و غروب کے مناظر دیکھو اور ان میں بالکل جذب ہو جاؤ ــ تم ایک پھول کو شاخ پر جھومتا ہوا دیکھو اور کائنات کو فراموش کر دو تم ایک خشک پتی کو دیکھو اور خزاں کی ساری کیفیات اپنے اوپر طاری کر لو۔ تم ایک سبز گھاس کا تنکا دیکھو اور بہار کے اثرات کو اپنی روح میں منتقل کر لو تم پانی کو دیکھو اور تڑپو۔ چاند کو دیکھو اور بے قرار ہو جاؤ۔ یہاں تک کہ تمہاری ہر نظر تمہارے لئے ایک دفتر جذبات ہو جائے اور تم اپنے وجود کو بالکل بھول جاؤ"

فنون لطیفہ کی دنیا ایسا ہی انہماک چاہتی ہے جس دنیا میں شہاب محمود کو پہنچانا چاہتا ہے وہ محض تصوراتی ہے مگر اس کے حسن سے انکار نہیں کر سکتے۔ فطرت حسن کا لازوال سرچشمہ ہے اور فطرت اپنا یہ خزانہ اسی کو بخشتی ہے جو اس کی خاطر اپنی ہر خوشی کو قربان کر دے چاہے ہم ایسی زندگی گزارنے کے لئے تیار نہ ہوں مگر ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس فضا میں زندگی گزارنے والے کا جمالیاتی احساس کسقدر بلند اور لطیف ہے۔

موجودہ زمانہ میں نفسیات سے دلچسپی دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ شہاب میں یہ خصوصیت بھی پائی جاتی ہے۔ خصوصاً عورتوں کی نفسیات سے وہ کافی آگاہ نظر آتا ہے مگر مصنف نے اس سلسلے میں کچھ مبالغے سے کام لیا ہے۔ ساحل اپالو پر وہ اس لئے جاتا ہے کہ " وہ ایک ایک گزرنے والی عورت کو غور سے دیکھ کر یہ معلوم کریگا کہ ساڑیوں کے کتنے رنگ، آرائش گیسو کے کتنے انداز اور حسن کی بے حجابیوں کی کتنی صورتیں ہو سکتی ہیں اور پھر ان سب میں وجہ مشترک کیا ہے" ایک ہی دن کے مشاہدہ کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اس عہد کی عورت نہ کسی سے محبت کر سکتی ہے اور نہ اسے کسی دوسرے کی محبت کی قدر ہو سکتی ہے۔ نفسیات داں یا فلسفی اس قسم کے اور اس طرح نتیجے اخذ نہیں کرتے۔ اسی طرح وہ صرف صورت

دیکھ کر دل کے حالات جان لینے کا دعویدار ہے اس کے ثبوت میں وہ یہ منطق پیش کرتا ہے: "اگر صورت میں کوئی بات ایسی نہ ہوتی جس سے دل کا حال معلوم ہو سکتا تو یقیناً انسان کا دل اس کی پیشانی پر قائم کیا جاتا اور پھر خصوصیت کے ساتھ "عورت کا دل"" اسی سلسلے میں وہ کہتا ہے "یاد رکھو جو عورت جس قدر زیادہ حسین نظر آنے کی کوشش کرتی ہے اسی قدر اس کا باطن خراب و کریہہ ہے۔ وہ کیا چیز ہے جو کشاں کشاں ان عورتوں کو مردوں کی حریص نگاہوں کے ہجوم میں ساحل اپالو پر لے آتی ہے ...... نرم نرم ریشمی ساریاں صرف اس لئے استعمال کی جاتی ہیں کہ دیکھنے والے یہ سمجھیں کہ ان کے اندر ریشم سے زیادہ نرم بدن چھپا ہوا ہے اور پھر یہ بھی مقصود ہے کہ ساری کا آنچل نرمی کی وجہ سے گھڑی گھڑی سرک جایا کرے اور وہ بار بار لپٹنے کا فور سینہ و جود شانہ کی شفاف جھلک دکھا کر پھر اسے سنبھال لیا کریں اور اس طرح اپنے گورے گورے ہاتھوں کو بھی کہنیوں تک دکھا سکیں ——

یاد رکھو ان کے تبسم میں زہر ہے ان کی نگاہیں سم آلود ہیں اور یہ وہ ناگنیں ہیں جن کو دنیا کے تمدن و تہذیب نے عالم میں صرف ہلاکت پھیلانے کے لئے چاروں طرف منتشر کر رکھا ہے۔" یہ اقتباس خاصہ طویل ہو گیا ہے مگر عورت کے بارے میں شہاب کے تصورات کو سمجھنے کے لئے اسے پیش کرنا ضروری تھا۔ وہ عورتوں کے بناؤ سنگار اور ان کے جذبۂ نمائش سے نفرت کرتا ہے مگر اس کا تذکرہ ایسے انداز سے کرتا ہے کہ اس کی ذہنیت مریضانہ نظر آنے لگتی ہے۔ بمبئی جیسے کاروباری اور ہماہمی کے شہر میں ساحل پر عورتیں صرف نمائش حسن ہی کے لئے نہیں آتی ہیں اسی طرح گھر سے باہر نکلتے وقت اچھا لباس پہننا ہماری تہذیبی روایت ہے اس رویہ کو کسی ناپاک اور غیر پسندیدہ جذبہ سے منسوب کرنا درست نہیں۔

مصنف نے غالباً شہاب کو فلسفی ثابت کرنے کے لئے ایسے عجیب اور انوکھے تصورات اس سے منسوب کئے ہیں۔ اسی طرح اس میں یہ بھی عجیب معلوم ہوتا ہے کہ وہ اختر جیسی حسین اور دل کش عورت سے کافی بے رخی سے گفتگو کرتا ہے اور بظاہر اس کے حسن و جمال کا کوئی اثر قبول نہیں کرتا ایسے حسن دوست نوجوان کے لئے یہ عجیب سا نظر آتا ہے مگر اس کی وجہ بھی شاید اس کی حد سے بڑھی ہوئی انانیت اور انفرادیت ہی ہے۔ اس کا ظاہر کبھی کبھی خشک اور درشت ہو جاتا ہے مگر اس کا باطن انتہائی ہمدردانہ ہوتا ہے۔ اس کا خلوص گفتگو سے نہیں بلکہ عمل سے ظاہر ہوتا ہے۔ محمود کے ساتھ اس کا رویہ بادی النظر میں بڑا جابرانہ نظر آتا ہے مگر پھر بھی اس میں کوئی بات ایسی ہے کہ محمود اس کے سامنے لرزہ براندام ہو جاتا ہے محمود کا دل ہمیشہ اس کا مطیع اور محکوم رہتا ہے۔ اسے شہاب سے اتنی عقیدت ہے جتنی کسی سادہ لوح مرید کو عیار پیر سے ہوتی ہے۔

شہاب کو نمود اور دنیا سازی سے نفرت ہے اسی لئے وہ حق بات بعض اوقات بڑے تلخ اور دل شکن انداز میں کہتا ہے۔ اس کے باوجود محمود سکینہ اور اختر اس کے دام عقیدت سے نہیں نکل سکتے۔ ایسے ہی واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ عظیم شخصیت کا حامل ہے دوسرے افراد قصہ کے مقابلے میں کردار کے اعتبار سے وہ دیو پیکر نظر آتا ہے۔

اختر گفتگو میں شہاب کو صاحب پندار اور آبگینہ کی طرح نازک مزاج کہہ کر پکارتی ہے مگر اس کا دل شہاب کی پرستش کرتا ہے۔

شہاب اس کہانی میں عمل کا بھی مرد میدان نظر آتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک رومانوی پیکر ہے۔ کیٹس کی طرح اس کی زندگی کا مقصد بھی تلاش حسن نظر آتا ہے۔ وہ مادی دنیا کا کامیاب انسان اس لئے نہیں بن سکا کہ وہ سمجھوتے کرنے کے لئے تیار نہیں اس کی دنیا سب سے الگ ہے۔ وہ اس بلندی پر نظر آتا ہے کہ کوئی اس کا ہم سفر نہیں ہو سکتا۔ طفیل اور محمود اختر کے حسن سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں شہاب کو زیادہ کشش حسن فطرت میں محسوس ہوتی ہے۔ اپنے دل کا حال اختر سے اس طرح کہتا ہے :-

"آسمان کو دیکھتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ شاید اس نیل میں ڈوب کر رہ گیا ہے۔ سمندر کو دیکھتا ہوں اور خیال ہوتا ہے کہ شاید اس کے تلاطم امواج میں مل گیا ہو گا۔ شفق نظر آجاتی ہے تو گمان ہوتا ہے کہیں اس رنگ میں تحلیل نہ ہو گیا ہو۔ چاند اپنی چاندنی پھیلا دیتا ہے میں کوشش کرتا ہوں کہ کہیں اس فرش سیمیں میں کوئی شکن نظر آجائے تو سمجھوں کہ دل یہیں ہے اس طرح ہر پھول اور پھول کی ہر پنکھڑی میں اسے اپنا دل ملفوف نظر آتا ہے۔ کچھ کا قاری اسے محض لفاظی اور تصنع سمجھتا ہے اور حقیقت نگاری کے دور میں ایسا سمجھنے والا حق بجانب بھی ہے۔ اگر ہم یہ ملحوظ رکھیں کہ شہاب ایک رومانوی

پیکر ہے تو ہمیں ان الفاظ کی تہ میں حقیقی آرٹسٹ اور پرستارِ فطرت کی روح نظر آتی ہے۔

میں کہہ چکا ہوں کہ قصہ نیاز کے لئے محض ایک بہانہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں کئی مقامات پر خامیاں نظر آتی ہیں۔ مثلاً ایک آدھ جگہ شہاب کے کردار میں بلندی پیدا کرنے کے لئے کچھ ایسے کام اس سے منسوب کئے ہیں جن کا کوئی جواز کہانی میں نہیں ملتا۔ محمود کی بیوی سکینہ کے پاس وہ پانچ نوٹ سو سو روپے کے بھیج دیتا ہے۔ اس سے پہلے سکینہ کو مالی پریشانیوں میں مبتلا دکھانا ضروری تھا۔ محمود کا خاندان کافی خوشحال نظر آتا ہے۔ پھر اس کا بھی کوئی جواز پیش نہیں کیا گیا ہے کہ شہاب کے پاس اتنی فالتو رقم کہاں سے آ گئی۔ جبکہ کہانی میں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پبلشر کی ایک رقم اس کے ذمے کافی عرصے سے واجب الادا تھی۔ اسے ضرورت مند سمجھ کر ہی اختر نے مناسب طریقے سے اس کی مدد کرنی چاہی مگر پتہ چلنے پر وہ اُلٹا اختر کے پاس کچھ رقم پہنچا دیتا ہے۔ یہ رویہ قابلِ تعریف تو ضرور ہے مگر قرینِ قیاس نظر نہیں آتا۔

قصے کے اختتام پر ہمیں شہاب سے ہمدردی ہوتی ہے اور اسکی وقعت کا سکہ دلوں پر بیٹھ جاتا ہے مگر حقیقت نگاری کے اس دور میں اگر ہم اس کے کردار کا تجزیہ کریں تو ہمیں پروفیسر مجنوں سے اتفاق کرنا پڑے گا لکھتے ہیں۔ "سارے افسانے کی بنیاد شہاب کی خارج المرکز (ECCEN-TRIC) انفرادیت پر ہے جو عام دنیائے انسانیت کے لئے کسی طریقے سے صحت و برکت کی چیز نہیں ہو سکتی۔"

محمود اس کے برخلاف اسی دُنیا کا انسان نظر آتا ہے۔ اسکی محبت، لغزشیں۔ گھر سے بھاگ آنا۔ یہ سب باتیں ایک عام نوجوان کی فطرت کے مطابق نظر آتی ہیں۔ شہاب کی محبت کی بنا پر وہ نکاح سے باز رہنے کے لئے آمادہ ہے مگر اس کا یہ جذبہ قابلِ غور ہے کہ اس کے انکار سے سکینہ کو سخت صدمہ پہنچے گا ایسا صدمہ جس سے وہ شاید جانبر نہ ہو سکے۔ وہ سکینہ کو اپنی شاعری پر قربان کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا ایسا کرنے میں اسے خود غرضی نظر آتی ہے۔ شہاب سے عقیدت رکھنے کے باوجود وہ اسے ناراض چھوڑ کر سکینہ سے نکاح کر لیتا ہے۔ بیوی اور ماں کے اختلافات کی بنا پر وہ گھر چھوڑ کر بمبئی چلا جاتا ہے ...... اور شہاب کی شفقت کے دامن میں پناہ لینا چاہتا ہے اس کے ارادوں کی کمزوری قرینِ قیاس ہے۔ شہاب کے ٹھکرائے جانے کے بعد اختر کی طرف مائل ہونا پھر اس کے ساتھ عیش کرنا بھی قرینِ قیاس اور فطری ہے لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ سکینہ چاہتی ہے کہ محمود اسے لیکر اپنی ماں سے علیحدہ رہے۔ محمود اس رائے سے اختلاف نہیں کرتا۔ مگر وہ اسکے اخراجات برداشت نہیں کر سکتا کیونکہ اس کی کوئی مستقل شخصیت نہیں تھی۔ اس کے والدین مصارف کے کفیل نہیں ہو سکتے تھے یہ تمام باتیں سمجھ میں آ سکتی ہیں مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ بمبئی میں رہکر عیاشی کرنے کے لئے اسے کہاں سے روپیہ مل جاتا ہے۔

طفیل عیش پرست، سخن ساز اور بے فکر نوجوان کا نمونہ پیش کرتا ہے اسے بازاری عورتوں کو پھانسنے میں کمال حاصل ہے۔ ان کے ذریعہ وہ اپنی معاش کا بھی بندوبست کر لیتا ہے۔ اس کا کردار بھی قرینِ قیاس نظر آتا ہے اس قسم کے انسان ہر زمانہ میں پائے جاتے ہیں۔ وہ صرف لذت پرست ہے۔ اس کے نزدیک جوانی کا لطف اس کی حفاظت میں نہیں بلکہ اسے ضائع کرنے میں ہے۔

اس کہانی کا ایک اہم کردار اختر ہے۔ اسے اداکارہ رقاصہ اور مغنیہ ظاہر کیا گیا ہے مگر اسے نیاز نے اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ اپنے پیشے کی سطح سے بہت بلند نظر آتی ہے اس کی ذہانت اس کا علم۔ اس کی نفسیات دانی، شعر فہمی غالباً اس لئے بیان کی گئی ہیں کہ وہ شہاب کی مدمقابل بن سکے۔ وہ اپنی ذہانت، اندازِ فکر اور خودداری کے اعتبار سے شہاب کا "مثنیٰ" نظر آتی ہے۔ اس کی ذہنی اور فکری بلندی کا کوئی جواز پیش نہیں کیا گیا ہے اس لئے وہ ماورائی سی نظر آتی ہے۔ وہ اعلیٰ درجہ کا شاعرانہ مذاق بھی رکھتی ہے اسکی گفتگو عورت کی گفتگو معلوم نہیں ہوتی اس کا لب و لہجہ اور منطق تقریباً "شہاب" جیسی ہی ہے دو ایک مکالمے ملاحظہ ہوں:-

اختر:- اگر ایک حساس دل پر موت جلد طاری نہیں ہوتی تو سمجھ لیجئے کہ وہ خود غرض ہو چلا ہے اور دل کا ایسا ہو جانا میرے نزدیک لطیف و پاکیزہ جذبات سے محروم ہو جانا ہے اور اپنے آپ سے بیزار ہو جانے کے لئے یہ وجہ کافی ہے۔

اختر:- شہاب صاحب آپ ابھی یقین کیجئے کہ مجھے کوئی تکلیف نہیں پہنچی اور آپ کا معافی چاہنا بے محل ہے۔ رہا اس امر پر اظہار ندامت کہ آپ نے اس قصہ

وقت ضائع فرمایا۔ سو اگر یہ صحیح بھی ہو تو آپ کی ندامت اس کی تلافی کر سکتی ہے؟ اس لئے یہ بھی بے کار ہے آپ نے ناحق اپنی تقریر کو اس قدر جلد ختم فرمایا۔ میرے لئے تو اس میں بہت کچھ سامانِ دلچسپی موجود تھا کیونکہ ہر وہ حقیقت جس پر حقیقت نہ سمجھ کر گفتگو کی جائے بہت دلکش ہو جاتی ہے اور شاعرانہ پروازِ خیال کے وسیع جولانگاہ۔ کاش مجھے بھی یہ سلیقہ حاصل ہوتا اور میں بھی اپنے ذوقِ ادب کی انتہا قرار دے سکتی۔"

مناظرِ قدرت کے شیدائی کے لئے ممبئی میں بہت کچھ سامان موجود ہے نیاز بھی اس طرف کافی توجہ دیتے ہیں مگر یہاں کے مناظر کی تصویر پیش کرتے وقت خیالی تشبیہات و استعارات سے کام لیتے ہیں۔ ان میں مشاہدے سے زیادہ تخیل کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ ایک جگہ لہروں کا منظر پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "سمندر کی اونچی اونچی لہریں باقاعدہ وقفوں کے ساتھ شور کرتی ہوئی آتی ہیں۔" جس نے بھی سمندر کی لہروں کا تھوڑی دیر مشاہدہ کیا ہوگا اس نے اندازہ لگایا ہوگا کہ لہریں باقاعدہ وقفوں کے ساتھ نہیں آتی ہیں۔

تھیٹر ہال کی تصویر اس طرح پیش کرتے ہیں :-

"تھیٹر ہال اوپر برقی روشنی سے اور نیچے درخشاں حسن سے جگمگا رہا تھا۔ بمبئی کا بہترین حسن اور حسن کی بہترین خود آرائیاں، تہذیب و تمدن کے بہترین ملبوس کی بہترین زرکاریاں، جلوہ بے محابا کی بے پناہ عشوہ باریاں، ناز و کرشمہ کی محشر خیز فسوں زائیاں، جمال کی بے نیازیاں، آرائشوں کی دلربائیاں، رنگینی و معطر ساریاں اور ان ساریوں کی ایمان طلب عریانیاں یہ تھا وہ تھیٹر ہال جہاں محمود و شہاب پہنچے۔" صاف نظر آ رہا ہے کہ مصنف کی توجہ حقیقی منظر کے بجائے انشاپردازی پر زیادہ ہے۔ جس زمانہ میں یہ کتاب لکھی گئی اس زمانہ میں ایسے ہی تخیلی انداز کا رواج زیادہ تھا۔ ایسے موقع پر وہ کسی حسین منظر کی تصویر پیش کرنے کے بجائے حسین الفاظ کے ذریعے تخلیقِ حسن کرنا چاہتے ہیں۔ ان بیانات کو پڑھ کر آپ انتخابِ الفاظ اور زورِ بیان کی داد تو ضرور دے سکتے ہیں مگر کسی منظر کا تصور نہیں کر سکتے۔

اختر کے رقص کا منظر پیش کرتے وقت بھی وہ محض تخیل سے کام لیتے ہیں۔ اس میں حقیقی رقص کی جھلک نظر نہیں آتی۔ شہاب ایک تصویر کا مضمون بیان کرتا ہے اس میں بھی نیاز صاحب نے ایسی باتیں درج کی ہیں جو کسی طرح تصویر میں ظاہر ہی نہیں ہو سکتیں۔ اس میں کئی اشیاء کو متحرک ظاہر کیا گیا ہے۔ ان باتوں کو تصویر میں نہیں بلکہ مووی کیمرے سے لی ہوئی فلم میں ہی پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس تصویر میں دیگر مناظر کے علاوہ تین لڑکیاں بھی ہیں صرف ان کا تذکرہ ملاحظہ ہو :-

"اس سادہ خواب گاہ میں ریگستان پر تین جوان لڑکیاں شانہ و سر کھولے کھڑی ہیں۔ . . . . . . اسی وقت ننھا کیوپڈ اپنا تیر و کمان سنبھالے ہوئے سامنے سے نظر آتا ہے جس کو دیکھ کر لڑکیاں سہم جاتی ہیں۔ باہم ایک دوسرے سے خوف زدہ ہو کر لپٹ جاتی ہیں۔"

تصویر میں صرف ایک POSE ممکن ہے یا تو لڑکیاں کھڑی ہوئی دکھائی جا سکتی ہیں یا خوف زدہ ہو کر لپٹی ہوئی دونوں صورتیں بیک وقت کسی طرح ممکن نہیں۔

اختر کا سراپا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"اختر کے سانولے رنگ میں یہ خصوصیت اور زیادہ قیامت خیز تھی کہ جس قدر غور سے دیکھا جاتا اتنا ہی وہ کھلتا ہوا نظر آتا . . . . . . اس کا جسم اس قدر نازک تھا کہ بعض دفعہ تو یہ اندیشہ ہوتا کہ اگر وہ ساحل پر کھڑی ہو گئی اور ہوا تیز چلنے لگی تو اڑ کر سمندر میں گر جائے گی . . . . . . اس کی آنکھوں میں ایسی مقناطیسی شراب جھلکتی تھی کہ جس وقت وہ نگاہ اٹھا کر کسی کو دیکھتی تو معلوم ہوتا کہ اسے کھینچ کر جس طرف چاہے اٹھا کر پھینک دے۔"

یہ تمام بیانات جو اپنے مقصد میں ناکام رہتے ہیں۔ اس کی صرف ایک وجہ ہے وہ مصنف کا رجحان ہے۔ مصنف شعوری طور پر تحریر کا وہ انداز پیش کرنا چاہتا ہے جسے ہم انشاپردازی کہہ کر پکارتے ہیں۔ لطفِ زبان اسی وجہ سے

کہانی اور اس کے لوازم پر غالب آگیا ہے۔ اسی رجحان کی بنا پر کئی جگہ مکالموں کے بجائے طویل تقریریں نظر آتی ہیں۔ تقریروں میں باتوں کی کیفیت ہونے کے بجائے مضمون نگاری کا انداز پایا جاتا ہے۔ مختلف کرداروں کے مکالموں کے متعلق ڈاکٹر محمد حسن نے لکھا ہے "ان کا اپنا کوئی لہجہ، زبان اور انداز گفتگو نہیں یہ سب نیاز کی سجی سجائی اور بے حد ادبی زبان بولتے ہیں:"

اس طرح کی مفرس اور معرب زبان اس دور کے دیگر مصنفین کے یہاں بھی نظر آتی ہے زبان پر "ایک شاعر کا انجام" میں اور بھی زیادہ توجہ دی گئی ہے ابتدا ہی میں نیاز نے لکھ دیا ہے۔ "غالباً دوران مطالعہ میں نوائے ترکیب، لطافت بیان، پاکیزگی تخیلات آپ ہر جگہ پائیں گے اور یہی میرا ذوق حدیث ہے:" نیاز اس کتاب کو افسانہ یا ناولٹ کہلوانے پر اصرار نہیں کرتے بلکہ اس کی زبان کا بغور مطالعہ کرنے کی طرف توجہ دلاتے ہیں

اگر ہم پیروی کے اصول کے مطابق اس کتاب کو نیاز صاحب کے نظریات ہی کی روشنی میں دیکھیں تو ہمیں تراکیب کی جدت، زور بیان اور انشا پردازی کی داد دینی پڑتی ہے مگر ساتھ ہی یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ زبان عورتوں کے مکالموں کے لئے قطعی موزوں نہیں کہیں کہیں وہ بھی مولویوں کی زبان میں گفتگو کرنے لگتی ہیں۔ زبان کا ثقل "ایک شاعر کا انجام" میں اور بھی نمایاں ہے۔ زبان کے بارے میں نیاز کا نظریہ سمجھنے کے لئے اس کتاب سے چند ترکیبیں پیش کی جاتی ہیں۔ مثلاً استبعاد حقیقی۔ لاعبانہ انداز۔ متغیر الالوان ہستی۔ سفیہانہ امر۔ مستغرق کلفت۔ پاسخ گزا۔ انفکاک خصوصیت۔ انشراح جراحت۔ انجذاب مضطر وغیرہ۔

اس دور کی زبان کو اگر آپ نیاز صاحب کی موجودہ دور کی زبان کے مقابل رکھیں تو رات دن کا فرق نظر آئے گا۔ ان کی اس دور کی زبان میں جو روانی اور لوچ ہے اسے اس دور کی مفرس اور معرب تراکیب نے دھندلا کر دیا ہے۔ اس کے باوجود یہ کتاب رومانوی ادب کی نمائندہ کتابوں میں شمار ہونے کے لائق ہے۔ اس کی یہ تاریخی حیثیت ہمیشہ قائم رہے گی۔

"پچھلے پچیس سال کے اندر جو انقلاب ہمارے ادبی میلانات میں رونما ہوا ہے، وہ یکسر اقتضائے زمانہ کا نتیجہ ہے اور زمانہ کا مقابلہ ممکن نہیں۔ زیادہ سے زیادہ ہم یہی کر سکتے ہیں کہ اس سیلاب میں اپنے پاؤں نہ اکھڑنے دیں اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم "نقد و انتقاد" کو اپنے ادب کا رہبر بنائیں اور اسی کے سہارے سے آگے بڑھیں۔

وہ زمانہ جب ہماری زندگی کا ہر شغل صرف اپنے لئے مخصوص ہوتا تھا، جب دنیا نام تھا اپنے سوا سب کو حرفِ غلط سمجھنے کا، اور جب ہر شخص اپنے جذبات کے لحاظ سے ایک علحدہ شخصیت رکھتا تھا، ختم ہو گیا۔

دنیا کو اب جن اصول پر سنورنا ہے اس میں اجتماعیات سے ہٹ کر کسی چیز کی گنجائش نہیں، اور اگر ہمارے شاعروں اور ادیبوں کو زندہ رہنا ہے تو ان کو تنہا جینے، تنہا لکھنے اور تنہا غزل سرائی کر لے کا جذبہ محو کرنا ہوگا ان کو وہی کہنا ہوگا جس کی ضرورت ہے، اسی راہ کو اختیار کرنا پڑے گا، جو انفرادیت نہیں بلکہ اجتماعیت کی طرف جاتی ہے۔ . . . اور اگر اخوت عامہ اور انسانیت کبریٰ کے مقصد سے ہٹ کر انھوں نے قدم اٹھایا تو یقیناً انھیں وہ سب کچھ سننا پڑے گا جو اس سے قبل شاید وہ کبھی نہ سن سکتے — !"

(نیازؔ)

نیاز فتحپوری ——— مکتوبات کے آئینے میں"

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی

ادبِ لطیف کے ائمہ میں نیاز فتح پوری کا نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے۔۔۔ ریاض خیر آبادی اور خلیقی دہلوی نے جس چیز کو دلآویز بنا دیا تھا، نیاز نے اس میں وزن اور گہرائی پیدا کردی۔ سجاد حیدر یلدرم اور ل۔ احمد نے نثر میں شاعری کی اور انشاء پردازی کو آتشِ سیال بنا دیا۔ انہوں نے زندگی کے حقائق پر غور نہیں کیا۔ بلکہ اسے شراب و شعر اور نور و نغمہ سے معمور کر دیا۔ اس ادب کی سب سے بڑی خصوصیت طرح داری، خود پسندی اور صناعانہ پختگی ہے۔ یہ لوگ شاعر پہلے تھے اور نثر نگار بعد میں۔ اس لئے انھوں نے نثر اور شعر کی حدوں کو ملانے کی کوشش کی ہے۔

اس زمانہ میں جو مکتوباتی ادب پیدا ہوا، وہ فضا کے مسموم اثرات سے محفوظ نہ رہ سکا۔ قاضی عبدالغفار کے "لیلیٰ کے خطوط" ادب طرازی کا لائقِ رشک نمونہ ہیں۔ لیکن وہ خطوط نہیں۔ خطوں کے پیرایہ میں مضامین ہیں۔ اسی طرح نیاز فتح پوری نے جو خط لکھے ہیں، وہ ایک خاص قسم کی انشاپردازی کی بہترین مثال ہیں۔ لیکن خط کی تعریف ان کے جسم پر چُست نہیں آتی۔ اصلی خط تو وہ ہیں جن میں جذبۂ بے اختیار شوق، اور خیام کی زبان میں "چناں کہ می نمایم ہستم" پر زور ہو۔ اگر ان میں عاقلانہ حزم و احتیاط برتی گئی ہے یا اسلوب کی نوک پلک اور تراش خراش کا قدم قدم پر لحاظ رکھا گیا ہے، تو وہ مضمون آفرینی سے زیادہ وقیع نہیں۔ نیاز کے مکتوبات کے تین مجموعے "مکتوباتِ نیاز" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں نہ مکتوب الیہ کا نام درج ہے، نہ تاریخ، نہ وقت، نہ مقام۔ حالاں کہ ان چیزوں کی موجودگی سے ایک خاص قسم کی فضا تیار ہوتی ہے اور جب پڑھنے والا اس "خلوت کدہ" میں داخل ہوتا ہے، تو اس کی حیرت اور مسرت کی انتہا نہیں رہتی۔ نیاز نے ہمیں اس لطفِ خاص سے یکسر محروم رکھا ہے، جو غالب کے یہاں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ انھوں نے ایک جام بھر کر محفل میں تو رکھ دیا ہے۔ لیکن ساقی کی اداؤں سے ہمیں لطف اندوز ہونے کا موقع نہیں دیا۔ حالاں کہ بعض اوقات اس کی دل ربایانہ نیم نگاہی اور مجمل تبسم فروشی اس جرعۂ شراب سے زیادہ سُرور انگیز ہوتی ہے۔

نیاز فتح پوری کے یہ خطوط ماہ بہ ماہ رسالہ "نگار" لکھنؤ میں شائع ہوتے رہے اس کے بعد کتابی صورت میں منظرِ عام پر آئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لکھے ہی اس مقصد سے گئے ہیں کہ شائع کیئے جائیں۔ اس لئے ان میں "نگاہے سر راہم گرفت" کا لطف نہیں ہے۔ ان خطوں میں اسلوب کا اچھوتا پن، بیان کی ندرت تخیل کی بلندی، ظرافت کی بہار سب کچھ ہے۔ لیکن خلوص کی گرمی نہیں ہے۔ ان تینوں مجموعو
کو پڑھتے وقت وہ خوشی ہوتی ہے، جو چڑھتی ہوئی ہوا کو دیکھ کر۔ لیکن ختم کرنے کے بعد وہ کوفت بھی جو گرتی ہوئی ہوا کے نظارہ سے ہوتی ہے۔ ان مست ہواؤں اور گھنگھور گھٹاؤں میں ہمارا مغالیہ جام خالی ہی رہتا ہے۔ غالب کے خط پڑھ کر دوئی کا فرق مٹ جاتا ہے۔ ان کی بھرپور انسانیت اور ارضیت ہمیں غم گساری کے آداب سکھلاتی ہے۔ لیکن نیاز کے ساتھ یہ ہمدردی پیدا نہیں ہوتی۔ ہم ان کے ساتھ

دور تک نہیں جا سکتے۔ وہ خضر کی طرح بہت سی شرطیں لگاتے ہیں، جو ہمیں قبول نہیں ہوتیں۔ وہ شوق تو پیدا کرتے ہیں لیکن رخصتِ نظر نہیں دیتے۔ "وہ خود نمائی اور خود پرستی کے درمیان جھولتے رہتے ہیں"۔ ہم اگر چاہیں کہ ان کی شخصیت دیکھ لیں، تو یہ ممکن نہیں ہے۔ وہ صرف ان ہی گوشوں کی نمائش روا رکھتے ہیں، جن کی نمائش وہ چاہتے ہیں کہ ہو۔ ان کی شخصیت پر اس قدر دبیز اور تہ بہ تہ نقاب پڑے ہوئے ہیں کہ محرومیاں سر پٹک پٹک رہ جاتی ہیں۔ لیکن ان کی بزم وصال میں ایک نگاہ سے زیادہ نظارہ میسر نہیں آتا۔ نقاب شبلی کے یہاں بھی ہے لیکن وہاں "نقاب نے خود جلوؤں کو نمایاں کر دیا ہے"۔ غالب، شبلی اور مہدی کے خطوں میں حسن اتفاق کی جلوہ گری ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ دفعتہً ہرنوں کی ایک قطار کمین گاہ سے نکل پڑی ہے۔ نیاز کے یہاں بات پہلے سے سوچی سمجھی ہوئی ہے۔ ان کے مکتوب الیہ سوچ سمجھ کر انتخاب کیئے گئے ہیں۔ ان میں ہر ایک کا علم نیاز کے برابر ہے۔ ہر ایک کو شعر و سخن کا تھوڑا بہت ذوق ہے انھوں نے اس مجموعے میں کوئی خط بھائی، بہن، بیوی، ماں، باپ، ملازم یا متوسل کو نہیں لکھا۔ اس لیئے ان خطوں سے نیاز کے متعلق کم اور ان کے مکتوب الیہم کے متعلق زیادہ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ بعض اوقات یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ مکتوب الیہ کی جنس کیا ہے؟ اور نیاز کے اس سے کس قسم کے اور کب سے مراسم ہیں؟ ان کی محفل میں رند، قلندر، شاعر، ادیب، صحافی، عالم سب موجود ہیں لیکن ان سے ان ہی رموز پر گفتگو کی گئی ہے جو ایک خوش مزاج اور شائستہ انسان کو عام طور پر پیش آتے رہتے ہیں۔

نیاز کے ہر خط میں رومان پسندی جاری و ساری ہے۔ انھوں نے کسی حقیقت کا ذکر رومانیت سے ہٹ کر نہیں کیا۔ یہ ہی ان کی انفرادیت ہے۔ دنیا انھوں نے بڑے اہتمام اور کوشش سے سجائی ہے۔ بارگاہِ حسن، کارگاہِ مے و مینا، صحبتِ رقص و نغمہ، اہتمامات رندی و سرمستی، شاہد و شعر، غرض دنیائے خرابات کا کوئی خلد فروش منظر ایسا نہیں ہے جو اِن خطوں میں موجود نہ ہو۔ رندانہ خوش طبعی نے اس رومانی فضا کو اور چمکا دیا ہے۔ ان کے طنز میں تیکھا پن ہے، ہمدردی نہیں۔ ایک پندارِ تفوق ہے جو ہر جگہ نمایاں ہے۔

ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"حضرت، آپ نے بالکل درست فرمایا۔ خوباں سے چھیڑ چلی جانے میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن وصل آپ کے حصے میں آئے اور حسرت میرے حصے میں، اس پر مفاہمت دشوار ہے۔

محض آپ کے ارشاد کی تعمیل میں یہ بحث میں نے چھیڑی تھی، اس امید پر کہ آپ میرا ساتھ دیں گے لیکن معاف فرمایئے کہ آپ نے بالکل خلاف توقع وہی حرکت کی جو کوفیوں نے کی تھی۔ بہتر ہے۔ میں تو شہید ہوا جاتا ہوں۔ لیکن یاد رہے آپ بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ یزید کی سی قسمت پانا آسان نہیں۔ اس کی ہستی کو غیر فانی بنا دیا۔ اور میں یہ موقع بموقع کسی سے نہ کہوں گا کہ آپ کا فریب خوردہ ہوں"۔[1]

ایک شیخ صاحب کو لکھتے ہیں:۔

"گرامی نامہ پہنچا۔ یقیناً نہ میں آپ کا سا تجربہ رکھتا ہوں، نہ آپ کی سی عقل و فراست۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ مجھے اپنی ناتجربہ کاری و حماقت دونوں بہت عزیز ہیں کیوں کہ وہ میری اپنی ہیں۔"[2]

یہ مثال بھی ملاحظہ ہو ———

"میں آپ سے زیادہ عقلمند ہونے کا مدعی نہیں ہوں لیکن اتنا احمق بھی نہیں کہ آپ کی "ذکر بیدار" کی داد نہ دے سکوں۔ آپ نے جو کچھ کہا ہے، اسے آپ کا جی خوش کرنے کے لئے کہیئے تو "خوب" کہہ دوں۔ ورنہ سچ پوچھیئے تو میں اسے آپ کی ذہانت و فراست سے بہت فروتر سمجھتا ہوں"۔[3]

یہ زخم تیغ بھی ملاحظہ ہو:۔

"جی ہاں، دیکھا۔ کیا کہنا ہے کہ آپ کے انتخاب کا! ماشاءاللہ! دو عالم از اثر شعلہ جمالش سوخت

---

(۱) مکتوبات نیاز ج ۲۔ ص ۹۰ (۲) مکتوباتِ نیاز ص ۱۳۸ (۳) مکتوباتِ نیاز ص ۱۴۲

دیکھئے، کہیں آپ کے دست و بازو کو نظر نہ لگے۔

سچ کہتا ہوں کہ میں نے ایسے مجرمانہ قیافہ کا انسان آج تک نہیں دیکھا۔ حیرت ہے کہ ان میں وہ آخر کون سی بات ہے جس نے آپ ک اتنا گرویدہ کر لیا۔ صورت دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ فطرت کا شاید اولین نقشِ ناکام کچھ ایسا ہی رہا ہوگا۔ وہ چھوٹی چھوٹی اندر دھنسی ہوئی گو گول آنکھیں کہ کیا کوئی پرکار سے ایسا صحیح دائرہ کھینچ سکتا ہے۔ وہ "تنگیٔ چشمِ حسود" رکھنے والی بھدی پیشانی۔ وہ رخسار اور ابرو کی ہڈیوں کا افقی **ابھار**، وہ ٹیبل لینڈ قسم کی چوڑی چکلی ناک۔ وہ کچی کلیجی کی طرح کالے کالے ہونٹ اور اس پر وہ دیمک خوردہ مونچھ اور داڑھی۔

اللہ اللہ چہ جمال ست بدیں بوالعجبی (۴)"

بعض جگہ نیاز فتح پوری واقعہ کا انتخاب اور جُزئیات کا بیان اس طرح کرتے ہیں کہ اس میں تکلف پیدا ہو جاتا ہے۔ اور طنز کی شگفتگی کم اور زہرناکی بڑھ جاتی ہے۔ مثلاً ایک نواب صاحب کو جو عازمِ حج ہیں، لکھتے ہیں:۔

"میرے لئے آپ جارجیا کی کوئی حسین کنیز لیتے آئیے گا۔ اور یہ ناممکن ہو تو خیر اس کی تصویر ہی سہی۔ لیکن خاکِ شفا اور زمزم کے پانی سے اسے علاحدہ ہی رکھئیے گا، ورنہ ممکن ہے خراب ہو جائے"[1]

یا ایک دوست کو جو میر صاحب کے ساتھ ان کے گھر مہمان ہونا چاہتے ہیں، لکھتے ہیں:

"آپ شوق سے میرے یہاں قیام فرما سکتے ہیں۔ لیکن قبلہ میر صاحب کی مہمان داری، ان کے شایانِ شان مجھ سے ممکن نہیں۔ ان کے زہد و تقدس کا مجھے اعتراف ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ بہت کھلے ڈلے انسان ہیں۔ لیکن یہ رات بھر کی ہُو حق میری برداشت سے باہر ہے۔ علاوہ اس کے، ایک بات اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ آج کل میرے ایک دوست، میرے ہی مکان پر رہتے ہیں اور بہت صبح اٹھ کر ریاض کرتے ہیں۔ ہے میر صاحب کی شب بیداریوں میں ان کی موسیقی حائل نہ ہو۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ ان کے گانے میں کوئی ہرج واقع ہو اور یہ مجھے گوارا نہ ہوگا"[2]

نیاز نے ایک خط میں جنت کو ہدفِ ملامت بنایا ہے۔ لیکن اس بیان میں غالب کی سی شگفتگی نہیں ہے ابتذال اور سوقیت ہے

"حوروں کی آرزو کیا کروں۔ جانتا ہوں کہ من و سلویٰ کھانے والے بھی لہسن و پیاز پر اتر آئے تھے۔ سونے، چاندی کے مکان وہاں ملے بھی تو کس کام کے۔ جبکہ اُن کی اینٹ بھی فروخت کر کے یورپ جانے کے لئے ہوائی جہاز میں کوئی سیٹ ریزرو نہیں کرا سکتا۔ رہ گئے پھل، سو آپ جانتے ہیں کہ یہاں یوں ہی نزلہ کا زور رہتا ہے، چہ جائے کہ اُس پر پھلوں کی بھرمار۔ جو سریع الاستحالہ ہونے کی وجہ سے فوراً خلط غالب میں تبدیل ہو جاتے ہیں"[3]

نیاز فتح پوری جب زہد اور مولویت پر قلم اٹھاتے ہیں، تو اپنے طعن و طنز کا سارا ترکش ختم کر دیتے ہیں۔:۔

"آپ نے بھی کس طبقہ کا ذکر کیا۔ آپ اتنا وقت کسی گناہ میں صرف کرتے تو بہتر تھا۔ یہ "محرابِ دعا" سے حلقۂ دام تیار کرنے والے باوجود "کوتاہ آستینی" کے "انتہائی دراز دستی" سے کبھی نہ چوکنے والے اور وہ سب کر گزرنے والے جو دوسروں کے لئے ممنوع ہے، ہماری قوم کے وہ افراد ہیں جنھیں پاؤں کا چھالا کہنا چاہیئے کہ جب تک آپ انھیں پھوڑ نہ ڈالیں، راستہ چلنا ممکن نہیں۔ انھوں نے سلطنتوں تک کو کھا لیا۔ قوموں کو ہضم کر لیا۔ مذہب کیا چیز ہے۔ یہ ملک و ملت کے لئے بیماری ہے اور بیماری بھی دق کی انتہا کی جس سے چھٹکارا ممکن نہیں۔ اس لئے اگر اتنے طویل و تلخ تجربے کے بعد، اس سے کوئی توقع فلاح کی رکھئیے تو اس کے "اہلِ جنت" ہونے میں کوئی شک نہیں"[4]

---

[1] مکتوبات نیاز ج ۲۔ ص ۱۱۵ و ۱۱۶۔ [2] مکتوبات نیاز جلد دوم ص ۸۲ (۳) مکتوبات نیاز جلد دوم ص ۲۰۰

۴۔ مکتوبات نیاز ج ۲ ص۔ ۱۱۵ و ۱۱۶۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں :۔

"لڑکپن میں ایک طرف حجام تمہاری سر تراشی کیا کرتے تھے اور دوسری طرف مولوی تمہاری دماغ خراشی۔ کیا سمجھ سکتے ہو کہ خدا اگر ہے تو وہ منطقی حدود سے بالاتر ہے"[1]

نیاز کی بے زاری مولویوں سے مسلّم ہے۔ لیکن حیرت ہے کہ ان کے دوستوں میں کافی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو ان ہی کے الفاظ میں القارعہ کی عین استفراغ کی حد تک نکالتے ہیں اور جن کے چہرے وضو کرتے کرتے اچھے خاصے کمبخت بن گئے ہیں۔

نیاز کے خطوں میں ایسے مواقع بھی ہیں جب ان کی عبارت کو پڑھ کر ہمارے اندر شگفتگی اور بالیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور ان کے طنز میں زہرناکی نہیں لیکن تیزی باقی رہتی ہے۔ اپنے متعلق لکھتے ہیں :۔

"میں انیسویں صدی کی چیز ہوں، جب خشک سالیوں میں بھی لوگ تردامنی کی فکر سے غافل نہ رہتے تھے۔ اور آپ بیسویں صدی کی پیداوار ہیں، جب باوجود خوش حالی کے بھی عشق میں کسی کا بُرا حال دیکھنے میں نہیں آتا...... ہمارے زمانے میں دنیا اتنی عقلمند نہ تھی۔ حُسن زیادہ دل کش رہا ہو یا نہ رہا ہو، لیکن جوانی ضرور اندھی تھی۔

"دیدن ہمان و دل دادن ہماں"[2]

نیاز کی یہ شوخیاں ان خطوں میں سب سے زیادہ ہیں جو انھوں نے عورتوں کو لکھے ہیں :۔

"بارے آپ نے یاد تو کیا۔ میں تو سمجھا تھا کہ آپ برہم ہو گئیں، اور آپ کبھی نہ بولیں گی۔ میری سمجھی ہوئی کوئی بات بھی آج تک صحیح نکلی ہے، جو یہ صحیح نکلتی۔ اور سچ پوچھیے تو اسی امید پر جی رہا تھا۔ ڈرتا ہوں اس وقت سے جب مجھے آپ کی محبت کا یقین آجائے کہ پھر تو آپ کی عداوت مسلّم ہے" (۳)

ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو :۔

"عنایت نامہ پہنچا۔

پارۂ شوخ و پارۂ نمکیں
ہائے دشنامِ ناتمام کسے

جاں کنی کا لطف جب ہے جب شاہد و مشہود دونوں یک جا ہوں۔ آپ نے کوئی الزام قائم کیا۔ میں نے اسے رد کر دیا۔ آپ کو اس پر غصہ آیا، میں خاموش ہو گیا۔ میری خاموشی پر آپ کی برہمی اور بڑھی۔ میں ہنس پڑا۔ (۴)

نیاز کو اسلوبِ بیان پر بڑی قدرت ہے۔ جدّت طرازی کے جیسے اچھوتے نمونے ان کے یہاں ملیں گی وہ مکتوباتی ادب کے گوہر نایاب ہیں۔

ایک خط میں لکھتے ہیں :

"جب تک خواہش کا اظہار صرف آنکھوں سے ہو رہا ہے وہ "تمنا" ہے۔ لیکن زبان سے کہا اور اس نے گدائی کی صورت اختیار کی۔ پھر آپ ہی انصاف کیجیے کہ جو انتہا شدید احمق ہو اس کو مجبور کرنا کہ وہ کہے اور بار بار کہے کتنی عظیم الشان دانائی کی ذمہ داری اس کی گردن پر

---

[1] نگار لکھنؤ، نومبر ۳۷ء ص ۱۵۰

[2] مکتوباتِ نیاز ج ۲ ص ۱۹

[3] نگار لکھنؤ، ص ۱۴۷۔

[4] نگار لکھنؤ، ص ۱۸۸

رکھتا ہے۔"[۱]

ایک دوست سے رنج پہنچتا ہے۔ ان کو لکھتے ہیں :-

"درِ توبہ کبھی بند نہیں ہوتا" یہ ان لوگوں کا عقیدہ ہے جو ہمیشہ گناہ کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ اس لئے تمہارے اعتراف کی قیمت مجھے معلوم ہے۔ بت شکنی کا کفارہ "تعمیرِ کعبہ" سے کبھی نہیں ہو سکتا۔ تمہاری جھوٹی باتوں کی کیا حقیقت ہے"[۲]

نیاز کے قلم سے ڈھلتے ہوئے جملے نکلتے ہیں۔ بیان کی ندرت اور شوخی، اور طرزِ ادا کی صفائی اور شائستگی ان کی بلا میں لیتی ہیں۔ ان کے یہاں دورِ مغلیہ کے مصوروں کی سی نفاست اور نازک کاری اور قدیم انشا پردازوں کی سی مہارت اور صنع طرازی ہے۔ یہ انداز اس وقت پیدا ہو سکتا ہے جب کلاسیکی ادب کا ذوق خوب رچا ہوا ہو اور نثر میں داخلہ شاعری کے دروازہ سے ہوا ہو۔ اپنے مے کدہ کے سب سے پرانے" ؟ " کے متعلق لکھتے ہیں :-

"جس وقت وہ داڑھی صاف کرا کے، بالوں میں خضاب لگا کر، مونچھوں کو کاسمٹک سے نوکیلا بنا کر بیٹھتے ہیں، اس وقت دیکھو کیا عالم ہوتا ہے۔ وہی دل کشی و رعنائی، وہی ولولہ و برنائی، وہی دہکتا ہوا شباب وہی ٹپکتا ہوا شہاب"[۳]

بعض جگہ وہ مصرعوں میں باتیں کرنے لگتے ہیں :-

"کیوں صاحب۔ یہ کیا بات ہے کہ سوال عمر، زید، بکر کا آیا تو

"التفات کے دریا بہا دیئے"

اور "چوں نوبتے بما رسد آتش بجام کردند"[۴]

"ساقی یہ تری کم نگہی یاد رہے گی"

اپنے دوست کو لکھتے ہیں :-

"اے ! کیا پوچھتے ہو، کیا کر رہا ہوں ؟ نہ یادِ رفتگاں کا مشغلہ ہے کہ کچھ دیر اُس سے جی بہلے، نہ عشقِ بتاں کا حوصلہ کہ کچھ وقت سر ٹکرانے میں گزر جائے۔ اب تو حال کی سوگواریاں ہیں یا مستقبل کی حوصلہ فرسائیاں۔ جیوں تو کیوں کر، اور مروں تو کیوں کر۔ جب تک وہم اور خیال کی دنیا میں جیتا تھا "چشم وا کردن زمیں تا آسمان آغوش داشت"، لیکن اب کہ تعینات و حقائق کے خبط میں مبتلا ہوں "سایۂ شاخِ گل افعی نظر آتا ہے مجھے"۔"[۴]

ایک شاعر کو لکھتے ہیں جو مشاعروں میں مارے مارے پھرتے ہیں :-

"ماشاء اللہ، کیا کہنا۔ جہیں ساقی کا نام آپ نے قسمت آزمائی رکھا ہے۔ تدابیرِ انسانی کی ناکامی کوئی ایسا تجربہ نہیں، جس پر حیرت کی جائے۔ لیکن بندگی میں بھلا نہ ہونا عبد اور معبود دونوں کے لئے شرمناک ہے"[۵]

یہ خط ملاحظہ ہو۔ نیاز کی انشا پردازی کا بڑا دلکش نمونہ ہے :-

"اللہ اللہ، آپ تشریف لا رہے ہیں۔ ڈرتا ہوں کہیں ساکنانِ ملاءِ علیٰ کی نظر نہ لگ جائے۔ حجرۂ فلک سے جھانکتے جھانکتے کہیں حوریں نہ زمین پر آ رہیں۔ کہیں کروبیاں عالمِ قدس میں تسبیح و تہلیل نہ بھول جائیں۔ اور کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ آتے آتے رہ جائیں۔

---

[۱] مکتوباتِ نیاز ج ۲ ص ۲۲ [۲] مکتوباتِ نیاز ج ۲ ص ۲۲۸ [۳] مکتوباتِ نیاز ج ۲ ص ۸۲،

[۴] مکتوباتِ نیاز ج ۲ ص ۶۱ [۵] مکتوباتِ نیاز ج ۲ ص ۱۰۱ و ۱۰۲۔

اسے کیوں بے وقوف بناتے ہو، تم اور وعدہ پورا کرو۔ سچ کہتا ہوں جس دن ایسا ہوگا تو آسمان پھٹ جائے گا، زمین شق ہو جائے گی اور ہم اور تم دونوں اس میں سما جائیں گے۔ آپ تو مہربانی فرما کر وہیں جمے رہیے جہاں آپ نصب کر دیئے گئے ہیں، گلگشت کی ضرورت نہیں۔ چمن والے یوں ہی تباہ ہیں"[1]

نیاز نے بعض جگہ قافیہ پیمائی کی ہے اور اس طرح عبارت کے لطف کو بڑھا دیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:-

"میری ہر ہر سانس آلودۂ گناہ، ان کے جسم کا ریشہ ریشہ عالم پناہ"[2]

"(میں نے) نہ کبھی اپنے دعوئ خلوص کو ذریعۂ افتخار سمجھا، نہ اخلاقِ گرامی کو وسیلۂ کار"[3]

ان کی عبارت کا تانا بانا ریسمانِ شعر سے بُنا گیا ہے۔ اشعار کی کثرت بلاشبہ ناگوار گزرتی ہے لیکن بعض جگہ مصرعے عبارت کا جزو بن گئے ہیں۔ مثلاً:-

"غارت گر ہوش! زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی"

یا "ماشاءاللہ، کیا کہنا ہے۔ آپ اور مدارج خلوت و محبت پر وعظ فرمائیں۔ یعنی "وہ" "جو نہیں جانتے وفا کیا ہے"[5]

یا "اگر آپ نے بے گناہ کے خون سے دامن آلودہ کرنے کا عزم کر لیا ہے، تو بسم اللہ۔ شوق سے خنجر اٹھائیے۔ "لہو پکارے گا آستین کا"[6]

نیاز کو بات میں بات پیدا کرنے کا بڑا اچھا سلیقہ ہے۔ اس نکتہ یابی میں ذہانت اور شوخی نے گنگا جمنی لہریں پیدا کر دی ہیں۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"ایک عرصہ سے آپ نے یاد نہیں فرمایا۔ میں نے تو اس خیال سے مراسلت میں تقدیم نہیں کی کہ آپ مجھ سے خفا ہیں۔ اور آپ نے اس لئے پروا نہیں کی کہ میں کبھی آپ سے خفا ہو ہی نہیں سکتا۔ اور جو کبھی خفا ہو نہ جانے، اس کو پوچھنا ہی کیا۔ اللہ اللہ، کیا فرق مراتب ہے"[7]

نیاز اپنے خطوں میں اشارہ و کنایہ سے خاص طور پر کام لیتے ہیں۔ جس سے بھولی بسری یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ اور تخیل کے لئے گنجائش نکل آتی ہے۔ یہ اسلوب اس جگہ" خاص طور پر کامیاب ہے، جہاں انھوں نے تلمیحات کو برتا ہے۔

"باور کیجیے کہ میرا مقصود بجز اس کے اور کچھ نہ تھا کہ آپ مجھے بھلا نہ دیں۔ رہا یہ امر کہ جو طریقہ میں نے اختیار کیا وہ درست تھا یا نہیں، سو شوق و نیاز کی دنیا میں اس کا معاملہ نہیں ہوتا۔ مصر کے بازار میں یوسف کی خریداری کے لئے ایک بڑھیا صرف سوت کی انٹی لے کر گئی تھی"[8]

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:-

"آپ وہاں جا رہے ہیں تو کس اہتمام کے ساتھ، اس کی خبر نہیں۔ (یوسف) تو خیر پیغمبر تھے کہ الزام عائد ہوا تو صفائی میں قمیص کا پچھلا دامن پھٹا ہوا دکھا دیا اور لوگوں نے اسے مان بھی لیا۔ لیکن آپ اپنی چاک دامانی کو کیوں کر چھپائیں گے"[9]

ایک دوست کو لکھتے ہیں:-

"اچھا ہوا تمہارا تبادلہ وہاں سے ہو گیا۔ لیکن نہیں کہا۔ دمشق میں قحط سالی ہو یا نہ ہو، لیکن تمہاری فراموش کاری کو تو بہرحال قائم رہنا ہی ہے"[10]

---

[1] مکتوبات نیاز ج ۲- ص ۲۳۸ - ۲۳۹ - [2] ایضاً ص ۱۷۵ [3] ایضاً ص ۱۲۹ [4] ایضاً ص ۱۷۶ [5] نگار، اکتوبر ۳۶ء، عنوان مکتوبات نیاز [6] ایضاً ص۔ [7] مکتوبات نیاز ج ۲ ص ۹۴-۹۵ [8] ایضاً ص ۲۱۹ [9] ایضاً ۱۶۱ [10] ایضاً ۳۰۲ -

نیاز اس گُر سے اچھی طرح واقف ہیں کہ خطوں میں اگر بے تکلفی نہ ہو تو وہ بے مزہ ہوتے ہیں۔ انھوں نے یہ بے تکلفی ہر ممکن ذریعے سے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

" اللہ اللہ یہ برہمی۔ خوبصورت پیشانی کی یہ خوبصورت شکنیں پھولوں سے رخساروں کے نیچے یہ دہکتی ہوئی آتشِ گل۔ یہ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے نکلنے والے شعلے معاذاللہ۔

" آتشم تیز ست و داماں می زنم "[1]

ایک اور مثال ملاحظہ ہو:-

" بجا ارشاد ہوا، یہ سارا فتنہ میرا ہی پیدا کیا ہوا ہے۔ میں ہی اودھ سے دامن کشاں گزرتا ہوں - اور میرے ہی لئے

غبار اٹھ اٹھ کے رہ جاتا ہے اکثر خاک بسمل کا

کیوں بنا بنایا گھر بگاڑتے ہو .... اور کیوں وہ بات کرتے ہو جو شیوۂ مردانگی کے خلاف ہے "[2]

نیاز نے بعض جگہ چند لکیروں سے تصویریں کھینچی ہیں۔ لیکن وہ بے ساختہ اور مؤثر ہیں:-

" بھئی، مجھے کیا معلوم تھا کہ جا رہا ہوں گا اچھا اور ہو جائے گا بُرا۔ بہ خدا میری نیت یہ تھی کہ کسی طرح ان دونوں کی صلح ہو جائے۔ لیکن وہاں تو قیامت برپا ہو گئی۔ آستینیں چڑھ گئیں۔ منہ سے جھاگ اڑنے لگا۔ اور اگر خان صاحب موجود نہ ہوتے تو شاید خون کے فوارے جاری ہو جاتے۔ لاحول ولاقوۃ۔ کس قدر خفیف ہوا ہوں، اور کتنی ملامت کی ہے میں نے اپنے آپ پر "[3]

ایک خط میں منشی امیر اللہ تسلیم کا نقشہ کھینچا ہے:-

" ہاں، میں نے منشی امیر اللہ تسلیم کو دیکھا ہے۔ ان سے ملا بھی ہوں۔ ان کی شاعری کا بھی معترف ہوں۔ میرا عنفوانِ شباب ہے اور ان کا زمانۂ شیب۔ یعنی میری مسیں بھیگ رہی ہیں اور وہ دورِ پُر افشانی سے گزر رہے ہیں۔ ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ جس پر جھرلیوں کا یہ عالم جیسے کپڑے پر الو کر دیا ہو۔ یہ ہے ان کی ہیئت کذائی۔ بغیر عصا کے سہارے ایک قدم چلنا دشوار ہے۔ سماعت اور بینائی تقریباً مفقود۔ کمر جھکی ہوئی۔ بروت سب برف کے گالے کی طرح سفید۔ ہاتھ پاؤں میں رعشہ لیکن خوش دلی اور خوش مزاجی کا یہ عالم کہ گویا جوانی ابھی آئی ہے "[4]

ایک خط میں برسات کے غلد فروش موسم کا ذکر کیا ہے:-

" جانِ عالم - کیا بتاؤں کل شام سے کس عالم میں ہوں - بادل امنڈ امنڈ کر آ رہے ہیں۔ اور کوندا لپک رہا ہے - بادل گرج رہے ہیں۔ ہوائیں چل رہی ہیں اور میگھ برسے - دن میں سانولاپن تو دوپہر ہی سے تھا، لیکن شام کو یہ شیام رنگ محفل ایسی جمی، ایسی رچی کہ اب کیا کہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کنور کنہیا پاؤں میں گھونگرو باندھے ہوئے بانسری بجا رہے ہیں۔ بے تابانہ رقص کر رہے ہیں۔ اور شاید پاؤں کی آخری ضرب، گھونگرو کی آخری جھنکار اور بانسری کے آخری بول کے ساتھ بساطِ عالم بھی ہمیشہ کے لئے الٹ دی جانے والی ہے "[5]

" اُردو کے انشا پردازوں میں نیاز کی حیثیت بہت ممتاز ہے۔ وہ شروع میں ادبِ لطیف کی طرف جھکے رہے۔ لیکن اس لٹریچر کا یہ احسان معمولی نہیں ہے کہ اس نے ہمیں ایک دلکش نقاد بھی دیا۔ اُن کی تنقیدوں میں ماضی کا رس اور حال کا احساس ہے۔ ان کی شعریت اور جمالیت نے اس میں رعنائی و زیبائی پیدا کر دی ہے۔ ان کا ادبی شعور گہرا اور ان کی

---

[1] مکتوبات نیاز ج ۲ ص ۹۴، ۹۵۔ [2] ، ، ۳۱ ۔ [3] ، ۳۰۲

[4] ، ۱۵ [5] ، ۱۳۱۔

جمالی حسن بہت نازک ہے۔ اس کا اندازہ بآسانی ان تنقیدوں سے ہو سکتا ہے جو انھوں نے مکتوبات کے پیرائے میں کی ہیں۔ انہوں نے تسلیم لکھنوی[1] اردو طنز و مزاح[2] اقبال[3] ناسخیت[4] مومن[5] جلال[6] منظوماتِ جدید[7] اور انقلابی شاعری[8] کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس میں فنی گہرائی، شیرینی اور شگفتگی ہے۔

نیاز کے خطوں سے ان کی سیرت اور معتقدات کے متعلق قطعی رائے قائم کرنا خطرہ سے خالی نہیں ہے۔ اس لئے کہ ان کی "تعمیر" میں ایک صورت خرابی کی بھی مضمر ہے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے صحیح لکھا ہے کہ سب سے دلچسپ خطوط وہ ہوتے ہیں جو تلف کر دیئے جائیں یا منظرِ عام پر نہ آئیں[9] نیاز فتح پوری نے ان خطوں میں تصوّر کا صرف ایک رخ پیش کیا ہے جو آئینہ کی طرح دمکتا ہوا ہے۔ وہ زندہ رہنا اور دوسروں کو زندہ رہنے دینا چاہتے ہیں۔ مشربِ پروانہ رکھتے ہیں اور جُرمِ محبت کی سزا میں دوزخ میں جانے کے لئے تیار ہیں۔ ذوق کے سلسلے میں وہ سراپا رہنِ عشق ہیں اور ایک مرتبہ رہنِ محبت ہونے کے بعد انہوں نے کبھی اپنے آپ کو واگذاشت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ان میں نرمی، دردمندی، خودداری، اور غیرت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ عورت کی حمایت پر کمربستہ ہیں۔ ترقی پسند تحریکوں سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ آزاد ملک، آزاد فضا، آزاد خیال لوگوں کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ انہیں خیام کا فلسفہ اتنا عزیز تھا جتنا اس کا عمل۔ وہ مخالفت کی پروا نہیں کرتے، اور خذف ریزوں کو ٹھکرائے ہوئے گذر جاتے ہیں۔ ظواہر و رسوم کو پسند نہیں کرتے۔ اور انسانیت کو سب سے بڑا خدا سمجھتے ہیں۔

اصلی نیاز تک ہماری رسائی اس وجہ سے نہیں ہوتی کہ انہیں خود پوشی میں کمال حاصل ہے۔ عام طور پر یہ خیال ہے کہ خطوط سیرت کا آئینہ ہوتے ہیں۔ اور انسان کے اصلی جذبات اور خیالات کا جتنا صحیح اظہار خطوں سے ہوتا ہے، اتنا کسی اور ذریعے سے نہیں۔ مگر بقول ڈاکٹر سید عابد حسین "جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ بات سب خطوں پر صادق نہیں آتی۔ جسے پردہ داری منظور ہے اور اس کا سلیقہ بھی رکھتا ہے، وہ خطوں کو بھی اپنی اور تحریروں کی طرح اخفائے حقیقت کا ذریعہ بنالیتا ہے بلکہ اکثر یہ ذریعہ اور ذرائع سے زیادہ کامیاب ثابت ہوتا ہے۔ اس لئے کہ لکھنے والا پر تکلف سادگی اور ساختہ، بے ساختہ پن کے پردے میں بات کو اس طرح چھپاتا ہے کہ پڑھنے والے کو شبہ بھی نہیں ہوتا کہ اس سے کچھ چھپایا جا رہا ہے۔[10]

نیاز کے خطوط بے لاگ نہیں ہیں۔ ان کا سلسلہ عشق و محبت کا سا معاملہ ہے۔ "جس طور پر محبت ہو جاتی ہے، کی نہیں جاتی، اسی طور پر خط لکھ جاتا ہے، لکھا نہیں جاتا۔" نیاز نے مصیبت کا علاج سکرات سے کیا ہے۔ اور حقائق سے آنکھ نہیں ملاتی، چرائی ہے۔ اس لئے ان کے مکتوبات میں "غیر ذمہ دارانہ بشارتیں" اور "غفلت زا طرب انگیزیاں" ہیں۔ ان کی شہرت کا تمام تر انحصار ان کے شگفتہ اور پختہ اسلوب پر ہے، جس کی چمک دمک ابھی بہت دنوں تک قائم رہے گی۔

---

[1] مکتوبات نیاز ج ۲، ص ۱۶، ۱۷

[2] مکتوبات نیاز ج ۲، ص ۱۱۳

[3] 〃 〃 〃 〃 ۱۲۵

[4] 〃 〃 〃 〃 ۱۳۱

[5] 〃 〃 〃 〃 ۱۴۶

[6] 〃 〃 〃 〃 ۱۵۰

[7] 〃 〃 〃 〃 ۱۹۷

[8] 〃 〃 〃 〃 ۳۱۶

[9] نگار، لکھنو ج ۲، ش ۱، ص ۱۹۔

[10] اردو خطوط۔ تعارف ص ۷ کتابی دنیا لمیٹڈ دہلی

[11] نگار، ج ۲۸، ش ۱، ص ۱۹ و ۲۰

مکتوبات نیاز کی ادبی قدر و قیمت کا تعین

(پروفیسر ارشد کاکوی)

فرانسیسی زبان میں Bella کسی حسین و جمیل عورت کو کہتے ہیں اور Belles Letters اُن کے یہاں صنف ادب میں اُن تحریروں کو کہتے ہیں جو جمالیات وادبیات بلکہ انتقادیات جیسے اہم موضوعات سے متعلق ہوتے ہوئے بھی ہلکے پھلکے، سادہ، شگفتہ، نازک اور شاعرانہ اندازِ بیان کے حامل ہوں۔ گویا "ادبِ لطیف" سمجھئے۔ فرانسیسی ادب کی اس صنف کے پیشِ نظر اگر اردو ادب کے سرمائے کو یکجا کیا جائے تو "مکتوباتِ نیاز" کو سرفہرست رکھنا ہوگا۔ بلکہ ہمارے یہاں اس نوع کی چیز اگر نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہوگی، اصغر گونڈوی مرحوم کی تعریف کے مطابق ادبِ لطیف اس طرزِ انشا کا نام ہے جو وسعتِ علم، شعریت اور حکیمانہ نزاکتِ خیال کے امتزاج سے پیدا ہوتا ہے۔ اس تعریف کے پیشِ نظر ایک موجودہ نقاد کا یہ فرمانا کہ یہ تعریف اس ادب کا کوئی افادی پہلو متعین نہیں کرتی اور اسی لئے ان تینوں عناصر کے امتزاج سے جس ادب کی تخلیق عمل میں آئی وہ ایک رومانی اور صرف جمالیاتی تقاضوں کو پورا کرنے والا ادب تھا[1] محلِ نظر ہے۔ اصغر گونڈوی مرحوم کی تعریف بذاتِ خود ادبِ لطیف کی افادیت کی مدعی ہے۔ وسعتِ علم، احساسِ شعریت اور حکیمانہ نزاکتِ خیال سے ترتیب پانے والا ادب غیر افادی کیسے ہو سکتا ہے؟ اللہ جانے مقالہ نگار نے "افادیت" کن معنوں میں استعمال کیا ہے۔ کیا ان معنوں میں کہ ایک حسین، تر و تازہ، شگفتہ پھول کی افادیت اس وقت تک مستند نہیں جب تک اس کی ترکاری پک کر دسترخوان پر نہ آجائے۔ کیا روح کی شگفتگی، طبیعت کی بالیدگی اور فکر کی تازگی انسانی زندگی کے حق میں مفید نہیں؟ ادب برائے ادب اور ادب برائے حیات کا ڈھونگ رچانے والے نہ جانے اس نکتہ کو کیوں نظر انداز کر جاتے ہیں کہ ادب برائے حیات بھی خالص ادب (Pure Literature) ہو سکتا ہے بشرطیکہ وہ ادب ہو۔ انساب برائے ادب کے ممتاز انگریز علمبردار آسکر وائلڈ (Oscar Wilde) کا افسانہ "گلاب" اس کی بہترین مثال ہے گل و بلبل کی کہانی ہے لیکن سماج اور رسم و رواج نیز انسانی فطرت کے نامطبوع رخ کی اس میں کتنی پُر تاثیر تصویر ہے۔ بات کا رخ دوسری سمت نکلا جا! ہے مجھے کہنا یہ تھا کہ نیاز کی بیشتر تحریریں ادبِ لطیف کے ذیل میں آتی ہے ان کے یہاں وسعتِ علم، احساسِ شعریت، اور نزاکتِ خیال کے ساتھ بڑی تیز بصیرت (Sharp Insight) بھی ہے۔ ادبِ لطیف سے ایک زمانہ تک ٹیگوری طرزِ انشا مراد لی جاتی رہی اور اس کی غلط تقلید ایک وبا کی طرح پھیلی۔ اس میں الفاظ کم ہوتے تھے اور لکیریں زیادہ۔ خواتین کے حلقہ میں یہ روش زیادہ مقبول ہوئی لیکن جلد ہی یہ پُرتصنع انداز ختم ہو گیا کیونکہ تاثیر محض تحریر میں آہ لینے اور لکیریں کھینچنے سے نہیں آتی کچھ لوگ ادبِ لطیف صرف اس طرزِ انشا کو کہتے ہیں جو خلیقی مرحوم کا حصہ تھی۔ اس میں شک نہیں کہ "دبستان" ادبِ لطیف کا بڑا دلکش نمونہ ہے لیکن ادبِ لطیف فقط اسی طرزِ انشا کا نام نہیں ادبِ لطیف اس طرزِ انشا کا نام ہے جو اچھے شعر کی طرح دل میں اتر جائے جس میں دامنِ دل تھام لینے کی صلاحیت ہو اور جس طرح کسی اچھے

---

[1] بحوالہ شاعر (جولائی ۵۵ء)

شعر کے دل میں اترنے کے اسباب محدود و معین نہیں، اسی طرح ادب لطیف کو مواد و متن کے اعتبار سے محدود و معین کرنا مناسب نہیں۔

نیاز کی ادبی شخصیت کا بظاہر سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ شاعر نہیں لیکن واقعہ یہ ہے .... وہ شاعر اور صرف شاعر ہیں۔ اُن کا مزاج جو یکسر شاعرانہ ہے اُن کی ادبیات اور انتقادیات میں ہر جگہ کار فرما ہے، اکثر حضرات شاعر پیدا نہیں ہوتے لیکن ساری عمر شعر کہتے رہتے ہیں اور کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو شاعر ہی پیدا ہوتے ہیں لیکن شعر کبھی نہیں کہتے، نیاز کا تعلق ایسی جماعت سے ہے۔ (ہر چند وہ کبھی شعر بھی کہہ لیا کرتے تھے)۔ اُن کی انشا پردازی ہی اُن کی شاعری ہے۔ وہ شاعری نہیں جو نثر میں کی جاتی ہے۔ بلکہ وہ شاعری جو انسان کی جمالیاتی حس اور اُس کے ذوق لطیف کا بے اختیار مظاہرہ ہوتی ہے، نیاز کی انشا پردازی میں اکثر اسی لطف و کیف کا احساس ہوتا ہے، جو ایک لطیف سے لطیف شعر کو سن کر ہو سکتا ہے۔ اسے نہ بھولئے کہ لطافت شعر "کیسے کہا" سے پیدا ہوتی ہے، بلکہ "کیا کہا" کو بھی اس میں برابر کا دخل ہے۔ خصوصاً ادب لطیف میں جہاں فکر کی تازگی کو اتنا ہی دخل ہے جتنا فن کی شگفتگی کو، سہاگن کی پہچان مانگ کا سیندور ہے لیکن یہ سیندور الجھے، بکھرے، روکھے سوکھے بالوں میں سہاگن بیوہ کا تصور پیدا کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ کوئی سخت گیر نقاد یہ کہے کہ چونکہ اُن کی تحریریں عموماً شعر اور اُن کے افسانوں میں چونکہ ایک مخصوص ماحول ہوتا ہے، اور اُن کا پس منظر زیادہ تر ماہ و ماہی سے تعلق رکھتا ہے اور وہاں ایک خاص طبقہ کے افراد و کردار ہوتے ہیں، اس لئے وہاں حسن و جمالیات کی فضا اُن کی انشا پردازی کو شاعرانہ اسلوب دے دیتی ہے۔ ان دونوں باتوں کی اہمیت مسلم لیکن اس کے باوجود اُن سے یہ تو پوچھا ہی جا سکتا ہے کہ "مکتوباتِ نیاز" کے متعلق کیا ارشاد ہے، جہاں زندگی اور ادب اپنی تمام صد رنگی اور تنوع کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ جہاں مذہبی، سیاسی، علمی، معاشی غرضکہ ہر قسم کی بحث موجود ہے لیکن بیان میں کہیں گرانی نہیں۔ بحث تو بحث، تکرار میں بھی نیاز کا لب و لہجہ اپنی مخصوص دلکشی برقرار رکھتا ہے، شگفتگی و تازگی، سرشاری و پُر کیفی، نیاز کی تحریروں میں عموماً اور اُن کے مکاتیب میں خصوصاً جاری و ساری ہے۔ اُن کی انشا پردازی کا جوہر انتقادیات، ملاحظات اور مذاکرات میں بھی جلوہ پاش ہے، لیکن مکتوبات کا تو عالم ہی کچھ اور ہے ؎ صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھائیے۔

نیاز کی تحریر کا ایک بڑا گر یہ ہے کہ وہ الفاظ کے صحیح محل استعمال پر قادر ہیں، اس سے ہوتا یہ ہے کہ کم سے کم الفاظ زیادہ سے زیادہ مفہوم ادا کرتے ہیں، اپنے جملہ کی تشریح اور اپنے خیال کی وضاحت کے لئے وہ کوئی دوسرا تیسرا جملہ لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے، اور وہی جملہ بھرپور، مکمل اور اٹل ہوتا ہے، انسان کی نفسیات ایک مشین ہے اور الفاظ اُس کے پرزے، ہر پرزے کی صحیح جگہ اور اس کے طریق استعمال سے واقف ہوئے بغیر اس مشین سے صاف ستھری تخلیقات کی توقع نہیں ہو سکتی، نیاز لفظ و معنی کے رشتہ کو جو جسم و جان کا رشتہ ہے اچھی طرح جانتے ہیں بقول خود اُن کے زبان کی ترقی کا مفہوم صرف یہ ہے کہ جذبات کو اُن کے حقیقی رنگ میں ظاہر کرنے کی اہلیت اس میں پیدا ہو جائے، چنانچہ نیاز کے یہاں الفاظ بیّن طور پر جذبات کے نقش کا صحیح رنگ نظر آتے ہیں، تحریر میں زور اور اثر اسی طرح آتا ہے کہ الفاظ جاندار محسوس ہونے لگیں۔ نیاز کی طبیعت میں فطری جوش ہے، اور یہی جوش و کیف اُن کی تحریر میں نمایاں ہے۔

مکتوبات نیاز کی طرف آنے سے پہلے "مذاکراتِ نیاز" کی ایک مثال دیکھئے۔ ڈائری لکھی جا رہی ہے۔ مختلف شاعروں سے ملنے اور ان کا کلام اُن کی زبانی سننے کا حال بیان ہو رہا ہے، اور ساتھ ہی ساتھ نقد و نظر کا حق بھی ادا کر رہے ہیں۔ کسی صاحب کا ذکر آتا ہے، اور یوں آتا ہے:-

"..... خود اُن کی زبانی اُن کا کلام سننے کا فخر بھی مجھے حاصل نہیں ہوا۔ اور میں اس کے لئے بیتاب تھا....."

شاعری میں شوخی اور طنز کے مضامین عموماً باندھے جاتے ہیں، دیکھئے اس جملے میں یہ دونوں عناصر کس حسن سے یکجا ہو گئے ہیں، جملہ کا پہلا اور دوسرا حصہ بظاہر کتنا متضاد ہے، لیکن وحدتِ مفہوم ظاہر ہے، اور پانچ چھ الفاظ کے اندر نیاز نے کس قدر مفہوم کو سمیٹ لیا،

میں یہاں والٹیر (Voltaire) کی ایک مثال دیئے بغیر نہیں رہوں گا، کسی کی موت کے بعد ایک شخص نے والٹیر سے مرحوم کی بابت اس کے خیالات دریافت کئے، والٹیر نے جواب دیا۔

"He was a Sturdy patriot
a Talentedwriter, a loyal friend
a good father and a husband
provided he is realy dead

مذکورۂ بالا اقتباس کا آخری حصہ جس طرح پوری بات کو موڑ کر رکھ دیتا ہے۔ اس کی تفصیل لاحاصل ہے۔ Parodox اور Epigram نیاز کی خاص چیز ہے لیکن یہ چیز اُن کے یہاں آسکر وائیلڈ، برنارڈ شا یا چسٹرٹن وغیرہ کی تقلید سے نہیں آئی، یہ صنعتیں Original Thinkers کی طبیعتوں کا اشتراک ہوتی ہیں، تقلید سے اور سب کچھ سہی انفرادیت تو پیدا ہونے سے رہی۔

مکتوب نگاری کی بابت کہا جاتا ہے اور صحیح کہا جاتا ہے کہ شعروں کے انتخاب کی طرح اس سے بھی دل کا معاملہ کھلتا ہے، اور مکتوب نگار کی رسوائی ہوتی ہے، لیکن یہ کہنا کہ مکتوب نگاری صرف معاملاتِ دل کا اظہار ہے، غلط ہے، معاملاتِ دل کا اظہار محض دو ایک افراد کی چیز ہوتے ہوئے بھی عام دلچسپی کا سبب بنتا ہے، جیسا کسی شاعر کے اس قطعے سے ظاہر ہے ؎

وقتِ وداع بوسے حکیم صاحب نے دیئے   اچھلیں، کودیں، ہزار ہا ناز کئے
جلوے جو لٹائے اس طرح سرِ راہ   نصف عاشق کیلئے تھے نصف ہم سب کیلئے

اِس لئے ظاہر ہے کہ مکتوب اگر محض اپنے معاملاتِ دل کا اظہار ہو جب بھی اس کی دلچسپی ہمہ گیر ہے، لیکن مکتوب نگاری کو محض معاملاتِ دل کا اظہار سمجھنا غلط ہے۔ خصوصاً مکتوباتِ نیاز کے سلسلے میں جہاں شعر و ادب، منطق و فلسفہ، حیات و کائنات، خدا و رسولؐ، قرآن و حدیث مختلف و متضاد موضوعات پر مکتوب نگار کے خیالات کا اظہار ہے، لیکن زبان و بیان، لب و لہجہ سب کچھ بے پناہ صد رنگی و نیرنگی کا حامل ہے، مجموعی طور پر مکاتیب سب سے سچے اور بہت ہی دلچسپ دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں، یہ ناممکن نہیں کہ تنقید و تبصرہ میں کبھی نیاز کو مصلحت اندیشیوں سے کام لینا پڑا ہو، اور یہاں وہاں انہوں نے خود کو کبھی مارے باندھے رکھا ہو، اور کہیں گھٹ بڑھ گئے ہوں، لیکن مکاتیب میں تاوقتیکہ اظہار کی ایسی کوئی مصیبت دامنگیر نہ ہوگئی، ہوتا وہی ہے جو دل میں ہوتا ہے، بقول ڈاکٹر شادانی، پرائیویٹ خطوط میں مصلحتوں کے تمام پردے اُٹھ جاتے ہیں اور قلم کی زبان صحیح معنی میں دل کی ترجمان بن جاتی ہے[1] مثال کے طور پر ڈاکٹر شادانی نے شبلی کا حوالہ دیا ہے کہ تعلیمِ نسواں، پردہ، موسیقی اور بعض دیگر معاشرتی مسائل کے متعلق انہوں نے عطیہ بیگم اور زہرہ بیگم کے نام اپنے پرائیویٹ خطوط میں جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے، وہ اُن کی کسی دوسری تصنیف میں نہیں اور اس کا سبب پبلک لائف کی مجبوریاں اور مصلحتیں ہیں جو مکتوب نگار کی حیثیت سے اُن پر عائد نہیں ہوتیں۔

یوں تو ہر خطیب اور ادیب کا Audience ہوتا ہے۔ ناول نگار، افسانہ نگار، شاعر سبھوں کے پیشِ نظر کچھ لوگ ہوتے ہیں جو اُن کی تحریر میں ان کے افراد و کردار سے ملتے ہیں، اُن کے احساسات و جذبات میں شریک ہوتے ہیں لیکن جن لوگوں کا Audience سے بہت ہی قریب کا (Immediate) رشتہ ہوتا ہے وہ مقرر اور مکتوب نگار کا ہے، ان دونوں میں کڑی آزمائش

---

[1] بحوالہ تحقیقات، صہ ۱۲۹

مکتوب نگار کی ہے۔ ایک مقرر اپنے سامعین پر مسلط ہونے کے لئے بہت ہی باخبر (Conscious) رہتا ہے۔ وہ ایک جملہ کہے گا پھر اپنے سامعین کو تولے گا، وہ اُن کو بڑی چالاکی سے آزماتا جاتا ہے، اُن سے اُن کا یقین و اعتراف چھیننے کو اس کے پاس بہت سارے حربے ہوتے ہیں، اور مواقع بھی اس کے برخلاف مکتوب نگار کے پیشِ نظر اس کا صرف ایک audience ہوتا ہے اور یہی وقت اس کی سب سے بڑی آزمائش ہے، سینکڑوں انفاس کے درمیان اسے خطیب کی طرح خود کو لئے دیئے رکھنے کی ضرورت نہیں، مکتوب نگار اپنے خیالات کو منوانے پر آئے گا تو اسے استدلال (Argument) سے کام لینا ہوگا، لسانی (Rhetoric) سے نہیں، قلم اور دوات سے لحن و لے یا اشارہ و ادا ممکن نہیں، اگر وہ کسی چیز کا اعتراف کرتا ہے تو اسے بالکل یا کم از کم قریب ترین صداقت سے کام لینا ہوتا ہے، کیونکہ اس کا ہر لفظ اس کے مکتوب الیہ کی نگاہِ انتقاد سے گزرے گا، خواہ وہ اس کا دوست ہو یا دشمن — اس لئے مکاتیب میں صداقت کا زیادہ سے زیادہ امکان ہے، اور اسی لئے لکھنے والے کی شخصیت کا صحیح مطالعہ جس قدر مکاتیب سے ممکن ہے، اور کسی طرح ممکن نہیں، مکتوب نگار کے ساتھ ہی ساتھ آپ کے ذہن میں یہ بات آئی ہوگی کہ ڈائری لکھنے والے کی بابت کیا خیال ہے، جس کی شخصیت مکتوب نگار سے زیادہ معتبر ہے، اس باب میں میری رائے شاید زیادہ قابلِ قبول ہو، ایک مقرر سینکڑوں ہزاروں انفاس کے درمیان رہتا ہے، مکتوب نگار کے پیشِ نظر صرف ایک شخص ہوتا ہے، لیکن ڈائری لکھنے والا تو بالکل ہی آزاد ہے، اس کی مثال ایک ایسے شخص کی ہے جو کسی آئینہ خانہ میں داخل ہو، اور اپنے ہی سراپے کے سامنے طرح طرح سے "بنے" لطف یہ ہے کہ وہ صداقت سے اپنا وہ رشتہ بھی کاٹ دیتا ہے جو اور کچھ نہ سہی تو کسی غلط فہمی ہی کا سبب بن سکے، چونکہ وہ اپنا (Audience) آپ ہوتا ہے اس لئے وہ اس خلوت میں خود فریبی کے امکانات زیادہ سے زیادہ پاتا ہے، تنہائی میں اسے چھپنے اور چھپانے کے زیادہ مواقع ہیں، (عجیب بات ہے) تکلّف اور تصنع کی اجازت ہے، سرمہ و غازہ کا استعمال اور آرائشِ خمِ کاکل تنہائی میں جس سکون و اطمینان کے ساتھ ممکن ہے کسی کے سامنے ممکن نہیں۔ آپ کو کیا علم کہ جو ادا و تبسّم آپ کے پیشِ نظر ہے تنہائی میں کس مشق و ریاض کے بعد اُن میں ہلاکت آفرینی آئی ہے، آرائش و زیبائش کے وقت کوئی آ جائے یا کسی کا خیال ہی آ جائے تو وہ اطمینان کہاں؟ اور پھر یہ بھی تو دیکھئے کہ ڈائری کا کوئی اپنا وجود بھی ہے؟ جہاں تک یادداشت کا تعلق ہے اس کی عام افادیت معلوم؟ اگر کسی خاص شخص یا فن پارے کی بابت اظہارِ رائے ہے تو وہ مکتوب میں بھی ممکن ہے، جہاں تک اپنی خامیوں اور کمزوریوں، بے اعتدالیوں اور خطاؤں کے اعتراف کا تعلق ہے، اول تو ہندوستان و پاکستان کا کوئی فرد اس کے اظہار و اعتراف کا حق ادا کرنے سے رہا، جہاں کسی کا منہ چوم لینے کا اعتراف ممکن نہیں، کسی کو دل دینے کے اعتراف کا یارا نہیں وہاں ڈائری اور اس کی اہمیت کیا، اور پھر ڈائری میں کوئی شخص یہ سب باتیں چھوڑ کیوں جائے؟ کون چاہے گا کہ اس کی موت کے بعد لوگ اسے برے ناموں سے یاد کریں۔ اس لئے ڈائری محض ڈھونگ ہے۔ دلداری و جانبازی کے جو واقعے سامنے آئے ہیں وہ مکاتیب ہی کے ذریعہ آئے ہیں، اس لئے مکاتیب ہی کو سچے دستاویز ہونے کی حیثیت حاصل ہے، غالب کے خطوط کا راز اس میں نہیں کہ وہ غالب کے ہیں اور ان کی حیثیت تبرکات کی ہے، بلکہ وہ اس لئے اہم ہیں کہ غالب نے اپنی زندگی کی ان میں نقاب کشائی کی ہے، اور ایسی سادگی و بے تکلفی سے جو اُن کی شخصیت کا جزو تھی، وہ اس لئے اہم ہیں کہ اُن کے بغیر غالب کی شخصیت کا مکمل نقش نہیں بنتا، وہ اس لئے اہم ہیں کہ ان میں ان کی خوبیاں ان کی خامیاں اُن کا جھوٹ، اُن کا سچ، اُن کی توانائیاں، ان کی کمزوریاں، اُن کی پسند، ان کی ناپسندیدگی، ان کی ہوشیاری اُن کی بیخودی اُن کی پارسائی، ان کی رندی، ان کا مزاج، اُن کا اخلاق، ان کی طبیعت، اُن کی فطرت، ان کی سپردگی، ان کا کس بل، ان کی پوشاک، ان کی غذا اُن کی فطرت، ان کی نفرت، غرضکہ اُن کی زندگی کا ہر پہلو بے نقاب ہے، وہ اس لئے اہم ہیں کہ ان میں غالب کے عہد کی سماجی اور سیاسی تاریخ ملتی ہے، اور سب سے بڑھکر وہ اس لئے اہم ہیں کہ انہوں نے اردو نثر کی رو اور رفتار کو بدلنے میں حصہ لیا ہے۔

مکاتیب کے بارے میں ایک بات عام طور پر یہ کہی جاتی ہے کہ اور بعض لوگ تو اسے معیار قرار دیتے ہیں کہ مکتوب نگار خط لکھتے وقت یہ نہ سوچے کہ آج یا کل اس کا یہ خط شائع ہوگا، یعنی یہ کہ خطوط اشاعت کی غرض سے نہ لکھے جائیں، مکتوباتِ نیاز کے متعلق عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ یہ خاص طور پر اشاعت ہی کی غرض سے لکھے گئے ہیں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس غرض و غایت کے باوجود ان کے مکاتیب میں وہی بے تکلفی و سادگی و سرمستی و بے حجابی کا عالم ہے یا نہیں۔ جو ہونا چاہئے، اس میں شک نہیں کہ جو خط اشاعت کی غرض سے لکھے جائیں، وہ اشاعت کے قابل نہیں ہوتے، یعنی یہ کہ مکتوب کی حیثیت سے اُن کی اہمیت کم ہو جاتی ہے، مکتوب نگار اس میں زبان و بیان کے نکتے پیدا کرنے لگے گا لیکن نیاز کے ساتھ یہ صورتِ حال نہیں، اُن کی تحریر میں بے ساختگی اور بے خوفی یوں بھی موجود ہے، وہ کہہ گزرنے کے قائل ہیں اور ان کی تحریریں کوشش و آورد سے بہت دور ہوتی ہیں۔ خط لکھنا، اور اس طرح لکھنا کہ یہ خط، خط کی حیثیت سے شائع ہوگا اور بھی مشکل کام ہے نیاز کا کمال یہ کہ انہوں نے علم و ادب اور تنقید و تحقیق کا حق ادا کرتے ہوئے بھی اپنے خطوط کی زبان کو بوجھل نہیں بنایا، ایک اقتباس ملاحظہ ہو:۔

> "پھر باوجود اس کے کہ قدیم رنگ مجھے پسند نہیں مکمل شعرا اسی میں ملتے ہیں اور جدید شاعری میں باوصف ندرتوں کے بہت کم ایسے شعر نظر آئے ہیں جن کو ہر لحاظ سے مکمل کہا جائے۔"

میں نے یہ اقتباس اس لئے دیا کہ دیکھئے کس سادگی سے نیازؔ نے بڑی بات بیان کر دی۔ اور اب ایک اقتباس خاص اُن کے رنگ کا دیکھئے:۔

> "میرا مشرب تغزّل کے بارے میں ذرا قدامت پسند واقع ہوا ہے۔ اور تصوّف و فلسفہ طرازی دونوں میری سمجھ سے باہر ہے اس لئے فارسی میں سعدی اب بھی میرا محبوب ہے اور اُردو میں میرؔ و دردؔ پر جان دیتا ہوں۔"

بظاہر یہ سیدھی سادی صاف بات نظر آتی ہے لیکن نہیں، غور کیجئے کہ نیاز نے ان سطروں میں کتنے بڑے مروجہ خیال کی گردن ماری ہے، عام طور پر فارسی میں سعدی اور اُردو میں دردؔ تصوف ہی کے لئے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ نیاز فلسفہ اور تصوف دونوں سے کورے اور جان دیتے ہیں تو میرؔ و سعدی پر، دیکھا آپ نے کتنا زبردست انتقادی پینترا ہے، دردؔ، سعدی، فلسفہ، تصوف تمام باتوں کو کس حسن و اختصار سے سمیٹ لیا ہے۔ نیاز کے گوشۂ اظہار میں بلا کی انفرادیت ہے، تغزل و تصوف، قدامت و جدّت، شعر و فلسفہ نیازؔ نے ہر موضوع پر لکھا ہے، اور اُن کے خطوط کی بعض تحریریں اس ضمن میں اس قدر معنی خیز اور اہم ہیں کہ بڑے بڑے مقالوں پر بھاری ہیں، دوسرے نقاد خصوصاً ڈاکٹر عبادت بریلوی جس بات کو دو صفحات میں بیان کریں گے، نیازؔ اسے دس پانچ سطروں میں کہہ دیں گے، اُن کے مکاتیب میں بڑے کام کے ادبی و انتقادی نکات مل جاتے ہیں، اور اس کثرت سے کہ اُن کی انتقادی بصیرت ان کے مقالوں کے مطالعہ کے بغیر بھی اس سے واضح ہو جاتی ہے، یہی حال اُن کے مذہبی معتقدات کا ہے، اُن کی مذہبی اسپرٹ اُن کے مکاتیب میں اسی تندی و تیزی کے ساتھ موجود ہے جس کے لئے وہ بدنام یا نیکنام ہیں۔ ہر چند کہ اقبال کے مکاتیب کا بیشتر موضوع علمی ہے، اور مکاتیب نیاز بھی علمی و ادبی موضوعات سے خالی نہیں لیکن دونوں کا فرق ظاہر ہے۔ یہ دونوں کی شخصیت کا فرق ہے۔ اقبال کے بعض خطوط ضرورت کے تحت لکھے گئے، زیادہ تر جواباً لکھے گئے، لیکن نیاز کے مکاتیب محض خطوط کا جواب نہیں بلکہ خطوط بھی ہیں، وہ غالب کی طرح "ستم زدہ ذوق فرسانہ ہوں یا نہ ہوں انہوں نے خط جی سے لکھا ہے، دل سے لکھا ہے، فرض اور اخلاق کی تکمیل کے خیال سے نہیں۔ نیاز کی شخصیت میں بے اصولیاں نہ سہی یہ ضرور ہے کہ فرض و اخلاق کی تکمیل کا خیال اُن کے یہاں زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ یہ میں اور بہت سارے لوگ تجربات سے جانتے ہیں، اور اُن کی شخصیت کے اس رُخ پر روشنی ڈالنا اُن کے شخصیت نگار کا کام ہے، میرا نہیں۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ اُن کے مکاتیب کی نوعیت

سرتا سر وہی ہے جو شاعر کے کلام کی نوعیت ہوتی ہے اور غالباً اسی لئے اُن کے خطوط میں اُن کی شخصیت و بصیرت کی بہت ساری تہیں از خود کھلتی جاتی ہیں،

مکتوبات نیاز میں تلاش کے باوجود مجھے مقامات آہ و فغاں اور داستان ہائے ناز و نیاز کی ایسی مثالیں نہیں ملیں جو قطعیت کے ساتھ انھیں کسی کا اور کسی کو اُن کا بتا سکیں لیکن چند خطوط ایسے ضرور مل جاتے ہیں جن سے نیاز کی وارفتگی شوق کا اندازہ ہوتا ہے، ہو سکتا ہے نیاز نے اس قسم کے مکاتیب کو بربنائے مصلحت شامل نہ کیا ہو اور اگر یہ سچ ہے تو مجھے کہہ لینے دیجئے کہ انہوں نے انصاف سے کام نہیں لیا، ہاں انہوں نے عشق و محبت کا نام ضرور لیا ہے، گناہ و ہوس کا فلسفہ بھی بیان کیا ہے، اور جوانی و رندی کی وکالت بھی کی ہے، اور ان مام باتوں کی عکس ریزی میں نیاز ہی کی شخصیت سامنے آتی ہے۔

> بندہ نواز! عریانی بری چیز نہیں بشرطیکہ وہ نیم عریانی سے آگے نہ بڑھے۔ بدن چرا کر چلے جانے میں سینہ تان کر سامنے آجانے سے شاید زیادہ لطف ہے۔ ...... لباس تار تار ہو جانے کے بعد لباس لباس نہیں رہتا۔"

آپ جانئے کہ مذکورہ بالا اقتباس کسی عورت کی بے باکی و عریانی پر سرزنش نہیں، کسی صاحب کی نظم کے متعلق نیاز کی رائے کے سلسلے میں ہے۔ اسی خط میں لکھتے ہیں کہ:-

> آپ کی نظم سے لطف اٹھانے کے لئے "واردات" کو کہاں ڈھونڈھوں، ڈاکٹر اشرف الحق حیدرآبادی نے بھی اعادۂ شباب کا آپریشن اب شاید ترک کر دیا ہے"

یہ ڈاکٹر اشرف الحق غالباً بلکہ یقیناً وہی ہیں جن کا حوالہ طاہرہ دیوی شیرازی (سحر بنگال) نے اپنے ایک خط میں دیا ہے:

> "نیاز صاحب نے لکھا تھا کہ حیدرآباد میں کوئی ڈاکٹر اشرف الحق صاحب ہیں جو اعلیٰ حضرت کے بھی سرجن رہ چکے ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ صرف اعادۂ شباب کے لئے عمل تعمل کرتے ہیں[1]۔

مندرجہ ذیل خط کسی نازک مرحلہ کی نشاندہی کرتا ہے۔

> " عتاب نامہ ملا۔ لیکن مجبوری دیکھئے کہ اسے عتاب کہنے کی بھی تاب مجھ میں نہیں ...... اگر مقصد صرف معذرت سے لطف اٹھانا ہے تو پہلے گناہ کر لینے دیجئے۔ عذر بے گناہی میں کیا رکھا ہے۔ باور کیجئے میں نے کبھی ان سے رسم و راہ بڑھانے کا اقدام نہیں کیا۔ آپ کو سمجھنا چاہئے کہ اگر دل کو خون کرنے کی فرصت نصیب ہو تو کیا آپ سے بہتر کوئی دوسرا عدو ہو سکتا ہے۔"

کیا عجب کہ ان سطور میں سرتاسر اعتراف محبت ہو۔ ایک اقتباس اور سہی:-

> " آپ سے دور بھاگ رہا ہوں۔ یہی ایک جرم اتنا بڑا ہے کہ آپ جس قدر ملامت کریں کم ...... میں نے تو صرف پوچھا تھا کہ آشنا گاہی گہے ناآشنا" یہ ادا آپ کی عام ہے یا صرف میرے لئے مخصوص ۔ آپ نے اس کے جواب میں فلسفۂ محبت اور نکات عشق پر ایک لکچر دے ڈالا ...... میں نے اس پر پوچھا کیا عورت زیادہ پڑھ لکھ کر صرف بقراط ہی بن سکتی ہے؟ اس کا جواب دراصل یہ ہونا چاہئے تھا کہ آپ ہنس دیتیں...... لیکن خلاف اُمید آپ اور سنجیدہ بن گئیں۔ آپ برہم ہوتیں تو بھی میں اس سے لطف اٹھاتا لیکن اس "روڑھے پن" کو کیا کروں......
> ...... دیکھئے! اس کے جواب میں آپ چاہے قرآن ہی پورا لپیٹ کر بھیج دیں۔ لیکن خاموشی کی قسم نہیں،" ورنہ پھر میری اس بت پرستی کا مظلمہ سارا آپ کی گردن پر ہوگا۔"

---

[1] مکاتیب جمیل" (مولفہ ربیعہ سلطانہ) ص ۳،

اس قدرے طویل اقتباس سے ظاہر یہ کرنا تھا کہ نیاز کے آگے نسائیت کس چیز کا نام ہے۔ اس کے مطالبات کیا ہیں اور وہ کون سے جلوہ ہائے یر نقاب ہیں جو نیاز کو بے نقاب کرتے ہیں۔ نیاز کے نزدیک عورت بجائے خود معبد کی حیثیت رکھتی ہے۔ عورت حسن کا دوسرا نام ہے، اور حسن سائیت کے سوائے کچھ نہیں۔ اب رہی محبت تو بقول نیاز عورت محبت پر مجبور ہے۔ اور مرد کے لئے محبت سرت کا درجہ رکھتی ہے۔ مجبوری ختم نہیں ہوتی اور مسرت پائیدار نہیں ہوتی، کسی قدر ترمیم کے ساتھ میں نے نیاز کے یہ الفاظ یہاں لکھے ہیں، ان یں نیاز اور عورت کا رشتہ بالکل واضح ہے۔ اور اس رشتہ کی جلوہ پاشیاں ان کے مکتوبات میں پوری طرح موجود ہیں۔ اب ان کے دوسرے عتقدات کو دیکھئے:۔

"کل ایک صاحب تشریف لائے۔ کسی بزرگ کی تعریف کرنے لگے کہ دنیا سے کس قدر بے تعلقانہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور رات دن ایک گوشہ میں بیٹھ کر اللہ اللہ کیا کرتے ہیں، میں نے کہا کہ اگر یہ اچھی بات ہے تو سب کو کرنا چاہئے اور اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ساری دنیا میں الو بولنے لگے۔ پھر یہ ظلم تو چنگیز و ہلاکو نے بھی نہیں کیا تھا۔"

نیاز کی تحریر اس وقت اور دو آتشہ ہو جاتی ہے جب وہ تلملا کر کچھ لکھتے ہیں۔ موسم گرما کا ذکر ہے:۔

"...... آپ کو ضد ہے کہ ایسے موسم میں میرا حال پوچھیں گے۔ جب مجھے اپنی ذات سے بھی نفرت ہو جاتی ہے۔ سوچتا ہوں کہ خدا اگر بغیر سورج کے کرۂ زمین کو پیدا نہیں کر سکتا تھا تو کیا یہ ممکن نہ تھا کہ وہ خط استوا سے دور کسی مقام پر مجھے پیدا کرتا۔"

ایک خاص عالم کی تحریر ملاحظہ ہو۔ خط میں القاب "آرام جاں" کا ہے جو سر تا سر طنز ہے۔ دس پانچ اپنے انداز کے جملے کھنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

3 JUL 1963

"اچھا تو سنو، میں نے بھی ایک فیصلہ کیا ہے اور وہ یہ کہ تمہیں کسی نہ کسی طرح یہ یقین دلا ہی دوں کہ جو کچھ تم چاہتے ہو وہ پورا ہو گیا۔ کل شام کو ایسی آندھی آئی کہ میرے مکان کی چھتیں گر پڑیں، دیوار و در سرنگوں ہو گئے۔ اس کے بعد دفعتاً ایک گوشے سے شعلہ بلند ہوا اور میری ایک ایک چیز کو خاکستر کر گیا۔ میں گھر سے باہر نکل کر بھاگا تو لوگوں نے پتھر مارنا شروع کئے۔ میں گھبرا کر ایک کنوئیں میں کود پڑا اور وہیں ختم ہو گیا..... تمہیں خوش کرنے کے لئے اس سے زیادہ میرے امکان میں نہ تھا۔"

یہ تحریر نیاز ہی کی ہو سکتی تھی ــــ اس سے زیادہ اس کی تعریف ممکن نہیں۔ ان سطور سے نیاز کے نظریہ کی ایک جھلک ملتی ہے:۔

"کیا عرض کروں کتنی مسرت ہوئی یہ سن کر کہ اقبال میاں ولایت سے کامیاب واپس آئے..... ملازمت چاہے کیسی ہی ہو، بہر حال چاکری ہے اور انسانی خود داری کے منافی، لہٰذا اس کا تو سوال ہی نہیں رہی پریکٹس، سو اس کے لئے ایک بار پوری طرح غور کر کے جگہ مقرر کر لینا چاہئے۔ اور پھر یہ عہد کہ وہاں سے قدم نہیں اٹھانا۔"

شعر گوئی اور شعر فہمی کے متعلق بھی نیاز کے خیالات بس انہی کے خیالات ہیں:۔

"میں سمجھتا ہوں کہ شعر فہمی کا سلیقہ ترک شعر گوئی کے بعد ہی پیدا ہوتا ہے۔ ایک شاعر جب تک شاعر ہے بندۂ فریب ہے۔ اور اس کے سامنے جادہ و منزل کا سوال ہی نہیں۔ دوسرے دیکھتے ہیں اور ہنستے ہیں لیکن جب وہ یہ مشغلہ ترک کرنے کے بعد خود تماشائی بن جاتا ہے، تو اسے پتہ چلتا ہے کہ جسے وہ شاعری سمجھتا تھا دراصل اس میں کتنی غیر شاعرانہ باتیں ہیں۔"

یہ خیال بظاہر عجیب و غریب ہے لیکن کم از کم نیاز کے سلسلہ میں تو ٹھیک ہی معلوم ہوتا تھا۔

خالص شاعرانہ انداز کی ایک دلپذیر تصویر دیکھئے۔ ایک محترمہ سے خطاب ہے:

"آپ کو شاید یاد نہ ہو گا لیکن میں وہ ساعت کبھی نہیں بھول سکتا جب آپ میرے سامنے نگاہ جھکائے ایک پھول سے کھیل رہی تھیں۔

اور میں خوش تھا کہ ــــ آج میں نے اپنا دل ــــ حزن کیا ہوا دیکھا۔ گم کیا ہوا پایا۔

یہ بات غور کرنے کی ہے کہ نیاز کے مکاتیب میں اشعار کا حوالہ بے ساختہ ہے یا نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جس بے ساختگی سے نیاز کوئی مصرع دہراتے ہیں۔ کسی شعر کا حوالہ دیتے ہیں، یا نثر ہی میں کسی شعر سے کام لیتے ہیں۔ وہ بے ساختگی کسی کے یہاں نہیں ملتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اقتباس بالکل اسی موقع کی چیز ہے۔ یوں سمجھئے کہ نیاز کے یہاں حوالوں کا استعمال بھی "خلّاقانہ" ہے۔ ابوالکلام آزاد کے مکاتیب میں اردو فارسی عربی کے اشعار کا حوالہ کثرت سے رہتا ہے لیکن آزاد کے یہاں یہ کوشش نمایاں ہو جاتی ہے کہ اُن کو آگے چل کر فلاں شعر پیش کرنا اور اسی انداز سے وہ اپنے مفہوم اور اپنی تحریر کو موڑتے چلے جاتے ہیں۔ دوسری خامی ابوالکلام آزاد کے حوالوں میں یہ ہے کہ وہ جس شعر کو پیش کرتے ہیں اس کا مطلب پہلے نثر میں بیان کر دیتے ہیں، اور پھر وہ شعر لکھ دیتے ہیں۔ یہ چیز بڑی گراں گزرتی ہے کیونکہ اس کی ضرورت باقی نہیں رہتی، موقع کے لحاظ سے مناسب شعر کا حوالہ دے دینا کافی ہے۔ نیاز کے یہاں یہی حسن ہے، وہ کبھی تو پورا شعر، کبھی صرف ایک مصرع اور کبھی مصرع کا صرف ٹکڑا استعمال کرتے ہیں یعنی اپنے مفہوم کا احاطہ کرنے والے حصہ سے زیادہ وہ قبول نہیں کرتے۔ برخلاف اسکے ابوالکلام آزاد شعر کی تشریح فرمائیں گے، پھر شعر بھی نقل کر دیں گے، دوسرا فرق یہ ہے کہ کہیں کہیں آزاد کی اسٹائل عالمانہ ہو جاتی ہے، اور نیاز کے یہاں صرف ادیبانہ۔ باوجود شگفتہ طرازی اور نغز گوئی کے ابوالکلام آزاد کے مکاتیب سے ایک عالم ہی کی شخصیت سامنے آتی ہے اور نیاز کے خطوط میں ایک ادیب کا پرتو ہے۔

غالب کے خطوط کا ایک کمال یہ ہے کہ انہوں نے القاب و آداب کے مروجہ طریقوں کو ختم اور کم کر دیا۔ نیاز کے یہاں آپ دیکھیں گے کہ القاب یا تو سرے سے ہوتے ہی نہیں اور اگر ہوتے ہیں تو اپنے چوکھے" کر لیں۔ سچ تو یہ ہے کہ القاب و آداب سے مکتوب کی فضا میں ایک تکلف کی شان آ جاتی ہے۔ اور جہاں تکلف کا موقع نہ ہو وہاں القاب و آداب کی کیا ضرورت۔ نیاز کے خطوط عموماً یوں شروع ہوتے ہیں:۔

(۱) آپ نے دیکھی اپنے دوست کی حماقت! میں نہ کہتا تھا کہ چھ فٹ کے آدمی سے کبھی عقل کی توقع نہ رکھئے۔"

(۲) سنئے صاحب! جیتے جی موت کی باتیں مجھے پسند نہیں، مرنا برحق سہی! جب تک آپ جی رہے ہیں اس واویلا سے فائدہ بھی کیا۔

(۳) ماشاء اللہ! کیا کہنا ہے۔
دنیا اُدھر کی اُدھر ہو گئی اور ابھی تک آپ یہی سمجھ رہے ہیں کہ سورج ڈھلا ہی نہیں۔"

(۴) تم سب باتیں کرو لیکن خدا کے لئے میرے سامنے سیاست نہ بگھارا کرو۔"

وہ کبھی القاب و آداب لکھتے بھی ہیں تو محترم، صدیقی، مکرمی سے آگے نہیں بڑھتے، اور جہاں آپ بندہ نواز، قبلہ، قبلۂ حاجتمنداں قبلۂ روحانیاں جیسے القاب اُن کے مکاتیب میں دیکھیں تو سمجھ لیجئے کہ معاملہ نازک ہے، اور اس القاب میں کتنے ہی ناآزمودہ خنجروں کی کاٹ ہے۔ دو تین مثالیں یہ ہیں:۔

(۱) مولویت و ادبیت معقول! ان دونوں کا اجتماع آج تک کبھی ہوا ہے کہ اب ہوگا۔"

(۲) رند سجادہ بردوش تو مل سکتا ہے لیکن زاہدِ خرابات نشین کا میسر آنا دشوار ہے۔"

(۳) خدا پر بھروسہ کر کے ہاتھ پاؤں ڈال دینا خود خدا کو بھی پسند نہیں۔"

اس قسم کے بہتیرے جملوں پر نیاز کی مخصوص چھاپ ہے اور وہ اپنے جملوں سے پہچانے جا سکتے ہیں اور یہ اتنی بڑی بات ہے جس کی داد بھی بے داد ہے، نیاز کے مکاتیب میں شوخی و رنگینی بھی ہے، اور طعن و طنز بھی، بزرگی و ہوشمندی بھی ہے اور بحث و تکرار

بھی لیکن مختلف اور متنوع کیفیات کے اظہار کے باوجود اُن کے لب و لہجہ میں جو سنجیدہ دلکشی یا دلکش سنجیدگی ہے وہی نیاز کی انفرادیت ہے۔ نیاز کاروباری ہونے کی حد تک عملی آدمی ہیں، اور شاعر و ادیب ہونے کے باوجود عمل کی دنیا میں اُن کی حیثیت Mechanic کی ہے، "سود و زیاں" کو اُن کی زندگی میں اہمیت حاصل ہے۔ اُن میں خودداری انا کی حد تک موجود ہے۔ وہ رندی اور سرمستی کی وکالت تو کرتے ہیں اور "وقارِ معصیت" کا احترام بھی، آسکر وائلڈ کے اس نسخہ پر بھی اُن کا ایمان ہے کہ "جوانی کے گناہ کرنے لگو، جوانی خود بخود لوٹ آئیگی" وہ کسی کو مشورہ بھی دیتے ہیں کہ نماز روزہ کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی کوئی گناہ بھی کر لیجئے، کیونکہ زندگی کا احساس گناہ کے بعد بڑھ جاتا ہے۔ ان سب کے باوجود نیاز کی زندگی میں بلا کی "مصلحت بینی" ہے، اور اس باب میں بڑے حزم و احتیاط سے کام لیتے ہوئے نظر آتے ہیں، اور دامن بچا کر گزر جانے میں ہی اپنی عافیت سمجھتے ہیں، نیاز کا مذاق خاصہ ہندی مذاق ہے۔ عشق و محبت اور شعر و شاعری کے سلسلہ میں اُن کی تحریریں میرے اس خیال کی تائید کرتی ہیں اور اس سلسلے میں نیاز کے مکاتیب سب سے زیادہ معاون ہو سکتے ہیں۔

ایک انگریز مصنف کارل بیکر نے ٹھیک ہی لکھا ہے کہ انسانوں نے کیا کارنامے انجام دیئے ہیں اور اس کا انجام تو بہر حال مل جاتا ہے لیکن ان واقعات کے رونما کرنے میں دلی جذبات اور دماغی کیفیات کا کتنا حصہ ہے۔ اس کا علم خطوط کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔ جذبات اور جبلتوں کے پوشیدہ و پیچیدہ رازوں کو خطوط ہی میں کھلنے کا موقع ملتا ہے۔ اور سو تعریف کی ایک تعریف تو ڈاکٹر جانسن کا یہ جملہ ہے "انسان کے خطوط میں اس کی روح عریاں ہو جاتی ہے"۔ شبلی کے خطوط منظرِ عام پر نہ آئے ہوئے ہوتے تو ہمیں کیسے معلوم ہو سکتا کہ اُن کے فارسی کلام کا بے پناہ رس اور غضب کا بانکپن کہاں سے آیا، اس گلدان میں کس گلستان کے پھول ہیں۔ اس شفق میں کس کی مانگ کا سیندور ہے الفاظ میں یہ چمک دمک کس کے تبسم کا پرتو ہے۔ اور یہ کس کی بے اعتنائیاں ہیں جو مولانا کے لئے میرے دل میں ہمدردی کا جذبہ پیدا کرتی ہیں۔ لیکن رونا تو اس کا ہے کہ ہمارے یہاں اس لطیف ترین پاکیزہ جذبہ کو خطرے کی گھنٹی اور اس کے اظہار کو قربِ قیامت کے آثار سے تعبیر کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے کون کہے کہ "عشق توفیق ہے گناہ نہیں" رعنائی خیال کو گناہ ٹھہرانے والے جس گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں اُن کی بخشائش کس طرح ہوگی، یہ وہ جانیں، ہم آدمی کو فرشتہ بنانے کے درپے تو ہیں لیکن اتنا نہیں جانتے کہ انسان فرشتہ بن جانے کے بعد انسان نہیں رہتا۔ بقول حالی:-

فرشتے سے بہتر ہے انسان ہونا
مگر اس میں ہوتی ہے محنت زیادہ

حالی ہی کو لیجئے۔ حالی کے بارے میں ایک عام خیال یہ ہے کہ مولانا نرے خشک اور سنجیدہ مولوی تھے۔ اُن کے مکاتیب کا مطالعہ اس عام خیال کی حمایت کرنے سے قاصر ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب حالی کو اورنگ آباد بلاتے ہیں۔ حالی جانا چاہتے ہیں لیکن ضعف مانع ہے۔ لکھتے ہیں:-

"..... میرا بھی بے اختیار جی چاہتا ہے کہ چند روز وہاں جا کر رہوں مگر پیرانہ سالی میں اس قدر دور و دراز کی مسافت پر کسی دوست کے پاس جا کر رہنا یا تو اس کو بیمار داری کی تکلیف دینی ہے۔ یا اس پر تجہیز و تکفین کا بار ڈالنا ہے۔"

مایوس ہو کر مولوی عبدالحق ہی دہلی جانے کا پروگرام بناتے ہیں۔ اور حالی کو مطلع کرتے ہیں۔ اب حالی کا جواب سنئے:-

"آپ نے بہت جلد تشریف لانے کا وعدہ کیا ہے مگر میں اپنی حالت کے لحاظ سے یہ شعر پڑھتا ہوں ؎

خدا ہی جانے سحر ہو نہ ہو جئیں نہ جئیں
شبِ فراق کئی احتمال رکھتی ہے

میں اپنی طرف سے اس وقت تک زندہ رہنے کے لئے پوری کوشش کروں گا۔"

سچ بتلائیے کہ اگر مکتوب نگاری کی رسم اور رسم میں حقیقت نگاری کا رواج نہ ہوتا تو حالی کی طبیعت کا یہ رُخ اس طرح کب سامنے آتا اسی طرح حالی کے بعض مکاتیب سے اس کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اپنی بیوی کے ساتھ، جن کا مزاج بیحد تیز تھا ان کا سلوک کس قدر نرم، دھیما، منصفانہ اور پیارا تھا، اور اُن کی وفات کے بعد اُن پر کیا کچھ بیتی۔

میرا مقصد یہ نہیں کہ مکتوبات نیاز کا حالی، شبلی یا دیگر مشاہیر ادب کے مکاتیب کے ساتھ موازنہ کروں ایسا کرنا کسی طرح مستحسن نہیں ہوگا، نیاز بنیادی طور پر انشا پرداز ہیں۔ ایسے انشا پرداز نہیں جن کی انشا شاعری کا سہارا لے کر تکلف اور تصنع اور شوخی و رنگینی کے حدود میں داخل ہوتی ہے، بلکہ یہ وہ انشا ہے جو اس شاعرانہ فکر و احساس کی پروردہ ہے جس کی خصوصیت سادگی و رعنائی اور تاثیر و صداقت ہے۔

شاد کے مکاتیب شاد کی شخصی حیثیت کو Underrate کرتے ہیں۔ حالی کے خطوط حالی کی پاکیزہ سرشت کے عکاس ہیں وحشت کے مکاتیب ان کی خاکساری و انکساری کے نمائندہ ہیں، شبلی کے نامہ ہائے شوق اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ انسان تھے اور اُن کے پہلو میں دل اور دل میں جذب و شوق بلکہ ہوا و ہوس کی لہر تھی، غالب کے خطوط ایک دور کی تاریخ اور خود غالب کی زندگی فوٹو ہیں۔ اقبال کے مکاتیب محض علمی دستاویز ہیں، لیکن نیاز کے مکاتیب میں یہ تمام چیزیں ایک جگہ جمع ہیں، اور اُن کے مطالعہ کے بعد اُن کی شخصیت کے بہت سارے پہلو اور ان کے عقیدے و نظریے کے تمام گوشے سامنے آجاتے ہیں۔

حامد حسین صاحب کی یہ رائے بڑی بھرپور ہے کہ نیاز کی شخصیت ایک پہلودار شیشہ (Prism) کی سی ہے جس نے بکھری ہوئی شعاعوں کو ایک جا کر کے قوس قزحی رنگوں میں منتشر کر دیا ہے۔ میں اس پر صرف یہ اضافہ کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ تمام بکھری ہوئی شعاعیں اُن کے مکتوبات میں بھی جلوہ پاش ہیں۔ اور اس حد تک کہ اُن کی روشنی میں نیاز کی شخصیت پوری طرح تاباں و درخشاں ہے۔

انسان کا مطالعہ اور اشیا کا مطالعہ۔ ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ ہم ایک پھول کی تصویر دیکھ کر صرف اس کی ظاہری ساخت، اس کی پتیوں کی ترتیب کا مطالعہ کر سکتے ہیں اور اگر وہ تصویر رنگین ہے تو اس کے رنگ کا بھی۔ لیکن ایک انسان کی تصویر میں صرف اس کے اعضا اس کے خد و خال ہی ہمارے سامنے نہیں ہوتے بلکہ بہ حیثیت مجموعی کچھ اور چیز بھی سامنے ہوتی ہے، جو ہماری نگاہوں کو مجبور کرتی ہے کہ کاغذ کی سطح کے اندر نفوذ کر کے صاحب تصویر کی ذہنیت تک پہونچنے کی بھی کوشش کرے۔ بالکل یہی حال انسانی تحریروں کا بھی ہے، فرق صرف یہ ہے کہ تصویر میں ایک شخص کا صرف مادی وجود ہمارے سامنے ہوتا ہے اور تحریروں میں اس کا ذہن یعنی وہ زیادہ تر دعوتِ نگاہ ہے اور یہ دعوتِ فکر و نظر!

پھر جس طرح ہم تصویر کے مختلف POSES سے چہرہ کی ساخت کا مطالعہ مختلف زاویوں سے کر سکتے ہیں، اسی طرح ہم ایک شخص کی مختلف تحریروں سے اس کے مختلف ذہنی میلانات کو جان سکتے ہیں، لیکن اگر سوال ذاتی مطالعہ کا ہو تو اس صورت میں ہم کو اس کے نجی خطوط ہی سے مدد مل سکتی ہے جن میں وہ سب سے زیادہ برافگندہ نقاب دیکھا جا سکتا ہے۔ اگر غالب کے خطوط ہمارے سامنے نہ ہوتے تو ہم نہ کبھی اس کی شخصیت کو جان سکتے اور نہ یہ سمجھ سکتے کہ اس کی شاعری پر اس کے طبعی میلانات کے نقوش کتنے اور کیسے ہیں — اسی طرح اگر مولانا آزاد کے خطوط ہمارے سامنے نہ ہوتے تو شاید ہم کبھی نہ جان سکتے کہ محراب و منبر کے آزاد اور خلوتِ آرمیدگی کے آزاد میں کتنا فرق ہے۔

(نیاز)

نیاز بہ حیثیت مقالہ نگار

محمد خورشید عاصم

انگریزی تسلط نے جہاں ہندوستان کی تہذیب و تمدن کو متاثر کیا وہاں ادب بھی ان اثرات سے محفوظ نہ رہ سکا۔ خواہ یہ ادب نظم ہو یا نثر بعض چیزیں تو ایسی ہیں جو انگریزی اثرات کی وجہ سے اردو ادب میں نئی پیدا ہوئیں اور بعض جو ہمارے پاس موجود تھیں اُن میں ان اثرات کی وجہ سے ایک تغیر سا پیدا ہو گیا۔ نئی اصناف مثلاً مختصر افسانہ، ناول، نظم، آزاد شاعری اور مضمون نگاری وغیرہ وہ چیزیں ہیں جو اُردو ادب کے لئے نئی کہی جا سکتی ہیں، ہمارے ہاں کی داستانیں تو تھیں لیکن افسانے اور ناول نہ تھے، بڑی مثنویاں اور دیوان موجود تھے، لیکن آزاد شاعری سے ہمارے شعراء واقف نہ تھے، یہی حال مضمون نگاری کا ہے، مضمون نگاری تقریباً ناپید تھی،

اردو ادب میں مضمون نگاری کی ترویج کا سہرا سر سیّد کے سر ہے۔ سر سید ۱۸۶۹ء میں جب انگلستان گئے تو وہاں اُن کو سپیکٹیٹر او ٹیٹلر کے پرانے پرچے دیکھنے کا موقع ملا، اور اُنھوں نے اُن میں شائع شدہ مضامین کا مطالعہ کیا۔ اس مطالعہ نے انھیں بہت متاثر کیا۔ انھوں ن دیکھا کہ سپیکٹیٹر اور ٹیٹلر میں مختلف مجلسی، علمی اور ادبی موضوعات پر چھوٹے چھوٹے مضمون ہیں، جن میں اس دور کے انگلستان کی کئی برائیوں اور کئی نقائص پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور بغرضِ اصلاح تنقید کی گئی ہے۔ مضمون نگاری گو اصلاً اٹلی کی پیداوار تھی[1]۔ لیکن اس نے موجودہ صو فرانس میں اختیار کی اور MONTIGNE مونٹگنے کو موجودہ صنف مضمون نگاری کا موجد مانا جاتا ہے۔ سنہ ۱۶۰۰ء کے اردگرد مونٹگنے کے مضامین انگلست میں بڑے ذوق و شوق سے پڑھے جاتے تھے، اور اُن کا ترجمہ انگریزی میں کیا جا رہا تھا، مضمون نگاروں میں سب سے پہلا مشہور انگریز بیکن ہے[2]۔ جس نے انگریزی میں اس صنف کی طرح ڈالی۔ خیال ہے کہ بیکن مونٹگنے کے مضامین سے اچھی طرح واقف تھا بہر حال انگلستان میں بیکن کی وجہ سے مضمون نگاری کو وسعت اور مقبولیت حاصل ہوئی[3] تاہم اس کی ترقی میں سب سے زیادہ سپیکٹیٹر اور ٹیٹلر کا ہاتھ ہے۔ جو بالترتیب ۱۷۱۱ء اور ۱۷۰۹ء میں نکلے تھے۔ ۱۷۱۱ء کے بعد بھی اس زمانہ میں سٹیل نے ایڈیسن کی مدد سے نکالا[4]۔ ان پرچوں میں لکھنے والے اپنے زمانہ کے اور مابعد کے زمانہ کے بہت بڑے ادیب اسٹیل، پوپ اور ایڈیسن تھے۔ ان پرچوں نے جہاں اس دور کے اہم علمی اور مجلسی مسائل پر روشنی ڈالی تھی، اور ان موضوعات پر مضامین پیش کئے تھے، وہاں انگریزی نثر کو بھی متاثر کیا تھا، بالخصوص سپیکٹیٹر نے طرزِ تحریر لوگوں کو سکھا دی۔ یہی چیزیں تھیں جو سر سید کو

---

[1] TYPICAL FORM OF ENGLISH LITERATURE ص ۱۱۷

[2] ″ ″

[3] ″ ″

[4] ″ ″

[5] تہذیب الاخلاق جلد دوم ص ۳۳۰

[6] ″ ″ ″ ۴۸۴

پسند آئیں اور انہوں نے اسی انداز پر ایک رسالہ ہندوستان میں بھی جاری کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ سنہ۱۸۷۰ء میں ہندوستان واپس آئے تو انہوں نے تہذیب الاخلاق جاری کیا اور اس میں مذہبی اور علمی مضامین شائع کرنے شروع کئے۔ ظاہر ہے کہ یہ مضامین قوم کی مجلسی، معاشرتی مذہبی اور اخلاقی اصلاح کے مدنظر لکھنے شروع کئے گئے۔ اور ساتھ ہی ساتھ اردو زبان میں ایک سادہ اور بے تکلف طرزِ نگارش کی ترویج کو بھی خاص اہمیت دی گئی جس میں مدعا نگاری کا اصول سب سے پہلے نمایاں تھا۔

تہذیب الاخلاق میں لکھنے والے سرسید کے علاوہ بھی کئی اصحاب تھے، جن میں سے نواب محسن الملک، نواب وقار الملک۔ مولانا حالی، نواب اعظم یار جنگ، مولوی ذکاء اللہ۔ مولوی نذیر احمد۔ علامہ شبلی نعمانی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ چھ سال کے عرصہ میں جو مضامین وقتاً فوقتاً اس پرچہ میں شائع ہوئے، اُن کی تعداد ۲۲۶ ہے۔ اور اُن میں سرسید کے خود نوشت مضامین ۱۱۲ شمار کئے جاتے ہیں[1]۔ ان مضامین میں زیادہ تعداد مذہبی مضامین کی ہے، کیونکہ سرسید اور اُن کے رفقاء مسلمانوں کی اصلاح چاہتے تھے، اور یہ محسوس کرتے تھے کہ مسلمان مذہبی توہمات اور تاویلات کی وجہ سے زوال پذیر ہیں۔ اس لئے انھوں نے ان مسائل پر زیادہ توجہ کی، اور اس طرح قوم کو جہالت کے قید و بند سے نجات دلانے کی کوشش کی۔ سرسید نے تہذیب الاخلاق کے پہلے پرچہ میں لکھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجہ سویلائزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جائے، تاکہ جس حقارت سے سویلائزڈ یعنی مہذب قومیں اُن کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہو، اور وہ بھی دنیا میں مہذب کہلائیں۔ ان مضامین میں جو اخلاقی اور تمدنی نقطۂ نظر کے ماتحت لکھے گئے چند ایک مضامین یہ ہیں:۔ بحث و تکرار۔ خوشامد۔ رسم و رواج۔ طریقۂ تناولِ طعام۔ خط و کتابت وغیرہ۔ اور اسی طرح مذہبی اور علمی مضامین میں سے چند ایک یہ ہیں:۔ مذہب اور عام تعلیم، دین و دنیا کا رشتہ۔ احادیث غیر معتمد۔ مسئلہ جبر و اختیار۔ عقائد اہلِ اسلام وغیرہ۔

سرسید کے مضامین کو اپنے زمانہ میں خاص شہرت حاصل ہوئی، کیونکہ ان میں پرانے رسم و رواج اور عقائد پر خاص چوٹیں کی گئی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تہذیب الاخلاق کے خلاف کئی اخبار نکالے گئے مثلاً امداد الآفاق۔ مزید الاوہام۔ نور الآفاق۔ نور الانوار وغیرہ۔ ان مخالف اخبارات میں سرسید کے لکھے ہوئے مضامین کا جواب دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مضمون نگاری کی صنف کو مقبولیت اور وسعت نصیب ہوئی۔ تہذیب الاخلاق کے بند ہونے کے بعد کئی اخبارات میں وقتاً فوقتاً مضامین نکلتے رہے۔ جن میں مولانا عبد الحلیم شرر کا دلگداز، مہذب اور محشر کافی مشہور ہیں۔ ان میں شائع شدہ مضامین کتابی صورت میں جمع ہو کر کئی جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ اسی طرح اودھ پنچ میں لکھنے والے سجاد حسین، رتن ناتھ سرشار، محمد علی کسمنڈوی، پنڈت جوالا پرشاد اور مرزا مچھو بیگ ستم ظریف خاص طور پر مشہور ہیں، یہ الگ بات ہے کہ اودھ پنچ میں شائع ہونے والے مضامین کا لہجہ ظریفانہ اور طنزیہ ہوتا تھا۔

سرسید کے رفقاء میں بعض احباب ابھی بقیدِ حیات ہی تھے کہ نیاز نے بھی مضمون نگاری شروع کی، نیاز صاحب کے مضامین کا بھی اکثر حصہ مذہبی مضامین پر مشتمل ہے، باقی مضامین میں کچھ علمی ہیں کچھ تنقیدی ہیں، کچھ تاریخی اور بعض ایسے ہیں جنھیں مضمون سے زیادہ انشائے لطیف کا نام دیا جائے تو بجا ہوگا۔ مذہبی مضامین میں سے بعض وہ ہیں جو باب الاستفسار میں مختلف اصحاب کی جانب سے مختلف اوقات میں استفسارات کے جواب میں لکھے گئے۔ اور بعض وہ ہیں جو اپنے نظریات کی وضاحت اور اشاعت کے لئے لکھے۔ چند ایک مضامین یہ ہیں:۔ خدا ہے یا نہیں۔

---

[1] تہذیب الاخلاق جلد دوم ص ۲۵۳

[2] بحوالہ مسلمانوں کا روشن مستقبل ص ۲۰۲

[3] حیات جاوید ۲۶

[4] محشر سنہ۱۸۹۵ء میں جاری ہوا

[5] مخزن ص ۱۶۸

ہمارے علمائے کرام کا دینی نظریہ۔ مذہب والحاد۔ بقائے روح۔ معاد۔ خدا نے روح کو کیوں پیدا کیا۔ قرآن کے کلام خدا ہونے کا صحیح مفہوم روایت و معجزہ وغیرہ

سرسید کی طرح نیاز کے مضامین میں بھی عام طور پر مروجہ مذہبی عقائد کے خلاف ایک بغاوت کا جذبہ پایا جاتا ہے لیکن سرسید کا حملہ اتنا سخت نہیں تھا جتنا نیاز کا۔ سرسید نے بعض روایات کی تردید کی اور بعض اعتقادات کی عقلی نقطۂ نظر سے تاویل پیش کی، غلط روایات میں سے تعصب اور رسم و رواج کا قلع قمع مقصود تھا اور عقائد میں سے جن، فرشتے، قیامت، معجزات حور و غلمان وغیرہ وغیرہ کی تاویلات تھیں لیکن نیاز سرسید سے بھی بڑھ گئے، انھوں نے خود خدا کو بھی عقلی نقطۂ نظر سے سمجھنے کی کوشش کی ہے، اور خدا کے وجود کے اثبات و عدم اثبات پر کئی بحثیں کی ہیں۔ اور آخر یہ کہا ہے کہ خدا کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ نیاز صاحب کے یہاں خدا کی تعریف مولویوں کی عام مروجہ تعریف سے مختلف ہے۔ وہ مولویوں کے خدا کا مذاق اڑاتے ہیں کہ انھوں نے اپنی شکل میں ایک بھاری بھرکم غضبناک آنکھوں والا قہار بادشاہ اختراع کر رکھا ہے۔ جو دنیا کو تباہ و برباد کرنے اور انسان کو عذاب دینے سے خوش ہوتا ہے۔ بدکار مسلمانوں کو عقیدہ کی وجہ سے بخش دے اور نیک غیر مسلموں کو عذاب دے۔ نیاز خدا کو محض ایک قوت سمجھتے ہیں، جس نے یہ دنیا پیدا کی، جس کو نہ عبادات کی ضرورت ہے نہ خوشامد کی، جو نہ کسی کو بہشت عطا کرتا ہے اور نہ سزا دے کر دوزخ میں ڈالتا ہے۔ نیاز اس خیال کے پیرو ہیں کہ انسان جو کچھ بھی کرتا ہے اس کا پھل اسے دنیا میں ہی مل جاتا ہے۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ برائی کرنے سے جو ذہنی اذیت ہوتی ہے۔ وہی انسان کا دوزخ ہے۔ اچھے کاموں سے جو فرحت نصیب ہوتی ہے وہ بہشت ہے۔

اس کے بعد ایک عجیب بحث قرآن کے متعلق ہے کہ قرآن واقعی خدا کا کلام ہے یا نہیں اور اگر ہے تو اس کا کیا مفہوم ہے۔ علاوہ ازیں قرآن کے مآخذ پر بھی بحث کی گئی ہے، اور یہ چیز اردو ادب میں شاید اس سے پہلے کبھی موضوع بحث نہیں بن سکی، باقی مذہبی مضامین جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے بہ اعتبار موضوعات سرسید سے بڑی حد تک مماثل ہیں۔ لیکن نیاز کا دائرہ سرسید کی بہ نسبت زیادہ وسیع تر ہے۔

نیاز اور سرسید کے مذہبی مضامین میں بنیادی فرق جو محسوس ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ سرسید کا انداز ترغیبی ہے، اور نیاز کا بالعموم مجادلانہ۔ چوٹیں سرسید بھی خوب کرتے ہیں لیکن نیاز کا طرز زیادہ سخت ہے۔ سرسید بھی الزامات کا جواب دیتے تھے لیکن نیاز کے جواب سوالیہ ہوتے ہیں، اور ان کی مدافعت میں اقدام کا جذبہ زیادہ کارفرما ہوتا ہے۔

ایک اور فرق یہ ہے کہ سرسید کی عقلیت پرستی میں ایک کڑا پن اور رکھائی پائی جاتی ہے۔ سیدھی سی عبارت میں وہ اپنے مقاصد کو بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور اس میں جذبات کی آمیزش سے اکثر پرہیز کرتے ہیں، لیکن نیاز کے تعقل میں بھی جذباتیت پوری طرح جلوہ گر دکھائی دیتی ہے۔ وہ کہیں خطیبانہ رنگ اختیار کر لیتے ہیں اور کہیں ویسے ہی تلخ ہو جاتے ہیں، جس سے مضامین میں ایک سکون اور نرمی نہیں رہتی۔ یہ دراصل ان کی طبیعت کا اقتضا ہے۔

ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

> "اس سوال کا جواب سورج کے طلوع و غروب سے لو، چاند کے ایاب و ذہاب سے پوچھو، آبشاروں کی روانی اور دشت و صحرا کی ویرانی سے دریافت کرو، پہاڑوں کے سکوت اور دریاؤں کے شور سے طلب کرو۔"
>
> "موسموں کا باقاعدہ تغیر و تبدل، بہار و خزاں کا ظہور و خفا، نباتات کی بوقلمونی، وحوش و طیور کی طبعی نیرنگی، نوعِ انسانی کے قوائے کاملہ، فضائے بسیط کے ستارے، کائنات کی لانہایت وسعت، خور و شبنم، ذرّہ و آفتاب اور ان سے فروتر انسانی مسائل کی مختلف صورتیں (جن کا نام ہم نے علم طبقات الارض، علم النجوم، علم الافلاک، علم الکیمیا، علم وظائف الاعضاء،

علم الحیات، نفسیات وغیرہ رکھا ہے) بتائیں گی کہ کوئی ایسی قوت ہے جن کے سمجھنے کے لئے ہم اپنی عقل کو عاجز اور بے بس پاتے ہیں[1]

اس کے علاوہ اُن کی بحثوں میں بھی تلخی آجاتی ہے۔ مثلاً علماء اور مولویوں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:۔

"ان میں باہم دگر ایسی حریفانہ کشمکش پائی جاتی ہے کہ عوام کے لئے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ ان میں سے کس کے خلوص پر اعتبار کیا جائے، جمعیت العلماء کانپور کی ہدایت پر عمل کیا جائے یا جمعیت العلماء دہلی کے مشورے پر، لیکن اگر یہ اختلاف و تصادم نہ ہو تو بھی ان کے وجود کا کوئی افادی پہلو ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ اگر ہمارے شہر کے بہشتی، معمار، کفش دوز باقی نہ رہیں تو عوام کو واقعی تکلیف پہنچے لیکن اگر مولویوں کی جماعت فنا ہو جائے تو قوم کو کیا نقصان پہنچ سکتا ہے۔"[2]

اور پھر یہ کہ سر سید کی طرح سیدھا سادا طریقۂ بیان اختیار نہیں کرتے بلکہ بات کو طرح طرح سے اور رنگین بنا کر پیش کرتے ہیں مثلاً

اے خدا اس وقت بھی جب قرونِ مظلمہ کی دنیا تجھے صرف آگ برسانے والا دیوتا سمجھتی تھی، مجھے تیرے دونوں ہاتھ لطف و راحت کے پھولوں سے اور عطوفت کے ہاروں سے لدے ہوئے نظر آتے تھے[3] حالانکہ سر سید ہوتے تو یہی کہتے کہ وہ لوگ تجھے ظالم سمجھتے تھے اور میں مہربان"

لیکن ان مضامین کے لئے مضامین سے زیادہ مقالات کا نام زیادہ موزوں ہے، کیونکہ مضمون میں کسی موضوع کا وضاحت سے بیان ہوتا ہے، اور مقالے میں لکھنے والے کا اس موضوع کے بارے میں اپنے خیالات کا بیان۔ اس لئے مضمون بالعموم غیر شخصی ہوتا ہے، جس کی مثالیں ان کے ہاں بھی ہیں جو ابھی پیش کی جائیں گی، لیکن مقالے میں شخصی رنگ زیادہ پایا جاتا ہے، مقالہ نگار اپنے موضوع کے بارے میں جو بھی تحقیق و تفتیش کرتا ہے، اس سے درحقیقت اپنے نظریہ کو تقویت دینا اور اپنے دعوے کا جواب پیش کرنا مقصود ہوتا ہے، یہی چیز سر سید کے مضامین کے بارے میں کہی جا سکتی ہے کہ وہ مضامین سے زیادہ مقالے ہیں

اس کے بعد مضامین کی وہ قسم ہے جسے علمی، تاریخی اور تنقیدی تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ علمی مضامین سے مراد یہاں وہ مضامین ہیں جن میں بعض کے انکشافات پر بحث کی گئی ہے۔ مثلاً "داستانِ ابر و باد" "دنیا کی سب سے بڑی دوربین" "دنیائے آب کی کہانی" شعاعوں کے حیرت انگیز استعمالات" وغیرہ اور کچھ وہ مضامین ہیں جنہیں فلسفیانہ مضامین کہا جاتا ہے۔ مثلاً "فلسفۂ نٹشے پر ایک نظر" وقت و زمان کی حقیقت" اور بعض عام اطلاعی مضامین ہیں۔ جیسے "مغرب کا نظامِ تعلیم" "صحافتِ مغرب کی حیرت ناک داستان" "تمدنِ جدید کی دردناک داستان" "عورت کے ساتھ دنیا کا سلوک"[4] "عورت اہلِ فارس کے نزدیک"[5] وغیرہ۔ اس کے بعد وہ مضامین ہیں جن میں عہدِ گزشتہ سے متعلق مختلف اطلاعات بہم پہنچائی گئی ہیں۔ ان مضامین کو تاریخی مضامین کا نام دیا جا سکتا ہے۔ مثلاً "زنگاری یا جپسی جماعت کے دلچسپ حالات"[6] باب و بہا" "اندلس کے آثارِ علمیہ" فرانس کی اعاظم پرستی" "فراعنۂ مصر کی خوابگاہیں" "ضمیاتِ یونان و روما"[7]

---

[1] من و یزداں اول ص ۴

[2] " " ص ۳۴۵

[3] " " ص ۱۰۷

[4] " "

[5] مطالعاتِ نیاز

[6] تاملاتِ نیاز

[7] تاملاتِ نیاز

نیاز کے مضامین میں کثرتِ تعداد کے لحاظ سے مذہبی مضامین کے بعد سب سے زیادہ اہمیت اُن کے تنقیدی مضامین کو دی جاسکتی ہے۔ ان مضامین میں انہوں نے ادب کے متعلق بالخصوص شعراء کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ یہ مضامین کچھ تو انتقادیات حصہ اول و دوم اور مالہ وماعلیہ میں شامل ہو کر کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں، اور کچھ ابھی نگار کے پرچوں میں منتشر ہیں۔ ان مضامین میں بیشتر اُن کی تنقیدی آرا ہیں۔

آخر میں ان مضامین کا ذکر کیا جاسکتا ہے، جو اپنے خصائص معنوی کے لحاظ سے سب سے پہلے مذکور ہونا چاہئے تھے۔ یہ مضامین کی وہ قسم ہے جنھیں رومانیت کا حامل کہا جاسکتا ہے۔ اور جو انشائے لطیف میں شمار ہوسکتے ہیں۔ ان مضامین میں سے اکثر نگارستان کے مجموعے میں شائع ہو چکے ہیں، یہ اس دور کے مضامین ہیں جب نیاز کی طبیعت ٹیگور سے زیادہ متاثر تھی۔ اس زمانہ میں سید سجّاد حیدر یلدرم اپنے رومانی افسانوں کی تصنیف میں مشغول تھے۔ خود نیاز کے وہ افسانے جو انھوں نے اس دور میں لکھے۔ مثلاً "کیوپڈ وسائیکی" "قربان گاہ حسن" وغیرہ ان رومانی مضامین میں کوئی علمی، ادبی، تنقیدی، تاریخی بحثیں نہیں ہیں۔ بلکہ احساساتِ لطیف اور جذباتِ رنگین کا بیان ہے۔ مصنّف کی منظر قدرت کے دیکھتا ہے۔ وہ چمن اور اس کی بہار، ابر ہو، قافلۂ صحرا ہو کر طلوع وغروبِ آفتاب و مہتاب، نغمۂ آہنگ ہو یا محفلِ رقص وطرب غرض ہر چیز ایک حُسن کی حامل دکھائی دیتی ہے، اور ہر ذرّہ میں کیف ومستی کی دنیائیں آباد نظر آتی ہیں، مصنف ان مناظر میں محو ہو جاتا ہے، اور اپنے خیالات کی دنیا میں آباد ہو کر اپنے دل سے سرگوشیاں کرنے لگتا ہے۔ اس طرح اپنی تمنائیں، اپنی آرزوئیں، اپنا درد اور اپنا سوز لطیف پیرایہ میں اور دلآویز انداز میں پیش کرتا ہے۔ ان مضامین میں درحقیقت نیاز نے نثر میں شاعری کی ہے۔ شاعری کیا ہے۔ جذبات و احساسات کا ایک پیرایہ لطیف کے ساتھ بیان ہے۔ اور یہ وصف ان مضامین میں پوری طرح جلوہ گر ہے۔ اور ایک شاعرانہ رُوح ایک سرے سے دوسرے سرے تک جاری وساری ہے۔ ان مضامین میں سے چند کے نام یہ ہیں۔ "ایک رقاصہ سے" "برسات" "ایک قافلۂ صحرا کو دیکھ کر" "طلوعِ آفتاب سے پہلے" "سرزمین دکن کی ایک دلنواز شام"[1] وغیرہ۔

اس نوع کے مضامین اور افسانوں کو دیکھ کر اردو ادب کے نقادوں نے نیاز فتحپوری کو "ادب برائے ادب" کا علمبردار قرار دیا تھا۔ جیسے عزیز احمد نے لکھا ہے کہ اگر جدید اردو ادب میں واقعاً ادب برائے ادب کسی کا مسلک رہا ہے، تو نیاز فتحپوری کا[2] لیکن اس رائے کا اطلاق نہ تو ان تمام مضامین پر کیا جاسکتا ہے۔ اور نہ تمام افسانوں پر، ہاں شروع شروع میں نیاز کی روش، ایسی ہی تھی جس میں بعد ازاں خاصی تبدیلی واقع ہوگئی، جیسا کہ اُن کے مضامین کی مختلف اقسام سے ظاہر ہوتا ہے، اُن کے علمی، ادبی، تاریخی مضامین کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔

ان مضامین کی ساخت کا جہاں تک تعلق ہے ان میں اپنی نوع کے اعتبار سے ایک دوسرے کی بہ نسبت تفاوت پایا جاتا ہے۔ مثلاً مذہبی مضامین میں چونکہ نیاز اپنے عقائد۔ احساسات اور تصورات مذہبی بیان کرتے ہیں۔ اس لئے وہاں وہ مضمون کی ساخت کے بارے میں کوئی احتیاط عمل میں نہیں لاتے، مثلاً تمہید نفسِ مضمون اور انجام، یہ چیزیں اپنے اقتضائی مقام اور اہمیت کی حامل نہیں ہیں تمہیدیں عام طور پر طویل ہیں۔ "روایات ومعجزہ" "کورانہ تقلید" "خدا ہے یا نہیں ہے" کی قسم کے مضمون بطور نمونہ پیش کئے جاسکتے ہیں کورانہ تقلید میں قریباً ۳/۴ حصہ تمہید پر مشتمل ہے اور ۱/۴ حصہ کورانہ تقلید کے موضوع "خدا ہے یا نہیں ہے"[3] کے مضمون میں خدا کے وجود وعدم پر کوئی فلسفیانہ یا عقلی دلیل پیش نہیں کی گئی۔ شروع میں یہ کہا گیا ہے کہ سورج، چاند، پہاڑ، آبشار، دشت وصحرا کی ویرانی سے پوچھو۔ اسی طرح وحوش وطیور سے خدا کے وجود وعدم کے بارے میں استفسار کرنے کی ترغیب دی گئی ہے، یعنی عجیب خطیبانہ اور شاعرانہ

---

[1] نگارستان ص [2] ترقی پسند ادب ص ۱۶ [3] من ویزداں ص ۳

طرز بیان اور طریقۂ استدلال ہے۔ پھر اس کے بعد یہ ہے کہ خدا کو پیش کس طرح کیا جاتا رہا ہے۔ اور از روئے اسلام خدا کا تصور کیا ہے یعنی اس میں جو بھی بحث ہے، اس سے ہٹ کر ہے کہ خدا ہے یا نہیں ہے۔ مضمون کے اختتام سے قبل وطن کا مسئلہ زیر بحث لایا جاتا ہے کہ ہم وطن کو جمیل کہتے ہیں، جب وہ قوی ہوتا ہے، ہم اسے عظیم کہتے ہیں، جب اس کے افراد مہذب اور شائستہ ہوتے ہیں۔ یہ قول TARDE کی کتاب المنطق الاجتماعی سے نقل کیا گیا ہے۔ پھر اس کا انجام بھی اس طرح ہے کہ سرزمین ہندوستان بھی جمیل تھی، جب کرشن کی تعلیم نے حریت و آزادی کی روح پھونک رکھی تھی،

ظاہر ہے کہ اس مضمون کا اپنے عنوان سے کوئی تعلق نہیں ہے [1]

علمی اور اطلاعی مضامین جو اکثر ترجمے، ملخصات یا ماخوذات معلوم ہوتے ہیں، مضمون کی ٹیکنک پر پورے اترتے ہیں، کیونکہ ان مضامین میں نیاز کے خیال کی جولانیاں ایک خاص نہج کی پابند ہو جاتی ہیں، اور اس طرح وہ جذبات کی رو میں بہہ کر حدود کو توڑ نہیں سکتے کیونکہ یہاں خیال سے بحث نہیں ہوتی بلکہ ٹھوس حقائق کا بیان ہوتا ہے، فرق موضوع کے تقاضوں سے پیدا ہوتا ہے اگر موضوع ہی دنیا کی سب سے بڑی دوربین ہو، اور مضمون خود اپنے ذہن کی پیداوار نہ ہو بلکہ ماخوذ ہو تو ظاہر ہے کہ شاعری کی گنجائش باقی نہیں رہتی مثلاً علم الافلاک کے بعض دلچسپ حقائق" میں مضمون کو اس طرح شروع کرتے ہیں کہ پہلے یونان کے جن حکماء نے کرۂ ارض اور سیاروں کے بارے میں غور کرنا شروع کیا ان کا ذکر ہے، پھر اس زمانہ کی تحقیقات کے پیش نظر زمین کے قطر حجم وزن کا مقابلہ زہرہ عطارد وغیرہ سے کرتے ہیں۔ پھر عطارد، زہرہ۔ مریخ مشتری زحل آفتاب وغیرہ کے بارے میں جو معلومات ہیں اُن کا ذکر کیا ہے۔ اور اسی ضمن میں مختلف لوگوں کی آرا بھی نقل کی ہیں کہ ان کروں کی ساخت کیسی ہے ان میں کوئی زندگی ہے کہ نہیں۔ ان تک پہنچا جا سکتا ہے یا نہیں۔ وغیرہ۔ ان حقائق کو معلوم کرنے میں دوربین اور ریڈیو وغیرہ سے جو کام لیا جا رہا ہے یا لئے جانے کی توقع ہے اس کا ذکر کیا ہے اور اس پر مضمون ختم ہو جاتا ہے [2]

ان علمی اور معلوماتی مضامین کو چھوڑ کر باقی تمام مضامین خواہ وہ مذہبی مضامین ہوں یا تنقیدی، نیاز کے ذاتی رجحانات وخیالات کے حامل ہیں اور اس طرح جذبات استدلال سے زیادہ کارفرما دکھائی دیتے ہیں۔ تنقیدی مضامین جو خالص ادبی ہوتے ہیں، اُن میں بھی نیاز اپنی رائے سے ادھر اُدھر نہیں ہوتے۔ موضوع خواہ غزل ہو یا عام شعر یا بذات خود تنقید وہ اپنی پسند و ناپسند کو سامنے رکھتے ہیں اور عام مروجہ اصولوں کی بہت کم پروا کرتے ہیں۔

وہ تنقید کرتے وقت رد و قبول کے پیمانے اپنی جانب سے اختراع کرتے ہیں، اور انہی کے مطابق حکم لگاتے ہیں، یہاں تک کہ بعض [3] اصول جو کبھی اُنہوں نے اپنے خطوط میں بیان کئے ہیں، یا دیگر تنقیدی مضامین میں جن میں وہ شاعری و ادب کو جانچنے کے لئے معیار اور طریقے کی طرف اشارہ کرتے ہیں، لیکن تنقید کرتے وقت وہ خود اپنے ہی اصول کی خلاف ورزی کر جاتے ہیں۔

اب رہے وہ مضامین جنھیں ہم اُن کے رومانی مضامین کہتے ہیں، وہ اُن کے شخصی جذبات و احساسات کے آئینہ دار ہونے کی وجہ سے کسی ٹیکنک کے پابند نہیں ہیں، کیونکہ اُن مضامین میں وہ کسی موضوع پر بحث نہیں کر رہے ہیں۔ وہ اپنے احساسات کے بیان میں کھو جاتے ہیں اور شروع سے آخر تک ایک ہی طرح کی جاری رہتی ہے۔ جہاں جہاں اُن کے تخیال کا سلسلہ اُن کی رہنمائی کرتا ہے۔ وہ چلے جاتے ہیں اور جو چیز انھیں اس وقت سوجھتی ہے اس کو بیان کر دیتے ہیں، اور یہ سارا عمل کسی اصول یا نظام کا پابند نہیں ہوتا OPHAM اوپہم ایسے مضامین کو LYRIC جذباتی نظموں سے مماثل قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کوئی چیز مثلاً کسی کی کتاب کا کوئی فقرہ، کسی مکالمے کا کوئی جز، خیال کے اس سلسلہ کو بیدار کر دیتا ہے یا مصنف

---

[1] من ویزداں ص۳ [2] مطالعات نیاز ص۲۳۱

کے دل میں کسی حلول تجزیہ کے قابل نقطۂ نظر کو برق پاش کردیتا ہے لہ۔ اس کے بعد ادیب بطورِ مثال لیمب LAMB اور ہیزلٹ HAZLITY کے ایک دو مضامین کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

نیاز نے رومانی مضامین بھی کسی واقعہ یا منظر سے متاثر ہوکر لکھے ہیں۔ اور ان میں اپنے خیالات کے سلسلہ کو بے کم و کاست بیان کرتے چلے جاتے ہیں "ایک رقاصہ"، "ایک شب کی قیمت"، "عورت"، "برسات"، "ایک قافلۂ صحرا کو دیکھکر"، "طلوعِ آفتاب سے پہلے"، "سرزمین دکن کی ایک دلنواز شام" وغیرہ اسی قسم کے مضامین ہیں۔ اپنے مضمون "ایک رقاصہ" کو شروع ہی اس طرح کرتے ہیں کہ رقاصہ کو دیکھنے سے جو ردِ عمل ان پر ہوا اس کا تذکرہ شروع کردیتے ہیں، اور پھر خیالات کی رو میں بہہ جاتے ہیں۔ اس مضمون کو وہ اس طرح شروع کرتے ہیں:۔ "اے رقاصہ! تو اپنا رقص کر، میں منع نہیں کرتا، مگر مجھے اپنی محفل سے اٹھ جانے دے کہ میں تیرے رقص کو برداشت نہیں کرسکتا۔ میری طبیعت بگڑتی ہے۔ اے مغنیہ تو گا۔ میں نہیں روکتا، مگر خدا کے لئے مجھے اپنی بزم سے چلے جانے دے۔۔۔۔ جب تو اپنے سانچے میں ڈھلے ہوئے مجسمۂ ذی حیات کی کشیدہ قامتی اور اپنی قدِ آدم تصویر کی رعنائی کو لیکر محفل میں کھڑی ہوجاتی ہے تو میں چاہتا ہوں کہ اس فتنۂ سرکش، اس سحرِ خوش قامت، اس قیامتِ بلند و بالا کو نہ دیکھوں، مگر دیکھتا ہوں، اور کانپتا ہوں جب تو اپنی آواز میں ایک دادخواہ بیچارگی، اور مترحم نشیب پیدا کرکے، اپنے نغمہ کو میرے دل کی سب سے پنہاں رگ میں ڈبو دیتی ہے، تو میں چاہتا ہوں کہ اس صدائے بے پناہ کی طرف سے اپنے کان بند کرلوں، لیکن ایسا نہیں کرسکتا۔ سنتا ہوں اور تڑپتا ہوں۔۔۔۔ جس وقت تو اپنے حنائی پاؤں میں سے ایک پاؤں کو زمین پر قائم رکھکر، دوسرے پاؤں کی ایڑی اٹھاکر صرف پنجہ کی ہلکی ہلکی ٹھوکر سے اپنے گھونگروؤں کی آواز کو تال و سم کیساتھ ملاکر ہوا میں منتشر کردیتی ہے تو میں اس منظر سے جان بچاکر کسی طرف نکل جانا چاہتا ہوں۔۔ مگر نہیں نکل سکتا۔۔۔۔ پھر۔۔۔۔۔ اگر تیرے رقص سے جس کو میں خرامِ نغمہ یا نغمۂ خراماں کہہ سکتا ہوں، کانپتا ہوں۔ ڈرتا ہوں، تو مجھے معذور سمجھ کر واقعی میری کمزور طبیعت اس کی تاب نہیں لاسکتی، لیکن اگر تجھے مجھ سے ضد ہے، تو میرا کہنا نہیں مانتی تو صرف ایک کام کر۔۔۔ گا مگر رقص نہ کر، ہر چند تیرا نغمہ بھی مجھے ہلاک کرنے کے لئے کافی ہے، اور میری روح کو اندر ہی اندر تحلیل کرسکتا ہے۔ جب تو آمادۂ رقص ہوتی ہے اور تال سم کے ساتھ تیری بوٹی بوٹی پھڑکنے لگتی ہے تو میں بھی اپنے اعضا میں جنبش محسوس کرتا ہوں۔۔۔ اور بے اختیار یہ چاہنے لگتا ہوں کہ میں بھی تیرے ساتھ رقص کروں۔۔۔" نیاز اسی طرح خیالات میں کھوئے ہوئے تھے کہ انھیں ایکدم خیال آگیا کہ اس رقاصہ تک تو ہر کسی کی رسائی ہے، اس سے تخیلات کا دھارا دوسری طرف مڑ جاتا ہے اور وہ کہنے لگتے ہیں۔

> "ہر چند میری روح تیری نگاہوں کے ان ہلکے ہلکے جرموں کے لئے تشنہ ہے مگر وہ تشنہ ہی رہے گی، کیونکہ انھیں ہر شخص چکھ سکتا ہے، اور میں اس لذت کو صرف اپنے لئے مخصوص کرنا چاہتا ہوں۔ اپنی جوانی کا وہ نشہ جو تیرے بستر کی شکنوں پر ہر شخص کو میسر آسکتا ہے مجھ پر نہ ڈال۔"

پھر ان کا خیال صنعت کاری کی طرف چلا جاتا ہے اور کہنے لگتے ہیں کہ لوگ تیرا رقص نہیں دیکھتے بلکہ تجھے حالتِ رقص میں دیکھتے ہیں، اس لئے تو ان سے بچ، ان لوگوں کی مثال اس بچے کی سی ہے جو ہر تیتری پر جان دیتا ہے، مگر جب اسے پاجاتا ہے تو مل کر پھینک دیتا ہے، تیری دو حیثیتیں ہیں، ایک صرف عورت ہونے کی یعنی تیری نسائیت کی، اور دوسری صرف تیرے رقاصہ اور مغنیہ ہونے کی، اور ان دونوں حیثیتوں کو ایک دوسرے سے جدا رکھ۔ تو صرف اسی وجہ سے نغمہ و رقص کو اختیار نہ کر کہ عورت ہے تو صرف اس لحاظ سے اس فن کی نمائش نہ کر کہ تیری نسائیت میں اس سے زیادہ دلکشی اور دلربائی پیدا ہو جاتی ہے۔ بلکہ تو گا، محض گانے کے لئے، رقص کر صرف رقص کی غرض سے، تو اگر عصمت فروش ہے تو ہو، مگر اپنے فن کی معصومیت کو مجروح نہ کر تو اس کے ذریعہ سے اپنے بازارِ حسن کو رونق نہ دے۔ کوئی قائل ہو یا نہ ہو مگر میں تو قائل ہوں کہ تیرا رقص

لہ ۱۴۷ TIPICAL FORM OF ENGLISH LITERATURE

معجزہ ہے اور میں اس معجزہ پر ایمان لانے کے لئے تیار، لیکن کاش اس معجزہ سے تو معجزہ کا کام لیتی، اور کوئی قیمت اس کی مقرر نہ کرتی، کیونکہ جس وقت صنعت بازار میں آجاتی ہے، صنعت باقی نہیں رہتی بلکہ وہ بازار کی ایک جنس ہو جاتی ہے، جو لاکھ گراں ہونے پر بھی کم قیمت ہے، اور پھر اس سے التجا کرنے لگتے ہیں کہ اپنے لبوں کی شراب چھلکا، مگر ہر کسی کو نہ چکھنے دے، اور ہر بازو کو کمر کا احاطہ کرنے کی اجازت نہ دے، کیونکہ لہروں کے لئے ساحل کا وجود قطع روانی ہے، الغرض تو جو چاہے بن، مگر رہ آزاد و رمیدہ، آغوش سے دور، معانقہ سے الگ، اور پھر مجھ سے پوچھ کہ تو کیا ہے، دنیا کی پرواہ نہ کر، اس کے اصول پر نہ جا، اور وہ کر جو میں کہتا ہوں، پھر تو یہ میرا کام ہے کہ تیرے مجسموں کی پرستش عالم کے ہر ہر گوشے میں اور تیری خدائی ساری دنیا میں قائم کر دوں ـــ اب تجھے اختیار ہے، خواہ پرستیدۂ عالم بن یا پرستارۂ دنیا۔[1]

من حیث المجموع نیاز کے مضامین اردو ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہیں، اندازِ بیان کے لحاظ سے بھی اور موضوعات کے تنوع کے اعتبار سے بھی، اُن کے مضامین پڑھتے ہوئے یکسانی کا احساس پیدا نہیں ہوتا جس سے پڑھنے والا بیزار ہو جائے یا اکتا جائے، کہیں تاریخ کے مسئلہ پر بحث ہے۔ کسی جگہ پر شرع کا کوئی حکم پیش نظر ہے، کسی موقع پر جنت و دوزخ کا معاملہ متنازعہ فیہ ہے، کہیں وارداتِ عشق و محبت سے واسطے ہیں، کسی جگہ خالص سائنس کے کمالات پر اظہارِ خیال ہے۔ الغرض موضوعات محدود نہیں

ان میں سائنس و فلسفہ و تاریخ سے تعلق رکھنے والے مضامین کا حصہ اکثر ماخوذ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ غیر زبانوں کے جواہر سے اردو زبان کا دامن بھرنے کی کوشش کی گئی ہے، اور یہ اُردو زبان کی بہت بڑی خدمت ہے، زبانیں اسی طرح ترقی کرتی ہیں، کیونکہ تراجم و ماخوذات سے جہاں مختلف معلومات حاصل ہوتی ہیں، وہاں ہزاروں الفاظ بھی ساتھ ہی چلے آتے ہیں، اسی طرح بذاتِ خود زبان کی لفظی حیثیت بھی بڑھ جاتی ہے،

نیاز کی نثر نگاری کی سب سے بڑی خصوصیت روانی اور برجستگی ہے، وہ بعض اوقات مشکل الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں، کہیں کسی موقع پر نئی تراکیب بھی اختراع کرتے ہیں، جو ذہنوں سے قریب نہیں ہوتی لیکن اس کے باوجود عبارت ایک تیز رو دریا کی طرح ٹھاٹھیں مارتی ہوئی چلی جاتی ہے، یہ بھی باعثِ دلچسپی ہوتا ہے اور مطالعہ کرنے والا لطف حاصل کرتا ہے۔

نیاز کے مضامین ایک اور اعتبار سے بھی اہم ہیں، بالخصوص وہ مضامین جن میں مذہبی مباحث ہیں، وہ اس طرح کہ انہوں نے کچھ لکھا، اس کے جواب میں دوسروں نے لکھا اور بحث چل کھڑی ہوئی۔

اس بحث کا حاصل مذہبی، شرعی یا تاریخی طور پر مفید ہو یا نہ ہو، اور نیاز کا مفہوم غلط ہو یا صحیح لیکن اس چیز سے انکار ممکن نہیں کہ اس سبب سے کتنے ہی نئے مضامین کا اُردو میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس اعتبار سے نیاز کے مضامین کی حیثیت بھی سرسید کے مضامین کی سی ہو جاتی ہے۔ سرسید کے مضامین جو تہذیب الاخلاق میں چھپے اُن کی تعداد ان مضامین کا عشر بھی نہ ہوگی جو اُن کے جواب میں لکھے گئے۔ غرض نیاز کے مضامین کا اردو ادب کی ترقی میں ایک نمایاں حصہ ہے۔

---

[1] نگارستان ص۵۲، ص۵۳

نیاز کے مختصر ناول

پروفیسر وقار عظیم

مختصر افسانے کی طرح مختصر ناول بھی اردو میں بیسویں صدی کے بالکل شروع میں آیا اور مختصر افسانے کی طرح اس کی فنی روایت کی داغ بیل بھی رومان کی فضاؤں میں رکھی گئی۔ پریم چند جو ہماری افسانوی دنیا کے سب سے بڑے حقیقت نگار ہیں جب افسانے سے خدمتِ وطن کا کام لیتے ہیں تو رومان کی وادیوں میں گلگشت کرتے ہیں اور سجاد حیدر یلدرم جو رومانی تصورات کو زندگی کی سب سے بڑی حقیقت سمجھنے والے قصہ گو ہیں جب اپنے مسلک کی قدروں کی تلقین و تبلیغ کی طرف مائل ہوتے ہیں تو افسانے کے بام و در کی تزئین رومانی تخیل کے رنگوں سے کرتے ہیں اور نیاز فتحپوری جب پریم چند کی داستان نما کہانیوں اور سجاد حیدر کے شعر آگیں افسانوں سے الگ ہٹ کر کہانی کی اس صنف کا تجربہ شروع کرتے ہیں جسے ہم نے آگے چل کر ناولٹ یا مختصر ناول کے نام سے جانا پہچانا تو وہ بھی اپنے قصوں کے سارے خط و خال کی آرائش و زیبائش میں رومان کے نازک موقلم سے ہی کام لیتے ہیں اور یوں مختصر ناول کی فنی روایت کا آغاز اردو میں رومانی تخیل کی سربراہی اور سرکردگی میں ہوتا ہے۔

نیاز فتحپوری نے اپنے دونوں مختصر ناول، شاعر کا انجام اور شہاب کی سرگزشت ایسے زمانے میں لکھے جب ہندوستانی معاشرہ مغربی تعلیم، مغربی معاشرت اور ان دونوں کے لائے ہوئے اثرات کو آہستہ آہستہ اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ نئی تعلیم کے اثر نے نوجوانوں کے مزاج میں ایک نئی طرح کی وارفتگی پیدا کی تھی۔ ان کے فکر و تخیل میں فلسفہ و شعر کی ملی جلی کیفیت کروٹیں لے رہی تھی۔ حالت یہ ہے کہ معاشرتی زندگی کی تبدیلیاں ہر گھڑی زندگی کے رخ سے پردے اٹھا کر ایک نیا جلوہ دکھاتی اور نظر کو حیرت و استعجاب میں مبتلا کرتی ہیں۔ ذہن ان نت نئے جلووں کے معنے سمجھنے اور ان کی تاویلیں کرنے میں مصروف ہے اور کبھی فلسفے اور کبھی شعر کا سہارا ڈھونڈتا ہے۔ افراتفری کے اس عالم میں فلسفہ اور شعر کبھی ایک دوسرے کے ہم نوا بن جاتے ہیں اور کبھی باہم برسرِ پیکار نظر آتے ہیں اور اس جنگ میں نقصان فلسفے کو سہنا پڑتا ہے کہ اس کی منطق یا تو الجھ کر رہ جاتی ہے یا شعر کے جذباتی جوش اور زور کے آگے سپر ڈال دیتی ہے، اور بعض صورتوں میں ایک ایسا فلسفہ جنم لیتا ہے جس کی حدیں شعر سے ملتی ہیں اور جس کی منطق فکر کے بجائے جذبے کی پروردہ ہوتی ہے اور جس کی تاویلات، توجیہات اور نتائج پر ذہن کی نہیں دل کی لگائی ہوئی مہر ثبت ہوتی ہے۔ نیاز فتح پوری کے یہ دونوں ناولٹ جہاں افسانہ میں بہترین ناولٹ اس بدلتے ہوئے ماحول کے بہترین مرقعے ہیں ——— بہترین اس اعتبار سے کہ ان دونوں مختصر ناولوں میں جو کہانی بیان کی گئی ہے وہ اس بدلتے ہوئے ماحول کے خارجی پہلوؤں کی مصوری کرنے کے بجائے اس کی داخلی کیفیتوں کی عکاسی اور ترجمانی کرتی ہے۔ ان دونوں کہانیوں میں چلنے پھرنے والے کردار حقیقت کی دنیا کے کردار نظر آنے کے باوجود خیال کی دنیا میں رہتے بستے سوچتے اور محسوس کرتے ہیں اور ان کے عمل اور ردِ عمل کے پیچھے ایک ایسا فلسفہ کام کرتا نظر آتا ہے جس کی تشکیل و تعمیر فکر سے زیادہ جذبے کی مرہونِ منت ہے

"شاعر کا انجام" کا ہیرو افضال اور شہاب کی سرگزشت کا ہیرو قصہ شہاب، بعض باتوں میں منفرد شخصیتوں کے حامل ہونے کے باوجود بہت سی باتوں میں ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں کہ ان کی سیرتوں کی بنیاد میں ایک ایسے ماحول کے اثرات شامل ہیں جو محسوس کرنے اور متاثر ہونے والے مزاجوں میں اضطراب پیدا کرتا ہے۔ یہ اضطراب کسی کو مسلسل تڑپاتا اور بے قرار رکھتا ہے اور یہ تڑپ اور بے قراری اظہار کے نئے نئے راستے تلاش اور خلق کرتی ہے۔ اور اس طرح عارضی سکون کی ایک صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی یہ اضطراب التہاب بن کر رگ و پے میں سما جاتا ہے اور جسم و جان اس کی گرمی سے پگھلنے لگتے ہیں۔ ضبط سے اس کی آگ میں اور تیزی پیدا ہوتی ہے اور آہوں کا دھواں پورے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ اور کبھی یوں ہوتا ہے کہ یہ اضطراب کا التہاب اور اس کی گرمی کی لپیٹ اور لپک صرف آنسوؤں کے پانی سے کم ہوتی ہے اور مضطرب طبیعتیں اسی کو اپنے سوز غم کا مداوا بناتی ہیں۔ افضال اور شہاب کے علاوہ "شہاب کی سرگزشت" کے کردار محمود، اختر، اور سکینہ طبیعتوں کے اسی اضطراب کی چلتی پھرتی تصویریں ہیں اور "شاعر کا انجام" کے کرداروں میں رقیہ اسی اضطراب کا مجسمہ ہے۔

شہاب کی سرگزشت، کے سرورق پر یہ مختصر عبارت لکھی ہوئی ہے

(ابتدائی بیسویں صدی کا معجزۂ ادب)

حضرت نیاز کا وہ طویل افسانہ جو مطالعۂ جزئیات اور تجزیۂ کردار کے اصول پر سب سے پہلی بار اردو میں لکھا گیا اور جو اپنی تخییل کی نزاکت کے لحاظ سے سحرِ حلال کا درجہ رکھتی ہے۔"

اور "شاعر کا انجام" میں مہدیہ کی عبارت کے علاوہ گزارش کے عنوان سے لکھی ہوئی ایک عبارت شامل ہے۔

تہدیہ

تقاضائے مصلحت تو یہ تھا کہ میں اُن اوراق کو کسی معزز وجود کے ساتھ منسوب کرتا اور اُسی کے پرشوکت نام کو ان کا عنوان بناتا لیکن ڈرتا ہوں کہ کہیں یہ جنوں خراش، یہ ہذیانِ محبت، دولت کے نزدیک خراشِ سامعہ نہ ثابت ہو اس لئے

اے دلِ دیوانہ

تیرے نالہائے شکستہ، تیرے پارہ ہائے آہ، تیرے ہی سازِ بے خودی کے سامنے پیش کرتا ہوں، خدا کرے یہ عرضِ نغمہ تیری ہستیٔ متالم کے حضور میں خجالت کاوش نہ ثابت ہو۔ اور اس کے بعد

گزارش

اِس مجموعۂ اوراق کو جسے اب بھی پریشان سمجھتا ہوں، اس نِگاہ سے نہ دیکھئے گا جس نگاہ سے آپ نے، اس وقت تک دیگر قصص و حکایات کو ملاحظہ فرمایا ہے۔ یہ، نہ تو مذاق پیش رکھنے کا مدعی ہے کہ قافیہ پیمائی آپ تلاش کریں اور نہ موجودہ ناول طرازی کا ہم آہنگ کہ ضلع جگت اور غزلیات کی آپ کو جستجو ہو۔ نہ آپ اس میں اشعار پائیں گے اور نہ عامیانہ زبان۔ مگر ہاں اس میں کلام نہیں کہ اگر اس افسانۂ درد کو آپ نے ایک نگاہِ دردمند اور دلِ مبتلا کے معیار سے دیکھا تو میری وارفتہ نوائی کی داد ضرور مل جائے گی۔ ایک باب کا تسلسل بھی دوسرے باب سے ذرا کم پائیے گا۔ لیکن معاف فرمائیے، نم پروردۂ اشک ہوں، مجھے تو موتی کچھ بکھرے ہوئے بھلے معلوم ہوتے ہیں۔

غالباً دوران مطالعہ میں، نوائے ترکیب، لطافتِ بیان، پاکیزگیٔ خیال آپ ہر جگہ پائیں گے،

> اور یہی میرا ذوقِ حدیث ہے۔ اگر جناب کی نگاہ میں یہ آشفتہ بیانی محمود سمجھی گئی تو میں اس کا دوسرا حصّہ بھی پیش کرسکوں گا، ورنہ میری یہی پرفشانی حسرات کیا کم ہیں۔

شہاب کی سرگزشت کو ابتدائی بیسویں صدی کا "معجزۂ ادب" کہا گیا ہے اور "مطالعۂ جزئیات"، "تجزیۂ کردار" اور "تخیل کی نزاکت" کو اس کی اہم خصوصیات بتایا گیا ہے۔ بلکہ پہلی دو خصوصیتوں سے زیادہ زور تیسری خصوصیت پر دیا گیا ہے کہ اسی کی بدولت اس میں "سحرِ حلال" کی تاثیر پیدا ہوئی ہے۔

"ایک شاعر کا انجام" کے متعلق جس تفصیل سے باتیں کہی گئی ہیں۔ وہ نیازؔ کے فنی مسلک کی زیادہ واضح نشان دہی کرتی ہیں۔ "تمہید" میں "جنوں فروشی" اور "ہذیانِ محبت" کے علاوہ "نالہائے شکستہ"، "پارہ ہائے آہ"، "سازِ بے خودی"، "عرضِ نغمہ" اور "ہستیٔ متالم" کی ترکیبیں معنی خیز ہیں۔

"گذارش" میں اس "افسانۂ درد" کو "نگاہِ دردمند" اور "دلِ مبتلا" کے معیار سے جانچنے کی دعوت دے کر "وارفتہ نوائی" کی داد چاہی گئی ہے۔ ایک باب اور دوسرے باب میں تسلسل کی کمی کی معذرت اس بنا پر کی گئی ہے کہ "غم پروردۂ اشک" کو موتی بکھرے ہوئے بھلے معلوم ہوتے ہیں۔

بیان کی خصوصیتوں کے سلسلے میں نوائے ترکیب، لطافتِ بیان اور پاکیزگیٔ خیال کو اپنے "ذوقِ حدیث" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

"شہاب کی سرگزشت" کو تخیل کی نزاکت نے سحرِ حلال بنایا ہے اور "شاعر کا انجام" میں نوائے ترکیب، لطافتِ بیان اور پاکیزگیٔ خیال کو آشفتہ بیانی کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے اور یوں ان دونوں کتابوں کی قدرِ مشترک اس کا ایک خاص قسم کا طرزِ بیان ہے جس کی بنیاد تخیل کی نزاکت اور پاکیزگیٔ خیال پر ہے، وارفتہ نوائی، جنوں فروشی، ہذیانِ محبت، سازِ بے خودی اور عرضِ نغمہ کی ترکیبیں بھی براہِ راست یا بالواسطہ بیان کے اسلوب کے بعض رخوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ "نالہائے شکستہ"، "پارہ ہائے آہ"، "ہستیٔ متالم"، "افسانۂ درد"، "نگاہِ دردمند" اور "غم پروردہ اشک" میں سوچنے اور محسوس کرنے کے جس انداز کا عکس ہے، اس میں اور بیان کی ان خصوصیتوں میں جن پر بار بار زور دیا گیا ہے۔ بڑا قریبی تعلق ہے۔ اور اس قریبی تعلق سے ان دونوں نئی طرح کی طویل کہانیوں کی فنی ساخت اور ترتیب اور اس کے مختلف اجزا کی تعمیر و تشکیل اور پھر اس تعمیر، تشکیل، ترتیب اور ساخت و پرداخت کے پیدا ہونے والے مجموعی آہنگ اور تاثیر کی تخلیق ہوئی ہے۔

نیازؔ فتحپوری نے اپنی دونوں کہانیوں کا تعارف کراتے وقت قاری کو جس طرح کی کہانیاں پڑھنے کی طرف مائل کیا ہے اس کے لئے وہ اپنے قاری سے ایک خاص طرح کی ذہنی اور جذباتی آمادگی کی توقع رکھتے ہیں۔ انھیں اس بات کا شدید احساس ہے کہ غم و الم کے جس جوش، جنوں و محبت کے جس خروش اور درد و کرب کی جس خلش اور اضطراب نے ان افسانوں کی تخلیق کی ہے، وہ زندگی کے سفر میں عقل و خرد کی نہیں وارفتگی و شوق کی رہنمائی کا قائل ہے، یہاں فکر کی نہیں احساس کی حکومت ہے۔ یہاں عقل جنوں کی اور ذہن قلب کا تابع ہے۔ اس دنیا کی منطق دلیلوں کے اساس پر نہیں، شعر و نغمہ کے سوز و گداز کے سہارے مستحکم ہوتی ہے۔ یہاں الم لذت کا سب سے بڑا سرمایہ اور اشک خوں سکونِ دل کا سب سے موثر وسیلہ ہے۔ یہاں نظر صرف حسن کی جستجو کرتی او اسی کی جستجو میں تڑپتی، تلملاتی، مضطرب ہوتی اور یوں اپنی زندگی کی بنیادوں کو استوار کرتی ہے۔ نیازؔ کے ان دونوں مختصر ناولوں کی دنیا رومانوں کی، ز کی حسین رنگینیوں کی، رومانوں کی حسین رعنائیوں کی، رومانوں کے نشاطِ اضطراب کی اور اس سے بھی بڑھ کر کیف و نغمہ کی اور شاعرانہ تصویروں کی دنیا ہے۔ اور اس دنیا سے تعلق رکھنے والی ہر چیز — اس کے کردار، اس کے واقعات، اس کی فضائیں اور ان کرداروں اور فضاؤں کی ترجمانی اور مصوری کرنے والے الفاظ — رومان کے اسی گہرے رنگ اور اسی حسین اضطراب سے ہم آہنگ ہے۔

"شاعر کا انجام" کا ہیرو افضال ہر تاثر سے تڑپ جانے والا، ہر حسین شے پر مٹنے کے لئے آمادہ و منتظر افضال ہے جو حساس شاعر اور فکرِ معنی ہے، میرؔ کے شعروں پر گھنٹوں سر دھنتا ہے، راتوں کو اپنے نشۂ حیات میں مستغرق "شعر و موسیقی کے عمانِ بے پایاں کی کسی مچھلی" کی طرح ادھر ادھر تیرتا پھرتا ہے

وہ اپنے جذبات سے عملی لذت اٹھانے کا شائق ہے۔ یہی جذبات اس پر کبھی یہ کیفیت طاری کرتے ہیں کہ وہ "اپنے سینے سے ایک کاغذ نکال کے چاندنی میں دیکھنے لگتا ہے اور بے اختیار رونا شروع کر دیتا ہے، جو، ہچکیوں کے سلسلے پر ختم ہو کر" اُسے دیوانہ وار پھر آبادی کی راہ بتا دیتا ہے۔ کسی اَن دیکھے محبوب کی تحریر نظر کے سامنے آتی ہے تو بے اختیار آنسو نکل آتے ہیں۔ کبھی "تپشِ نظارگی" اس کی کشادہ اور متحیر آنکھوں کو مضطرب تخیلات کا محل بنا دیتی ہے۔ کبھی اس کے حسیاتِ تند اُسے ایک ایسا آنسو بنا دیتے ہیں جو نوکِ مژگاں پر تھرتھرا رہا ہو۔ اور ذرا سی جنبش، خفیف سی ہمدردی جسے منتشر کر دینے کے لئے کافی ہو۔ ہر نئی صبح اُس کے جوشِ جنوں میں اضافہ کرتی ہے۔ اس کی دیوانگی ہی اس کی حیات کی ضامن بنتی ہے اور طبیب اُس کے متعلق یہ فیصلہ صادر کرتے ہیں کہ "اگر وہ کسی وقت ہوش میں آگیا تو اُس کے قلب کی حرکت بند ہو جائے گی" ـــــ افضال کا وجود سراپا عاشقانہ ہے لیکن زندگی کے متعلق اس نے فلسفیوں کی طرح سوچا ہے، یہ بات اور ہے کہ اس کا فلسفہ فلسفے سے کہیں زیادہ شعر ہے۔ ایک دن دورانِ گفتگو میں اُس نے کہا تھا کہ :۔

> "کھلا ہوا پھول نکہت بیز زیادہ ہوتا ہے مگر اس میں وہ شعریت و موسیقیت کہاں جو غنچۂ ناشگفتہ میں ہے، پھول کھل جانے کے بعد اپنی زندگی کا جلوۂ آخر ہے، مگر غنچہ جس کو انجام دیکھنے کی آرزو ہوتی ہے، ایک دنیائے اشتیاق ہے، اس لئے لطف یہی ہے کہ اس کی لذتیں اپنی ہی نگاہوں کے سامنے منتشر ہوں"۔

دوسرے طویل افسانے کا ہیرو شہاب نازک و نحیف جسم رکھنے والا نوجوان ہے، جس کی ادائیں ہر دل میں گھر کرتی ہیں۔ لفظ شہاب کا مفہوم ہی متانت، سنجیدگی، خودداری، رعنائی، ذہانت اور تہذیب قرار پایا ہے۔ نقاشی و مصوری اُس کے محبوب ترین مشاغل ہیں۔ اس کے نزدیک کتاب سے زیادہ ساکت بات کرنے والا اور صفحۂ تصویر سے زیادہ خاموش مخاطب کوئی نہیں۔ اس کی زندگی کا ہر لمحہ اضطراب اور اُس کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ اس اضطراب کا ترجمان ہے۔ لیکن اس کا فلسفۂ احساس یہ ہے کہ جو نگاہوں کی التجاؤں کو نہیں سمجھتا اس کے سامنے زبان کو شرمندۂ تکلم نہ کرو"۔ اس کا ذوقِ نظر کسی ایسی چیز کی جستجو میں مضطرب اور بے قرار ہے کہ وہ مل جائے تو وہ اپنا دلِ خون کر دے۔ اس کے فلسفے نے اُسے یہ شاعرانہ تعلیم دی ہے کہ "آرزو کا حصول آرزو کی موت ہے۔ اور لطف کا حقیقی راز صرف خلش ہے"۔ وہ اپنے عزیز دوست کو خلش کی اس لذت سے آگاہ کرنا چاہتا ہے تو اُس سے یوں مخاطب ہوتا ہے :۔

> "تم طلوع و غروب کے مناظر دیکھو اور ان میں بالکل جذب ہو جاؤ۔ تم ایک پھول کو شاخ پر جھومتا ہوا دیکھو اور کائنات کو فراموش کر دو۔ تم ایک خشک پتی کو دیکھو اور خزاں کی ساری کیفیات اپنے اُوپر طاری کر لو۔ تم ایک سبز گھاس کا تنکا دیکھو اور بہار کے اثرات کو اپنی روح میں منتقل کر لو۔ تم پانی کو دیکھو اور تڑپو، چاند کو دیکھو اور بے قرار ہو جاؤ، یہاں تک کہ تمہاری ہر نظر تمہارے لئے ایک دفترِ جذبات ہو جائے اور تم اپنے وجود کو بالکل بھول جاؤ"۔

طلوع و غروب کے مناظر میں جذب ہو جانا، اپنے اوپر خزاں کی ساری کیفیتیں طاری کر لینا، بہار کے اثرات کو اپنی روح میں منتقل کر لینا، پانی کو دیکھ کر تڑپنا اور چاند کو دیکھ کر بے قرار ہو جانا، ہر نظر کو اپنے لئے دفترِ جذبات بنا لینا، اپنے اوپر خود فراموشی طاری کرنے اور اپنے وجود کو بھول جانے یا کسی حسن کے رنگ و بو میں جذب اور فنا کر دینے کا دوسرا نام ہے۔ یہ فلسفہ شہاب کا نہیں، نیاز کا ہے اور اسی لئے نیاز کے دونوں ناولوں کے کم و بیش ہر کردار کا عملی فلسفہ ہے۔ نیاز کے یہ سب کردار اپنے اپنے انداز میں ایک دوسرے سے الگ اور اس لئے منفرد شخصیتوں، سیرتوں اور مزاجوں کے حامل ہونے کے باوجود اپنے آپ کو بھول جانے، فنا کر دینے یا کسی چیز کی خاطر مٹنے کو اپنی زندگی کا آخری مقصد اور نصب العین جانتے ہیں۔ اور

اس نصب العین تک پہنچنے کے لئے ہر طرح کی قربانی دینے کے آمادہ و تیار دکھائی دیتے ہیں؛ ہر طرح کی قربانی دینے کے لئے اور اپنے سفر کی منزل آخر پہنچنے میں ہر طرح کی صعوبت جھیلنے کے لئے۔ سفر کی صعوبتوں میں ان کے لئے ایک ایسی لذت ہے جو زندگی کی کسی اور چیز میں نہیں۔ اس لئے وہ صعوبتوں کی طرف پوری بے تابی، بیقراری اور بے صبری سے بڑھتے ہیں۔ ان کا شوقِ فراواں انکی رفتار میں تیزی پیدا کرتا ہے، ان کے عمل اور عمل کی نوعیت اضطراری بن جاتی ہے۔ انھیں اپنے جذبات پر قابو نہیں رہتا اور اس بے اختیاری میں ان سے ایسی حرکات سرزد ہوتی ہیں کا عام حالات میں کوئی جواز تلاش کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ ان کے تاثرات ہمیشہ شدید ہوتے ہیں۔ اور ان کا جو عکس ان کے قول و فعل پر تا ہے۔ ان کی نوعیت بھی ہمیشہ شدید ہوتی ہے۔ ہیجان، اضطراب، تڑپ، تپش، بے تابی ان کی طبیعتوں کا معمول ہے جو قدم قدم پر ظاہر ا اور کہانی کی فضا کو متاثر کرتا ہے۔

شہاب کی سرگزشت، کی حسین و جمیل "اختر" مایوس ہوتی ہے تو اس حد تک پہنچ جاتی ہے۔ جہاں " اضطراب ختم ہو کر سکون میں تبدیل نے لگتا ہے" —— زندگی کے ایک مرحلے پر " بے انتہا حزن و ملال کہیں شدید ترین اشتعال (وہ اشتعال جو ایک انسان میں نہایت ہی خطرناک بۂ انتقام پیدا کر دیتا ہے) لے کر" اپنے محبوب کے پاس سے رخصت ہوتی ہے۔ اس وقت اُسکی حالت "ایک ایسے پروانہ کی تھی جسے "نیم داغ نیم خاکستر" سکتے ہیں۔ اگر ایک لمحے میں وہ اپنی مایوسیوں کو حیات شکن حد تک بڑھا ہوا دیکھتی تھی تو دوسرے لمحے میں محسوس کرتی تھی کہ تڑپنے کی قوت میں باقی ہے۔ اگر کبھی وہ خیال کرتی تھی کہ عالم نامرادی کی تلخ کیفیات دُور کرنے کا بہترین طریقہ اپنے کو ہلاک کر ڈالنا ہے تو کبھی وہ اس ے پر پہنچتی تھی کہ انتقام میں بہت زیادہ لذت ہے۔

شہاب کا دوست محمود جو بقول شہاب کے شاعر ہے، ادیب ہے اور ایسا شاعر اور ادیب کہ زمانہ کم پیدا کرتا ہے۔ وہ فطرتاً" نقاش و ور پیدا ہوا ہے۔ ایسا نقاش و مصور کہ اگر اُسے خود فطرت کا موقلم کہہ دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ ذہین و حساس ہے، ایسا ذہین و حساس درت شاذ و نادر ایسے افراد پیدا کرتی ہے۔ جب شہاب سے بحث کرتا ہے تو اُس کی شاعرانہ روح فلسفے کے پیکر میں ڈھل کر سامنے آتی ہے وہ کہتا ہے کہ :-

> "حسیات قلب کا حد سے بڑھ جانا عین روحانیت ہے اور اس لئے اگر کوئی شخص تاثرات سے مغلوب ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس پر جذبۂ روحانی طاری ہے۔"

اور جب حسیات قلب کے حد سے بڑھ جانے کو عین روحانیت کہنے والا یہ شاعر فلسفی یا فلسفی شاعر (جو بقول شخصے فکراً شاعر اور مغنّی ہے) شہاب کی دلیلوں سے تنگ آجاتا ہے تو اس کی طبیعت کا ہیجان اُبل کر جوش میں آتا ہے۔ اور الفاظ کا دریا ایک بحرِ تلاطم خیز کی طرح اترتا کبھی چڑھتا، آگے بڑھتا رہتا ہے۔ محمودؔ کی بے بسی خطابت کے زور کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔

> "کیا کہوں شہاب! میرے بس کی بات نہیں ورنہ تمہیں کہیں محبت میں مبتلا کر دیتا اور پھر پوچھتا کہ کہئے قلب کا کیا حال ہے۔ اس وقت روح پر کیا بن رہی ہے۔ تم کچھ کہتے اور میں کہتا کہ یہ تو قلب کا تاثر ہے، روح اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ تم بگڑتے اور میں خوش ہوتا، تم تڑپتے اور میں مسرور ہوتا، مگر افسوس ہے کہ ایسا نہیں کر سکتا، اس لئے سنتا ہوں جو تم کہتے ہو اور برداشت کرتا ہوں جو سنتا ہوں آزاد ہو، خلش سے ناآشنا ہو، جس طرح ... چاہو حکیم بن لو۔ فیلسوف ہو جاؤ۔ محبت کرنے کا سلیقہ ہوتا تو معلوم ہوتا کہ دل جب تک مبتلا نہیں ہے سب کچھ ہے۔ لیکن جہاں مبتلا ہوا پھر وہ خود کچھ نہیں رہتا۔ یہ تو ساری ہوش کی باتیں ہیں کہ روح کیا ہے اور قلب کیا۔ اس کے تاثرات کیا ہیں اور اسکی بے تابیاں کیا

وہ کب پیدا ہوتے ہیں اور یہ کس وقت، لیکن جہاں یہ ہوش جاتا رہا تو پھر یہ خبر بھی نہیں ہوتی کہ دل کہیں تھا۔ اگر تھا تو اب وہ کہاں ہے۔ آہ! شہاب! اگر کبھی تم محبت کرنے لگو تو خدا جانے کیا ہو جاؤ۔"

جذبات کے دریا کے بند جب ٹوٹتے ہیں تو انھیں کوئی روک نہیں سکتا اور عموماً ہوتا یہی ہے کہ یہ بند کسی نہ کسی بہانے ٹوٹتا ضرور ہے۔ اور جب ٹوٹتا ہے تو سامنے آنے والی کوئی چیز اس کی زد کے آگے ٹھہر نہیں سکتی۔ ایک ہستی فنا ہوتی ہے اور دوسروں کی ہستی کی فنا کے سامان پیدا ہو جاتے ہیں، ایک شعلہ اٹھتا ہے اور اس کی تپش نہ جانے کیسے کیسے اپنی لپیٹ میں لیتی ہے۔ شہاب کی سرگزشت، والی سکینہ اور شاعر کا انجام والے طفیل، رقیہ اور حمیدہ اسی آگ کے جلائے اور مٹائے ہوئے ہیں۔ لیکن ان کے ذکر سے پہلے محمود کے طوفان کی ایک جھلک اور دیکھ لیجئے۔

"اگر میری دعا مقبول ہوتی تو میں تمہارے اس لمحۂ الوہیت کے گزر جانے کے بعد خدا سے التجا کرتا کہ الٰہی شہاب کو انھیں میں سے کسی پیکر سنگین کی محبت میں اسقدر شدت کے ساتھ مبتلا کر دے کہ وہ دیوانہ وار اس پتھر کی صورت کے سامنے جبیں سائی کرے۔ وہ فریاد کرے اور کوئی سننے والا نہ ہو۔ وہ محبت سے چیخ چیخ اٹھے اور کسی کو خبر نہ ہو۔ وہ رو رو کر طوفان نوح برپا کر دے لیکن کوئی اس کے آنسوؤں کا پونچھنے والا نہ ہو تاکہ میں اس وقت نصیحت کروں کہ شہاب حسن کو صرف حسن کے لحاظ سے چاہو۔ محبت کو صرف محبت کی نگاہ سے دیکھو۔ یہ بے قراری کیوں ہے؟ یہ اضطراب کس لئے ہے؟ تمہارا ذوق نظر پورا ہو رہا ہے، تمہاری نگاہیں اچھی طرح آسودہ ہو رہی ہیں۔ پھر اور تمہیں کیا چاہیئے۔ سچ بتاؤ شہاب کیا ہو، اگر واقعی تمہیں کسی مجسمہ یا تصویر سے عشق ہو جائے، کم از کم مجھے تو بڑا لطف آئے۔"

سکینہ جو محمود کے انتظار میں فراق کی گھڑیاں گن گن کر کاٹ رہی ہے اسے خط لکھتی ہے تو اپنی بے قراری کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتی:

"خدا جانے گھبرا کے کتنی مرتبہ ارادہ کیا کہ میں بھی آ جاؤں۔ میں جانتی ہوں کہ نہیں جا سکتی۔ میں سمجھتی ہوں کہ تم تک نہیں پہنچ سکتی، لیکن جی یہی چاہتا ہے، دل اس کے لئے بے قرار ہے ...."

اپنے ایک اور خط میں ایک گزری ہوئی کیفیت کا حال یوں بیان کرتی ہے،

"ایک دن آپ نے مجھ سے پوچھا تھا "تم کھوئی ہوئی سی کیوں رہتی ہو؟" میں اس وقت کوئی جواب نہ دے سکی کیونکہ زبان کی جنبش بھی میرے قابو سے باہر تھی۔ لیکن اب بتاتی ہوں کہ آپ کو پالینے کے بعد میں خود کھو گئی تھی ...... پھر آپ کو یاد ہے کہ میری یہ بے خودی کب تک قائم رہی؟"

سکینہ کی بیقراری میں، اس کے کھوئے ہوئے سے رہنے میں، اور پھر کسی کو پالینے کے بعد خود کھو جانے اور نہ جانے کب تک اس عالم بے خودی میں رہنے میں جو اضطراب، جو تڑپ ہے، اس پر سکون کا سایہ ہے لیکن یہ سکون بھی حقیقت میں اضطراب ہی کا ایک پہلو ہے اور اس لحاظ سے سکینہ کی تعمیر میں بھی وہی آب و گل صرف ہوا ہے جس نے شہاب، محمود اور اختر اور افضال کے پیکروں میں اضطراب کا خون دوڑایا۔

طفیل کے کردار میں اس اضطراب، حرکت، ہلچل اور تڑپ نے ایک اور انداز سے جگہ پائی ہے:-

"طفیل سے زیادہ خوش زندگی بسر کرنیوالا اور اس سے زیادہ اپنے اوقات کو لطف مسرت میں گزارنے والا اور کوئی نہ تھا۔ کہ ہر جذبہ صرف اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ پورا کیا جائے اور اسی کا نام زندگی ہے۔ اس کے ہاں ماضی و مستقبل کا مفہوم کوئی نہ تھا۔ وہ صرف حال کو دیکھتا اور چاہتا کہ ہر ممکن صورت سے اس کو کام میں لایا جائے ......"

شہابؔ کی سرگزشت کے آخری چند فقرے اسی کے بیان پر ختم ہوتے ہیں :۔

"طفیل نے آخری مرتبہ بمبئی کی ایک مشہور رقاصہ سے تعلق پیدا کرکے اُس کو بھی تباہ و برباد کردیا ہے، لیکن ابھی تک اُس سے تعلق قائم ہے کیونکہ چند قطرے خون کے ابھی اُس میں اور باقی ہیں اور نہیں کہا جاسکتا کہ اب اُن کے نچوڑنے کے لئے کس قسم کا نشتر استعمال کیا جارہا ہے۔"

طفیلؔ کی طبیعت کا اضطراب دوسروں کو تباہ کرنے کے بہانے ڈھونڈتا اور موقع تلاش کرتا ہے اور "شاعر کا انجام" کی رقیہؔ کے لئے افضالؔ کا حسن عالم آشوب تباہی کا بہانہ ہو جاتا ہے :

"اس کے درد مند سینے کو شفق ہو جانے کے لئے صرف ایک حیلہ درکار تھا اور آخر کار وہ حیلہ اُسے گھر بیٹھے ہاتھ آگیا"۔

ناول میں رقیہؔ کا تعارف ان الفاظ میں کردیا گیا ہے :۔

"رقیہؔ، ایک دولت مند خاندان کی ناز پروردہ لڑکی، اثراتِ تعلیم کی وجہ سے نہایت فہیم، بے باکانہ خصائل سے متصف، حسنِ صورت کے ساتھ جذباتِ لطیف سے مالا مال، عنفوانِ شباب کے ناقابلِ ضبط جوش سے مہیج سینہ رکھنے والی، شاعرانہ کیف کی مبہوت وارفتگیوں سے مزہ لینے والی، یوں ہی اپنے مست و مخمور قدموں سے آمادہ ہلاکت تھی کہ دفعتاً افضالؔ کا حسن عالم آشوب......"

"اُسے یہ کیا خبر نہ تھی کہ حصولِ مقصود کے بعد شباب کی لذات منقبض کیا پُر لطف انبساط، کیا پر مزہ انتشار چاہتی ہیں۔ رقیہؔ کو چاہنے اور چاہے جانے کی لذتوں سے صرف خیالی آگاہی تھی اور اسی لئے اس غریب کو کیا خبر تھی کہ محبت صرف ایک پسندیدگی نہیں ہے، بلکہ وہ ایک پرستش ہے بیتاب ایک لذت ہے مضطرب، ایک لطف ہے بے قرار......"

رقیہؔ کا حال بیان کرتے ہوئے نیازؔ نے محبت کو پرستش بیتاب، لذتِ مضطرب اور لطف بیقرار کہہ کر محض ایک کردار کے احساس کی ترجمانی نہیں کی۔ حقیقت میں یہی احساس اور اسی احساس کی شدت ہے کہ وہ ایک خاص طرح کے فلسفے کی واضع اور خالق بنی ہے اور اس کی گونج کہانی کے کردار ہر موڑ پر سنائی دیتی ہے، کرداروں کے مکالمے اسی فلسفے کی لڑیاں جوڑ کر اُسے مربوط زنجیر بناتے ہیں، کہانی میں پیش آنے والے واقعات میں اسی کا عکس دکھائی دیتا ہے اور حسنِ فطرت اسی کے نغمے گاتی اور دلوں کو وجد میں لاتی ہے، شاعرانہ فکر، شاعرانہ نغمے اور شاعرانہ تخیل کا یہ فلسفہ جس جس رنگ میں ابھرتا، نمایاں ہوتا اور نظر کے سامنے آتا ہے۔ اس کی پرورش، رومانی جوش، اضطراب اور بے تابی کی آغوش میں ہوتی ہے۔

'شاعر کا انجام' میں یہ فلسفہ کس کس طرح سامنے آتا ہے :

"محبت! محبت! ایک جذباتِ فانی کا انعکاس، داعیاتِ شباب کا ایک فوری جوش، سیلاب خواہشات کا ایک موقت مد"

"وہ سمجھتا تھا کہ حسن و محبت ایک چیز ہے۔ وہ جانتا تھا کہ آنکھیں بارِ اُلفت سے دبی ہوتی ہیں، ورنہ جھکی ہوئی کیوں ہوں؟ وہ باور کرتا تھا کہ ایک لطیف سینہ کی تمنائیں محبت کی مختلف صورتیں ہیں......

وہ یقین کرتا تھا کہ عورت نام ہے عشق کا اور اس کی ادائیں اسی عشق کا نطق ہے۔"

اور اس سے بھی زیادہ شہابؔ کی سرگزشت، میں قدم قدم پر اس کے جلوے نظر آتے ہیں :۔

"محبت سے لذت جدا نہیں ہوتی اور اگر ہو جائے تو محبت نہیں"

"محبت نام ہے ایک بے غرض انہماک کا، ایک خود فراموش محویت کا جو پیدا ہو حسن کو دیکھ کر، خواہ وہ حسن ظاہری ہو یا باطنی ۔"

"یہی جذبہ ہے کبھی حقیقت میں تبدیل ہو جاتا ہے، یعنی مادّی محبت روحانیت اختیار کرتی ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب محبت ناکام و نامراد ہو۔"

"محبت کا وجود کہیں نہیں ہے اور اگر ہے تو ایسی جگہ جہاں ہر شخص کی رسائی ممکن نہیں۔"

"محبت جو ظلم کی طرف سے دل میں پیدا ہو جاتی ہے اس کا مداوا ممکن نہیں"

"دُنیا جس چیز کو حُسن سمجھتی ہے وہ اکثر و بیشتر صرف ملمع ہے اور محبت ریاکاری۔ ہم میں کم ایسے ہیں جو حُسن کو جسارت و فریب سے جُدا کر سکیں اور محبت کو نمود و تصنع سے۔"

"تباہیاں محبت سے پیدا ہوتی ہیں، دوستی سے نہیں۔ محبّت ہماری بصارت سلب کرتی ہے اور دوستی ہماری روح کو منوّر بنا دیتی ہے۔ وہ دعوتِ خسران ہے اور یہ کسب فیضان"

"جوانی کو اپنی سرشاریوں کا علم اس وقت ہوتا ہے جب ہر شام اسے انتظار نظر آنے لگے اور ہر رات آغوشِ بیدار"

"جوانی! آہ وہ جوانی جس کی لذتوں، جس کی کیفیتوں کا بیان الفاظ سے ممکن نہیں، جس کی حقیقت کا اندازہ صرف اِسی وقت ہو سکتا ہے جب وہ کسی کو حاصل ہو، جس کے نشہ کا کیف وہی جان سکتا ہے جس نے اس شراب کو پیا ہو۔ کس قدر جی چاہتا ہے کہ یہ اپنے قابو میں ہو۔ آئے جس وقت اس کا جی چاہے، لیکن جائے اس وقت جب ہم چاہیں۔

یوں تو وہ کون ہے جس پر شباب اور کیفیاتِ شباب طاری نہیں ہوتیں لیکن سچ پوچھئے تو جوانی اُسی شخص کی ہے جس نے اسے بُری طرح ضائع کیا۔ دنیا میں اگر کوئی چیز ضائع کرنے کی ہے تو وہ جوانی ہے اور یہی وہ بربادی ہے جس کے خیال میں بھی قریب قریب وہی لذت ہے جیسی نفس کی تباہی میں۔ لوگ کہتے ہیں کہ جوانی سے زیادہ قیمتی کوئی چیز نہیں، اور اس لئے اس کی حفاظت ضروری ہے۔ میں کہتا ہوں یہ قیمتی ہی صرف اس لئے ہے کہ اس کی حفاظت نہیں ہو سکتی اور اگر کوئی اس کو محفوظ رکھ سکے تو وہ جوانی نہیں بلکہ کچھ اور بَلا ہے۔

نیاز نے اپنی دونوں کہانیوں میں اپنے کرداروں کی مزاجی کیفیت اور ان مزاجوں سے پیدا ہونے والے فلسفۂ حیات کے اظہار کے لئے خلش بے تابی، ہیجان، بے اختیاری، خود فراموشی، تپشِ نظارگی، مضطرب تخیلات۔ حیاتِ تند۔ شوقِ فراواں۔ مسرتِ وارفتگی، آمادۂ ہلاکت، پژمردہ انتشار سیلابِ خواہشات، خود فراموش محویت، حسن کی جسارت۔ جوانی کی سرشاری اور شباب کا ناقابلِ ضبط تہیج جیسے الفاظ اور ترکیبیں استعمال کی ہیں۔ ان سب

الفاظ اور ترکیبوں کی بنیاد مصنف کے پرجوش اور اضطراب انگیز رومانی تخیل اور ایسے فلسفہ حیات پر ہے جو رنگین شعریت کا تابع ہے، جو ذہن کے بجائے قلب کی گہرائیوں سے ابھرا ہے اور جس میں فکر نے ایک لمحے کے لئے بھی جذبے کی جدائی گوارا نہیں کی۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان ناولوں کے پورے فن پر جس میں سیرت کشی کے علاوہ، واقعات کا بیان، فضا اور منظر کی مصوری، کرداروں کے مکالمے اور مصنف کے تبصرے سب چیزیں شامل ہیں،

ان میں وہ گہرائی ہے جو فلسفیانہ غور و فکر کے بغیر ممکن نہیں ہوتی اور وہ دل کشی اور دل نشینی ہے جو اکثر اوقات دلدوز، دل گداز اور دل ستاں بنتی ہے اور بغیر جذبے کی شدت کے پیدا نہیں ہوتی۔ اس فن میں فلسفہ آمیز شاعری اور رومان آمیز فلسفے کی یکساں اہمیت ہے۔ کہانی میں مختلف موقعوں پر جس تاثر کا آغاز فلسفے سے ہوتا ہے اس کا انجام شعر پر ہوتا ہے۔ جو کچھ فلسفہ کرنا چاہتا ہے۔ اُسے شاعری پورا کرتی ہے۔ حقیقت اور شعریت ہر جگہ ایک دوسرے میں جذب نظر آتے ہیں۔ افسانہ نگار کسی واقعہ کا ذکر کرنا چاہتا ہے تو اس کی تفصیل بیان کرنے سے پہلے اس کے گرد شاعرانہ تصورات کا ہالہ بناتا ہے۔ شاعرانہ تصورات احساس اور تخیل کی دنیا میں ہلچل مچاتے ہیں۔ اور موقلم حسین تصویریں بنانے میں مصروف ہو جاتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ واقعہ نگاری اصل میں شاعرانہ بیان کا دوسرا نام ہے، اور اس شاعری کو حسین سے حسین تر بنانے میں مناظر فطرت کا حسن، شہری زندگی کی گہما گہمی، محبوبوں کی ادائیں اور عشوہ طرازیاں اور ان عاشقوں کے دلوں کی دھڑکنیں مصنف کی شاعرانہ سازش میں اس طرح شریک ہیں کہ جیسے حسن و جاذبیت اور رومان و اضطراب کے ان مرقعوں کی تخلیق کی ذمہ داری تنہا افسانہ نگار پر نہیں بلکہ ان میں سے ہر ایک پر ہے۔ اب اس طرح کے چند مرقعے ملاحظہ کیجیے

پہلا مرقع شہاب کی سرگزشت کا ہے کہ جہاں شہاب کا دلِ دیوانہ اور فطرت کے ان گنت حسین و جمیل مناظر باہم مل کر اس مرقع میں رنگ بھرتے ہیں۔

شہاب اختر سے مخاطب ہے :-

” اختر صاحب ! یہ کھیل کھیلنے کے لئے اب دل کہاں سے لاؤں ؟ ایک تھا سو اس کا حال یہ ہے کہ اب یہ بھی خبر نہیں کہ وہ ہے کہاں۔ آسمان کو دیکھتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ شاید اس نیل میں ڈوب کر رہ گیا ہے۔ سمندر کو دیکھتا ہوں اور خیال ہوتا ہے کہ شاید اس کے تلاطم امواج میں مل گیا ہوگا۔ شفق نظر آجاتی ہے تو گمان ہوتا ہے کہ کہیں اس رنگ میں نہ تحلیل ہو گیا ہو۔ چاند اپنی چاندنی پھیلا دیتا ہے میں کوشش کرتا ہوں کہ کہیں اس فرشِ سمیں میں کوئی شکن نظر آجائے تو سمجھوں کہ دل یہیں ہے۔ جب بہار اپنی شگفتگی چاروں طرف منتشر کر دیتی ہے تو خیال ہوتا ہے کہ ہر ہر پھول اور پھول کی ہر ہر پنکھڑی میں دل ملفوف ہے۔ تیتری اڑتی ہوئی گذر جاتی ہے تو میں تڑپ جاتا ہوں کہ یہ کہیں ٹھہرتی تو میں اس کے پروں کے غبار رنگ سے اس آوارہ ہو جانے والے کا پتہ پوچھتا۔ بھنبھیری اک اضطراب بنی ہوئی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ میں کہتا ہوں ذرا بھی نگاہ قائم ہو تو اس رعشہ پرداز سے لے جانے والے کا سراغ لگاؤں :-

یہاں حسن فطرت کا اضطراب اور دلِ عاشق کا اضطراب ایک دوسرے میں جذب اور حل ہو رہے ہیں۔ لیکن نظر نیلگوں آسمانوں، متلاطم سمندروں، شفق کی سرخیوں، بہار کی شگفتگیوں اور تیتری کے غبار رنگ سے ہٹ کر حسن ارضی کے نظاروں میں گم ہوتی ہے تو اس کی بے تابی اور بے قراری اس سے بھی زیادہ ہوتی ہے :-

محمود اور طفیل تھیٹر میں بیٹھے ہیں۔ پردہ اٹھتا ہے اور :-

” اختر اپنی تمام رعنائیوں اور دل ربائیوں کے ساتھ...... نمودار ہوتی ہے۔ اس کی ساری کا وہ زرکار پلّو جو روشنی میں اپنے اندر بجلیاں لئے نظر آتا ہے، سر پر پڑا ہوا ہے اور اس کی ضو سے پیشانی پر پیدا ہونے والی روشن لرزش دلوں کو مسحور کر رہی ہے۔ وہ تمام تر شاہانہ اداؤں کے ساتھ اُس کی قامت کی رعنائی وہ یکسر

برق پاش کیفیتوں کے ساتھ اس کی آنکھوں سے چھلک پڑنے والا تبسم۔ وہ بیک وقت جاں فرسا و حیات بخش اثرات کے ساتھ چہرے کے رنگ میں امتزاجِ شعلہ و بلور۔ وہ تمام ممکن التہاب کے ساتھ ایک ایک عضو سے لپٹ جانے والا شباب۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ دنیا سے آثارِ حیات مٹا دینے کی قسم کھا کر آئی ہے اور ادھر دنیا بھی اس کے قدموں پر جان دینے کے لئے اشارے کی منتظر ہے"

منظر ساحل اپالو کا ہے :-

"وہ ہلکی ہلکی ریشم کی ساریاں اور ان ساریوں کے آنکھوں کو خیرہ کرنے والے زرکار پلو، وہ صدف ہائے کانوں میں رنگین رخساروں سے چھو کر کانپ کانپ اٹھنے والے آویزے اور ان آویزوں کے وہ درخشاں و تابناک الماس۔ وہ پیشانیوں کی محدود و مختصر فضا میں ناقابل شمار اداؤں سے گیسو کی آرائشیں اور ان آرائشوں کی وہ مبہوت و دیوانہ بنانے والی نکہت باریاں —— یہ معلوم ہوتا تھا کہ آج یہ قطعۂ زمین پر لگا کر اڑ جائے گا"

ی ساحل پر جب شہاب نے پہلی مرتبہ اختر کو دیکھا ہے تو اس رنگ میں :-

"اختر کے سالونے رنگ میں یہ خصوصیت اور زیادہ قیامت خیز تھی کہ جس قدر زیادہ غور سے دیکھا جاتا اتنا ہی وہ کھلتا ہوا نظر آتا۔ یہاں تک کہ بعض دفعہ تو یہ معلوم ہوتا کہ اس میں بجلیاں کوٹ کر بھر دی گئی ہیں اس کا جسم اس قدر نازک تھا کہ بعض دفعہ تو یہ اندیشہ ہوتا کہ اگر وہ ساحل پر کھڑی ہو گئی اور ہوا تیز چلنے لگی۔ تو اڑ کر سمندر میں گر جائے گی۔ جس وقت وہ یہاں آئی تو اپنی اڑنے والی ساری کے آنچل کو سنبھالتی تھی اور لچک جاتی تھی ...... اس کی پیشانی کی فراخی کا صحیح اندازہ نہ ہو سکتا تھا، کیونکہ بل کھائی زلفوں کے چھلوں نے اس کی وسعت کو چھپا رکھا تھا۔ لیکن اس میں بھی کوئی شک نہ تھا کہ اس کی پیشانی کا صندل گیسوؤں کی ناگنوں کو پوری طرح آسودہ کر رہا تھا....."

دو ایک تصویریں دل کی چھپی ہوئی کیفیتوں کی :-

پہلی تصویر "شاعر کا انجام" والی زبیدہ کے جذبات کی ہے :

"جب .... گرمی نہ تھی مگر اس کی کافوری پیشانی عرق آلودہ تھی۔ وہ گھڑی گھڑی اپنی انگشتِ شہادت کے ہلال سے ان قطرات کو زمین پر گرا گرا کے شہاب ثاقب کا منظر پیش کر رہی تھی۔ وہ پریشان بالوں کو رخساروں سے گھڑی گھڑی ہٹاتی، مگر آتشِ گل کا دھواں کہیں یوں ہٹتا ہے۔ وہ پھر آ کر سینے میں چپک کر رہ جاتے تھے۔ آنکھوں میں آنسو بھرے تھے، مگر موتیوں بھری صورت کا کوئی قدرداں و خریدار نہ تھا....."

شاعر کا انجام" کی ایک شاعرانہ تصویر اور :-

"رقیہ حیاتِ خجل کی شبیہہ، لذاتِ منفعل کی مجسم تصویر بنی ہوئی افضال کے روبرو بیٹھی تھی اور جھکی ہوئی نگاہیں، مائل نشیبِ مژگاں سے ملی ہوئی، دفترِ ندامت کا شیرازہ بنی ہوئی تھیں، آنکھوں میں پھیلا ہوا سُرمہ، دودِ مستی بنا ہوا صحبتِ دوشینہ کے پُرکیف قہقہائے مسرت پر روشنی ڈال رہا تھا۔ لبوں کی بیڑائی ہوئی، سُرخیاں ملی دلی پنکھڑیوں کی طرح مرجھائی ہوئی نظر آتی تھیں، اس کا کُندنی رنگ رات بھر کی حدتِ آغوش،

> سے اور بھی دمکنے لگا تھا۔ اُس کے رخساروں کا شہاب بس یہی معلوم ہوتا تھا کہ اب ٹپکنا ہی چاہتا ہے۔ چہرے کی نازک رگوں میں تبسم دوڑ رہا تھا، مگر آنکھوں تک آکر اس کھلی ہوئی آغوشِ ندامت میں پہنچ کر خدا معلوم کہاں غائب ہو جاتا تھا......"

3 JUL 19

مناظرِ فطرت کے یہ مرقعے، خارجی زندگی کے حقائق کی یہ تصویریں، حُسن و محبت کے سربستہ معزِ رازوں کی یہ داستانیں، دل پر گزرنے والی کیفیتوں کی یہ ترجمانیاں، مشاہدے کی اساس پر نہیں تخیل کی بنیادوں پر قائم ہیں۔ افسانہ نگار کے تخیل نے زندگی کے کسی ایک سیدھے سادے مشاہدے، تجربے یا احساس کو خیال کی رنگینیوں میں ڈبو کر ہر جگہ ایک ایسی صورت دی ہے کہ پڑھنے والا ایک خوابوں کی دُنیا میں، ایک سحر و افسوں کی دنیا میں، اور ایک پر کیف رومانوں کی دُنیا میں پہنچ جاتا ہے جہاں اُسے ایسے واقعات دکھائی دیتے ہیں جو اُس کی دیکھی بھالی دُنیا کے واقعات سے مشابہ نہیں ہوتے اور جہاں اُسے ایسے کرداروں سے سابقہ پڑتا ہے جن کے سوچنے، محسوس کرنے، عمل کرنے، بولنے چالنے، کہنے سننے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ متاثر ہونے اور تاثرات کو ظاہر کرنے کا انداز زندگی کے عام کرداروں سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ ان کے فلسفے میں شعر کا رنگ ہے اور انکی شاعری فلسفیانہ فکر کی طرف مائل ہے۔ یہاں احساس اور جذبے کی رو چلتی ہے تو تھمنے کا نام نہیں لیتی۔ اس کے بہاؤ میں ایسا زور اور ایسی روانی ہے کہ اُس کے جوشِ مضطرب اور سیلِ مُسلسل کو کوئی قوت روک نہیں سکتی۔ اور تخیل کی قوت اور جوش کا نتیجہ ہے۔ مصنف کے لئے ہر حسین منظر میں خواہ یہ منظر فطرت کے حسین و جمیل مظاہر کا ہو، خواہ کسی حسین و جمیل انسانی پیکر کا، خواہ جذبہ کی لطافت، نزاکت اور شوخی کا سرور و انبساط کا سرمایہ مہیا کرتا ہے۔ اس کے مشاہدے سے اس کے احساسات میں تموج اور جذبات میں اضطراب پیدا ہوتا ہے اور احساس و جذبے کے اس تموج و اضطراب سے شاعرانہ طبیعت اور رومانی مزاج میں اس حسین منظر کی مصوری کا ولولہ کروٹیں لیتا ہے۔ خیال کی رنگینی ولولے کی اِس آواز پر لبیک کہتی ہے اور حسین منظر کی مصوری کے لئے پُرشکوہ لفظوں، مترنم ترکیبوں اور خیال انگیز تشبیہوں کا ایک سیلاب اُبلنا شروع ہو جاتا ہے اور اس سیلاب کی رَو میں بہنے اور بہتے رہنے میں ایک ایسی لذت ہے کہ پڑھنے والا ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ یہ لذت اس سے چھین لی جائے۔

نیازؔ کا فن یا شاید یہ کہنا زیادہ صحیح ہو کہ ان دونوں ناولچوں میں نیازؔ کا فن اسی لذت کا فن ہے۔ لیکن اس لذت کے مہیا کرنے میں اتنی بہت سی چیزوں کا قصہ ہے کہ ہم اس فن کو شوقِ فراواں اور آرزوئے بے تاب کا فن بھی کہہ سکتے ہیں اور کلیوں کی نیم خوابی اور پھولوں کی بیداری کا فن بھی۔ یہ نغمۂ مسرت کی جھنکار کا فن بھی ہے اور سوز و گداز کی خاموش پکار کا فن بھی۔ یہاں فلسفہ شعر کا تابع ہے اور منطق کا ہر قدم تخیل کی رہنمائی میں آگے بڑھتا ہے۔ اور یوں یہ فن فکر کی سنجیدگی سے زیادہ تخیل کی رنگینی اور جذبے کے شوق، اضطراب اور بیتابی کا فن بنتا ہے۔ یہ فن حقیقت کی رنگینی اور جذبے کی دُنیا میں رہ کر اُن عواقب سے بے خبر اور بے نیاز ہے جو انسان کی بربادی کا پیش خیمہ بنتے ہیں شوق کی اسی فراوانی اور اضطراب کی اسی شدت نے اس فن میں انتشار کی ایسی تیزی پیدا کی ہے کہ قاری کا ذہن کبھی کبھی اس دوڑ میں پیچھے رہ جاتا ہے۔ لیکن واقعات اور اتفاقات، کرداروں کے خیالات اور جذبات اور اس سے بھی زیادہ اُنکی رفتار، گفتار اور عمل و ردِ عمل میں اِس تیزیٔ رفتار کی موجودگی کے باوجود قاری ناول پڑھتے وقت کسی جگہ یہ نہیں محسوس کرتا کہ جو دُنیا افسانہ نگار نے اپنے ناولوں میں بنائی ہے۔ اس میں اس کے لئے کسی طرح کی اجنبیت ہے، اس معنی میں کہ ناول کسی نہ کسی صورت میں اس کے لئے دلچسپی، لطف، انبساط اور ذہنی نشاط کا سامان فراہم کرتا ہے۔ ناول میں برابر تحیر کے موقعے اور محل پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ حل طلب معمے برابر اس کے سامنے آتے رہتے ہیں اور یوں اسے برابر گرہیں کھولنے میں مصروف رکھتے ہیں۔ پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں اور مناسب موقع اور محل پر دُور ہوتی رہتی ہیں۔ ایسی لطیف باتیں بھی کہی جاتی ہیں جو بعض اوقات بے حد الجھی ہوئی ہوتی ہیں۔ لیکن ان باتوں میں کوئی نہ کوئی صورت بھی نکلتی رہتی ہے کہ پڑھنے والے کا

ذہن تھوڑی سی کاوش سے انھیں سلجھا لیتا ہے اور یہ بات اس کے لئے بڑی تسکین اور خوشی کی ہوتی ہے کہ کہانی کے تخلیقی عمل میں اُس نے بھی تھوڑا سا حصّہ لیا ہے۔

شہاب کی سرگزشت’ اور ایک شاعر کا انجام’ کے انجام کی ایک بڑی خوبی جسے ناول نگار کے نازک فنی احساس و ادراک کا نتیجہ سمجھنا چاہیئے یہ ہے کہ ان دونوں ناولوں کی پوری فضا اس کے باوجود کہ خیالی ہے قاری کو یہ محسوس کرنے کا موقع نہیں دیتی کہ اس کی نظر کے سامنے جو واقعات گزر رہے ہیں وہ محض شاعرانہ ہیں یا ان ناولوں کے کردار جو کچھ بولتے اور کرتے ہیں اس کا انداز عام انسانوں کی گفتار و رفتار سے مختلف ہے۔ نیاز نے فلسفے، تخیّل اور شاعرانہ احساس اور بیان کی مدد سے دونوں ناولوں کو حقیقت شعری کا ایسا حسین و جمیل، ایسا موثر اور دل نشین مرقع بنایا ہے کہ پڑھنے والے پر برابر ایک طلسم و افسوں کا سایہ رہتا ہے اور وہ اپنے آپ سے یہ سوال کئے بغیر کہ ایسا کیوں ہوا اور ایسا کس طرح ہوا ہر بات کو دل میں جگہ دیتا اور بے یقینی کو یقین میں بدلتا چلا جاتا ہے۔ نیاز نے اپنے فن کی بنیاد "کیا ہو سکتا ہے" کے بجائے "کیا ہونا چاہیئے" پر رکھی ہے اور قاری کو اپنی فنی چابک دستی سے اس طرح اپنا ہم خیال بنایا ہے کہ خیال کی اس دُنیا کو جہاں فلسفہ بھی شعر کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے، وہ حقیقت کی دُنیا سمجھ کر اس میں چلتا پھرتا اور اس دُنیا کے مشاہدات و تجربات کو حقیقی مشاہدات و تجربات سمجھ کر ان سے متاثر ہوتا ہے۔

نیاز فتحپوری نے اپنے شاعرانہ تخیّل کی قوت سے دو ایسے ناولوں کی تخلیق کی ہے جن میں حقیقت اور رومان کا بڑا لطیف امتزاج ہے، جہاں فلسفہ، نفسیات اور منطق نے ایک حد تک اپنا اپنا منصب ادا کر کے خود کو شاعری کے حوالے کر دیا ہے۔ یہاں کرداروں کے ساتھ زندگی میں ایسے واقعات پیش آتے ہیں کہ انھیں سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ واقعات کی رَو انھیں کشمکش میں مبتلا کرتی ہے، لیکن بالآخر فیصلہ دل کے ہاتھ رہتا ہے۔ کردار چلتا اسی راستے پر ہے جدھر اُس کے جذبے کا جھکاؤ ہے۔ یہ کردار گفتگو شروع کرتے ہیں فلسفیانہ انداز میں، لیکن یہ فلسفہ اپنے اظہار کے لئے ہمیشہ شاعرانہ اسلوب کا سہارا ڈھونڈتا ہے اور اپنی تاثیر کے لئے شاعرانہ ترکیبوں، شاعرانہ لفظوں شاعرانہ تشبیہوں اور اشاروں کنایوں سے مدد لیتا ہے۔ کرداروں پر کبھی کبھی یہ کیفیت بھی طاری ہوتی ہے کہ وہ اپنا تجزیہ خود کرتے ہیں لیکن تجزیے کا یہ راستہ اختیار کر کے بھی بالآخر پناہ انھیں وہیں ملتی ہے جہاں دل کی دھڑکنوں کی آواز ہر آواز پر غالب آتی ہے۔ کرداروں کا زیادہ وقت عمل سے زیادہ گفتگو میں صرف ہوتا ہے اور اس گفتگو میں بات پوری دلیلوں کے ساتھ کہی جاتی ہے۔ باتوں کی زنجیر منطقی فکر کی کڑیوں سے جڑتی اور بنتی ہے لیکن اس زنجیر میں جھنکار شعر کی سنائی دیتی ہے۔ باتوں میں معمّوں کا رنگ ہوتا ہے۔ لیکن یہ معمے کہانی کو فکر انگیز بنا کر اس میں زیادہ دل کشی پیدا کرتے ہیں۔ یہاں فلسفیانہ باتیں ادیبوں اور شاعروں کی زبان میں کہی جاتی ہیں گفتگو میں سوال و جواب کا تیکھا پن پڑھنے والے کو برابر اپنی طرف متوجہ اور اس کے ذہن کو پوری طرح بیدار رکھتا ہے۔ سوال جواب قاری کے تخیّل کے لئے تازیانہ بھی بنتے ہیں اور لفظوں کے استعمال کی چابک دستی اس کے نشاط کی کیفیت کو مستقل بناتی ہے۔

دونوں ناولوں میں ایسے واقعات پیش آتے ہیں جو صرف خوابوں کی دُنیا میں پیش آ سکتے ہیں۔ ان واقعات کے بیان میں شاعرانہ مبالغے سے کام لیا جاتا ہے لیکن یہ شاعرانہ مبالغہ کہانی کی اس مجموعی فضا سے ہم آہنگ ہوتا ہے جو خیال کی شوخی اور ثروت نے بنائی ہے۔ فضا کا یہ کیف کہیں کسی جگہ کم نہیں ہوتا۔ ہر چیز پر طلسم و افسوں کا سایہ ہے۔ ہر تصویر میں قوس قزح کے رنگ ہیں اور اس طلسم و افسوں کی دُنیا اور قوس قزح کے ان رنگوں کی مصوّری شاعرانہ زبان کے موقلم سے ہوئی ہے۔ لفظوں اور ترکیبوں کا حُسن اپنی طرف کھینچتا ہے۔ حُسنِ تعلیل کی جدّتیں نئی سی نئی تاویل کی صورتیں پیدا کرتی ہیں۔ خیال کی رنگینی اور جذبے اور احساس کا جوش اور زور ہر آن ایسے بیان کا طالب ہوتا ہے جو صرف لفظوں کو سب کچھ سمجھے، جو معنی کے حسن کو لفظوں کے غازے سے نکھارے، اور جو تصوّر کے سامنے ہر گھڑی تازہ بہ تازہ نقش بنائے اور

انھیں ایسے رنگوں سے سجائے جن کی شوخی برابر بڑھتی رہے۔ ان ناولوں میں خیال میں جو زور اور جذبے میں جو جوش ہے سادگیٔ بیان اس کا ساتھ نہیں دے سکتی اس لئے نیازؔ نے اس کے لئے ایسا اسلوب وضع کیا ہے جو کہانی کا اسلوب نہ معلوم ہونے کے باوجود اس لئے پڑھنے والے کے دل میں گھر کرتا ہے کہ یہ اسی زور اور جوش کا پیدا کیا ہوا ہے جو ان کہانیوں کی رگ و پے میں سمایا ہوا ہے، جو اس کے رواں دواں لہو میں دوڑ رہا ہے اور جس سے برابر اس کی نبض کی رفتار کی تیزی بڑھتی رہتی ہے۔

جس طرح "شہاب کی سرگزشت" اور "ایک شاعر کا انجام"، نے ایک ایسے دور میں جب کہانی تیزی سے زندگی کی سچائی کو اپنانے کی طرف قدم بڑھا رہی تھی، رومان کی روایت کے پرچم کو اونچا کیا اور فن کے اس مسلک کی قیادت کا صحیح حق ادا کرکے اس تصور کو تقویت دی کہ کہانی محض حسنِ خیال کی جنم دی ہوئی حقیقتوں کو حقیقت سمجھ کر اور اس حقیقت کو شعر و نغمہ کی زبان دے کر بھی دلوں کو تسخیر کر سکتی ہے اور یوں رومان حقیقت سے بھی زیادہ مؤثر اور دل نشیں بن سکتا ہے —— "شہاب کی سرگزشت" اور "ایک شاعر کا انجام" کہانی کی روایت میں رومانی تصورات کے فن کے سنگ میل اور روشن مینار ہیں۔

"میں آپ کو بتاؤں کہ افسانے کے ضروری اجزا کیا ہیں۔ ایک ...... کسی واقعہ میں بحیثیت واقعہ
ہونے کے واقعیت کا پایا جانا۔ دوسرے نفسیاتی طور پر کسی کردار یا سیرت کو نمایاں کرنا اس کو انگریزی میں
characterisation کہتے ہیں۔ تیسرے پلاٹ کو اتنا اور ایسے اجزاء میں تقسیم کرنا کہ
پڑھنے والے کو ایک سے زاید خلاء خود اپنے ذہن سے پُر کرنا پڑیں۔ چوتھے ہلکا
سا مزاح۔ خواہ وہ الفاظ سے پیدا کیا جائے یا مفہوم سے — اگر پلاٹ
میں کوئی کیفیت رومان کی پیدا کرکے تھوڑا سا تمثیلی رنگ Dramatic
touch دے دیا گیا تو اور زیادہ دلچسپی پیدا ہو جائے گی۔
کسی ایک مسئلہ پر مکالمے میں صفحات رنگین کر دینا خلافِ
آئین افسانہ نگاری ہے۔ یہ درست ہے کہ بہترین افسانے
وہی ہوتے ہیں جن میں ٹریجڈی کا عنصر غالب ہو۔
لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ اس کو ایک
مستقل عذاب کی طرح سر پر نازل کر دیا جائے
کہ ایک خاندان کی تباہی دکھانے پر
آئے تو باپ کو ہیضے میں مبتلا کرکے فنا کر دیا۔ ماں
کو طاعون سے ہلاک کرا دیا۔ بھائی کو
سانپ سے ڈسوا دیا اور بہن کو
کنوئیں میں ڈھکیل کر
ختم کر دیا۔" (نیاز)

نیاز کا ایک ناولٹ

ڈاکٹر سید شاہ علی

ناولٹ کی حیثیت سے "شاعر کا انجام" جتنی خام تصنیف ہے اتنی ہی پختہ اور کامیاب "شہاب کی سرگزشت" ہے، زبان و بیان اور خیالات کے لحاظ سے بھی اور تکنیک کے اعتبار سے بھی۔ یہ وہ شاہکار ہے جسے سرت چندر چٹرجی کی دیوداس اور بھگوتی چرن ورما کی چترلیکھا کے ساتھ ایک طاق پر رکھا جاسکتا ہے۔ ان تینوں شہ پاروں کا موضوع عشق ہے۔ دیوداس کا عشق جذبات پرستانہ، لیلیٰ مجنوں کا سا مختل دماغ فنا فی العشق قسم کا ہے۔ چترلیکھا کا تیاگ یعنی بانٹ دو اور واپسی کی توقع نہ رکھو، والا اور شہاب کا نیم افلاطونی، یہ صحیح ہے کہ نیاز صاحب نے "شاعر کا انجام" کے خاتمہ پر عشق و محبت کی بحث چھیڑی ہے اور اسے "ایک جذبات فانی کا انعکاس، داعیات شباب کا ایک فوری جوش، سفلی خواہشات، ایک موقت مد" قرار دیا ہے اور نیاز کے علاوہ ان کے معاصرین کے یہاں بھی اس قسم کے خیالات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً خلیق دہلوی کے یہاں یہ جملہ "محمود، عورت شادی کے لئے ہے نہیں شاعری کے لئے ہے" (رقص ادبستان ۲۱۵) لیکن شہاب کی سرگزشت میں جس تفصیل اور ترتیب کے ساتھ اس نظریہ کی وضاحت اور تجزیہ کی سعی کی گئی ہے وہ ایک نادر چیز ہے اور افلاطون کے ان مکالمات کی یاد دلاتی ہے جو سمپوزیم کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ افلاطون کے سارے مکالمات میں یہ سب سے زیادہ متنوع اور مکمل ہے۔ اس میں افلاطون نے تاریخی، حقیقی اور فطری پہلو کو برقرار رکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور اپنے نظریے کو آسان ترین پیرایے میں انتہائی وضاحت سے پیش کیا ہے لیکن یہ قابل لحاظ ہے کہ نیاز فتحپوری نے باوجود اس کی ڈرامائی مکالمات (DRAMATIC DIALOGUE) کی ہیئت کو اپنانے کے، موضوع کے اعتبار سے صرف اس کے مرکزی خیال کو لیا ہے اور خصوصاً ہم جنسی رجحانات کا ذکر تک نہیں آنے دیا ہے، جو یونانیوں کے نزدیک جائز تھے۔ افلاطون نے عورت مرد کے عشق کو انتہائی کم درجہ اور محض جذبہ تولید کی خواہش کا نتیجہ بتایا ہے، لیکن نیاز نے یہ باریکی پیدا کی ہے کہ جس سے عشق ہو اس سے شادی نہ کی جائے ورنہ ساری گرم جوشی ختم ہو جائے گی، جو عشق کی موت کے مترادف ہے۔ افلاطون طبقۂ نسواں کو حقیقی عشق کا نااہل اور محض گھریلو زندگی کے قابل بتاتا ہے۔ افلاطون کی رائے میں عشق انسان میں خودداری اور قربانی کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ افلاطون مرد کے عورت سے ہو یا مرد سے جسمانی اختلاط کو قابلِ مذمت سمجھتا ہے۔ سمپوزیم کے ایک مقرر ارسٹافنیس کے مطابق ابتدا میں انسان میں تین جنسیں شامل تھیں، مرد عورت اور مشترک۔ خداؤں نے انسان کے غرور کی سزا کے طور پر انھیں کاٹ کے دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ اتحاد اور وصل کی فطری خواہش اسی اصل کی طرف مراجعت کی آرزو پر مبنی ہے اور انسانی عشق گم گشتہ مسرت کی بازیافت کی تمنا پر مشتمل ہے۔ اگیتھان کی تقریر جو لفاظی سے پُر ہے بقراط کے فلسفے سے مقابلے کا کام دیتی ہے۔ سقراط کی تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ عشق حسن اور سچائی کا متلاشی ہے۔ عشق مادی اور روحانی دنیا کی درمیانی کڑی ہے۔ عشق کی ماں افلاس ہے لیکن باپ کی طرف سے اسے جد و جہد ورثہ میں ملی ہے۔ سچا عاشق وہی ہے جو فلسفی یعنی دانائی کا عاشق ہے یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ عاشق بلکہ عام انسان بھی دونوں دنیاؤں سے تعلق رکھتا ہے۔ افلاطون کا سقراط کی زبانی یہ تجربہ مذہبی تجربہ سے بھی مطابقت رکھتا ہے زندگی ایک دور دراز لیکن دھندلی اچھائی کے لئے کوشاں ہے جس کا حصول باعث مسرت ہے۔ اگر انسان کو یہ شے حاصل ہوتی تو وہ انسان نہ ہوتا۔ اور اگر اس کی تڑپ نہ ہوتی تو وہ جانور ہوتا۔ جو چیز سقراط اور افلاطون کے نزدیک جہل یا نادانی ہے وہ مذہبی نقطۂ نظر سے گناہ ہے۔ ان فلسفیوں کی رائے میں غلط روی نادانی ہے اور کامل کردار کامل آگہی کا لازمی نتیجہ۔

لیکن عرفِ عام میں عشق محض جنس سے متعلق ہے۔ یہ اچھائی کا صرف ایک پہلو ہے اور لوگ چاہتے ہیں کہ اچھائی ہمیشہ ان کے تصرف میں رہے۔

لہٰذا اس قسم کے عشق کی بقائے دوام کا ذریعہ جنسی اختلاط ہے۔ . . . . جو نسلِ انسانی کی بقا کا بھی ذریعہ ہے لیکن جسمانی اختلاط عشق کا پست ترین عمل ہے اس سے کچھ برتر وہ لوگ ہیں جو اس اختلاط کا نتیجہ تو ہیں لیکن یونانی ہیروؤں کی طرح کارہائے نمایاں انجام دیتے ہیں۔ روحانی اختلاط اس سے بلند تر ہے جس پر فن، تہذیب اور سماج کی ترقی کا دارومدار ہے۔ یہ ترقی اعلیٰ دماغوں کے ازدواج سے منسلک ہے۔ جب انسانی روح کسی تخلیق یا انکشاف کی حامل ہوتی ہے تو وہ ایک ساتھی کی طالب ہوتی ہے۔ تاکہ اپنی روحانی اولاد کو جنم دے سکے۔ ساتھی کے انتخاب کے معاملے میں جسمانی حسن اثر انداز ہوتا ہے لیکن جب تک روحانی حُسن موجود نہ ہو یہ ازدواج زرخیز نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ ملحوظ رہے کہ افلاطون کی رائے میں طبقۂ نسواں غیر جسمانی تخلیقی عمل کا نا اہل ہے، لہٰذا یہ عمل مردوں تک محدود ہے۔ دانائی کا عاشق یا فلسفی مادی دُنیا سے بلند ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس کی ترقی کے مراحل یہ ہیں۔ جسمانی حُسن کے خاص نمونوں عام تک، پھر روحانی حُسن تک گو وہ جسمانی حُسن سے معرّی ہو اور اس طرح عام اخلاقی حُسن کی جانب اور آخر کار علم و آگہی کے حُسن تک جس کی مختلف شاخوں کے ذریعہ اس حُسن مجسم کے تصور تک رسائی حاصل ہوتی ہے جو کل کائنات کے بارے میں سچائی کی مکمل اور متحد آگہی بخشتا ہو۔ یہ مراحل ذہنی روحانی اور عاشقانہ سفر میں درپیش ہوتے ہیں اور مذہبی تجربات اور صوفیانہ الہامات کی طرح ناقابل بیان و ابلاغ ہوتے ہیں۔ البتہ سقراط کا سا روحانی رہبر مضمر تصورات اور انکشافات کی ولادت میں مدد دے سکتا ہے۔ ان مراحل سے گذر جانے کے بعد دانائی کا عاشق مادی قیود سے آزاد ہو جاتا ہے اور فانی نہیں حقیقی دُنیا میں زندگی بسر کرتا ہے۔ افلاطون کی جمہوریت کا مسافر بھی اسی قسم کے حالات سے دوچار ہوتا ہے۔

عام تصور کے برعکس افلاطون کی محبت کا اصل مفہوم، ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار دو ہم جنس افراد کی سچائی اور حُسن کی تلاش ہے۔ افلاطون کا اس طرح جذبۂ عشق کو فلسفی کی سچائی کی جستجو کے جذبے کے مترادف قرار دینا عجیب سا لگتا ہے، لیکن افلاطون کا قوانین اور اداروں کے حسین ہونے کا ذکر، علم النفس کے جدید نظریات کے مدنظر، جو غیر متوقع میدانوں میں جنسی جذبے کی کارفرمائی اور جسمانی خواہش کے ترفع کو نمایاں کرتے ہیں، اس قدر نرالا نہیں معلوم ہوتا، خصوصاً جب کہ مذہب اور تصوف میں بھی اسی قسم کی عاشقانہ اصطلاحات کا استعمال کیا جاتا ہے (مثلاً روح اور کلیسا کو حضرت عیسیٰؑ کا محبوب کہنا)۔ افلاطون نے سقراط کو دانشمندی کے عاشق کی حیثیت سے کامل ترین نمونہ قرار دیا ہے۔ سقراط کے یہاں بدصورتی اور روحانی حُسن کا امتزاج ہوا ہے باوجود ALCIBIADES کو پسند کرنے کے سقراط اس کے حُسن ظاہری سے اس قدر متاثر نہیں ہے جس قدر السیباڈس سقراط کے روحانی حسن کا دلدادہ ہے

افلاطون کے نظریۂ عشق کے اس سرسری جائزے کے بعد جو کچھ طویل سا ہو گیا ہے اگر ہم شہاب کی سرگزشت پر نظر ڈالیں تو یہ محسوس ہوگا کہ نیاز صاحب نے اسے جوں کا توں اپنی تصنیف میں پیش نہیں کیا ہے بلکہ اپنے ذاتی تاثرات، تجربات، مطالعات اور مشاہدات کا خلاصہ بھی اس میں شامل کیا ہے۔ جہاں تک شہاب کا تعلق ہے اس کا نازک اندام، قوی اعصاب اور بلند خیالی و الہامات کا مجموعہ ہونا، بدصورت و بدہیئت سقراط کے بجائے، نزاکت، مجسم گبن، اس کی فوجی تربیت اور مشہور تاریخی شاہ کار زوال رُوما کی یاد دلاتا ہے۔ البتہ محبت اور شادی کے موضوع پر اس کی اپنے دوست محمود سے بحث بالکل سقراطی انداز کی ہے۔ اگرچہ محمود شہاب کا ایسا ہی مستقل مصاحب ہے جیسا ڈاکٹر واٹسن، شرلک ہومس کا تھا، لیکن اس کا شہاب سے لگاؤ ایسا ہی ہے جیسا کہ السیباڈس کا سقراط سے ہے، یعنی ایک ناقابل بیان مقناطیسی کشش کا نتیجہ، البتہ اختر سے گفتگو میں وہ شہاب کو سب سے زیادہ محبت خلوص اور ایثار کرنے والا اور دانشمند مشیر قرار دیتا ہے ص ۱۰۲ ایک اور صریح مشابہت جو سقراط اور شہاب میں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ جس طرح غیر معمولی سقراط، اگیتھان کے یہاں عشق و محبت کے موضوع پر مذاکرے، مے نوشی اور رت جگے کے بعد صبح کو تازہ دم دوسرے دن کے معمولاتِ حیات میں منہمک ہو جاتا ہے اسی طرح شہاب بھی "جو کبھی سونے کا معمولی وقت گذر جانے کے بعد نہیں سوتا تھا، جاگتا رہا۔ اپنے کمرے میں دیر تک کرسی پر دراز ہو کر رات کے واقعات تماشہ کی کیفیات، وہاں کے کوائف و حالات پر غور کرتا رہا اور طلوعِ آفتاب سے ایک گھنٹہ قبل محمود کے لئے یہ تحریر میز پر رکھ کر کہ "آٹھ بجے تک سال چرچ گیٹ پر انتظار کروں گا" باہر نکل کھڑا ہوا۔" ص ۴۹۔ شہاب کی منظرِ قدرت، مصوری، موسیقی، رقص، مشاہدات حیات وغیرہ سے دلچسپی اور ان کا تجزیہ، افلاطون کے اس ابتدائی منزلِ عشق کو ظاہر کرتا ہے جب عاشق،

معشوق کے حسنِ ذاتی کے علاوہ، عام حسن سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت پیدا کر لیتا ہے۔ جس طرح افلاطون نے اپنے مذاکرے کو فطری اور تاریخی رنگ دینے اور مقرروں کے انتخاب میں بڑا اہتمام کیا ہے، اسی طرح نیاز صاحب نے اپنے کرداروں کو منتخب کرنے میں مختلف شعبہ ہائے کی نمائندگی کو ملحوظ رکھا ہے۔ اور بمبئی کی رنگا رنگ اور رواں دواں زندگی کو پس منظر بنا کے اپنے خیالات، نظریات اور تصورات کو واضح کرنے کی سعی کی ہے۔ یہ کردار ہیں: متین اور سنجیدہ فلسفی شہاب، اس کا دوست محمود جس کا "حسن فطرت صرف تجرد و بے تعلقی ہی کی حالت میں قائم رہ سکتا ہے" ص ۸۱ خیالی، فلسفہ عشق و عشرت کا قائل طفیل، اختر جو ایک اداکارہ ہے اور شہاب کی رائے میں بد تربیت کے باعث خطرناک ہے اور جو بالآخر اس کی تعلیمات کے زیر اثر اپنے پیشے سے توبہ کر کے ایک زنانہ مدرسہ کھول لیتی ہے اور محمود کی بیوی سکینہ جو ایک تعلیم یافتہ "لیکن گھریلو اور وفادار سرشت کی خاتون ہے۔ ان میں سب سے غالب آواز شہاب کی ہے جس کے سامنے سب لاجواب ہو جاتے ہیں اور حقیر نظر آتے ہیں۔ شہاب کا قوی اعصاب اور مضبوط قوت ارادی کو تو سقراط کی سیرت سے مشابہ قرار دیا جا سکتا ہے لیکن اختر کے ساتھ اس کی سخت کلامی اور محمود سے برہمی کے بعد اس انسانی عنصر کی نفی ہے، جو ہر انسانی کمال خصوصاً فلسفہ کی بنیاد ہونا چاہیئے۔ سقراط کا اپنی بدمزاج بیوی سے شگفتہ مزاجی کے ساتھ نباہ اس کے برعکس اوصاف کو ظاہر کرتا ہے، شہاب کو فلسفی ظاہر کرنے کے لئے، اس کے مختلف موضوعات پر مباحث کے ساتھ ساتھ اس کی تصنیف "الہامات" کا ذکر کیا گیا ہے، جو اس کے ناشر کی رائے میں خلل دماغ کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ کہیں افلاطون یا سقراط کے فلسفہ کی جھلک نظر نہیں آتی۔

نیاز صاحب مشہور امریکی فلسفی امرسن کے خیالات سے بھی (ESSAYS "LOVE-FRIENDSHIP" 1836/1841) متاثر معلوم ہوتے ہیں، لیکن اپنے مخصوص نظریے کے تحت اس سے بھی بازی لے جاتے ہیں۔ امرسن محبت اور دوستی کا مقابلہ کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ کہ دوستی کو محبت پر فوقیت حاصل ہے۔ کیونکہ محبت میں ناکامی انتقام کی آگ بھڑکاتی ہے اور دوستی بے غرض ہوتی ہے۔ .... نیاز صاحب نے شہاب کی زبانی اس موضوع پر یہ کہلوایا ہے۔ "ہاں وہ محبت جس سے میں اب بالکل بیزار ہو گیا ہوں اس قدر ہادم انسانیت ہے کہ دوستی کا وجود میرے نزدیک بہترین جذبۂ انسانی ہے ..... اور یہی وجہ ہے کہ تباہیاں محبت سے پیدا ہوتی ہیں، دوستی سے نہیں، محبت ہماری بصارت سلب کرتی ہے اور دوستی ہماری روح کو منور بنا دیتی ہے ...... لیکن میرا مقصود محبت سے وہ محبت ہے جو آج کل سمجھی جاتی ہے ورنہ محبت و دوستی ایک چیز ہے۔ ص ۲۷، ص ۲۹۔ لیکن امرسن کی فکری بحث موجودہ اور مثالی محبت میں کوئی امتیاز نہیں کرتی۔ یہ چیز بھی قابلِ ذکر ہے کہ امرسن بھی افلاطونی تعلیمات سے بے حد متاثر ہے چنانچہ وہ بھی افلاطونیت اور اپنے مذہب (عیسائیت) کے امتزاج کی کوشش کرتا ہے

نیاز صاحب نے اپنے ہندوستانی فلسفہ اور عربی شاعری کے مطالعہ سے بھی کام لیا ہے، چنانچہ ص ۱۸، ص ۱۹ اور ص ۹۱ پر بار بار محبت میں ناکامی کو روحانیت شاعری اور ترقی کے لئے ضروری قرار دیا ہے۔ ہو سکتا ہے نیاز صاحب کی نظر سے وید کی یہ عبارت گزری ہو کہ "خواہشات کے دریا دل کے سمندر کے لئے ضروری ہیں، ان کی تسکین کر کے انہیں خشک نہ کر دو۔" اسی طرح محبت کی شادی کے خلاف نیاز صاحب عرب تہذیب میں محبت کی شادی کے، چاہے وہ بنت عم ہی سے کیوں نہ ہو، سخت معیوب سمجھے جاتے اور خصوصاً افشائے راز پر لڑکی کی کسی اور جگہ شادی کر دیئے جانے کا ذکر کیا ہے ص ۱۲۹۔ نیاز صاحب نے شہاب کی زبانی مناظر قدرت ص ۵۲، ۵۳، ۶۲ رسالہ تصویر ص ۳۸، ص ۳۹ تصویروں کی نمائش ص ۱۱۱، ص ۱۱۵ رقص و سرود ص ۱۲۳، ص ۱۲۶، ایک حسینہ کی مے نوشی کے عالم ص ۱۴۵، ص ۱۴۷ وغیرہ کا نہایت عمدہ تجزیاتی بیان کیا ہے، گویا نثر میں شاعری کی ہے اور خود کو بھی جوش کی طرح الفاظ کا بادشاہ ثابت کیا ہے اس میں مختلف غیر معمولی کیفیات اور تاثرات کی نہایت کامیابی سے مرقع کشی کی گئی ہے۔ کہیں کہیں انہوں نے عدم مساوات ص ۱۶۸ فرد اور سماج ص ۱۰۶، ص ۱۰۷ تعداد ازدواج ص ۱۷۰ وغیرہ مسائل پر بھی اظہار خیال کیا ہے، گو ان کے یہاں وہ وسعت اور گہرائی نہیں ہے جو سرت چندر چٹرجی کے اس ناول میں جس میں اس نے ادارۂ ازدواج، خاندان، جنسی مزاج وغیرہ کو بنیادی انسانی مسائل کو موضوع بنایا ہے۔

شہاب کے کردار میں، اس کی نسوانیت اور نزاکت کے ذکر کے ساتھ ساتھ اس کی متانت، فلسفیانہ رجحان، خودداری، اعصاب کی مضبوطی، قوت

ارادی اور ہنسی سے اجتناب کی عادت صـ۱۳۶ وغیرہ کے علاوہ، سخت مزاجی، (مثلاً اختر سے عشق کے باوجود سماج کی خاطر اس کی زندگی کو ختم کر دینے کی کوشش اور خواہش) کی طرف اشارات بھی ملتے ہیں۔ حالانکہ سقراط نے اپنے زمانے کی مشہور طوائف کو اپنے گاہکوں سے نرمی اور ملائمت سے پیش آنے کی تلقین کی تھی کیونکہ وہ زمانے کے ہاتھوں ستائے ہوئے ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ موجودہ نظام کی اونچ نیچ دکھ درد، انتشار اور مادی مواقع کے فقدان کے مدنظر اس ادارے کو مطعون کرنا کوئی دانشمندی کی دلیل نہیں ہے، خصوصاً جب کہ اس کو جنم دینے والے اسباب کا خاتمہ نہ کیا جائے۔ جیسے کہتے ہیں چین میں کیا گیا ہے۔ شہاب کا چاندنی میں سمندر کے مدوجزر کو ایک مقناطیسی کشش وصل سے، جو ایک سیل نور کی شکل میں ظاہر ہو سکتی ہے، تعبیر کرنا نہایت حسین تخیل ہے لیکن خواتین ساحل اپالو کی طرف کشاں کشاں جانے کو محض نمائش حسن اور دعوت نظارہ کی خاطر قرار دینا۔ بمبئی کی نسوانی آبادی کے ساتھ ظلم کے مترادف ہے، جس کا ایک قوی محرک گنجان فلیٹوں کی گھٹن سے، عارضی ہی، نجات کی خواہش بھی ہے۔ اور یہ بھی حقیقت سے بعید ہے کہ ان عورتوں کے اہل خاندان کا ذکر نہ کیا جائے جن میں بچوں کے علاوہ مرد بھی ہوتے ہیں۔ نسوانی نفسیات جاننے والے جانتے ہیں کہ آرائش و زیبائش کی نمود کے اس کھیل کی تہ میں مردوں کی داد تحسین حاصل کرنے کی تمنا سے زیادہ عورتوں کے مابین جذبۂ مسابقت کارفرما رہتا ہے۔ گو اس کا اثر مردوں پر ہوتا ہے، یعنی یہ داد علت نہیں معلول ہے۔ شبلی کی آنکھیں دیکھے ہوئے نیاز صاحب کا یہ نیم رومانی اور نیم کلاسیکی ہیرو شہاب اس حسین فرانسیسی رقاصہ کو کیا کہے گا۔ جس نے حسن متناسب سے عام محرومی کے مدنظر عریانی کے جلوہ کو جائز قرار دیا تھا۔ بعض جگہ شہاب کے کردار کے بارے میں متضاد جملے بھی ملتے ہیں مثلاً صـ۵۲ پر وہ اپنے دوست محمود سے یہ کہتا نظر آتا ہے "دیکھو آج ہمیشہ کے لئے تم کو جان لینا چاہیئے کہ میں کبھی کسی سے برہم نہیں ہو سکتا۔ وہ شخص جو کبھی کسی سے کوئی توقع قائم نہ کرے۔ اس کو عالم کی کوئی چیز ناخوش نہیں کر سکتی۔" صـ۸۰ کی عبارت ملاحظہ ہو: "شہاب کو معلوم تھا کہ محمود پر اس تحریر کا کیا اثر ہوگا، لیکن وہ اپنی تمام عمر میں کسی سے برہم ہو کر پھر کبھی خوش نہیں ہوا۔ اس لئے وہ اس مسئلہ میں بھی اپنی طبیعت سے مجبور تھا۔" من چہ سرایم و طنبورۂ من چہ می سراید۔ اسی طرح یہ سمجھ میں نہیں آیا۔ کہ ایسا بلند خیال فلسفی "جو اکثر" نسوانی حسن کو ناقص و نامکمل اور ایک لمحے کے لئے بھی توجہ کا غیر مستحق۔ لہذا ہنگامہ حسن و عشق کو ناقابل فہم سمجھتا ہے" صـ۲۷، وہ ساحل اپالو پر بیٹھ کر ایک ایک عورت کی ساری کے رنگ اور آرائش گیسو کے انداز سے اُنکی وضع مشترک معلوم کرنے کی دھن میں لگا ہوا ہے۔ صـ۲۱، مصنف کے نزدیک غالباً یہ بھی ایک بڑا ہی اہم عمرانی مسئلہ ہے۔ کہیں شہاب سے ایسے اقوال و خیالات منسوب کئے گئے ہیں جو غیر حقیقی ہیں۔ مثلاً اختر۔ شہاب اور محمود نے ایک دوسرے کی صرف ایک جھلک دیکھی ہے۔ "لیکن شہاب اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ اختر کیا سوچ رہی ہے۔" گویا وہ عالم الغیب بھی ہے۔ شہاب کا یہ خیال بھی کہ "نکاح کا تعلق محبت سے بالکل نہیں ہے۔ صرف معاشرت سے ہے اس لئے وہ معاشرتاً کسی دوسرے کی ہو سکتی ہے لیکن روحانی لحاظ سے وہ تمہاری ہے اور ہمیشہ تمہاری رہے گی۔"

انگلستان میں بھی گبن اور مِل کی اس طرح کی مثالیں ملتی ہیں۔ لیکن گبن کی شادی میں اس کا باپ آڑے آیا تھا۔ اور مِل نے اپنی محبوبہ کے شوہر کی وفات پر اُس سے شادی کر لی تھی۔ اس کے علاوہ شہاب ایک بیوہ سے شادی کے بغیر بھی اُس کی مدد کر سکتا تھا۔ خصوصاً جب کہ وہ ایک عارضی مدت کے لئے تھی۔ فرد اور سماج کے دائرے ضروری نہیں کہ ایک دوسرے کی قربانی، طلب کریں۔ دیگر کرداروں میں محمود کا کردار متضاد سا ہے۔ محبت کی شادی جو اپنے عزیز ترین دوست، شہاب کی ممانعت کے باوجود کی جاتی ہے۔ مشترکہ خاندان کے مسائل کے مدنظر تحلیل ہونے لگتی ہے۔ حالانکہ مشترکہ خاندان کا رواج اس زمانے میں عام سا تھا۔ اور پھر محمود اپنے اسی عزیز ترین دوست کی محبوبہ سے دھوکے سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ "شاعر کا انجام" کے ہیرو افضال کی طرح یہ بھی رونے کا بڑا شائق ہے مشہور اداکارہ اختر اسقدر خام۔ کمزور۔ بے بس اور بے سہارا ہے کہ وہ پہلی ہی نظر میں شہاب پر عاشق ہو جاتی ہے۔ اور ٹھکرائے جانے پر شادی شدہ محمود سے نکاح کی کوشش کر کے دھوکا کھا جاتی ہے ـــ کہیں وہ مجسم حیا بنائی جاتی ہے اور کہیں بُری تربیت کے باعث

سماج کے لئے مہلک خطرہ جس کی موت ہی سے سماج محفوظ رہ سکتا ہے۔ ص ۱۴۳۔ حالانکہ وہ آخر میں سماجی کارکن ثابت ہوتی ہے۔ "شہاب کی سرگزشت" کے مکالموں میں بھی وہی "مشاعر کا انجام" والا زبان کا نقص موجود ہے۔ مثلاً سولہ سترہ سالہ بمبئی کی اداکارہ آسی "دست تطاول" اور "فکر اندمال" اور "داعیات شباب" کی نیاز والی ثقالت میں مبتلا ہے۔ مکالموں کی طوالت پر بعض لوگوں کو شدید اعتراض ہے۔ کہ وہ قصے کو بہت سست رفتار کر دیتے ہیں۔ معشوق کو اگر عاشق کا انتظار ہے تو ان طویل مکالموں کے باعث قاری کو بھی اسی ہجر و فراق کے عالم سے گذرنا پڑتا ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن بھی شاید اسی باعث ان کے کرداروں کو بے عمل بتاتے ہیں۔ لیکن اس قسم کے مذاکرہ نما قصوں میں شاید یہ ناگزیر ہوں۔ جیسا کہ عرض کیا گیا ہے۔ "ڈرامائی مکالمات" کی تکنیک نیاز صاحب نے افلاطون سے اخذ کی ہے۔ اور قصے کی حیثیت محض ضمنی ہے۔ گویا یہ اس زمانے میں جرمنی کے اس عام رجحان کی نمائندگی کرتی ہے جو تمام علوم کو افسانوی شکل میں پیش کرنے کے لئے کوشاں تھا۔ اتفاقات اس میں بھی ہیں۔ لیکن کمتر، مثلاً اختر کا شہاب اور محمود کے "اتفاقاً" بہت ہی قریب بیٹھنا۔ اُن کی باتیں سننا، پہلی نظر میں عاشق ہو جانا۔ طفیل کی دوست ہونا۔ محمود کا بیوی کو چھوڑ کر واپس آنا وغیرہ۔

زبان و بیان اس میں پہلے ناولٹ کے طرزِ بیدل سے بہت بہتر ہے۔ گو یا کہیں کہیں جملوں کی انگریزی ساخت کھٹکتی ہے۔ مجموعی طور پر "شہاب کی سرگزشت" اردو ادب کے شاہکاروں کو شمار ہو سکتی ہے۔ بقول بعض یہ نیاز صاحب کی آپ بیتی ہے۔ بعض ایسے نیاز صاحب کی نمائشی خود کلامی کا مجموعہ بتاتے ہیں۔ کننگ کالج بمبئی کے قیام اور اداکارہ کا بار بار ذکر دونوں ناولٹوں میں مشترک ہے۔ اور کچھ حد تک نیاز صاحب کی حسرتوں اور تجربوں۔ اور حالی۔ شبلی کے اثر کے عمل اور ردِ عمل پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مصنف اور تصنیف کے درمیان آپ بیتی کا یہی رشتہ درد و اثر کا باعث ہوتا ہے۔ گو یہ مصنف کی اپنے بارے میں بہت سی غلط فہمیوں اور خوش فہمیوں کا بھانڈا بھی پھوڑ دیتا ہے۔ نیاز سے متاثر ہونے والوں میں نمایاں نام مجنوں گورکھپوری کا ہے۔ جن کا افسانہ "زیدی کا حشر" اسی اثر کا نتیجہ بتایا جاتا ہے۔ لیکن انھوں نے نیاز کے مرکزی کردار "شہاب" کو سنکی قرار دیا ہے۔ اور انسانیت کے لیے "غیر صحت مند"

* * *

"میرے نزدیک حبِ جنسی نام ہے ایک فطری کہربائیت کا جو ایجابی و سلبی کیفیات کے ساتھ مرد و عورت میں پیدا ہوتی ہے اور یہ فطری کہربائیت، سیالاتِ عصبیہ میں سے ایک سیال شے ہے مثل ہوا کے جو مرد یا عورت کی ہستی سے پیدا ہو کر مقابل کو متاثر کرتی ہے۔

بعض صورتیں محبت کی ایسی ہوتی ہیں کہ اولین تصادمِ نگاہ میں کیفیتِ معاشقہ پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جانبین سے ایجابی و سلبی رَو پوری قوت کیساتھ ظاہر ہوتی ہے اور تجاذب شدت کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے بعض صورتوں میں چند دن کی ملاقات کے بعد یہ کیفیت پیدا ہوتی ہے لیکن کہربائی رَو یا سیالِ عصبی کی کیا حقیقت ہے سو اس کا جواب کوئی نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ مقناطیسی یا کہربائی رَو اُن میں نوامیس فطرت میں سے ہے جن کی حقیقت کا علم انسان کی سعی و کاوش سے باہر ہے

یہاں تک تو حبِ جنسی کا بیان ہوا، اب اس محبت کی اور صورتیں وہ اس قدر وسیع اور واضح ہیں کہ اُن سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا اور اس لئے محبت کو صرف لوثِ جنسی سے متعلق سمجھنا نہایت کوتاہ نظری کی بات ہے۔" (نیاز)

* * *

نیاز کی غیر مطبوعہ ارتجالی نظمیں

ضیاء عباس ہاشمی

احساس نارسائی بُری چیز ہے، لیکن بعض اوقات یہ حد درجہ تکلیف دہ ثابت ہوتا ہے کیا قیامت ہے کہ نگار کا نیاز نمبر شائع ہو اور میں دل کھول کر کچھ نہ کہہ سکوں۔ کئی سال سے علیل ہوں اور دل و دماغ دونوں برجا نہیں۔ اسی کے ساتھ ہاتھوں نے بھی جواب دے دیا ہے اور مشکل ہی سے دو چار سطریں لکھ سکتا ہوں۔ ظاہر ہے اس عالم میں، میں کیا لکھوں گا اور وہ بھی نیاز کے متعلق جو میرے ۵۰ سال کے دوست ہیں اور جن کے متعلق میرے تاثرات و جذبات کی فراوانی کی کوئی حد نہیں۔

میرے حلقۂ احباب میں مختلف طبع و مزاج کے لوگ ہیں، لیکن جس حد تک عزم و استقلال کا تعلق ہے وہ اپنی جگہ بالکل منفرد نظر آتے ہیں۔ جب میں یہ سوچتا ہوں کہ اب سے ۴۳ سال قبل جو عہد انھوں نے اجراء نگار کا کیا تھا وہ آب تک اس پر قایم ہیں اور اس طویل زمانہ میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ نگار وقت پر شائع نہ ہوا ہو، تو میں ان کی ہمت پر عش عش کرنے لگتا ہوں۔ حالانکہ اسی دوران میں خدا جانے کتنے رسالے جاری ہوئے اور کافی سرمایہ کے ساتھ جاری ہوئے، لیکن ان میں کسی نے چند سال سے زیادہ عمر نہ پائی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کا تعلق محض پختگی عزم سے نہیں بلکہ پختگی فکر سے بھی ہے اور اگر میں نیاز کی اس خصوصیت کو بھی سامنے رکھوں تو داستان بہت طویل ہو جاتی ہے اور میں اس کو حد درجہ اختصار کے ساتھ بھی بیان کرنے پر اس وقت قادر نہیں۔ تاہم اس خیال کے پیشِ نظر کہ "نیاز نمبر" میں شرکت سے محروم نہ رہوں، ان کی ایسی دو نظمیں پیش کر رہا ہوں جن کو وہ یقیناً بھول گئے ہونگے اور اتفاق سے ان دونوں کی نقلیں انہیں کے قلم کی لکھی ہوئی میرے پاس محفوظ ہیں۔ جو میرے کہنے پر انھوں نے ارتجالاً لکھ دی تھیں۔

نیاز گوالیار آئے ہوئے ہیں، میرے پاس مقیم ہیں اور ہر وقت شعر و سخن کا چرچا رہتا ہے۔ اتفاقاً میرے ایک دوست آتے ہیں اور دھنجی شاہ بہمن جی پارسی کی شان میں ایک مدحیہ نظم کی فرمائش کرتے ہیں۔ نیاز میرے کہنے پر اسی وقت یہ نظم کہہ کر ان کے حوالے کر دیتے ہیں:-

چرخ می نازد بہ خور، بر توسن زریں لجام مہر می نازد کہ دارد آتش، رنگیں بجام
ارض می رقصد کہ در آغوش او ہنگامہ ہاست ماہ می خندد کہ دارد جلوہ ہائے سیم خام
بحر را نازش کہ امواجش صدف آراستہ کوہ را صد فخر بر الماس و یاقوت درخام
عارضِ گلشن بیاراید صبا در اہتزاز غنچہ ہا نازاں کہ دارد عشوہ ہائے ابتسام
من ہمی گیرم کہ ہر شے بر نہد پندار خویش من ہمی دانم کہ فطرت بر فزوند ایں نظام
چوں بدیں منوال نگر ستم بہ سوئے قوم خویش چوں بدیں اسلوب جستم روئے انجاح مرام

یافت چوں نور طباشیرِ صباحِ پر سکوں
روئے دھنجی شاہ بہمن جی بہ فکرم ارتسام
او کہ دارد در کفِ صد گنجہائے شایگاں
او کہ ریزد از کفِ دیگر گہر ہا چوں غمام
او کہ تابد از جبینش جلوۂ ظلمت ربا
او کہ یابد نفسِ ہستی از وجودش احترام
از نوالش خوشہ چین علم فرزندانِ قوم
در ہمایوں ظلِ او آسودہ صد کار عظام
ہر نگاہش غم ربائے قلب بیمار و حزیں
جنبشِ ابروئے او ہر خستگی را التیام
ہمچنیں ہمدستِ خاتونش فرینی آمدہ
بیوۂ کو، ازیمِ لطفش نہ گیرد موج کام
من چہ پردازم بہ مدحِ ایں نفوسِ قدسیاں
کو، کہ بگرفتن تواند سیل دریا را بدام
جز دعائے دولت و اقبال شاں گویم چہ بیش
از حدود کارہائے خود زنم بیروں چہ گام
تا بآں وقتیکہ روز و شب بپا پے می دوند
تا بآں ساعت کہ باشد جلوہ آرا صبح و شام
تا بآں وقتیکہ چینید ماہ از خود روشنی
تا بآں ساعت کہ ماند کوہ فارغ از خرام

عمر شاں، اقبال شاں بالد و ہمدستاں شود
دشمنِ شاں از ہمہ اطراف یابد انہزام

مہاراجہ گوالیار کی صاحبزادی کملا راجہ کی شادی ہو رہی ہے اور اس تقریب کے لئے میرے دوسرے دوست نظم تہنیت پیش کرنا چاہتے ہیں۔ میں یہ خدمت پھر نیاز کے سپرد کر دیتا ہوں اور وہ یہ نظم لکھ کر دیدیتے ہیں۔

صحن چمن میں آج جو گزرا میں تو عجب منظر دیکھا
ایک لچکتی شاخ گل پر بلبل ہے اک نغمہ سرا
میں نے کہا منصب ہے ترا فریاد مگر اے سوختہ جاں
چھیڑا ہے تو نے کیوں سر گلشن آج سرودِ روح فزا
سن کے مری آشفتہ بیانی بلبل ہنسکر کہنے لگی
حد ہے تیری بے خبری کی، کوئی نہ ہو غافل اتنا
شادی کملا راجہ کی ہے اور تجھے معلوم نہیں
لیکے چلی ہے اپنے تحایف اسکی خدمت میں دنیا
شاید وہ آرایشِ گیتی ان کو بخشے حسن قبول
صرف یہی اک مطلب ہے میرے رنگین نغموں کا
میں نے کہا ہوں میں بھی واقف لو یہی ہے فکر مجھے
سامنے لیکر کیا جاؤں میں ذرہ صفت وہ مہر ادا
حالت یہ ہے عالم نذر میں لے کر آیا ہے
روئے زمیں سے تا بہ فلک طوفانِ ہدایا ہے برپا
صبح نے شیشہ پیش کیا ہے، شام نے بیندی زہرہ کی
اور شفق نے اطلس احمر، کاہکشاں نے گجرا
مہر نے زریں چتر دیا ہے، ماہ نے کشتی چاندی کی
بحر نے موتی پیش کئے ہیں کوہ نے لعل بیش بہا
غنچوں نے کنگن پیش کیا ہے، غازۂ رنگیں پھولوں نے
تارے افشاں لائے ہیں اور عقد ثریا آویزہ
موسم گل نے نور لطافت، ساز طرب نے نغمۂ جوش
حسن کرم نے شان امارت، دولت نے احساس عطا
تو ہی بتا اس حال میں مجھ سا تنگ جہاں کیا نذر کرے
سینہ میں بے چین ہے لیکن جذبۂ شوق عرض وفا
یعنی میں اک ادنیٰ خادم اور بھلا کس قابل ہوں
خالی دامن بے سر و ساماں، نذر ہے اپنی صرف دعا

عمر ابد، تکمیل تمنا، طالع روشن حاصل ہو — اوج مراتب بڑھتا جائے، گیتی ہو قدموں پہ فدا

حلقہ بگوشِ دولت سرمد، مجھ سے ہزاروں خیر طلب
عتبۂ عالی پر بہ ارادت شام و سحر ہوں ناصیہ سا

خشک کتابیں علم کی پیاس بجھانے میں ہمیشہ کامیاب نہیں ہوتیں۔

بعض آدمی تھکے ہوئے پیدا ہوتے ہیں اور بعض دوسروں کو تھکا دینے والے۔

مرد زندگی کو "ممکن" بناتا ہے اور عورت اسے "اغلباً" میں تبدیل کر دیتی ہے۔

اگر تم کوئی غلطی نہیں کر سکتے تو دنیا میں کچھ نہیں کر سکتے۔

عورت جب کبھی آئینہ دیکھتی ہے تو اسے کوئی نہ کوئی مرد بھی وہاں نظر آتا ہے۔

اگر کوئی مرد کنوئیں میں کود پڑے تو سمجھو کہ اس کی تہ میں ضرور کوئی عورت ہے۔

ایک مقرر دوران تقریر میں کہہ رہا تھا کہ "جو آج لڑکے ہیں وہ کل مرد ہونے والے ہیں" مگر جنس لطیف سے اس کا کوئی تعلق نہیں کیونکہ وہاں تو یہ عالم ہے کہ جو آج عورتیں ہیں وہ کل لڑکیاں بن جائیں گی؟

ایک موتی سے دانت رکھنے والی عورت کا منہ فطری موزونیت کے لحاظ سے سیپی کی طرح بند رہنا چاہیے۔

قزاق وہ ہے جو دوسروں کو اپنی معاش کا ذمہ دار قرار دیتا ہے۔

اکثر عورتیں آئینہ کے سامنے گھنٹوں صرف کیا کرتی ہیں، اس کا سبب پندار نہیں بلکہ قصور ہے

احمقوں کی بے وقوفیاں، صاحبانِ عقل کی دانشمندیوں سے زیادہ دلچسپ ہوتی ہیں۔

شاعر پیدا ہوتا ہے۔ اسی لیے اس کا علاج ممکن نہیں

عورت کو دنیا سے علیحدہ کر دو، اس کے بعد مرد کی مشکلات کو تمہیں "خورد بین" سے دیکھنا پڑے گا۔

(نیاز)

نیاز فتحپوری شاعر کی حیثیت سے

پروفیسر عصمت اللہ خاں محسن

نیاز فتحپوری کی شخصیت اردو میں گوناگوں ادبی صفات کی حامل ہے۔ افسانہ، مختصر ناول، تحقیق، تنقید، مکتوب نگاری، انشا پردازی، مقالہ نگاری، صحافت اور شاعری سب میں انہوں نے طبع آزمائی کی ہے اور امتیازی نشانات چھوڑے ہیں، یہ مانا کہ ان کی نثر، ان کی شاعری کے مقابلے میں بہت زیادہ جاندار، فکر انگیز اور سرور آگیں ہے لیکن ہمیں اس تاریخی حقیقت کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ ایک زمانہ میں .. اردو نثر اور نظم دونوں میں ان کا سکہ چل رہا تھا، بلکہ ۱۹۰۵ء سے لیکر ۱۹۲۵ء کے درمیانی عہد میں انکی شہرت زیادہ تر شاعری اور شعر منثور کی وجہ سے تھی۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم نے ۱۹۲۳ء میں نگار پر تبصرہ کرتے ہوئے نیاز کی نثری اور شاعرانہ دونوں حیثیتوں کو تسلیم کیا ہے، بات یہ ہے کہ ۱۹۲۲ء تک نیاز، نثر سے زیادہ نظمیں اور غزلیں ہی لکھ رہے تھے، یوں تو اس زمانے کے رسائل میں نیاز کے قصیدے، رباعیاں، مثنویاں، فارسی نظمیں اور غزلیں، قطعات، جدید اردو نظمیں اور غزلیں سبھی کچھ ملتی ہیں۔ اور ان سب میں حسن بیان و بیان حسن کی کرشمہ سازیاں نظر آتی ہیں لیکن جس چیز نے انھیں ایک ممتاز و مقبول شاعر بنا دیا تھا وہ ان کی جدید نظمیں اور غزلیں تھیں، ان کا کلام اردو کے معیاری پرچوں مثلاً الہلال، انتخاب لاجواب، نقاد، تمدن اور زمانہ وغیرہ میں بڑے اہتمام سے اور اکثر مدیر کے تعارفی نوٹ کے ساتھ شائع ہوتا تھا۔ ۱۹۲۱ء میں زمانہ کے کسی شمارے میں نیاز کی شاعری پر ایک طویل مضمون بھی شائع ہوا تھا، یہ قدر و منزلت و مقبولیت بے سبب نہیں تھی۔ وہ شاعر کی حیثیت سے بھی ایک ممتاز مقام حاصل کر چکے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ نیاز کا ادبی شعور، مشاہدہ، تجربہ اور مطالعہ کے توسل سے جسقدر پختہ ہوتا گیا اسی قدر وہ شاعری سے اجتناب کرتے گئے، یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آیا کہ ان کا ذریعہ اظہار صرف نثر رہ گئی اور ایک قابل قدر شاعرانہ شخصیت اپنی بڑھتی ہوئی علمیت کی وجہ سے اردو کے دامن .. شاعری سے الگ ہو گئی۔

اس جگہ نیاز پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ اگر وہ حقیقی شاعر ہوتے تو شاعری کو خیرباد نہ کہتے۔ اس اعتراض کے جواب میں اردو شاعری کی تاریخ سے کئی ایسے شاعروں کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ جن کی علمیت، مطالعہ، اور وسعت نظر نے انھیں شعر گوئی سے باز رکھا، مولانا ابوالکلام آزاد، مولوی وحیدالدین سلیم اور شبلی وغیرہ غالباً انھیں وجوہ کی بنا پر شاعر کی حیثیت سے بہت زیادہ نمایاں نہ ہو سکے، لیکن یہ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ لوگ مذاق شعر گوئی و سخنوری کے جملہ لوازم و کوائف سے متمتع نہ تھے۔

نیاز کی شاعری کا زمانہ دراصل برصغیر کی اصلاحی اور سیاسی تحریکوں کے ابتدائی دور سے تعلق رکھتا ہے۔ انیسویں صدی کے آواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں کئی اصلاح پسند شعرا قوم و ملک کو مذہبی تنگ نظری اور سماجی و اخلاقی پستی سے نجات دلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ نیاز بھی اس اصلاحی تحریک کے ہمنوا تھے۔ قوم کی پستی اور ملت کی زبوں حالی پر ان کا دل بھی کڑھتا تھا۔ چنانچہ اس ماحول میں جہاں

اقبال کے روح پرور ترانے گونج رہے تھے۔ اور جہاں حالی کے مدوجزر اسلام کی پُرسوز دھن فضا میں تموج پیدا کر رہی تھی وہاں نیاز کی شعلہ نوائی بھی ملک و ملت کو ترغیب انقلاب دے رہی تھی۔ نیاز کی اُن اصلاحی یا قومی و ملی نظموں میں دو باتیں خصوصاً اپیل کرتی ہیں، ایک تو یہ اُن کے یہاں اقبال کا خطیبانہ و فلسفیانہ لب و لہجہ، شبلی کا تاریخی استدلال اور حالی کا طرز غمخواری، تینوں چیزیں ایک جگہ مجتمع نظر آتی ہیں۔ دوسری خصوصیت نیاز کا تفاولی اور رجائی انداز بیان ہے، نیاز اگرچہ قوم کی زبوں حالی کا دکھڑا روتے ہیں اور حالی و اقبال کی طرح اسلام کے شاندار ماضی کی جھلکیاں بھی دکھلاتے ہیں، مصائب و آلام اور زمانے کی سخت گیری کا تذکرہ بھی کرتے ہیں۔ لیکن بے دلی اور مایوسی کو قریب نہیں آنے دیتے۔ اُنکی لے حوصلہ خیز اور حیات افروز لحن سے ذرا دیر کے لیے بھی جدا نہیں ہوتی۔

نیاز کی دو طویل ملی نظمیں "شہر آشوب اسلام" اور بتخالہ جو سنہ ۱۲ھ ۱۹۱۳ء میں "الہلال" و "نقاد" میں شائع ہوئی ہیں، مقصدیت و ولولہ کے لحاظ سے حالی کے مدوجزر اسلام اور اقبال کے "جواب شکوہ" سے بہت مماثل ہیں، اقبال کے یہاں روانی و تسلسل کے ساتھ مذہبی جوش و خروش ہے۔ نیاز کے یہاں احساس کی شدت اور ملی و قومی جذبات کی گرمی ہے۔ حالی کے یہاں سوز و گداز اور قومی غمخواری کا رنگ گہرا ہے، نیاز کے یہاں سادگی ٹھہراؤ اور سوزش جذبات کو زیادہ دخل ہے، شہر آشوب، کا پہلا بند دیکھئے۔ اس بند کا مزاج اقبال کے انداز تخاطب سے معنی خیز مطابقت رکھتا ہے

ہم نفس اب تجھ سے میں افسانۂ دل کیا کہوں!   داستان یہ بھی اور رنگِ محفل کیا کہوں
حال قیس نارِسا و اوجِ محمل کیا کہوں!   قصۂ اندوہِ یک گم کردہ منزل کیا کہوں
ہاں زباں تک آ نہیں سکتا ہے اب دل کا پیام
ساز مجروحِ نوا ہے، لب ہے مجروحِ کلام

یہ نظم شروع سے آخر تک اسی کیفیت کی حامل ہے۔ اور اس سے نیاز کے ایک خاص طرزِ فکر کی وضاحت بھی ہوتی ہے۔ اقبال نے پہلے شکوہ لکھا تھا۔ بعد کو مصلحت اندیشی نے اُن سے "جواب شکوہ" لکھوایا۔ لیکن نیاز کی جرأت رندانہ کسی مصلحت کا شکار نہیں ہوئی۔ انھوں نے خالق کائنات . . . . شکوہ سنجی کرنے کے بجائے مخلوق ہی کو اس کے زوال و زبوں حالی کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔ اور ماضی کے کارناموں کے حوالے سے اُنکی رگِ حمیت اور جذبۂ غیرت کو ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ چند اشعار دیکھئے......

پھر اگر ہم پست ہیں تو ہے ہمارا ہی قصور   ہے خطا اپنی اگر اخلاق ہے ہم سے نفور
اپنی لغزش تھی اگر ہے ظرفِ ہستی چور چور   زہر اگر کھائیں گے ہم، تو ہم کو مر جانا ضرور
خود تو ہوں برباد اور شکوہ کریں اللہ سے
ہو خدا بیزار ایسے زمزمہ آگاہ سے

تو وہی ہے جس نے دنیا کو دیا درسِ حیات   تو وہی ہے! زندگی جس کی تھی فخرِ کائنات
ہر قدم تیرا اٹھا گویا صدحیل عزم و ثبات   نام تیرا دہر میں تھا باعثِ امن و نجات

بتخالہ بھی اسی نوع کی نظم ہے اور اس کا لب و لہجہ بھی اقبال کے شکوہ و جواب شکوہ سے بہت قریب ہے۔ صرف ایک بند دیکھئے:۔

زلزلہ پڑ گیا یورپ کے کلیساؤں میں   کھلبلی مچ گئی یونان کے داناؤں میں
آج غواص جو تیونس کے دریاؤں میں   ڈیرے کل ڈال دیے روم کے صحراؤں میں

بجلیاں تیغ کی گر آج گریں بلقاں پر
چھاگئیں کل وہی بادل کی طرح ایراں پر

"شہر آشوب" اور "بنگالہ" کے علاوہ "لیلۃ القدر" "سوز پروانہ" "شمع حرم" وغیرہ میں بھی قومی و ملی ہمدردی کا یہی جذبہ کارفرما ہے ور ان میں بھی غافل مسلمانوں کو بیداری کا پیغام دیا گیا ہے۔ ان ساری نظموں میں جذبات کے ساتھ روح عصر بھی پوری طرح منعکس نظر آتی ہے۔ رصغیر کی سیاسی ہلچل، معاشی و اخلاقی افراتفری اور بین الاقوامی و بین الملکی سیاسی کشمکش کو سمجھنے میں یہ نظمیں بڑی مدد دیتی ہیں۔ اس لئے ندوپاک کی اصلاحی و انقلابی تحریکوں میں نیاز کی شاعری کا اثر و نفوذ یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

عصری رجحانات و قومی میلانات کے ساتھ نیاز کی شاعری میں جذباتی شدت کا عنصر بھی بہت نمایاں ہے اور جذبات کی یہی شدت ے جو دراصل ان کے لب و لہجہ کو زیادہ موثر و دلکش بناتی ہے۔ ان کی دو نظمیں "جگنو" اور "کوئل" بڑی خوبصورت اور جذبات آفریں نظمیں یں۔ ان نظموں میں نیاز کا جمالیاتی احساس پوری قوت کے ساتھ ابھر آیا ہے۔ اور نادر تشبیہات و موزوں و مترنم الفاظ کے انتخاب نے ان نظموں ں بلا کا حسن و زور پیدا کر دیا ہے۔ ذرا کوئل سے مخاطبے کا انداز دیکھئے :۔

اے نوید جانفزا اے طائر فرخندہ حال   آگئی بارے تو لے کر پھر پیام برشگال
یعنی آ پہنچی وہی شوریدگی سر میں لئے   اک جہان بے قراری جنبش پر میں لئے

اس کے بعد کوئل کی سیمابی کیفیت اور انجانی بیقراری کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں۔

تیرے نغموں کا ذرا دیکھوں تو کیسا ساز ہے   تو کہیں ہے بھی کہ بس آواز ہی آواز ہے
دو منٹ بیٹھی یہاں اور پھر ادھر کو اڑ گئی   چار آوازیں لگائیں اور پھر تو اڑ گئی
کیسی بے چینی ہے تو شرمندہ جس سے پارہ ہے
میں سمجھتا ہوں کہ تو موسیقیٔ آوارہ ہے!

ہیات کا یہ زور، بندش کی چستی اور اسلوب کا یہ شکوہ، جوش کے سوا، کسی اور کے یہاں مشکل سے نظر آئیگا۔ خصوصاً یہ بند دیکھئے۔

اے نقیب ابر و باراں اے علم دار بہار   اے کلید میکدہ اے آرزوئے غمگسار
لے کے تیری ہر صدا گویا جواز بادہ ہے   کچھ گنہ کرنے پہ میرا دل بھی اب آمادہ ہے

ز کی نظم "جگنو" میں بھی کہیں کہیں اقبال کے "جگنو" کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ تاہم خیال اور تاثر کے لحاظ سے ان میں واضح فرق ہے۔ اقبال کہتے ہیں

یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا   غربت میں آکے چمکا گمنام تھا وطن میں

یاز شب کے پراسرار ماحول میں جگنو کے وجود کا اظہار یوں کرتے ہیں ؎

تو کوئی اقلیم شب میں روز کا جاسوس ہے   یا تو کوئی شمع ہے جو فارغ از فانوس ہے

یہاں نیاز اور اقبال کی نظموں کا مقابلہ مقصود نہیں پھر بھی اگر سلطنت شب میں، دن کی سفارت خیال آفریں بات ہے تو اقلیم شب میں تو کی جاسوسی بھی کم فکر انگیز تشبیہ نہیں ہے۔ اقبال کی نظم "جگنو" تشبیہات کے اعتبار سے ایک مرصع اور مقصد کے لحاظ سے اصلاحی نظم نیاز نے بھی تشبیہات کے میزان پر جگنو کے ساتھ پورا انصاف کیا ہے، لکھتے ہیں ؎

دامن زہرہ سے ٹوٹا بادلے کا تار ہے   شب کی زلف پرشکن یا آج افشاں بار ہے
جم گیا ہے حور کا تار نظر آکر کوئی!   یا شعاع ماہ ٹوٹی ہے گرہ کھا کر کوئی

ابر میں تیری وہ پرواز طلائی کی بہار   دیکھے خط جیسے -- کسوٹی پر کسے سونا سنار
نغمۂ فردوس کی تو کوئی مُرلی تو نہیں   دامنِ لیلائے شب کی کوئی چھچی تو نہیں

یہاں "بادلے کے تار کا ٹکڑا" - حور کا تارِ نظر، شعاعِ ماہ کی گرہ، سونے کا خط، نغمۂ فردوس کی مُرلی، اور لیلائے شب کی چھچی تشبیہی اختراعات ہیں جو نیاز کی قادر الکلامی اور شاعرانہ جودت پر دلالت کرتی ہیں۔ ..... جیسا ابھی کہا گیا ہے اقبال کی نظم ایک مقصدی ہے، ان کے یہاں جگنو بالآخر حسنِ ازل کی علامت بن جاتا ہے۔ نیاز جگنو کو اپنے قریب لانے کے لئے اسے دنیا سے متعلق رکھنا پسند کرتے ہیں۔ انھیں جگنو کی چمک میں حسنِ ازل کے بجائے سوزِ دل کی جھلک نظر آتی ہے۔

گو میں فرطِ غم سے یکسر ہستیِ ناکارہ ہوں   لیکن اب بھی دیکھ کر تجھ کو تپش آمادہ ہوں
کیوں مگر رہنے لگی تجھ کو بھلا ایسوں کی یاد   تو کہاں اک برق زادہ اور میں خاکی نژاد

اگرچہ نیاز کی شعر گوئی کا زمانہ بہت مختصر رہا ہے۔ پھر بھی ان کے کلام میں موضوعات و خیالات کے تنوع کی کمی نہیں ہے۔ مسائلِ حیات ا وارداتِ قلب دونوں کا بیان ان کے یہاں ملتا ہے۔ اور بصد آب و تاب ملتا ہے۔ ان کی ہر نظم میں پیغامِ بیداری کی نوائے سرکش کے ساتھ سا لطیف احساسات اور جذبات کا طمانیت بخش مرہم موجود ہے کہیں نقشِ آہن گداز کی شرر افشانی ہے تو کہیں مناظرِ فطرت کی گل باری لطف یہ ہے کہ اصلیت، جوش اور سادگی کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے پاتا۔ ذیل کے تین شعر دیکھئے۔ یہ مئی سنہ ۱۳ء کے نقاد میں شائع ہو

جب نگاہِ بے محابا کا میں لذت یاب تھا   جب شعاعِ حُسنِ سیمیں سے جگر سیراب تھا!
دستِ نازک جب مرے سینے پہ وجہِ خواب تھا   ہائے یہ کمبخت دل اسوقت بھی بے تاب تھا
حُسن تھا میرے قریں لیکن مٹا جاتا تھا میں
آتشِ ہجراں نہ تھی لیکن جلا جاتا تھا میں

اِن اشعار میں نیاز کی وہی جمالیاتی انفرادیت کام کر رہی ہے جو اُن کے شعور کی قوتِ محرکہ ہے اور جس کے اِشارے پر نیاز کی ساری صلاحیتیں گردش کرتی ہیں۔ ان کی یہی جمالیاتی انفرادیت اکثر شعور سے ہم آمیز ہو کر حقائق کے عرفان کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ جیسا کہ ان کی رباعی سے ظاہر ہے کہ :-

معمور تجھی سے پائے جب جملہ بیوت   کیا تیرے وجود کا چاہوں گا میں ثبوت
مژدہ ہوا گل میں، گریۂ شبنم میں ہوا   دریا میں فغاں تو ساحل میں سکوت

طبع زاد نظموں کے ساتھ نیاز کے یہاں ترکی اور انگریزی کے بعض خوبصورت ترجمے بھی ملتے ہیں۔ "تیر و نغمہ" جس میں نیاز کی جما جس ایک خاص انداز سے ابھری ہے، انگریزی کی نظم "The Arrow And Song" ترجمہ ہے یہ منظوم ترجمہ ۱۹۰۸ء یا ۱۹۰۹ء کے انتخا میں شائع ہوا ہے۔

جمالیاتی انفرادیت کی گل فشانی ان کی رومانی نظموں میں خصوصاً "بہار کی دیوی" "ساحلِ چمن کی ایک صبح" اور "انتساب" میں بھی ملتی ہے۔

خصوصاً "انتساب" میں ان کا طرزِ اظہار، مصوری کی حدود کو چھو لیتا ہے۔ حُسن کی جیسی مکمل تصویر یہاں ملتی ہے وہ کہیں اور مشکل سے ملے گی۔ دو تین شعر دیکھئے :-

ابرو میں پورا خم لئے صید زبوں کے واسطے   رخسار میں بجلی لئے صبر و سکوں کے واسطے !
آویزہ اس کے کان کا عارض پہ ہے ٹھہرا ہوا   درج صدف سے یا کوئی موتی ڈھلک کر رہ گیا
اک ہاتھ نیچے سر کے ہے اور دوسرا سینے پہ ہے   بادل میں ہے اک جوئے شیر اور ایک آئینہ پہ ہے

بہار کی دیوی بھی اسی قبیل کی نظم ہے صرف ایک بند بطور نمونہ دیکھئے :-

تھے ڈورے آنکھ کے یا موج صہبا جام کوثر میں   تھی پتلی یا دلہن کوئی سیہ اطلس کی چادر میں
نوید عشق تھا پنہاں نگاہ کیف پرور میں   مژہ کہتے ہم اسکو بھی لچک ہوتی جو نشتر میں
مسیحا کی زباں اسکی نگہ اعجاز پرور تھی !
خموشی اس کی گویا نطق عیسیٰ کے برابر تھی

نیاز کی نظموں میں اُن کی شخصیت کی جابجا جھلک ملتی ہے۔ لیکن ان کی غزلیں اُن کی شاعرانہ شخصیت کو سمجھنے کے لئے واضح اشارے دینے ے قاصر ہوتی ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ نظم نگار پہلے اور غزل گو بعد کو ہیں۔ پھر بھی وہ تغزل سے خالی نہیں ہیں بلکہ کہیں کہیں اس تغزل ں ایک ایسا تیکھا پن نظر آتا ہے جس کے پس منظر میں نظم والے ذہن اور طباع نیاز کی موجودگی کا گمان ہونے لگتا ہے۔

نیاز کی غزلوں کی نمایاں خصوصیات، کیفیات قلبی کی ترجمانی اور واردات حسن و عشق کی تصویر کشی ہیں۔ خیالات پاکیزہ ہیں اور وس جذبات پر مبنی محسوس ہوتے ہیں۔ بعض غزلوں میں تو بلا کی شعریت اور نشاط خیزی ہے۔ چند اشعار دیکھئے :-

مژہ کے دامن پہ کھیلتا تھا جو قطرہ اُس چشم فتنہ زا کا   وہ تیر دلدوز مرحمت تھا، پیامبر تھا مری قضا کا
نہیں گلہ کچھ ترے کرم سے ہمیں تو اس بات کا ہے رونا   ذرا سا دل وہ بھی زخم خوردہ خود اپنے ہی شوق التجا کا
وہ خونچکاں سوزش محبت، وہ زخم خوردہ شرار الفت   وُہ ان کے عارض پہ کیف بہت ہے رنگ حسرت تری دعا کا

ایسے کہاں نصیب کہ ہوں ہمکنار دوست   قائم رہے کہیں خلش انتظار دوست !
کچھ کچھ ہمارے دل کو سکوں ہو چلا تھا پھر   یہ تو نے کیا کیا نگہ انتظار دوست !
گو تم نے لاکھ کام لیا ضبط سے نیاز   پہچان ہی گئی نگہ ہوشیار دوست

دیکھ کر مجھ کو خیال ترک الفت چھوڑ دو   میں بھی تم کو دیکھ کر رونے کی عادت چھوڑ دوں
تم نہیں آتے تو ذکر اپنا مجھے کرنے ہی دو   شوق دل کی دفعتاً کیوں کر رعایت چھوڑ دوں
میں تم کو دیکھ کے اللہ جانے کیوں چپ ہوں   یہ کیسے جانا کہ دل میرا بے قرار نہیں !
گھڑی گھڑی نہ مجھے دیکھئے کہ دل پہ مجھے !   ہے اختیار پہ اتنا بھی اختیار نہیں !
اِدھر کچھ بے خبر وہ اپنے حسن بے محابا سے   اُدھر مجبور کچھ ہم اپنے قلب ناشکیبا سے
ہوں میں ایک بس ناآشنا دونوں سے محفل میں   تمہارے لطف پنہاں سے تمہارے جذب پیدا سے
خدا معلوم یہ ہنگامۂ ہستی ہے وابستہ !   تمہارے حسن سے یا میرے قلب ناشکیبا سے

خدا معلوم دنیائے محبت کیسی دنیا ہے: جو دشمن ہے تمنا کا وہی جانِ تمنا ہے!
نہیں ہے اور کیوں ہو التفاتِ دوست کا شکوہ   شکایت ہے تو اس دل سے جو مجبورِ مداوا ہے

آخری شعر میں "نہیں ہے اور کیوں ہو" میں جو بیدادِ حسن کی پذیرائی کا انداز نہاں ہے۔ وہ ایک اہلِ دل شاعر ہی کا اعتمادِ نظر ہو سکتا ہے۔ نیازؔ کے یہاں جب بھی اعتمادِ نظر شوقِ فراواں میں تحلیل ہو کر بے خودی کی سرحدوں کو چھونے لگتا ہے۔ تو طرزِ بیان کو غالبؔ سہارا دیتے دکھائی دیتے ہیں۔

اس نے پوچھا کون؟ میں قدموں پہ گر کر مر گیا
کون سنتا ہے مگر شوقِ فراواں کا جواب

نیازؔ کے کلام میں یہ عاشقانہ از خود رفتگی کبھی کبھی اعتدال سے گریز کرنے لگتی ہے۔ غالباً اس کی سب سے بڑی وجہ جمالیاتی احساسات کی شد ہے۔ ایسے مواقع پر ان کے کلام میں داغؔ کا رنگِ کلام جھلکنے لگتا ہے۔ اس کے باوجود کلام کی متانت اور لطافت کو صدمہ نہیں پہنچا اور اضطراب، جذبات کی کیفیات ایک مخصوص جمالیاتی معیار کی تابع رہتی ہیں۔ جیسا کہ ذیل کے اشعار سے ظاہر ہے۔

میں ہوں گا رات ہو گی وہ مہ جمال ہو گا   ساعت تو آئے وہ جب جینا محال ہو گا
تم آ گئے، میں خوش ہوں پوچھو نہ اب جو گزری   تم کو اگر نہ ہو گا مجھ کو ملال ہو گا
تسکیں سے اپنی کب تک میں مضطرب ہوں گا   اللہ شوق دل میں کب اعتدال ہو گا
شوقِ بیانِ غم کا اب نازکش ہوں تم نے   یہ کیا کہا کہ سن کر مجھ کو ملال ہو گا

اگرچہ نیازؔ نے بحیثیت شاعر اردو ادب میں جو اضافے کئے ہیں وہ مقدار کے اعتبار سے کم ہیں لیکن انکی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ اس حقیقت کی روشنی میں اس مضمون کو بے لچک تنقیدی اصولوں پر جانچنے کے بجائے ایک ہمہ اوصاف ادبی شخصیت کے ایک لطیف پہلو کی نقاب کشائی تصور کیا جائے۔ آخر میں نیازؔ کی فارسی شاعری کا اجمالی ذکر بے محل نہ ہوگا۔ انکے فارسی کلام میں بھی زبان و بیان کے محاسن ملتے ہیں جو اردو غزل اور نظموں میں ہیں۔ بطور نمونہ چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں:۔

اے کہ با چشمان مستت سامری فن آمدی   فرصتت بادا کہ دل را ہوش افگن آمدی
حالِ دل می پرسی ایں چہ دلنوازیہاست   دردِ جاں بیفزائی ایں چہ چارہ سازیہاست
غافل از نیاز اکنوں حالِ او چہ می پرسی   محوِ اشکباریہاست وقفِ جاں گدازیہاست
ما بہر جا ریم دریم سازِ عشرت خانہا!   از حضورِ وحشتِ دل می چکد ویرانہا!
شرار از برقِ خرمنش می جہد ہر دم ولے اے دل   حضورش اندکے سرمایۂ خاشاک کن پیدا
نیاز از خویش بگزشتن نقابِ حسن برگیرد   سحر آسا ز خود بر آو مہر از چاک کن پیدا
دلے من ز التفاتِ نگہت خراب گشتہ   مگر او ہنوز محوِ غمِ نارسیدنستے"!

فارسی کلام میں کہیں کہیں زہد و رندی کی روایاتی کشمکش کا اظہار بھی ہوتا ہے۔

چو داغِ خاکِ مسجد دید ساقی گفت شو بیروں   درونِ میکدہ با دامنِ آلودہ می آئی

غالبؔ، اقبالؔ اور حالیؔ تینوں نے ابنائے روزگار کی بے حسی اور معاندانہ طرزِ عمل کا شکوہ کیا ہے۔ نیازؔ بھی دہرِ ناموافق کے شاکی ہیں چنانچہ انکے مندرجہ ذیل شعر کے پہلے مصرعہ میں طنز کا وہی نشتر ملتا ہے جو غالبؔ کے لب و لہجہ کا طرۂ امتیاز ہے:۔

آرزوئے تکلف از اہلِ وطن داری نیازؔ   کہ مگس باشد حلیفِ سوزشِ پروانہا

نیاز اور جنسیات

شمیم رضوی

نیاز فتحپوری اردو کے ڈاکٹر جانسن ہیں۔ شاعر، نثرنگار، نقاد اور افسانہ نویس کے علاوہ وہ عربی، فارسی، اردو اور ہندی کے شعری و نثری ادب کے بہت بڑے عالم بھی ہیں۔ علاوہ ازیں مذاہبِ عالم کا گہرا مطالعہ، دینِ اسلام کا مکمل عرفان لسانیات میں مہارت، ادبیاتِ عالم پر قدرت، معاشیات کا علم، سیاسیاتِ حاضرہ سے لگاؤ، غرضیکہ مختلف علوم و فنون سے واقفیت و شناوری کے سبب اور اپنے تبحرِ علمی و وسعتِ معلومات کی بنا پر نیاز کی حیثیت ایک جیتے جاگتے انسائیکلوپیڈیا سے کم نہیں۔ ان کے شذرات و ملاحظات ہوں یا مضامین و مقالات، استفسارات کے جواب ہوں یا مکتوبات، مالہٗ و ماعلیہ ہوں یا تنقید و تبصرات ہر جگہ نیاز معلومات کے دریا بہاتے دکھائی دیتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ہر علم و فن پر نیاز کی عالمانہ، محققانہ اور ناقدانہ نظر رہی ہے۔ چنانچہ "جنسیات" بھی ان کی دسترس سے باہر نہیں رہا۔

سگمنڈ فرائڈ کے نظریۂ جنس کے مطابق جنس کا تعلق مرد و عورت کے محض جنسی فعل و کردار سے نہیں ہے بلکہ تمام انسانی اعمال جنسی جذبے کی پیداوار ہیں اور مشہور ماہرِ جنسیات ہیولاک ایلس کے نزدیک ہم زندگی کا احترام اس وقت تک نہیں کر سکتے جب تک ہم جنس کا احترام کرنا نہ سیکھیں اور جنس تمام علوم و فنون کا سرچشمہ ہے۔ چنانچہ فرائڈ کے نظریئے کی قبولیتِ عام اور ہیولاک ایلس کی مستند و وقیع رائے کے نتیجے میں اہلِ فکر و نظر و اصحابِ قلم جنسیات سے بہ حیثیت علم و فن کے دلچسپی لینے لگے اور تعلیمِ جنسی کی افادیت و ضرورت کے پیشِ نظر یورپ و امریکہ میں سوسائٹیاں اور انجمنیں قایم ہونا شروع ہو گئیں۔

لیکن جرمنی میں ہٹلر نے برسرِ اقتدار آتے ہی، جنسیات کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا اور نازی پارٹی کے سرپھرے سرگرم کارکنوں نے مئی ۱۹۳۳ء میں ڈاکٹر میگنس ہرش فیلڈ کی قایم کردہ شہرۂ آفاق Institute of sexual science پر دھاوا بول دیا اور جنسیات سے متعلق نادر سے نادر اور قیمتی سے قیمتی کتابوں، مسودوں، اعداد و شمار، خاکوں، تصویروں اور مجسموں کو جن کی مجموعی تعداد ہزاروں تھی اور جو لائبریری و میوزیم کی زینت تھے، توڑ پھوڑ جلا ڈالا۔ یہی حادثہ سگمنڈ فرائڈ کے ساتھ پیش ہوا۔ ۱۹۳۶ء میں نازیوں نے آسٹریا پر قابض ہونے کے بعد وایانا میں فرائڈ کے مکان کو گھیر لیا اور اس کی لائبریری

Rana Yugan کی کتاب Sexual freedom پر ڈاکٹر نارمن ہیر کا مقدمہ

کی کل کتابوں اور دارالتجربہ کی تمام چیزوں کو نیست و نابود کر دیا۔ فرائڈ بے چارہ انگلستان میں پناہ لینے پر مجبور ہوا جہاں وہ تھوڑے ہی عرصہ بعد فوت ہو گیا۔

نفسِ مضمون کے لحاظ سے اردو زبان میں ادبِ جنسیات کا سرسری جائزہ لینا ضروری ہے۔ سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر "بھوگ بچل" ہے۔ جسے بیدر کے بریدشاہی سلطنت (۹۰۰—۹۵۰ھ مطابق سولہویں صدی عیسوی) کے ایک درباری شاعر قریشی نے دکنی زبان میں لکھا۔ بقول قریشی، اس نے اسے فارسی سے ترجمہ کیا مگر فارسی کتاب کا نام نہیں لکھا۔ اس کتاب میں سنسکرت کتابوں کی طرح پہلے عورتوں کی قسمیں بیان ہوئی ہیں، پھر مختلف آسنوں کی صراحت کی گئی ہے۔ ۲۸ رنگین تصاویر مختلف آسنوں کی اور ۱۷ تصویریں عورتوں کی اقسام سے متعلق ہیں۔ پوری کتاب منظوم ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ امپیریل لائبریری کلکتہ میں ہے اور دوسرا نواب سالار جنگ مرحوم کے کتب خانہ حیدرآباد میں ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

ضرور ہے بچن فاحشہ سات انگ کرے مردمی جاے کروں ورنگ[۱]

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء تک اردو ادب کے شعری اصنافِ سخن اور نثری داستانوں میں اس وقت کے جنسی تصورات اور میلانات کا پتہ ملتا ہے۔ مثال کے طور پر نظیر اکبرآبادی کی نظم "برہ کی کوک" کو لیجئے جو عورتوں میں ہم جنس پرستی کے شوق و رجحان کو ظاہر کرتی ہے۔

شام گزر گئی، یار نہ آیا، رات بھی آدھی آن ڈھلی
آؤ پڑوسن چپٹی کھیلیں، بیٹھے سے بیگار بھلی

ریختی کے بعض اشعار سے اس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ شوہروں کی طوائف پرستی و بے التفاتی کے باعث اکثر عورتیں جنسی گھٹن کا شکار تھیں اور وہ اپنی جنسی پیاس بجھانے کے واسطے "استلذاذ بالمثل" کے علاوہ "استلذاذ بالنفس" کی طرف بھی مایل تھیں۔ بیشتر مثنویوں اور داستانوں سے اور ناولوں (مثلاً مرزا رسوا کی "امراؤ جان ادا" اور قاضی سرفراز حسین کی تصانیف) سے دنیا کے قدیم ترین پیشہ قحبگی، اور طوائف کی اقسام اور ان کی تمدنی، سماجی و معاشی زندگی (جو جنسیات کے موضوعات میں سے ہے) پر روشنی پڑتی ہے۔ قدیم غزلوں میں ایسے اشعار کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے جن سے مردوں میں "استلذاذ بالمثل" کے شوق و عادات کا پتہ چلتا ہے۔

لیکن مغلوں کے زمانے میں اور وکٹوریا کے عہدِ حکومت میں "جنسیات" پر علمی کتابوں کی تصنیف و تالیف کا سلسلہ یک گونہ موقوف ہو گیا۔ اور مذہبی تنگ نظری و خوفِ تعزیراتِ ہند کے اثر سے ریاکاری کا بول بالا ہوا اور اخلاق کی طنابیں اتنی کس دی گئیں کہ ڈپٹی نذیر احمد کو اپنے ناول "توبۃ النصوح" میں "فسانۂ عجائب" "قصہ گل بکاؤلی" "آرائشِ محفل" "مثنوی میر حسن" "بہارِ دانش" "اندر سبھا" "انشا کی دریائے لطافت" "کلیاتِ رند" "دیوان نظیر اکبرآبادی" "واسوخت امانت" وغیرہ وغیرہ کو خلافِ تہذیب، مزخرفات اور اخلاق سوز قرار دے کر نذرِ آتش کرنا پڑا۔ ڈپٹی صاحب تو محض خیالی دنیا میں ان کتابوں کو آگ لگا کر خوش ہو لئے ہوں گے مگر جب لوگوں نے ان کی کتاب ازواج

---

[۱] بحوالہ "نوائے ادب" بمبئی، جلد ۱۰ نمبر ۱، جنوری – مارچ ۱۹۵۹ء ایشوع

مطہرات پر' کی تمام کاپیوں کو اکٹھا کر کے برسرِ عام جلا ڈالا تو ڈپٹی صاحب مارے صدمہ کے دماغی توازن کھو بیٹھے۔ چاہ کن را چاہ درپیش۔

"بھوگ بھل" کے بعد اردو میں جنسیات پر جو کتاب قابلِ ذکر ملتی ہے وہ امریکی ڈاکٹر سلوانوس سٹال کی تصنیف What a young husband ought to know (مطبوعہ ۲۰ جولائی ۱۸۹۹ء) کا ترجمہ ہے جسے پنجاب ریلیجیس بک سوسائٹی انارکلی لاہور نے ۱۹۰۶ء میں "شوہر کا رہنما" کے نام سے شائع کیا۔ یہ کتاب گرچہ ترجمہ سہی، تاہم جدید تحقیقات و معلومات کی بنیاد پر اور سائنٹیفک اصول پر لکھی ہوئی اردو زبان میں پہلی کتاب ہے۔ اس کتاب کے ابواب "توالد و تناسل کا جسم سے تعلق" اور "ایام حمل اور وضع حمل سے پہلے درمیان اور مابعد کی تبدیلیاں" جدید معلومات و نظریات پر مبنی ہیں۔

بیسویں صدی میں، مغرب سے جنسی موضوعات پر مبنی ناولوں اور کہانیوں اور خالص جنسیات پر علمی و تحقیقی کتابوں کی درآمد شروع ہو گئی۔ سنسکرت زبان میں لکھی ہوئی وتسایانا، کلیان مل، پنڈت کوکا وغیرہ کی تصانیف کے انگریزی میں اور ہندوستان کی مختلف صوبائی زبانوں میں ترجمے شروع ہو گئے۔ طباعت و اشاعت میں سہولتوں کے باعث اور پہلی جنگِ عظیم کے دوران و مابعد سماجی تبدیلیوں اور ذہنی انقلاب کی وجہ سے بھی اخباروں و رسالوں میں جنسیات پر مضامین لکھے جانے لگے اور جنسیاتی پرچوں کا اجرا بھی ہونے لگا۔ ان سب باتوں کا اثر و نتیجہ یہ ہوا کہ اردو میں "کوک شاستر" "اصلی کوک شاستر" "چینی کوک شاستر" اور اسی قبیل کی کتابیں بازاروں میں آنے لگیں۔ ان میں ہندوؤں کے نظریات کے مطابق محبت کی قسمیں، مردوں کی اقسام ششنک، مرگ، برشب، اشو، عورتوں کی قسمیں (پدمنی، چرانی، سنکھنی، ہستنی) اور ۶۵ یا ۸۴ آسنوں کے سرسری بیان کے بعد آخر میں ممسک دواؤں کے نسخے یا اشتہارات ہوتے تھے۔ پھر ان کتابوں کا سلسلہ شروع ہوا جو "دلہن کی ڈائری" "دلہنوں کی کانفرنس" "پانچ سہیلیوں کا جھمکا" "داستانِ شبِ عروسی" "شادی کی رات" "سہاگ رات" وغیرہ کے نام سے بازاروں میں ملتی ہیں۔ ان کے مصنفین کا مقصد بزعمِ خود نیک اور اصلاحی ہے، جیسا کہ بطورِ نمونہ اس تمہید سے ظاہر ہوتا ہے،

> "ناظرین! یہ کتاب عام بازاری کتابوں کی طرح دل خوش کرنے اور اخلاق خراب کرنے کے لئے نہیں لکھی گئی بلکہ اس کتاب میں شادی کی رات سے لے کر ۲۰ دن کی مکمل مرد و عورت کے پوشیدہ تعلقات پر پوری پوری روشنی ڈالی گئی ہے اور تمام وہ باتیں تفصیل کے ساتھ لکھ دی گئی ہیں جن کا جاننا نوجوان جوڑوں کے لئے بہت ضروری ہے۔"

لیکن درحقیقت اس طرح کی تمام کتابیں جو افسانوی رنگ میں ہیں، بازاری اور مخربِ اخلاق ہیں۔

جب سنسکرت کی کتابوں سے "براہِ راست ترجمے" کا ڈھونگ ختم ہوا تو "عربی و فارسی کتابوں سے ترجمے کا ڈھونگ شروع ہوا۔ اور "قانونِ مواصلت" "جنسِ لطیف" "عروس و نوشاہ" "شادی کی پہلی رات کے پوشیدہ تجربے" "لذت النساء" "میاں بیوی" "دولہا دلہن" "مرد عورت" "ہدایت نامہ دولہا دولہن" وغیرہ کے نام سے کتابیں چھپنے اور بکنے لگیں۔ پہلی کتاب "قانونِ مواصلت" کو لیجئے۔

اس کے مصنف منشی حامد حسین قریشی ہیں۔ یہ کتاب فروری ۱۹۲۰ء میں شائع ہوئی۔ اس کے سرورق پر اعلان ہے:

"عربی زبان کی ایک نہایت مستند کتاب کا ترجمہ" - لیکن کون سی عربی کتاب کا ترجمہ ہے، کہیں درج نہیں۔ اور نہ کسی عربی کتاب کا ترجمہ معلوم ہوتی ہے۔ کیوں کہ اس میں کئی مقام پر انیسویں صدی عیسوی تک کے یورپی مصنفوں کے اقوال وتحاریر کے حوالے دیئے گئے ہیں۔ بہر حال یہ کتاب عام تصنیفوں کی طرح سنسنی خیز اور گھٹیا نہیں۔

اس زمانے میں سرقہ عام تھا۔ اور ایک کی تصنیف دوسرے کے نام سے، معمولی ردّ و بدل کے بعد شائع ہو جاتی تھی۔ مثال کے طور پر، "ہدایت نامہ دولہا دُلہن" جس کے مؤلف فدائے حکمت فخرالحکما، حکیم شیخ محمد ذکی قریشی ہیں "قانون مواصلت" مکا دھرا چھپا ہے۔ حیدر آباد دکن سے نفیس اکادمی نے "جنسیات" پر بعض عمدہ کتابیں شائع کیں جن میں وتسایانا کی "کام شترا" اور کلیان مل کی "اننگ رنگ" کے ترجمے قابل ذکر ہیں۔ پنڈت ہرنام داس بی اے نے "ہدایت نامہ خاوند" "ہدایت نامہ بیوی" وغیرہ کتابیں لکھیں۔ لاہور ہی کے ایک ادارہ نے "پریم شاستر" "کام شاستر" "گربھ شاستر" وغیرہ کتابیں شائع کیں۔ اسٹینو ایجنسی امرت سر کی خدمات بھی ادبِ جنسیات کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں بھلائی نہیں جا سکتیں۔ اردو میں پہلا جنسیاتی ماہنامہ "خضرِ راہ" ہے جو لاہور سے نکلا۔

رسالہ "نگار" کا اجرا ۱۹۲۲ء میں ہوا۔ اس وقت سے نیاز وقتاً فوقتاً جنسیات پر لکھتے رہے ہیں۔ ان کا قلم کبھی نہیں رکا جنسیات کا مطالعہ وہ امر ضروری سمجھتے ہیں کیوں کہ ان کے نزدیک

> "انسان کے فرائض علمی میں ایک بڑا اہم فرض "مطالعہ ذات" بھی ہے یہاں "ذات" سے فلسفہ تصوف کی "ذات خداوندی" مراد نہیں، بلکہ "ذات انسانی" مقصود ہے جس میں اس کے صفات و خواہشات یا "وظائف و کوائف" سب شامل ہیں"[1]

جنسیات کی اہمیت کے بارے میں نیاز کا خیال بالکل صحیح ہے کہ

> "جس طرح انسان نے اپنی اور تمام خواہشات میں اعتدال پیدا کرنے کے لئے تعقل کے ذریعہ سے متعدد علوم و فنون کی بنیاد ڈالی اسی طرح اس نے اپنی خواہشِ جنسی کو جائز حدود میں رکھنے کے لئے جنسیات (sexology) کو پیدا کیا اور اگر انصاف سے کام لیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ اس علم کی اہمیت اور تمام علوم کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے کیونکہ تمدن کا بڑا ہنگامہ اسی خواہش پر منحصر ہے"[2]

جنسیات پر قلم اٹھانے کا جواز نیاز نے یوں پیش کیا ہے۔

> "مغربی زبانوں میں اس فن پر کثرت سے کتابیں لکھی گئی ہیں، خصوصیت کے ساتھ گزشتہ ربع صدی میں تو نہایت زیادہ انہماک کے ساتھ اس پر توجہ کی گئی اور غیر معمولی طور پر بہت زیادہ لٹریچر اس موضوع پر شائع ہوا لیکن مشرقی زبانوں اور خاص کر اردو میں کوئی قابل ذکر کتاب اس مسئلہ پر نہیں لکھی گئی۔ اس میں شک نہیں کہ بعض کتابیں کوک شاستر کے اصول پر تو ضرور مرتب کی گئیں لیکن ان کا مقصود بجائے اصلاح کے اور زیادہ ہیجان

---

[1] تمہید "ترغیبات جنسی" از نیاز فتحپوری، پہلا اڈیشن ۱۹۲۳ء

[2] 〃 〃 〃

> پیدا کرنا ہے اور ان سے صرف وہی ادنیٰ ذہنیت اور معمولی ذوق کے آدمی لطف اٹھا سکتے ہیں جو اس فن کے علمی پہلو کی جگہ عملی پہلو کو دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ چنانچہ عرصہ سے میرا خیال تھا کہ ایک بسیط تالیف اس موضوع پر پیش کروں اور لوگوں کو بتاؤں کہ اس مسئلہ کے کون کون سے پہلو غور کرنے کے قابل ہیں اور تاریخ و علم کی روشنی میں اس کا مطالعہ کرنے سے کیا فائدے ہم کو حاصل ہو سکتے ہیں [1]

نیاز کا جنسیات سے دلچسپی لینا بلاوجہ اور خالی از سبب نہیں۔ ان کے جنسیات کی طرف متوجہ ہونے کی کہانی ی دلچسپ اور اہم ہے اور اس کہانی کا تعلق ان کی پچھلی زندگی سے ہے جس نے اُن کے خیالات و افکار اور اعتقادات کی دنیا کو ایک نئے سانچے میں ڈھال دیا۔ نیاز کی کہانی اُن ہی کی زبانی سنئے!

> "اپنی زندگی میں سب سے زیادہ اثر میں نے جس کا لیا وہ مولویوں کی جماعت تھی لیکن یہ اثر بالکل منفی قسم کا تھا۔ یعنی میں ان سے متاثر تو ہوا لیکن یہ تاثر ایک نوع کا انکاری تاثر تھا........ دفعتاً فضائے مذہب و مولویت سے ہٹ کر عشق و محبت یا بالفاظ دیگر جنسی رجحان و ہیجان کی دنیا میں آجانا میری زندگی کا ایسا واقعہ ہے جس کا ذکر کئے بغیر آگے گزر جانا اچھا نہیں معلوم ہوتا...... میرے والد عجیب و غریب اصول کے انسان تھے اور بچوں کی تربیت کے باب میں وہ اس قدر وسیع الخیال تھے کہ موجودہ عہد ترقی میں بھی اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا میں نے اپنے والد کا عہدِ شباب نہیں دیکھا لیکن جو کچھ میں نے سنا اس سے مجھے اس بات کا علم ہو گیا تھا کہ انہوں نے اپنی جوانی بالکل ایسی فضا میں گزاری تھی جس کا اصطلاحی نام بعد کو "شام اودھ" قرار پایا اور اپنے ذوقِ شباب کی تسکین میں انہوں نے وہ سب کچھ کیا جو ایک رنگین مزاج، دولتمند انسان لکھنؤ کی نشہ بخش اور عشق خیز سرزمین میں کر سکتا تھا۔ پھر یہ بھی بالکل اتفاقی بات ہے کہ میرے عہدِ شباب کی وہ جھرجھری جو عورت کے جسم سے مَس ہونے کے بعد پیدا ہوتی ہے، سب سے پہلے میرے جسم میں بھی یہیں پیدا ہوئی۔
>
> جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا، تربیت اخلاق کے باب میں میرے والد کا نظریہ [2] عجیب و غریب تھا۔ وہ جنسی داعیات کو دبانے کے قائل نہ تھے، بلکہ ان کی تسکین ہی کو ذہنی و جسمانی نشو و نما کا صحیح ذریعہ قرار دیتے تھے۔ اس لئے جب میں اپنی عمر کے ان حدود میں آگیا، جہاں ان کو اپنے نظریئے کا عملی تجربہ کرنا تھا، تو انہوں نے

---

[1] تمہید ترغیباتِ جنسی از نیاز فتحپوری، پہلا ایڈیشن ۱۹۳۳ء

> مجھے بالکل آزاد چھوڑ دیا۔ لیکن آپ کے لئے اس امر کا تصور بھی مشکل ہوگا کہ اب سے ۶۰ سال قبل لکھنؤ کیا چیز تھا اور اس میں کسی نوجوان کا آزاد چھوڑ دیا جانا کیا معنی رکھ سکتا تھا...... پھر اس دورِ آزادی میں میں نے وہاں کیا کیا دیکھا، کن کن گلیوں کی خاک چھانی، کن کن دیواروں کے سائے میں اور کن کن راہ گزاروں کی خاک پر میں نے اپنے لمحاتِ شباب صرف کئے یہ بڑی طویل داستان ہے۔...... میرے والد نے بھی مجھے اس دربار (بزم طوائف) میں بھیجنا شروع کیا اور یہیں سے میرے شباب کا وہ دور شروع ہوا جسے میں اپنے ادبی دور کا بھی آغاز کہہ سکتا ہوں.....
>
> میرے ذہنی انقلاب اور ادبی رجحانات کا تعلق زیادہ تر "مولوی" اور "عورت" ہی سے ہے۔ اس لئے مولوی کے ذکر کی تلخی کے بعد "عورت" کا ذکر آگیا ہے تو جی چاہتا ہے کہ اس سلسلہ میں وہ سب کچھ کہہ جاؤں جس کے اظہار کا موقع شاید مجھے پھر نہ مل سکے...... میرے عشق و جنوں کا یہ دور مختلف مقامات سے تعلق رکھتا ہے جن میں لکھنؤ، الہ آباد، مسوری، سری نگر، ہانسی، بھوپال، رامپور اور کلکتہ کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ ان تمام مقامات میں، میں اور میرا ذوق ادب عورت سے کس کس طرح متاثر ہوا اور اس میں کیا تدریجی تبدیلیاں پیدا ہوئیں، بڑی طویل داستان ہے[1]۔"

نیاز کے اعترافات سے یہ واضح ہے کہ ان کے ذہنی انقلاب اور ذوق ادب کی نشوونما میں عورت کا اہم و نمایاں کردار رہا ہے اور عورت کے بارے میں ان کا جی چاہتا ہے کہ وہ سب کچھ کہہ جائیں جس کے اظہار کا موقع شاید نہ مل سکے اور چونکہ، نیاز کا خیال ہے کہ

> "تمدن کا بڑا ہنگامہ خواہش جنسی پر منحصر ہے اور اس کا تعلق ایسی جنس سے ہے جو انسان کا بہترین نصف حصہ کہلاتی ہے اور دنیا کی تقریباً آدھی آبادی ہے،"

اس لئے نیاز کے نزدیک

> "جنسیات کی اہمیت اور تمام علوم کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔"

اور یہی وجہ ہے کہ جنسیات کو نیاز نے ایک محبوب علم اور مرغوب فن کا درجہ دیا ہے۔ نیاز مانتے ہیں۔

> "جنسی جذبات کی "پیداوار" کوئی نئی چیز نہیں، انسان ہمیشہ اس کے لئے تڑپا ہے۔ اسی جذبہ کی آزادی نے قوموں میں کشت و خون کا بازار گرم کیا اور اسی جذبہ

---

[1] "میری زندگی کے دو موڑ" از نیاز فتحپوری، مطبوعہ "نگار" اگست ۱۹۶۰ء

کی پابندی کی طرف سب سے پہلے سوسائٹی نے توجہ کی۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ جس جذبہ کا کھلم کھلا عمل میں لانا معیوب ہو اس کا اظہار مستحسن سمجھا جائے۔ لیکن اگر اس طرح بے باکی سے اس کا اظہار کیا جاتا ہے تو پھر اس کو علی الاعلان عمل سے بھی ظاہر کرنے کی جرأت کرنا چاہیئے۔"[لہ]

آخری جملہ تو خیر جملۂ معترضہ تھا، لیکن یہ حقیقت ہے کہ جنسیات کی اہمیت و افادیت کے قائل ہوتے ہوئے بھی یاز اس باب میں مغرب کی اندھی تقلید کو بُرا سمجھتے ہیں۔ خود فرماتے ہیں۔

"افسوس ہے کہ ہمارا نوجوان طبقہ مغربی تعلیم کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ وہاں کی عمرانی و معاشرتی برائیوں کو بھی اختیار کر لیتا ہے اور کورانہ تقلید مطلق غور کرنے کی اجازت نہیں دیتی، خصوصیت کے ساتھ جنسیات کے مسائل میں تو بالکل ہی عقل و تمیز سے کام نہیں لیا جاتا اور اس کا ایک سبب غالباً یہ بھی ہے کہ جوانی میں وہی باتیں زیادہ قرینِ عقل معلوم ہوتی ہیں، جو زیادہ فحش و عریاں ہیں۔"[لہ]

"عشق و محبت" کے بارے میں نیاز نے بارہا اپنے خیال کا اظہار کیا ہے۔ "محبت" پر کبھی فلسفیانہ نظر ڈالی ہے تو کبھی سی نقطۂ نگاہ سے اسے دیکھا ہے۔ چنانچہ نیاز ایک استفسار کے جواب میں لکھتے ہیں۔

"غالباً انہوں (اہل عرب) نے بہت زیادہ محبت کی ہے یا اس لئے کہ وہ نسبتاً اس کے زیادہ اہل ہیں۔ عشق و محبت کے جتنے مدارج انہوں نے مقرر کئے ہیں وہ کسی ملک یا زبان میں نہیں پائے جاتے۔ مختلف کیفیات کے لئے انہوں نے جدا نام وضع کیا اور ہر کیفیت کے اظہار میں دفتر کے دفتر سیاہ کر دیئے۔ شہاب الدین نویری نے لکھا ہے کہ سب سے پہلے جذبۂ پسندیدگی پیدا ہوتا ہے، اس کے بعد قرب و نزدیکی کی خواہش پیدا ہوتی ہے جو مودت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد محبت ہوتی ہے، پھر درجہ ہوئی کا ہے اور اس کے بعد عشق کا۔ لیکن عشق آخری منزل نہیں ہے کیونکہ عشق بڑھ جانے کے بعد تیتیم ہو جاتا ہے اور تیتیم میں زیادتی ہونے سے ولہ کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور جنون کا درجہ غالباً ولہ کے بعد ہے۔"[کہ]

ے ایک خط میں[عہ] نیاز فرماتے ہیں۔

[لہ] "نگار" جنوری و فروری ۱۹۴۴ء

"نگار" دسمبر ۱۹۴۵ء

مجموعہ استفسار و جواب

مکتوبات نیاز حصہ اول

> "حقیقت یہ ہے کہ "عشق" نام ہے صرف حماقت کا خواہ قبل مسیح ہو یا بعد مسیح
>
> حیرت ہے کہ ایسے گوش و ہوش والے انسان بھی اس کوچہ میں آکر اتنے احمق ہو جاتے ہیں"

نیاز نے شہاب الدین نوری کے مندرجہ بالا اقوال دہرانے کے بعد باہمی کشش کا ایک انوکھا سبب یوں بیان کیا کہ ۔

> "جدید ترین تحقیق سے ثابت ہے کہ ہر شخص کے جسم سے غیر مرئی کہربائی شرارے پیدا ہوتے رہتے ہیں اور بالکل ممکن ہے کہ جس وقت دو انسان کے برق پارے اپنی کیمیاوی حقیقت کے لحاظ سے یکساں ہوتے ہوں، اس وقت دونوں میں محبت ہو جاتی ہے اور جب ان میں تضاد ہوتا ہو تو نفرت ہو جاتی ہے۔ یہ بالکل جدید ترین تاویل ہے لیکن کس قدر حیرتناک امر ہے کہ اب سے تیرہ سو سال قبل جب رسول اللہ سے نفرت و محبت کی ماہیت دریافت کی گئی تھی تو آپ نے بھی یہی یہی فرمایا تھا کہ الارواح جنود مجندة ما تعارف"[1]

ایک اور جگہ "نیاز" نے شہاب الدین نوری ہی کے خیال کو دہراتے ہوئے لکھا ہے کہ

> "محبت یا عشق فی الحقیقت ایک شدید قسم کا احساس پسندیدگی ہے۔ پھر اگر یہی جذبۂ پسندیدگی افراد نوع انسانی میں سے کسی کے ساتھ ہو تو وہ بھی محبت کہلاتا ہے ..... بعض احباب کو میں نے کہتے ہوئے سنا ہے کہ علاوہ جنسی محبت کے ایک چیز ذہنی و روحانی محبت بھی ہے جسے Platonic love کہتے ہیں۔ لیکن میں اس کو محض شاعری سمجھتا ہوں اور اس کا وجود جنسی کیفیات سے علیحدہ میری سمجھ میں نہیں آتا"

نیاز افلاطونی محبت کو محض ڈھونگ سمجھتے ہیں اور اس کے سرے سے قایل نہیں۔ لیکن وہ فرائڈ کے بنیادی نظریۂ جنسی کے بھی قایل نہیں کہ محبت کی ہر قسم، خواہ وہ ماں کی بیٹے سے ہو یا باپ کی اپنی بیٹی سے، جنسی ہوتی ہے، گو شعوری طور پر اس کا احساس اور یقین دونوں میں کسی کو نہ ہو۔ ایک استفسار کے جواب میں کہ کیا محبت لوث جنسی سے منزہ ہو سکتی ہے؟ نیاز نے فرائڈی نظریۂ کے خلاف اپنی رائے کا اظہار کیا کہ

> "محبت کی اگر تقسیم کی جائے تو بہ ظاہر اس کی چھ صورتیں ہو سکتی ہیں:
>
> (۱) محبت اپنی ذات سے (۲) اولاد و اقارب سے (۳) احباب واصدقاء سے

---

[1] مجموعۂ استفسار و جواب

۴۔ مذہب اور ملت وطن سے، ۵۔ عام نوع انسانی سے اور ۶۔ حُبّ جنسی یعنی عورت مرد کی محبت۔ محبت کو صرف لوث جنسی سے متعلق سمجھنا نہایت کوتاہ نظری کی بات ہے"[1]

البتہ نیازؔ مذہبی ہیجان کا سبب جوش جنسی کو قرار دیتے ہیں۔ "مذہب و شہوانیات" کے عنوان سے اپنے ایک مقالہ[2] میں نیازؔ لکھتے ہیں!

> "اس میں شک نہیں کہ غذا کے بعد سب سے زیادہ قوی جذبہ، جنسی میلان ہی کا ہے جس سے انسان انتہائی لطف و مسرت حاصل کرتا تھا[3] اور زمانۂ حال کے ماہر نفسیات بھی کافی تحقیق و جستجو کے بعد اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مذاہب عالم کے بہت سے عقائد و مراسم کی بنیاد انسان کے اسی جذبہ پر قائم ہے۔ دیکھا جاتا ہے بعض لوگوں میں مذہبی جوش و ہیجان بہت زیادہ پایا جاتا ہے اور اس کا سبب عام طور پر مذہبی شغف کو قرار دیا جاتا ہے لیکن نفسیاتی نقطۂ نظر سے اس ہیجان کا سبب صرف یہ ہے کہ مذہبی ریاضت و اعمال میں جنسی خواہش کو سختی کے ساتھ دبایا جاتا ہے اور یہی جنسی جوش مذہبی خیالات میں منتقل ہو کر انتہائی تقشف کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ چنانچہ صوفیہ کے یہاں مشہور ہے کہ جذبات جنسی کی کمزوری کبھی ایک شخص کو صاحب حال اور اہل دل نہیں بنا سکتی ...... مذہبی ہیجان کے مظاہر میں ایک منزل وہ بھی آتی ہے جسے "حُبّ الٰہی" کہتے ہیں۔ لیکن سچ پوچھئے تو یہ خیال بھی اسی دبائے ہوئے جذبۂ شہوانی سے پیدا ہوا ہے۔ چنانچہ کلیسا کی تاریخ قدیم سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت جذبۂ شہوانی اور احترام الوہیت دونوں نے مل کر ایسی عجیب صورت اختیار کر لی تھی کہ بعض راہب اس خیال میں مست رہتے تھے کہ مریم کے ساتھ ان کی روحانی شادی ہو چکی ہے اور کلیسا کی کنواریاں اپنے آپ کو مسیح کی دلہن سمجھا کرتی تھیں یہ جذبہ ان میں محض اسی وجہ سے پیدا ہوتا تھا کہ وہ گوشت و پوست کے مخلوق ہونے کی حیثیت سے اپنی جنسی خواہش کو فطری طریقہ پر پورا نہ ہونے دیتے تھے اور ان کی یہی ناآسودہ آرزو انہیں مجبور کرتی تھی کہ وہ مریم اور مسیح کے ساتھ اس نوع کا روحانی مگر غیر فطری تعلق ظاہر کر کے اپنے جنسی ہیجان کی تسکین کر لیا کریں۔ ہو سکتا ہے کہ یہی چیز بعد میں استلذاذ بالنفس اور استلذاذ بالخیال کے رواج کا باعث ہوئی ہو۔ خدا اور انسان کے

---

[1] مجموعۂ استفسار و جواب

[2] نگار، جولائی ۱۹۴۵ء

[3] کیا اب نہیں کرتا ہے؟ ش ط

> درمیان عشق و محبت کی داستان بہت پرانی ہے اور عہد قدیم کے تمام مذاہب میں اس قسم کی روایات پائی جاتی ہیں جن میں مختلف دیوتاؤں نے زمین پر آکر حسین لڑکیوں سے عشق کیا اور ہو سکتا ہے کہ مسیح کا بطن مریم سے بغیر وساطت مرد پیدا ہونا ایسی خدائی عشق کے عقیدہ کا کرشمہ ہو...... ہندوستان کے مذاہب میں اعضائے جنسی کی پرستش کا علم تقریباً ہر شخص کو ہے لیکن یہ چیز صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ دوسرے ممالک میں بھی پائی گئی ہے۔"

نیاز نے "حب الٰہی" کے بارے میں اپنے ایک خط میں صاف صاف لکھا ہے کہ

> "حسن مجرد' کے پرستاروں کا میلان اس (امرد پرستی) کی طرف زیادہ ہوتا ہے..... محبت کے باب میں روحانیت و حقانیت میری سمجھ میں آتی نہیں۔"

نیاز نے جو کچھ لکھا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے اور مذہب کے نام پر جو ظلم و ستم ہوئے ہیں ان کے منجملہ اسباب میں ایک سبب جنسی ناآسودگی بھی ہے۔ اس سلسلہ میں کیتھراین ڈی میڈیچی (۸۹ - ۱۵۱۹ء) ملکۂ فرانس کی مثال کافی ہے جس نے جوشِ مذہبی میں ۱۵۷۲ء میں پروٹسٹنٹ مذہب کے ایک فرقہ کے ہزاروں آدمیوں کو مروا ڈالا اور جس کے بارے میں رچرڈ لیونسن نے لکھا ہے [1]

> "Catharine has earned the reputation of being one of the craftiest sadists of modern history .... it was a thwarted sex life that turned her into the patts of cruelty.

اور نیاز کا یہ خیال کہ

> "ہو سکتا ہے کہ یہی چیز (ناآسودہ خواہش جنسی) بعد میں استلذاذ بالنفس اور استلذاذ بالخیال کے رواج کا باعث ہوئی ہو۔"

بھی بالکل صحیح ہے۔ اسی ملکہ کیتھراین کے بارے میں اس کے ہم عصر مورخ اور اس کے دربار سے وابستہ امیر برانٹم (۱۶۱۴-۱۵۴۰ء) نے لکھا [2] ہے کہ

> "کیتھراین جب بیاہ کر کے فرانس آئی تو اٹلی سے اپنے ساتھ استلذاذ بالمثل کی بیماری بھی لائی اور فرانس کی عورتوں میں اس شوق کے رواج پانے کا باعث یہی عورت ہے۔"

---

[1] A History of Sexual Customs

[2] Lives of Fair and Gallant Ladies

مسئلہ ازدواج اور ازدواجی زندگی کے بارے میں بھی نیاز نے اکثر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور اُن کی رائے اس باب میں کتنی وقیع ہے، مندرجہ ذیل اقتباسات سے ظاہر ہوگی۔

۱۔ "ایک بیوی کے مرجانے کے بعد دوسری شادی کرنا ظاہر ہے کوئی شرعی گناہ تو ہے نہیں لیکن اخلاقی و معاشرتی معصیت ضرور ہے اگر کسی کے حالات اس کے مقتضی نہیں[1]"

۲۔ "رشتۂ ازدواج یقیناً جنسی داعیات پورا کرنے کا ذریعہ ہے اور اس سلسلہ میں میاں بیوی کو لذت اندوزی کی پوری آزادی حاصل ہے، لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ آپ اس آزادی سے ناجائز یا غلط فائدہ اٹھائیں۔ اس جگہ مجھے ذرا وضاحت کے ساتھ بتا دینا چاہیے کہ "ناجائز فائدہ" سے میری مراد کیا ہے۔ اتنا تو آپ بھی جانتے ہوں گے کہ انسان و حیوان میں کچھ فرق ہے اور یہ فرق تعلق رکھتا ہے صرف ذہن و تعقل سے۔ بقائے زندگی کی جو اصولی اور سادہ ضروریات ہیں، ان میں تو انسان و حیوان دونوں برابر ہیں، لیکن انسان چونکہ تمدنی حیوان ہے اور اس کی زندگی کا مقصد محض زندہ رہنا نہیں بلکہ ذہنی و عمرانی ترقی کرنا بھی ہے، اس لئے حیوانی خواہشات کے لحاظ سے اسے صرف اسی حد تک آزادی مل سکتی ہے کہ ذہنی، عمرانی و اخلاقی ترقیوں کو اس سے کوئی نقصان نہ پہنچے —— اور چونکہ جنسی جذبات کا تعلق یکسر حیوانی خواہشات سے ہے، اس لئے ان کے پورا کرنے میں بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے اور اس باب میں صرف لذت اندوزی کو سامنے رکھ کر بغیر کسی امتیاز کے وہ سب کچھ کر گزرنا جو جی میں آئے کبھی جائز قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اسی لئے تمام شریعتوں اور سماجی اداروں نے رسم ازدواج کے قیام کے ساتھ ساتھ کچھ اصول بھی مقرر کر دیئے تاکہ انسان محض جنسی لذت اندوزی کے لئے حیوان نہ بن جائے اور رشتۂ ازدواج کا حقیقی مقصد فوت نہ ہونے پائے۔ اگر جنسی ہیجان کی تسکین ہی مرد عورت کے باہمی تعلق کا واحد مقصود ہوتا تو پھر نکاح کی کوئی ضرورت نہ تھی، انسان کو اس باب میں جانوروں کی طرح آزاد ہونا چاہیے تھا، لیکن چونکہ مرد عورت کی باہمی وابستگی انسانی تمدن کی بھی بنیاد ہے، اس لئے وہ نکاح کبھی حقیقی معنے میں نکاح نہیں ہوسکتا جو اس ضرورت کو پورا نہ کرے۔ انسان ہمیشہ جوان ہی نہیں رہتا، بلکہ ایک وقت آتا ہے کہ وہ جوانی کی باتیں کرنے سے بھی گریز کرنے لگتا ہے اور یہی وہ وقت ہوتا ہے جب وہ محسوس کرتا ہے کہ مرد عورت کا حقیقی تعلق جذبۂ حیوانی سے علٰحدہ کسی اور جذبہ سے بھی ہے اور وہ جذبہ ہمارے سماج اور ہماری معاشرت اور ہمارے اجتماعی اخلاق و تمدن

---

[1] مکتوبات نیاز حصہ اول

> سے تعلق رکھتا ہے۔ اور اسی لئے ٹالسٹائی کا فیصلہ ہے کہ شادی کا زمانہ ۴۰ سال کے بعد آتا ہے جبکہ جذبات جوانی میں اعتدال پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر انسان کی عمر طبعی ۶۰ سال کی قرار دی جائے تو اس میں جوانی کے پرجوش ہیجان کا زمانہ (۲۰ سال کی عمر سے لے کر زیادہ سے زیادہ ۴۰ سال تک) صرف ۲۰ سال رہتا ہے اور باقی ۴۰ سال کی مدت وہ ہوتی ہے جب یہ جذبہ کار فرما نہیں ہوتا۔ اس لئے یوں بھی عقل انسانی یہی کہتی ہے کہ ۲۰ سال کے لئے ۴۰ سال ضائع کر دینا کسی طرح مناسب نہیں، اور اگر کسی شخص نے ہیجان شباب کا زمانہ بے احتیاطی سے بسر کیا تو اس کے متعلق یقیناً یہی کہا جائے گا کہ اس نے اپنی عمر کے بڑے حصے کو چھوٹے حصہ عمر کی لذتوں پر قربان کر دیا۔"[1]
>
> ۳۔ "میاں بیوی کا رشتہ بڑا نازک و پیچیدہ رشتہ ہے۔ کیوں کہ اس کا تعلق ایک طرف ذاتیات سے ہے اور دوسری طرف اجتماعیات سے بھی۔ یعنی اس تعلق کا ایک پہلو وہ ہے جو میاں بیوی کے ذاتی میلانات سے وابستہ ہے اور دوسرا وہ ہے جو سوسائٹی اور سماج کے نظام سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس میں جنسی میلانات کو اتنی زیادہ اہمیت حاصل نہیں ہے جتنی اجتماعی و تمدنی مصالح کو اور اسی کو پیش نظر رکھ کر "ادارۂ نکاح" قایم کیا گیا ورنہ جنسی خواہش تو بغیر نکاح کے بھی پوری ہو سکتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جنسی میلان اس سے بالکل بے نیاز ہے کہ وہ کسی نتیجہ پر غور کرے کیونکہ بھوک پیاس کی طرح وہ بھی ایک فطری خواہش ہے جس کو انسان پورا کرتا ہے، لیکن جس طرح غذا کا مقصود صرف زندہ رہنا نہیں بلکہ زندہ رہ کر مفید کام کرنا ہے، اسی طرح نکاح کا مقصد بھی صرف جنسی خواہش پورا کرنا نہیں بلکہ توالد و تناسل قائم رکھ کر اچھے افراد قوم پیدا کرنا ہے۔"[2]

عرض کر چکا ہوں کہ نیاز کے نظریات کو فکر کے سانچے میں ڈھالنے والی ہستی "عورت" کی ہے اور نیاز کے الفاظ ہیں:۔

> "عورت کے باب میں میرا نظریہ یہ ہے کہ وہ انتہائی گنہگار ہونے کے باوجود بھی اویس و بایزید سے زیادہ معصوم ہے۔"[3]

---

[1] "نگار" دسمبر ۱۹۴۵ء - باب المراسلہ

[2] "نگار" جون ۱۹۴۶ء - باب الاستفسار

[3] مکتوبات نیاز، حصہ سوم

عورت کے فرائض و ذمہ داریوں کی بابت نیاز فرماتے ہیں:۔

> "جنسیات' سے تعلق رکھنے والی باتوں کو چھوڑ کر آپ 'تمدنی' حیثیت سے غور کریں تو حالت اور زیادہ افسوسناک نظر آئے گی۔ خانہ داری، تربیتِ اولاد، اقتصادی نگہداشت وغیرہ جن میں دستگاہ رکھنا عورت کا حقیقی حسن ہے۔ تعلیم بے شک عورت کے لئے ضروری ہے لیکن اس کے لئے یہ لازم نہیں کہ وہ بے پردہ ہو کر سوسائٹی کا تفریحی عنصر بن جائے"[1] کامیاب ازدواجی زندگی کے لئے بیوی میں کن خصوصیات کا ہونا ضروری ہے، اس پر نیاز کی رائے ہے کہ
>
> "بیوی' کا تعلق 'جذبۂ شہوانی' سے اتنا نہیں جتنا 'مصلحت عمرانی' سے ہے۔ اس کا صاحبِ حسن و جمال ہونا اتنا ضروری نہیں جتنا خوش خصال ہونا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ جو مذہب اسلام میں کفو کے درمیان شادی کرنے کی ہدایت کی گئی ہے، اس کا مفہوم سب لوگ غلط سمجھتے ہیں۔ کفو سے یہ لوگ خاندان یا برادری مراد لیتے ہیں۔ درآں حالیکہ کفو کے معنی مماثل کے ہیں۔ یعنی جو لوگ تہذیب و شرافت، تعلیم و تربیت، سیرت و صورت میں باہمدگر مماثل ہیں ان میں ایک دوسرے کے ساتھ رشتۂ ازدواج قائم ہونا چاہیئے پھر اس کے لئے خاندان یا برادری کی قید بیکار ہے۔"[2]

عورت کے احترام کے باوجود نیاز جب میاں بیوی کی باہمی کشمکش اور آپس میں چپقلش پر غور کرتے ہیں تو شوہر سے زیادہ بیوی کو قصوروار ٹھہراتے ہیں۔ سنئے کیا فرماتے ہیں۔

> "دوسری بات جو میرے خیال میں عام طور پر باہمی کشمکش کا سبب ہوا کرتی ہے عورت کا جذبۂ رشک اور اس کی 'کاوش پسندی' ہے۔ یعنی وہ اس کوشش میں کہ مرد پر پوری طرح مستولی ہو جائے اس کی جائز تفریحوں اور ضروری آزادیوں میں بھی مخل ہونے لگتی ہے اور ہر وقت اس فکر میں لگی رہتی ہے کہ مرد کہاں جاتا ہے کس کس سے ملتا ہے اور کس جگہ کتنا وقت صرف کرتا ہے۔ زیادہ محبت کرنے والی عورتوں میں 'جاسوسی' کی یہ کیفیت زیادہ پیدا ہو جاتی ہے اور رات دن وہ اسی فکر میں مبتلا رہتی ہیں۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ ہندوستان میں (اور پاکستان میں بھی) زن و شوہر کی ناچاقی کا سبب ۸۰ فی صدی یہی ہوتا ہے اور میں اس باب میں یقیناً عورت کو خطاوار ٹھہراتا ہوں"[3]

---

[1] مکتوبات نیاز، حصہ سوم

[2] " " " اول

[3] " " " "

کامیاب ازدواجی زندگی گزارنے کے لئے نیاز عورتوں کے لئے تعلیم کی بہ نسبت امورِ خانہ داری پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں۔

> "میں لڑکیوں کے لئے امتحانات میں شریک ہو کر اسناد حاصل کرنا غیر ضروری سمجھتا ہوں ...... اگر ہمارے خیالات کی بلندی یہی ہے اور اصلاح کا مفہوم صرف اس قدر ہے کہ لڑکیاں مشن اسکولوں میں جا کر تھوڑی سی انگریزی اور بہت سی فیشن طرازی سیکھ لیں تو نتیجہ معلوم اور عورتوں کے ساتھ مردوں کا حشر بھی مستحق"[1]

رابعہ پنہاں کے استفسار کے جواب میں نیاز فرماتے ہیں۔

> "میں یقیناً اس کا مخالف ہوں کہ خواتینِ ہند غزل گوئی کی طرف متوجہ ہوں کیوں کہ ان کے عشقِ حقیقی کو بھی میں نے مجاز میں بہت جلد بدل جاتے ہوئے دیکھا ہے اور اس سے دنیا نا آشنا نہیں کہ وہ عورت جو محبت کرنا سیکھ جاتی ہے، سوسائٹی کے لئے کچھ مفید چیز نہیں۔ افسوس کہ میں اپنے اس خیال سے کسی طرح نہیں ہٹ سکتا۔"[2]

اسی طرح پردہ کے متعلق فرماتے ہیں۔

> "عورتوں کے لئے چار دیواری کے اندر بند رہنے کا کہیں حکم نہیں ہے، وہ مناسب و ضروری پردہ کے ساتھ باہر نکل سکتی ہیں، پردہ ایسا ہونا چاہیئے جس سے ان کی آرائش وغیرہ ظاہر نہ ہو سکے (اس لئے ہمارے ہاں کا موجودہ برقع عین اس حکم (قرآنی) کے مطابق ہے) اور اگر کوئی حصہ جسم کھل جائے جو چلنے میں چھپایا نہیں جا سکتا ہے جیسے پاؤں یا ہاتھ یا آنکھ تو کوئی حرج نہیں"[3]

بہت ممکن ہے، نیاز کے ان خیالات کو پڑھ کر لوگ ان کو دقیانوسی، قدامت پرست اور رجعت پسند ہونے کا طع دیں مگر نیاز نے آج سے اکتیس سال پہلے جو کہا تھا کہ

> "یہ واقعہ ہے کہ اب یہ آزادی کی رَو کسی طرح رکنے والی نہیں اور زمانہ جو عبارت ہے اس نوع کے مد و جزر سے کہ جب تک ایک بار مرد کو عورت اور عورت کو پوری طرح مرد نہ بنالے چین نہیں لینے دیگا"[4]

---

[1] مجموعہ استفسار و جواب

[2] " " "

[3] " " "

[4] "نگار، نومبر ۱۹۳۱ء

کیا غلط کہا تھا۔ کیا آج کی عورت مرد بننے کی کوششوں میں مصروف نہیں ہے؟ اور پھر نیازؔ کے اس قول سے کہ

> "اب تعلیم جدید نے ہندوستان کی (اور پاکستان کی بھی) عورتوں میں یہ میلان ضرور پیدا کر دیا ہے کہ وہ گھر کے کاموں سے الگ رہیں اور یہ میلان حد درجہ خطرناک ہے۔"[1]

س ہوشمند کو اختلاف ہو سکتا ہے۔

نیازؔ بعض حالات کے تحت ضبط تولید کے موافق ہیں اور فرماتے ہیں۔

> "یہ مسئلہ بھی منجملہ ان مسائل کے ہے جن کا تعلق مذہب و شریعت سے کوئی نہیں بلکہ اقتصادی و معاشی حالات سے ہے۔ اگر واقعی کوئی شخص مفلس و نادار ہے تو اس کے لئے سب سے زیادہ عذاب دنیا میں یہی ہے کہ اولاد کی کثرت ہو۔ اس لئے اس کا ذاتی وانفرادی فرض یہ ہے کہ وہ قطعاً اس سلسلہ کو روک دے ...... اگر کسی شخص کی مالی حالت اتنی کمزور ہے کہ وہ اپنی اولاد کی صحیح تربیت کا انتظام نہیں کر سکتا اور پھر بھی اولاد پیدا کرتا جاتا ہے تو میرے نزدیک ایسا شخص قوم کا مجرم ہے اور اس کو سخت سے سخت سزا ملنا چاہیئے۔ کیونکہ وہ سوسائٹی میں ناقابل نااہل افراد کا اضافہ کر رہا ہے جو قومی زندگی کے لئے سخت تباہ کن امر ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص تعلیم و تربیت کا پورا انتظام کر سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اولاد سے گھبرائے اور قطع نسل کی طرف مائل ہو ..... اس وقت مسلمانوں کی مالی حالت یقیناً نہایت خستہ ہو رہی ہے اور منجملہ دیگر اصلاحی تدبیروں کے ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اولاد کم پیدا کی جائے۔"[2]

جنسیات سے متعلق موضوعات پر نیازؔ کے افکار و خیالات، جن کا بیان و تجزیہ اوپر ہو چکا ہے، زیادہ ن کے مکتوبات، استفسارات کے جواب اور گنتی کے چند مضمون میں ملتے ہیں۔ علاوہ ازیں، کتابی صورت نیازؔ کی ایک علیحدہ مستقل تصنیف بھی ہے، جو "ترغیباتِ جنسی یا شہوانیات" کے نام سے موسوم اور مشہور ۔ اس کتاب میں، دعویٰ کیا گیا ہے 'انسان کے میلان شہوانی پر تاریخی، علمی و نفسیاتی نقطۂ نظر سے بسیط نظر ڈالی گئی ۔ یہ کتاب ۱۹۲۲ء میں پہلی بار منظرِ عام پر آئی اور اب تک اس کے تین اڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

جنسیات بہ حیثیت علم و فن کے ایک بحرِ ذخار ہے۔ چونکہ یہ علم الانسان، علم الاعضاء، علم الحیات، عمرانیات، ات و دیگر علوم و فنون کا مجموعہ ہے، اس لئے اس کے موضوعات متنوع اور نہایت وسیع ہیں۔ چنانچہ

---

[1] "نگار" جون ۱۹۴۶ء

[2] مجموعہ استفسار و جواب جلد سوم

اس کے تمام پہلوؤں پر بہ یک وقت روشنی ڈالنا، کسی فرد واحد کے بس کی بات نہیں۔ ہیولاک ایلس نے اکتیس ۳۱ سال (۱۸۹۷ء تا ۱۹۲۸ء) کے عرصہ میں Studies in The Psychology of Sex کی سات ضخیم جلدیں شائع کیں جو نہایت معتبر و مستند تسلیم کی جاتی ہیں، تاہم وہ جنسیات کے تمام پہلوؤں پر محیط و حاوی نہیں ہیں۔ نیاز نے اپنی کتاب میں ابنارمل جنسی رجحانات و میلانات سے بحث کی ہے، جنہیں انگریزی میں Sexual Abnormalities، Abberrations، Anamalies، Deviations، Perversions کہتے ہیں۔ جنسی گمراہیاں ایک دو نہیں ہزاروں ہیں اور ماہرین جنسیات، خصوصیت سے جرمن زبان میں کرافٹ ایبنگ؛ سیگنس، ہرش فلڈ؛ مول؛ بلاخ اور اسٹیکل نے جنسی گمراہیوں پر بلند پایہ تحقیقی کتابیں لکھی ہیں جن سے ہیولاک ایلس و دیگر مصنفوں نے بے تحاشا استفادہ کیا ہے۔ حال ہی میں امریکہ کے دو ڈاکٹروں، لنڈن اور کاپریو، نے مل کر سات سو صفحات پر مشتمل کتاب موسوم بہ Sexual Deviations میں جنسی گمراہی کی تمام اقسام کا اجمالی جائزہ لیا ہے۔ مگر نیاز نے محض چند جنسی گمراہیوں — قحبگی؛ استلذاذ بالمثل؛ استلذاذ بالوحوش؛ استلذاذ بالنفس — کو زیر بحث لانے پر اکتفا کیا ہے لیکن ان پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

دو چار سال پہلے کراچی کے ایک ماہنامہ نے "چہ دلاور است دزدے کہ چراغ بکف دارد" کے مستقل کالم میں نیاز پر سرقہ کا الزام لگایا تھا کہ ان کی "ترغیبات جنسی" ہیولاک ایلس کے شہرہ آفاق شاہکار کا چربہ ہے۔ اول یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ہزاروں صفحات پر پھیلی ہوئی سات جلدوں کی مشمولات کی چوری چار سو صفحوں میں کس طرح سما سکتی ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نیاز نے ہیولاک ایلس سے استفادہ کیا ہے اور جہاں جہاں انہوں نے جرمن و دیگر مغربی ماہر جنسیات کے حوالہ سے باتیں لکھی ہیں تو ان کا علم بھی ہیولاک ایلس ہی کی وساطت سے ہوا ہے نہ کہ براہ راست۔ یہ غلطی نیاز سے ضرور ہوئی کہ انہوں نے اصل ماخذات جن تک ان کی رسائی نہیں تھی، کے حوالے وساطت کا نام لئے بغیر دیدیئے۔ رہا معاملہ استفادہ کا تو بقول جناب غلام رسول مہر صاحب

> "اساتذہ ایک دوسرے کے کلام سے استفادہ بھی کرتے رہتے ہیں، جسے
> حق ناشناس لوگ سرقہ قرار دے لیتے ہیں۔"

اگر استفادہ سرقہ ہے تو دنیا کی کوئی کتاب حتیٰ کہ الہامی کتاب بھی اس الزام سے بچ نہیں سکتی ؎

"ما ارانا نقول الا معارا — او معاداً من قولنا مکرورا (کعب ابن زہیر)

(ہم جو کہتے ہیں وہ اگلوں سے مستعار لیا ہوا خیال ہوتا ہے یا اپنے ہی کہے ہوئے کو دہراتے ہیں)

"ترغیبات جنسی" اپنی نوعیت کی اردو زبان میں واحد کتاب ہے۔ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد اردو میں کوئی اور کتاب نظر آتی ہے جس میں اتنی تفصیل سے شادی؛ اعضائے جنسی کی پرستش، قحبگی، ہم جنس پرستی، خود لذتی، اور جانوروں سے لطف اندوزی کی ابتدا و ارتقا سے، مثالوں اور مستند حوالوں کے ساتھ بحث کی گئی

ہو۔ ان موضوعات پر یہ منفرد اور مستند کتاب ہے۔ بعض باتوں میں نیاز سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، مثلاً مخاشی کی تعریف میں اور بعض جگہ نیاز نے ایک طرفہ بات کہی ہے، مثلاً عورتوں میں خود لذتی سے پیدا شدہ نقصانات کے سلسلہ میں لکھتے ہیں[1]

> "چنانچہ ڈاکٹروں اور طبیبوں نے استلذاذ بالمثل (ہم جنسی پرستی) یا استلذاذ بالنفس (خود لذتی) کے جو نقصانات لکھے ہیں ان کی فہرست بہت طویل ہے۔ ہم ذیل میں ایک نقشہ درج کرتے ہیں جس سے استلذاذ بالنفس کے نقصانات کے متعلق ڈاکٹروں کی رائیں ظاہر ہوتی ہیں"۔

اور نیاز نے ۲۸ ڈاکٹروں کے نام اور ان کے بتائے ہوئے نقصانات کی فہرست درج کر دی ہے۔ اس سلسلہ میں عرض ہے کہ یہ بیان محض ایک طرفہ ہے، کیوں کہ بعض ڈاکٹروں کی رائے میں اگرچہ صرف نقصانات ہی نقصانات ہیں لیکن دوگنی تعداد ڈاکٹروں اور ماہر جنسیات کی ایسی ہے جو نقصانات کے قائل نہیں ہیں بلکہ خود لذتی کو عورتوں کے لئے مفید اور سود مند بتاتے ہیں۔ بہ خوفِ طوالت، میں صرف چند مشہور و معروف ڈاکٹروں و ماہر جنسیات کے نام اور ان کی مستند رائے لکھنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

نمبر شمار	نام	رائے
۱۔	ہنٹر	میں اس بات کی تصدیق کر سکتا ہوں کہ یہ فعل (خود لذتی) بذات خود اجسمانی صحت کو مباشرت کے فطری فعل سے کم ہی نقصان پہنچاتا ہے۔
۲۔	ارسی	خود لذتی محبت کی ایک قسم ہے اور وہ لوگ جو اسے بُرا بھلا کہتے ہیں، حق بجانب نہیں ہیں۔
۳۔	لیپز	کم سنوں کے لئے اتنا ہی نارمل ہے جتنا کہ کھانا اور سونا۔
۴۔	برل	اس سے کبھی کوئی نقصان نہیں بلکہ یہ اچھی چیز ہے۔
۵۔	اسٹرین	سائنس اس کے نقصانات کی تردید کر چکا ہے۔
۶۔	اسٹوکس	کم سنوں کے لئے نارمل اور ہر عمر کے لئے بے ضرر۔
۷۔	ڈیر بارن	ضرورت اس بات کی ہے کہ عام پبلک کو اس کے بے ضرر ہونے اور اس کے مفید اثرات سے آگاہ کیا جائے۔
۸۔	اسٹیکل	اس سے پرہیز نیوراتی بیماریاں پیدا کرتا ہے۔
۹۔	مول	اعصاب کے لئے فائدہ مند اور تسکین دہ ہے۔

---

[1] ترغیبات جنسی بار دوم ۱۹۴۱ء ص ۲۹۱

۱۰	لونگ	ہونے والی دلہنوں؛ ایک دوسرے سے جدا میاں بیوی، بیواؤں اور کنواریوں کے لئے سفارش کرتا ہوں۔
۱۱۔	ابرہارڈ	عورتوں میں ذہن کی تیزی کو جلا دیتی ہے۔
۱۲۔	روبی	بہت سی حالتوں میں سود مند ہے۔
۱۳۔	ہوئیر	خصوصیت کے ساتھ عورتوں کے لئے مفید ہے۔
۱۴۔	بلنچارڈ و مناہیز	ایک مفید مقصد پورا کرتی ہے۔
۱۵۔	ہرش فلڈ	جوانوں کے واسطے حدِّ اعتدال میں خود لذتی باعثِ سکون ہوتی ہے۔
۱۶۔	ہٹن	مجرد عورتوں کو سکون بخشتی ہے۔
۱۷۔	ہنڈر	بچوں کی نارمل نشو و نما کا نہایت ہی اہم حصہ ہے۔
۱۸۔	آدمز	کوئی وجہ نہیں کہ اسے جنسی ہیجان کی تسکین کا بیہودہ ذریعہ سمجھا جائے۔
۱۹۔	ہارپر	بہت سوں کے لئے جنسی ہیجان کی تسکین کا بے ضرر ذریعہ ہے۔

غلطیاں کس نے نہیں کیں، ٹھوکریں کون نہیں کھاتا۔ ہیولاک ایلس جیسا عالم و محقق جب استلذاذ بالنفس کے باب میں ریختی کے مشہور شاعر جان صاحب کو عورت قرار دے کر ایک فاش غلطی کر سکتا ہے تو نیاز کی ایک دو معمولی غلطیاں اس علم کے بیان میں جو ان کے وقت تک شجرِ ممنوعہ تھا، کوئی حساب میں نہیں، حق تو یہ ہے کہ جنسیات کے باب میں نیاز کی خدمات بھلائی جا نہیں سکتیں اور ان کی تصنیف "ترغیباتِ جنسی" ادبِ جنسیات کا بیش بہا سرمایہ ہے۔

اگر کارگاہِ حیات پر نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ عالم کی تمام رونق، دنیا کا سارا ہنگامہ منحصر ہے صرف انسانی خواہشات پر جن کی تکمیل کے لئے وہ اپنی تمام جسمانی و دماغی قوتیں صرف کر دیتا ہے۔ وہ بھوکا ہوتا ہے تو حصولِ غذا کے لئے کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتا وہ سردی گرمی محسوس کرتا ہے تو اس کے دور کرنے کے لئے شب و روز محنت کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ اور جب اسے پیاس معلوم ہوتی ہے تو پانی کے لئے وہ دیوانہ وار دوڑتا پھرتا ہے۔ منجملہ انہیں فطری خواہشات کے ایک خواہش وہ بھی ہے جو تعلق جنسی یا جذبۂ شہوانی سے وابستہ ہے اور اس کے لئے بھی تگ و دو کرنا اس کی عادت ہے۔ لیکن جس طرح فراہمیٔ غذا کے سلسلہ میں انسان سدِّ رمق یا نانِ جویں سے بڑھ کر مزعفر و بریانی پر بھی بس نہیں کرتا، حفاظت کے لئے کھدّر سے گزر کر حریر و پرنیاں تک پہنچ جاتا ہے۔ تشنگی رفع کرنے کے سلسلہ میں پانی سے شرابِ انگور تک بڑھ جاتا ہے اسی طرح وہ خواہش جنسی پورا کرنے میں ایک جائز حد سے گزر کر ان صورتوں تک پہنچ جاتا ہے جو بڑی حد تک غیر فطری، غیر انسانی اور غیر تمدنی ہیں۔ انہیں بدعنوانیوں و بے اعتدالیوں کو روکنا "تعقل" کا کام ہے اور اسی کا استعمال انسان کو دوسرے حیوانات سے ممیز کرتا ہے۔ (نیاز)

نگارِ پاکستان کے خاص نمبر

اقبال نمبر

(سالنامہ سنہ ۶۲ء) جسے پاکستان کے معجز بیان شاعر اقبال کے نامِ نامی پر موسوم کیا گیا ہے اس میں اقبال کی تعلیم و تربیت، اخلاق و کردار، شاعری کی ابتداء اور مختلف ادوارِ شاعری، اقبال کا فلسفہ و پیام، تعلیم اخلاق و تصوف، اس کا آہنگ تغزل اور اس کی حیاتِ معاشقہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

قیمت :- تین ۳ روپے

مصحفی نمبر

نگارِ پاکستان کا خصوصی شمارہ جس میں اردو ادب کے مسلم الثبوت استاد شیخ غلام ہمدانی "مصحفی" کی تاریخ پیدائش و جائے ولادت کی تحقیق، ان کی ابتدائی تعلیم، ان کی شاعری کے آغاز و تدریجی ارتقاء، ان کی تالیف و تصانیف، ان کی غزل گوئی و مثنوی نگاری، ان کے معاصر شعراء و ادباء اور ان کے اپنے دور کے مخصوص علمی و ادبی رجحانات پر محققانہ و عالمانہ بحث کی گئی ہے۔

قیمت :- تین روپے

نظیر نمبر

نگارِ پاکستان کا خصوصی شمارہ جس میں نظیر اکبرآبادی کا مسلک، اس کا فارسی و اردو کلام میں عارفانہ رنگ اسکی قدرت بیان و زبان، اس کا معیاری تغزل، ادبیات اردو میں اس کا فنی اور لسانی درجہ، اس کے امتیازات اور محاسن شعری، اس کا شاعری میں مقام، صنائع و طبائع شعراء کا فرق، معاصرین کی رائیں، مستند ادباء کی موافقت و مخالفت میں تنقیدیں اور اسکی خصوصیات و اندازِ شاعری پر سیر حاصل تبصرہ ہے۔

قیمت :- تین روپے

غالب نمبر

سالنامہ سنہ ۱۹۶۱ء - جس میں مرزا غالب کی فارسی و اردو شاعری کی خصوصیات کو بالکل نئے زاویہ سے پیش کیا گیا ہے۔ یہ خاص نمبر اپنی جامعیت اور افادیت کے اعتبار سے طلباء اور شائقینِ ادب کیلئے بیحد مفید اور لائق مطالعہ ہے۔

قیمت :- چار روپے

ہندی شاعری نمبر

ہندی شاعری نمبر جس میں ہندی شاعری کی مکمل تاریخ اور اس کے تمام ادوار کا بسیط تذکرہ موجود ہے۔

قیمت : چار ۴ روپے

مینجر نگارِ پاکستان ۳۷/۳۲ گارڈن مارکیٹ کراچی ۳

تصانیف مولانا نیاز فتحپوری

انتقادیات مولانا نیاز فتحپوری کے معرکتہ الآراء ادبی، تحقیقی اور تنقیدی مقالات کا مجموعہ جن کی نظیر نہیں ملتی۔ ہر مقالہ اپنی جگہ حرفِ آخر اور معجز ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اردو زبان، اردو شاعری، غزل گوئی کی رفتارِ ترقی اور ہر بڑے شاعر کا مرتبہ متعین کرنے کے لئے اس کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ یہ کتاب اسی اہمیت کی بناء پر پاکستان کے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اعلیٰ امتحانات کے نصاب میں داخل ہے۔ قیمت چار ر،

مذاہب عالم کا تقابلی مقابلہ مولانا نیاز فتحپوری کی معرکتہ الآراء تصنیف جس میں مذاہب عالم کی ابتدا، مذہب کا فلسفہ وارتقا، مذہب کی حقیقت، مذہب کا مستقبل، مذہب سے بغاوت کے اسباب پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور مسیحیت کو علم و تاریخ کی روشنی میں پرکھا گیا ہے قیمت ۴ر

مشکلات غالب غالب کے تمام مشکل اشعارِ اردو کا نہایت صاف و صحیح حل جو وضاحت بیان کے لحاظ سے حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ قیمت:۔ ۲ روپیے

عرض نغمہ ٹیگور کی گیتا نجلی کا سب سے پہلا اردو ترجمہ جو نایاب ہو گیا تھا۔ وہ اب دوبارہ طبع ہوا ہے۔ معہ ایک بسیط مقدمہ کے۔ قیمت: ایک روپیہ

ترغیبات جنسی مولانا نیاز فتحپوری کی معرکتہ الآرا تصنیف، جس میں فحاشی کی تمام فطری و غیر فطری قسموں کے حالات، ان کی تاریخ و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی۔ قیمت:۔ ۵ روپے ۵۰ پیسے

تاریخ کے گمشدہ اوراق حضرت نیاز کے چوبیس افسانوں کا مجموعہ جو تاریخ اور انشائے لطیف کے امتزاج کا بلند ترین معیار قائم کرتے ہیں ان افسانوں کے مطا سے واضح ہو گا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ ہیں۔ جنھیں حضرت نیاز کی انشا نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔ قیمت:۔ ۲ روپے۔

جذبات بھاشا مولانا نیاز فتحپوری نے ایک دلچسپ اور عالمانہ تمہید کے ساتھ ہندی شاعری کے بہترین نمونے پیش کر کے انکی تشریح ایسے تخلیقی انداز میں کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے اردو میں یہ پہلی کتاب ہے جو اس موضوع پر لکھی گئی اور جس میں ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں قیمت 1.25

ایک شاعر کا انجام حضرت نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا طویل افسانہ جسے افسانہ نویسی میں ایک نئے باب کا آغاز ہے اس کا ایک ایک جملہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات سے معمور ہے۔ یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ اس کی نظیر نہیں ملتی۔ قیمت ایک روپیہ

نقاب اٹھ جانے کے بعد حضرت نیاز کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ہادیانِ طریقت اور علماء کرام کی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کیلئے کس درجہ سم قاتل ثابت ہوتا رہا ہے۔ زبان، پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ قیمت:۔ ۷۵ پیسے

شبستان کا قطرۂ گوہریں مولانا نیاز فتحپوری کے بہترین افسانوں کا مجموعہ جس میں حسن بیان ندرت خیالات اور پاکیزگی کے بہترین شاہکار پیش کئے گئے ہیں ہر افسانہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ قیمت ایک روپیہ پچیس پیسے

منیجر نگار پاکستان کراچی ۳